فکرونظر

نومبر ۲۰۰۳ء

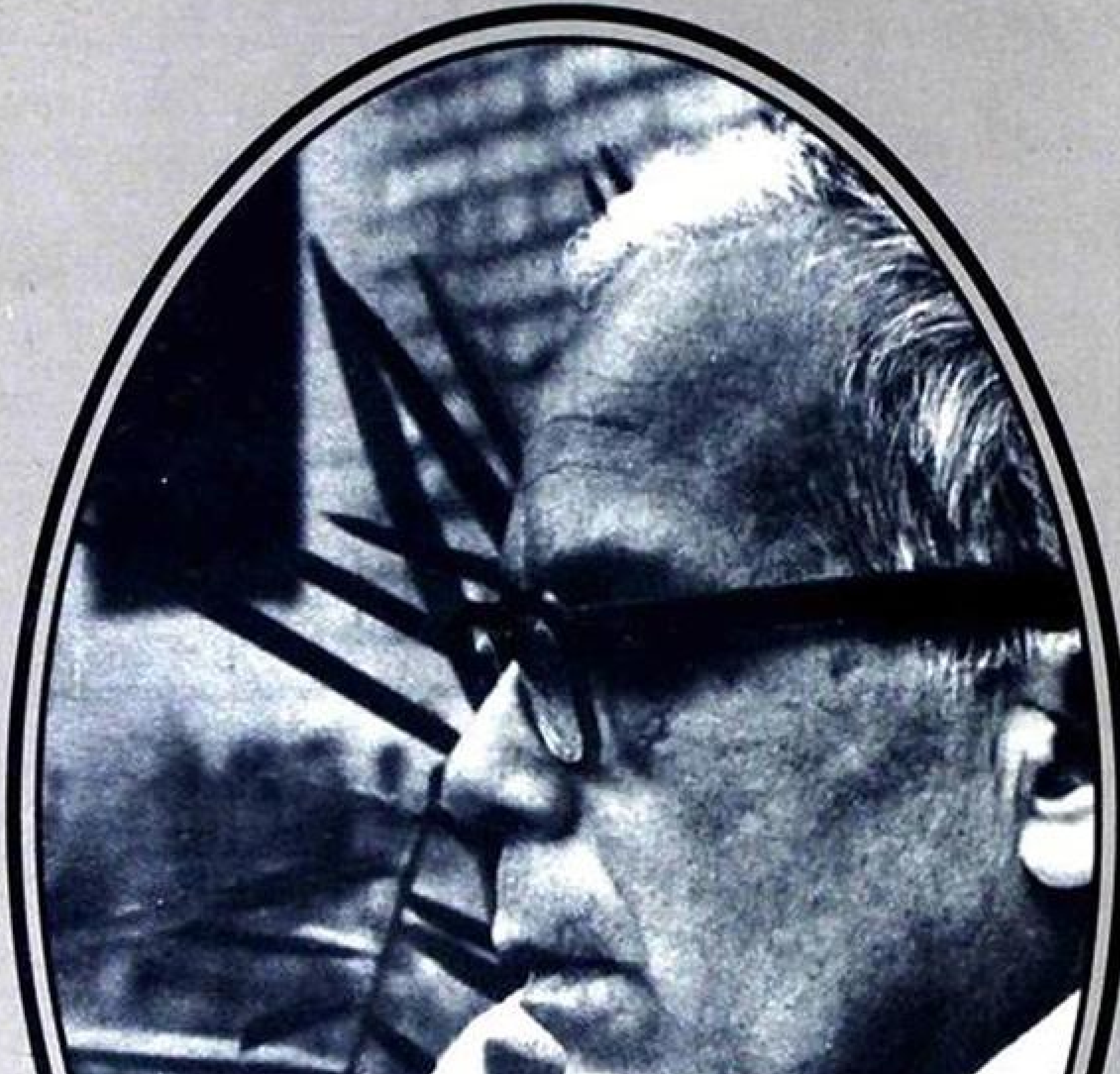

سرور نمبر

www.taemeernews.com

فکر و نظر

سرور نمبر

نومبر ۲۰۰۳ء

مدیر
پروفیسر آزرمی دخت صفوی

نائب مدیر
محمد صابر

۱۔شبلی روڈ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

www.taemeernews.com

مجلسِ ادارت

چیئرمین

جناب نسیم احمد

وائس چانسلر

پروفیسر ابو الکلام قاسمی

شعبۂ اردو

پروفیسر عالم حسین نقوی

شعبۂ ایپلائیڈ فزکس

ڈاکٹر محمد اعظم قاسمی

شعبۂ اسلامک اسٹڈیز

ڈاکٹر محمد آصف نعیم صدیقی

شعبۂ فارسی

فکرونظر علی گڑھ

سہ ماہی

زرسالانہ : ۶۰ روپے

برائے طلبائے اے۔ایم۔یو :

۳۵ روپیہ روپے

فی شمارہ : ۲۰ روپے

بیرون ملک : ۱۵ امریکی ڈالر

ٹیلی فون: 700937 Ext. 1542/1229

اس شمارہ کی قیمت:

تزئین: ساجد علی خاں

طباعت: اے۔ایم۔یو۔پریس، علی گڑھ

(ضروری نہیں کہ ادارہ مقالہ نگار کی آراء سے متفق ہو۔)

www.taemeernews.com

ترتیب

	اداریہ	پروفیسر آزرمی دخت صفوی	۵
	قصیدہ	پروفیسر اے۔ ایم۔ کے شہریار	۹

شخصیت اور کارنامے

۱-	سرور صاحب کی یاد میں	ڈاکٹر محمود الٰہی	۱۱
۲-	مؤسسِ اقبال انسٹی ٹیوٹ۔ سرور صاحب	پروفیسر کبیر احمد جائسی	۱۶
۳-	میرے استاد محترم۔ سرور صاحب	پروفیسر اصغر عباس	۳۲
۴-	لائے کہاں سے دنیا مثل و نظیر اس کا	پروفیسر محمد انصار اللہ	۴۰
۵-	پروفیسر آل احمد سرور	پروفیسر محمد یٰسین	۴۶
۶-	پروفیسر آل احمد سرور اور علی گڑھ	ڈاکٹر سلطان احمد	۵۳

نقد و نظر

۷-	غالب، جدید ذہن اور آل احمد سرور	پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی	۷۰
۸-	پروفیسر آل احمد سرور ایک دانشور، نقاد اور شاعر	پروفیسر باقر مہدی	۹۱
۹-	آل احمد سرور: اردو تنقید کی آبرو	ڈاکٹر خلیق انجم	۱۰۲
۱۰-	آل احمد سرور کی تنقید نگاری	پروفیسر عتیق اللہ	۱۰۹
۱۱-	سرور صاحب کا تصور نقد	پروفیسر قاضی افضال حسین	۱۱۷
۱۲-	دانشور سرور	پروفیسر عابد رضا بیدار	۱۳۷

تنقید و تخصیص

۱۳-	خود نوشت سرور	پروفیسر محمد حسن	۱۴۷
۱۴-	آل احمد سرور اور مطالعۂ میر	پروفیسر نیر مسعود	۱۵۷

www.taemeernews.com

۱۵-	خواب باقی ہیں۔ایک جائزہ	پروفیسر ریاض الرحمٰن شیروانی	۱۶۱
۱۶-	اقبال تنقید اور آل احمد سرور	پروفیسر ابوالکلام قاسمی	۱۷۳
۱۷-	اقبال شناسی اور پروفیسر آل احمد سرور	ڈاکٹر الطاف احمد اعظمی	۱۸۶
۱۸-	آل احمد سرور کی اقبال شناسی۔ایک عمومی جائزہ	ڈاکٹر علی احمد فاطمی	۱۹۷
۱۹-	اردو فکشن۔۔ آل احمد سرور کی نظر میں	ڈاکٹر صغیر افراہیم	۲۱۶

صحافت اور ادبی صحافت

۲۰-	سرور صاحب: مدیر ہماری زبان	پروفیسر عتیق احمد صدیقی	۲۲۸
۲۱-	آل احمد سرور کی ادبی صحافت	ڈاکٹر امتیاز احمد	۲۴۵

شعر و نقد

۲۲-	تنقیدی اشارے آج	پروفیسر سعید الظفر چغتائی	۲۶۱
۲۳-	خواب اور خلش	ڈاکٹر آصف نعیم	۲۸۴

یادیں اور باتیں

۲۴-	بیگم سرور سے خصوصی ملاقات	مدیر	۲۸۹
۲۵-	سرور بنام جائسی	پروفیسر کبیر احمد جائسی	۳۰۱
۲۶-	سرور صاحب یاد آتے ہیں	پروفیسر امیر زہرا حسین	۳۰۶
۲۷-	مجلس نور و سرور	ڈاکٹر سید احتشام ندوی	۳۱۰
	آثارِ آل احمد سرور	پروفیسر ضیاء الدین انصاری	۳۱۴

باقیات

الف:	سوانح		۳۵۳
ب:	کلام سرور بہ خط سرور		۳۵۶
	قطعۂ تاریخ وفات	ڈاکٹر سراج اجملی	۳۶۵

☆☆☆

www.taemeernews.com

اداریہ

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی صرف ایک دانشگاہ ہی نہیں، ایک عظیم الشان تحریک کی مکمل شکل اوراس کی جیتی جاگتی علامت ہے۔ وہ تحریک جس کا مقصد نہائی ہمارا ذہنی ارتقااور ہماری تاریخ اور کلچر کی بقا رہا ہے۔ اردو زبان وادب کو فروغ دینے میں سرسیداوران کے ساتھیوں نے جوخدمات انجام دیں ان کوفراموش نہیں کیا جا سکتا۔ خود سرسید کے طرز نگارش نے ہی اردو زبان کواس کا بنیادی اسلوب دیا ہے۔ حالی نے اس بنیادی اسلوب کوسنواراور نکھار کر ہماری زبان کوقوت اظہار دی۔ علی گڑھ گذشتہ تقریباً ایک سو سال سے اردو زبان وادب کا مرکز رہا ہے اور آج یہ مرکزیت اور بھی زیادہ نمایاں ہوگئی ہے۔ ۱۹۶۰ء میں 'فکرونظر' کی بنیاں گزاری بھی اسی مقصد کے پیش نظر کی گئی تھی۔ جب سے لے کر آج تک یونیورسٹی کا یہ مؤقر رسالہ اس خدمت کوانجام دیتا رہا ہے۔ نامورانِ علی گڑھ، حالی نمبر، شبلی نمبر وغیرہ اسی مقصد کی تکمیل کا حصہ رہے ہیں۔ زیر نظر خصوصی شمارہ 'سرور نمبر' بھی اسی سلسلے کوآگے بڑھانے کی ایک کڑی ہے۔

پروفیسر آل احمد سرور نے جس دانشوری، ہنرمندی، انہماک اور اشتیاق سے اردو زبان وادب کی گراں قدر خدمت کی اوراس کے مختلف پہلوؤں کو اپنے فکروفن سے جلادی اس نے ان کواس تحریک کا اہم جزو بنا دیا۔ فکرونظر نے ہمیشہ بانی درسگاہ کے مقاصد اوران کی تحریک کوعزیز رکھنے والوں کوعزیز رکھا ہے اوران کے کارناموں کوسراہا ہے۔ 'سرور نمبر' سرسید کی زندہ و پائندہ تحریک کے اس سرگرم نمائندہ کوخراج تحسین پیش کرتا ہے۔

پروفیسر آل احمد سرور دنیا سے رخصت ہوئے۔ ان کی دلنواز شخصیت، دل گرمی، علم وادب سے ان کا غیر معمولی شغف، ان کی فکر بلیغ، تنقید ادب کی بے پناہ صلاحیت، نظر کی وسعت، ان کے منفرد اسلوبِ نثر کی جمالیات، شعری تخلیق میں ان کے حسی اور مشاہداتی تجربے کی گیرائی و گہرائی، دوستوں، شاگردوں اور دلبا ختگانِ اردو کے لیے ان کی گرم جوشی نے آمیختہ ہوکر سرور صاحب کوایک غیر معمولی انسان اور شعروادب میں ایک مشخص و ممتاز مقام کا حقدار بنایا ہے۔ تنقید کے میدان میں ان کے نقش پا واضح اور گہرے ہیں۔ نقد ادب کی تاریخ اردو میں بہت طویل نہ سہی، لیکن دلچسپ اور معنی خیز ضرور ہے۔ اس کا آغاز شاید ان فارسی، اردو تذکروں کو مانا جاسکتا ہے جو 'بلندش بغایت بلند اما پستش بغایت پست است'' کہہ کر مجمل اور موٹے طور پر خوانندہ کوایک عمومی اور تاثراتی نقد کی طرف متوجہ ضرور کرتے تھے۔ پھر آزاد نے آب حیات میں استعارہ کا ایسا باغ لگایا کہ ہر دور کی خصوصیات کومجسم اور شعرا کو جیتا جاگتا بنا کر پیش کر دیا۔ مغربی تنقید سے فی الجملہ استفادہ کرنے والوں کی ابتدا میں علی گڑھ کے دو نامور سرفہرست ہیں، حالی اور شبلی ——

ان بدلتے ہوئے معاییر وموازین اور ارزش ادبی کے نئے اصول واسالیب کے دھاروں کوایک خاص نہج

www.taemeernews.com

دینے والوں میں آل احمد سرور کا نام ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس تنقیدی سفر کی ابتدا ان کے 'تنقیدی اشارے' سے ہوتی ہے۔ کلاسیکی مشرقی ادب کے تقاضوں سے پوری طرح واقف ہونے کے ساتھ وہ جدید اصول تنقید پر بھرپور نظر رکھتے تھے۔ ان کا مطمح نظر ان دونوں کی فطری آمیزش تھا۔ سرور صاحب پر اعتراض یہ کیا گیا ہے کہ وہ کسی ایک 'اسکول' کے پابند نہیں رہے۔ میری نظر میں شاید یہ ایک دانشور کی پہچان ہے کہ وہ اپنے کو کسی ایک مکتب فکر کا پابند نہیں بناتا۔ اس کا فکر اور فن بہت سی نتیجہ گیریوں سے ناشی ہوتا ہے اور بہ نوبہ خود، اس سے دوسرے بے شمار نئے مباحث مستخرج ہوتے ہیں۔ سرور صاحب کا نقد ادب قدیم وجدید کی بے شمار روایتوں کا نچوڑ بھی ہے اور آیندہ نقد کی اسالیب کا سرچشمہ بھی۔ غالب ہوں یا اقبال یا بہ مجرد تنقیدی اصول اور اسالیب کا تجزیہ، ان سب کا Treatment سرور صاحب خود اپنے مخصوص انداز میں کرتے ہیں اور یہی ان کی تنقید کی انفرادیت ہے۔

زیر نظر شمارہ میں اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ اس مختصر رسالے کے محدود صفحات میں اردو ادب کے اس نقاد، ادیب، شاعر اور دانشور کی شخصیت اور فکر وفن کے مختلف پہلوؤں کا جہاں تک ممکن ہو احاطہ کیا جائے۔ اسی کے مدنظر اس کو چھ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ بعض موضوعات پر ایک سے زیادہ مقالے بھی شامل کیے گئے ہیں کہ ان موضوعات کی اہمیت اور شرح وبسط بھی اس کے متقاضی تھے، مثلاً سرور صاحب کی اقبال شناسی، اور مختلف زاویہ ہای نگاہ نے ان میں گونا گوں جہات کا پتہ بھی دیا ہے۔ ان کی شخصیت اور کارناموں سے شروع ہو کر یہ شمارہ سرور صاحب کی تحریر پر ختم ہوتا ہے۔

سرور نمبر کی اشاعت کے سلسلے میں جن لوگوں کی معاونت اور ہمت افزائی کا میں تہہ دل سے شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں ان میں سرفہرست نام، مسلم یونیورسٹی کے علم دوست وائس چانسلر فکر ونظر کے سرپرست جناب نسیم احمد صاحب کا ہے۔ انہوں نے نہایت گرم جوشی اور صمیمیت کے ساتھ سرور نمبر نکالنے کی تائید کی اور ضروری رقم عنایت فرمائی۔ رسالہ نکلنے تک وہ 'دامے، درمے، قدمے، سخنے' ہر طرح ہماری مدد کرتے رہے۔ ان کی اس ہمت افزائی اور تعاون کے لیے ادارۂ فکر ونظر ان کا ازحد ممنون ہے۔

''اب نظر کا ہے کو آئینگی یہ تصویریں کہیں'' بیگم آل احمد سرور نے اپنے انٹرویو میں ان خوبصورت اور لازوال لمحات کو جو انہوں نے اپنے رفیق حیات کے ساتھ گزارے اپنے بے ساختہ انداز سے زندہ کر دیا ہے۔ ان کا شکریہ ادا کرنے کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں۔ باوجود کسالت مزاج کے انہوں نے ۲ گھنٹہ سے بھی زیادہ کا وقت دیا اور میرے ہر سوال کا جواب کبھی شگفتگی سے، کبھی افسردگی سے اور کبھی ہنس ہنس کر دیا۔ سرور صاحب کی بیٹی مہ جبین صاحبہ اور ان کی نواسی رخشندہ صاحبہ کی بھی ازحد ممنون ہوں جنہوں نے اس انٹرویو میں حصہ بھی لیا اور میری مدد بھی کی۔ سرور صاحب کی علمی اور ادبی حیثیت پر مقالے تو دوسرے مجلوں میں بھی ملیں گے، لیکن بیگم سرور کا یہ انٹرویو اس خصوصی شمارہ کے لیے مخصوص ہے۔ میں سرور صاحب کے صاحبزادے جناب صدیق صاحب کی شکرگزار ہوں کہ انہوں نے اپنے والد کی تصویر سرورق کے لیے عنایت کی۔

www.taemeernews.com

ان تمام مقالہ نگار حضرات کا شکریہ ادا کرنا میرا اوّلین فریضہ ہے جن کے تعاون کے بغیر اس شمارہ کی اشاعت ممکن ہی نہیں تھی۔ اپنی گوناگوں علمی مصروفیات کے باوجود انہوں نے ہماری درخواست پر سرور نمبر کے لیے اپنے گراں قدر مقالے بھیجے۔ ہمیں خوشی ہے کہ ملک کے نامور اہل قلم اس شمارہ کے شریک ہیں۔ ان حضرات کو شکریے کے ساتھ ایک ہی دعا دی جاسکتی ہے "زور قلم اور زیادہ"۔

جناب عابد رضا بیدار ہمارے خصوصی شکریے کے حقدار ہیں۔ انہوں نے سرور صاحب کے اپنے ہاتھ سے لکھی ہوئی سوانح اور انتخاب اشعار ہم کو عنایت کیے جو اس شمارہ کی زینت ہیں۔

ہم ممنون ہیں جناب ضیاء الدین انصاری صاحب، ڈائرکٹر خدا بخش لائبریری پٹنہ کے، انھوں نے بڑی ہی محنت اور تفصیل سے سرور صاحب کی تصنیفات و تالیفات کی فہرست مرتب کر کے سرور نمبر کے لیے بھیجی۔ اس کو دیکھ کر پروفیسر سرور کی علمی کاوشوں کے تنوع پر حیرت ہوتی ہے۔

تمام ممبران ایڈیٹوریل بورڈ کے تعاون کے لیے میں ان کی تہہ دل سے ممنون ہوں۔ ان کے قیمتی مشوروں کے بغیر 'سرور نمبر' کی اشاعت ممکن نہ ہوتی۔ اس کے علاوہ میں خصوصی طور پر پروفیسر ایم۔ کے۔ شہریار صاحب کی بے حد ممنون ہوں کہ انہوں نے ہر ہر موقع پر اپنی رائے اور مشوروں سے ہماری رہنمائی کی۔

فائنانس آفیسر جناب شفیق احمد صاحب کی میں شکرگزار ہوں کہ انھوں نے تمام مالی معاملات اور 'مشکلات' ہمارے لیے آسان کیں!۔ پروفیسر کبیر احمد جائسی، ڈاکٹر صغیر افراہیم، ڈاکٹر اسد علی خورشید، ڈاکٹر عثمان غنی، میرے ریسرچ اسکالر احتشام الدین اور ان تمام دوستوں اور ساتھیوں کا شکریہ ادا کرنا میرا خوش آیند فرض ہے جنھوں نے مختلف موقعوں پر مختلف طریقوں سے اس نمبر کو نکالنے میں مدد کی۔ اس کے ساتھ ساتھ میں ادارۂ فکر و نظر کے اپنے تمام ساتھیوں کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں۔ اس شمارہ کو نکالنے میں انہوں نے بڑی محنت اور عرق ریزی سے کام لیا اور میرے ساتھ پورا پورا تعاون کیا۔

قارئینِ باتمکین، سرور نمبر پیش خدمت ہے۔

آزرمی دخت صفوی

www.taemeernews.com

شہریار*

قصیدہ در مدح
پروفیسر آل احمد سرور

پیار یوں تو تمام فطرت سے
عشق بس ایک آدمیت سے

ساری دنیا میں نام، گرچہ رہا
عمر بھر بے نیاز شہرت سے

ماورا اپنی ذات کو رکھا
مصلحت کیشی سیاست سے

ہو نہ اہل و عیال کو مشکل
واسطہ رکھا اتنا دولت سے

جدتوں کو سراہا، منوایا
تھی محبت بہت روایت سے

پچھلی قدروں کا احترام تو تھا
کوئی رشتہ نہ تھا قدامت سے

اہل بینش نے کسب نور کیا
جس کی آگاہی اور بصیرت سے

شعر کے سحر کا اسیر مگر
آشنا نثر کی ضرورت سے

جس کا جو حق تھا اس کو دلوایا
ادب و شعر کی عدالت سے

کیسی ہی بزم ہو نہیں چاہا
آگے جانا حد متانت سے

جاگ کر کم کیے بہت ہی کم
خواب کے فاصلے حقیقت سے

کوئی دیوانہ حسن صورت کا
کوئی مرعوب حسن سیرت سے

اب میں سورج کو کیا چراغ دکھاؤں
سب ہی واقف ہیں اس کی عظمت سے

کوئی پوچھے کہ کون ہے ایسا
نام لوں گا ترا عقیدت سے

**ہے خدا سے دعا، ہو عمر دراز
اور نوازے مزید عزت سے

یعنی یہ ہو بروئے کار آئیں
جتنے جوہر ملے ہیں قدرت سے

---

*پروفیسر و سابق صدر، شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

**یہ قصیدہ سرور صاحب کے دوران حیات لکھا گیا۔

www.taemeernews.com

شخصیت اور کارنامے

www.taemeernews.com

محمود الٰہی*

سرور صاحب کی یاد میں

سرور صاحب نے دہلی میں اپنی جان جان آفریں کے سپرد کی، خبر اخبارات میں شائع ہوئی۔ میں اس وقت مکۂ مکرمہ میں تھا، وہاں کے اخبار 'اردو نیوز' میں بھی ان کی دفات کی خبر شائع ہوئی تھی، اگرچہ یہ اخبار میرے پاس تھا مگر میں ابھی اس کا مطالعہ نہیں کر سکا تھا کہ مشہور محقق پروفیسر حنیف نقوی میری قیام گاہ پر آئے اور دریافت کیا کہ آج کا اردو نیوز آپ نے دیکھا، میں نے نفی میں جواب دیا تو انہوں نے سرور صاحب کے انتقال کی خبر سنائی۔ دیر تک ہم دونوں سرور صاحب کو یاد کرتے رہے اور ان کی خدمات کا ذکر کرتے رہے۔ یہ گفتگو یکسر تعزیتی تھی۔ ہم محسوس کر رہے تھے کہ موت نے اردو زبان وادب کے میر کارواں کو ہم سے جدا کر دیا۔

سرور صاحب نے طویل عمر پائی اور ان کو قریب سے دیکھنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہی ہوتا رہا۔ ان کی قربت مجھے بھی نصیب ہوئی لیکن تواتر کے ساتھ نہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ہم دونوں کی جائے قیام میں بڑا فاصلہ تھا، ان کا مسکن علیگڑھ تھا اور میں گورکھپور میں قیام پذیر تھا۔ سال میں چار چھ بار کہیں نہ کہیں ان سے ملاقات ہو جاتی تھی اور ان ملاقاتوں میں ان کی شخصیت کے متعدد پہلو سامنے آجاتے تھے۔

جب ۱۹۵۵ء میں سرور صاحب نے لکھنؤ کو خیر باد کہا اور علی گڑھ کو اپنے علم و دانش کی جولاں گاہ بنایا تو دو ڈھائی سال تک مجھے سرور صاحب سے استفادے کا شرف حاصل ہوتا رہا۔ سرور صاحب کے علی گڑھ پہنچتے ہی ان سے قربت رکھنے والے دو حلقوں میں تقسیم ہو گئے۔ یہ تقسیم سرور صاحب کے علمی، ادبی اور تہذیبی حوالے سے نہیں ہوئی بلکہ ان کی گوناگوں شخصیت کی رہین منت تھی۔ سرور صاحب لکھنؤ سے آتے ہی یونیورسٹی پر چھا گئے۔ یہ ان کی ہمہ گیر شخصیت کی دین تھی۔ وہ جس طرف نکل جاتے، ان کا خاموش احترام کرنے والوں کی کمی نہیں رہتی تھی۔ سرور صاحب کی شخصیت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ وہ کم آمیز تھے، لیے دیے رہتے تھے، ان کا رکھ رکھاؤ قربت کو فاصلے میں بدل دیتا تھا مگر ان کا یہ پہلو فطری تھا، اکتسابی نہیں تھا۔ جب کوئی ان سے ملتا تو یہ بڑی

---

*پروفیسر، سابق صدر شعبہ اردو، گورکھپور یونیورسٹی، ٹانڈا، امبیڈکر نگر، اتر پردیش۔

www.taemeernews.com

عزت کے ساتھ اس سے گفتگو کرتے لیکن گفتگو کے دوران اگر سرور صاحب سے کسی سفارش کی طرف اشارہ کیا جاتا تو وہ خاموشی سے سن لیتے تھے مگر اس پر مثبت یا منفی ردعمل کا اظہار نہیں کرتے تھے۔ جب سرور صاحب سفارشوں پر عمل کرنے سے قاصر رہ جاتے تو بعض حضرات کی مایوسی بڑی حد تک فطری تھی اور یہ مایوسی سرور صاحب کی مخالفت کا سبب بن جاتی لیکن انہوں نے کبھی مخالفتوں کی پروا نہیں کی، انہوں نے وہی کیا جس کی توثیق ان کی عقل سلیم نے کی۔

یونیورسٹیوں کی متعدد سلیکشن کمیٹیوں میں مجھے سرور صاحب کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔ اکثر کمیٹیوں میں انہوں نے کسی بحث کے بغیر دوسرے اراکین کی سفارشوں سے اتفاق کیا۔ ایک بار کسی میٹنگ کے بارے میں لوگوں کا خیال تھا کہ یہ بڑی ہنگامہ خیز ہوگی اور اتفاق رائے سے کسی امیدوار کا انتخاب مشکل ہوگا لیکن یہ میٹنگ تھوڑی دیر میں فیصلہ کن نتیجے پر پہنچ گئی۔ وائس چانسلر نے کسی رکن کی رائے دریافت کی انہوں نے ایک امیدوار کا نام پیش کیا، سرور صاحب نے کہا کہ میں اس رائے کی تائید کرتا ہوں۔ دوسرے اراکین نے بھی اتفاق کیا، کوئی بحث نہیں ہوئی اور فیصلہ متفقہ تھا۔ ایک عرصے کے بعد کسی نے اس میٹنگ میں سرور صاحب کے رویئے کے بارے میں پوچھا۔ میرے جواب سے انہیں حیرت ہوئی۔ دراصل انہیں غلط فہمی تھی کہ سرور صاحب پہلے سے کسی اور امیدوار کے حق میں تھے۔ میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ کبھی سرور صاحب نے نہ تو کسی سلیکشن کمیٹی سے پہلے امیدواروں کے بارے میں مجھ سے گفتگو کی اور نہ اس کے بعد کبھی سلیکشن کمیٹیوں کو موضوع گفتگو بنایا۔ انہوں نے ہمیشہ اس طرح کی سلیکشن کمیٹیوں کے ضوابط اور وقار کو برقرار رکھا۔

سرور صاحب کے ضبط و استقلال اور معاملہ فہمی و دور اندیشی کی ایک مثال پیش کرنا چاہتا ہوں۔ یہ ڈھکی چھپی بات نہیں ہے کہ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو نے علی گڑھ ہسٹری آف اردو لٹریچر کی ترتیب و اشاعت کا ایک منصوبہ مرتب کیا تھا جسے یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے منظور کر لیا۔ منصوبے کے متعدد مسائل پر غور و خوض کے لیے ملک کے سربرآوردہ اساتذۂ اردو کی ایک میٹنگ مارچ ۱۹۵۷ء میں منعقد ہوئی۔ اس میٹنگ میں قاضی عبدالودود، پروفیسر محی الدین قادری زور، رام بابو سکسینہ، پروفیسر اختر اورینوی، پروفیسر عبدالقادر سروری، ڈاکٹر نجیب اشرف، مجنوں گورکھپوری، مالک رام، ڈاکٹر اعجاز حسین وغیرہ نے شرکت کی۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی نے جو اس منصوبے کے ڈائرکٹر تھے، میٹنگ کی صدارت کی۔ پروفیسر آل احمد سرور میٹنگ کی کارروائی چلا رہے تھے۔ پروفیسر نذیر احمد نے لکھنؤ یونیورسٹی سے رخصت لیکر پروجیکٹ کے اسسٹنٹ ڈائرکٹر کا عہدہ سنبھال لیا تھا۔ شعبۂ اردو کے اساتذہ بھی میٹنگ میں شریک ہوئے تھے۔ میٹنگ کی کارروائی بڑی خوش اسلوبی سے جاری تھی۔ دفتر والوں نے اخراجات سفر کا لفافہ مہمانوں کے سپرد کر دیا تھا۔ اب یہ گفتگو چل رہی تھی کہ مجوزہ تاریخ ادب کے ابواب اور اس کے ذیلی موضوعات کی ترتیب کن اساتذہ کے سپرد کی جائے۔ کسی رکن نے دو تین موضوعات کے لیے نام پیش کیے

www.taemeernews.com

جو کسی بحث کے بغیر منظور کیے گئے۔ قاضی عبدالودود بڑی دیر سے خاموش تھے، یکا یک کھڑے ہو گئے، اخراجات سفر کا لفافہ میز پر رکھ دیا اور فلیٹ ہیٹ اٹھا کر کمرے سے باہر چلے گئے اور یہ کہتے ہوئے گئے کہ میں واک آؤٹ کر رہا ہوں کیونکہ جن لوگوں کے سپرد موضوعات کیے جا رہے ہیں ان کی اہلیت قابل اعتنا نہیں ہے۔

قاضی صاحب کمرے سے باہر کیا گئے کہ حاضرین جلسہ کو سانپ سونگھ گیا، رشید صاحب نے سرور صاحب سے کچھ کہا اور سرور صاحب قاضی صاحب کے پاس پہنچ گئے، چند لمحوں کے بعد رشید صاحب بھی قاضی صاحب کے پاس پہنچ گئے۔ رشید صاحب جلد ہی واپس آ گئے، کوئی دس پندرہ منٹ کے بعد سرور صاحب اور قاضی صاحب آ گئے۔ سرور صاحب نے کارروائی پھر شروع کی اور کہا کہ جمہوریت کا تقاضا ہے کہ ہر رکن کو اظہار خیال کا موقع دیا جائے اور جمہوری انداز میں فیصلے کیے جائیں۔ اس کے بعد مرتبین کے نام پیش کیے جانے لگے اور ہر نام پر قاضی صاحب اپنا اختلافی نوٹ درج کراتے رہے۔

میں نے اس واقعے کا ذکر اس لیے کیا کہ قاضی صاحب جیسی شخصیت کو رام کر لینا سرور صاحب کی دانش مندی، معاملہ فہمی اور دوراندیشی کا بڑا ثبوت ہے۔ انہوں نے ایک تاریخی اجتماع اساتذہ کو رسوائی سے بچا لیا۔

جب گورکھپور یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں ایم۔اے کے درجات شروع ہوئے تو امتحانات کے لیے Viva.Voce کا مرحلہ سامنے آیا۔ میں نے پروفیسر احتشام حسین اور پروفیسر آل احمد سرور سے رابطہ قائم کیا۔ دونوں نے میری درخواست قبول کر لی۔ اس زمانے میں ایم۔اے پریوئس اور ایم۔اے فائنل دونوں میں Viva-Voce داخل نصاب تھا۔ یہ دونوں بزرگ ہر سال اس کام کے لیے آتے رہے۔ احتشام صاحب کی وفات کے بعد کسی دوسرے کے ساتھ یہ کام انجام پذیر ہوتا رہا مگر سرور صاحب اس وقت تک آتے رہے جب تک ان کی دوسری مصروفیات نے انہیں معذرت کر لینے پر مجبور نہیں کیا۔

میں یہ چاہتا تھا کہ ہمارے طلبہ کو ملک کے مشہور اساتذۂ اردو پرکھیں اور اساتذہ و طلبہ کی خامیوں کی نشاندہی کریں۔ یہ دونوں بزرگ وقتاً فوقتاً ہمیں مشورے دیتے رہے۔

میں نے کبھی ان بزرگوں کے فیصلوں میں مداخلت نہیں کی۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوا کہ بعض امیدواروں نے اپنی معاشی بدحالی اور خانگی مسائل کا ذکر کیا لیکن سرور صاحب کا یہ خیال تھا کہ امیدوار کے حالات قابل افسوس ہیں مگر ان کا علمیت اور اہلیت و قابلیت سے کیا رشتہ ہے؟ پھر اس کو واجبی نمبر دیتے تھے جو سوالوں کے جواب پر مبنی ہوتا تھا۔ سرور صاحب ادب کے مختلف گوشوں پر سوالات کرتے تھے اور اکثر کسی داخل نصاب کتاب کا متن بھی پڑھواتے تھے۔

سرور صاحب نے اتر پردیش اردو اکاڈمی کے سیاق و سباق میں میری بڑی حوصلہ افزائی کی اور رہنمائی بھی۔ میرا تجربہ تھا کہ عام طلبہ کو داخل نصاب کتابیں نہیں ملتیں۔ یا تو وہ کتابیں بہت مہنگی ہوتی تھیں یا بازار میں دستیاب نہیں ہوتی تھیں۔ میں نے مجلس انتظامیہ کے تعاون سے لاگت سے کم قیمت پر نصابی کتابوں کی ترتیب و اشاعت کی ذمہ داری قبول

www.taemeernews.com

کی۔ ہر چند بعض احباب نے اس گھاٹے کے سودے پر اعتراض کیا مگر میں نے صورت حال کی وضاحت کی اور انہیں بتایا کہ اکاڈمی ہر طالب علم کے ہاتھ میں نصابی کتابیں دیکھنا چاہتی ہے تاکہ کلاس میں وہ صرف لیکچر نہ سنیں بلکہ نصاب کے متن کے حوالے سے وہ لیکچر کی معنویت کا بھی ادراک کریں۔ اس زمانے میں بعض کتابیں سو ڈیڑھ سو روپیوں میں ملتی تھیں۔ ایسی کتابیں اکاڈمی نے چار چھ روپیوں میں فراہم کیں۔ اسی طرح حوالے کی ایک ایک کتاب کے لیے طلبہ لائبریریوں کا چکر لگاتے تھے، اکاڈمی نے ان کا عکس شائع کیا اور بہت کم قیمت پر ضرورت مندوں کو دستیاب کرایا۔ سرور صاحب نے اس امر خاص میں اکاڈمی کی بڑی حوصلہ افزائی کی اور جب کوئی نئی حوالے کی کتاب شائع ہوتی تو وہ خطوط کے ذریعہ اکاڈمی کی کارکردگی کو سراہتے تھے۔ اس عمل سے ان کی علم دوستی کا اظہار ہوتا ہے۔ ان کے بعض خطوط کے اقتباسات سے صورت حال اور بھی واضح ہو جائے گی:

۱۶۔ ستمبر ۸۳ء

''کل کی ڈاک سے سترہ کتابیں موصول ہوئیں۔ ان میں گیارہ جلدیں انتخاب سخن اور نسخۂ حمیدیہ، انتخاب یادگار، طبقات شعرائے ہند، انتخاب مستقل، انقلاب ۱۸۵۷ء مشاعرۂ زنداں ____ یہ چھ کتابیں تھیں...... ان کتابوں کی دوبارہ اشاعت سے ایک اہم ادبی ضرورت پوری ہوگئی۔ یہ آپ کے دور کا بہت اہم کام ہے۔ انتخاب سخن کی بعض کاپیاں اچھی نہیں چھپیں، خیر یہ تو ہوتا ہے، عکس میں ایسا ہو جاتا ہے۔''

۳ر جولائی ۹۴ء

''مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ آپ دوبارہ اکیڈمی کے چیرمین مقرر ہوئے۔ آپ کے پچھلے دور میں اکیڈمی بہت فعال رہی، امید ہے کہ اب اور بھی فعال ہوگی۔

اگر ممکن ہو تو میرے حسب ذیل معروضات پر غور کیجیے:

۱۔ انعامات کے سلسلے میں مجموعی خدمات پر انعام کے علاوہ باقی انعام اصناف کے لحاظ سے دیے جائیں یعنی نظم، غزل، ناول، افسانہ، علمی نثر وغیرہ۔

۲۔ انعام کی رقم بڑھائی جائے۔ موجودہ تعداد کم ہے۔

۳۔ ایک انعام، بڑا انعام تیس برس تک کے کسی ادیب کے لیے شاعری یا نثر پر۔

۴۔ لائبریریوں کی امداد دیتے وقت پہلے معلوم کر لیا جائے کہ یہ لائبریری فرضی تو نہیں، واقعی موجود ہے اور کم از کم دس برس سے چل رہی ہے۔

۵۔ اکیڈمی لکھنؤ کے مشاہیر پر ہر سال ایک سیمنار ضرور کرے۔ شروعات ملّا صاحب سے ہو۔

۶۔ نادر کتابوں یا حوالے کی کتابوں کی اشاعت کے لیے رقم مختص کی جائے۔''

سرور صاحب کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ شعبے میں جب وہ آتے تھے تو اکثر اپنی ضرورت کی کتابوں کی فہرست میرے حوالے کرتے تھے کہ لائبریری سے یہ کتابیں ان کے نام پر ایشو کرالاؤں۔ ان کی فہرست میں کلاسیکی کتابیں زیادہ ہوتی تھیں۔ جب وہ مطالعہ کر لیتے تو کتابیں واپس کر دیتے اور مزید کتابوں کی فہرست میرے حوالے کر دیتے۔ اس عمل سے میرا

www.taemeernews.com

بہت فائدہ ہوا۔ میں نے بہت سی ایسی کتابیں دیکھ لیں یا پڑھ لیں جن کا نام بھی میں نے نہیں سنا تھا۔ ایک بار مراۃ الشعر کی انہیں سخت ضرورت تھی، لائبریری میں کہیں اِدھر اُدھر رکھی تھی۔ حسن اتفاق کہ ایک دن وہ کتاب میرے ہاتھ آ گئی، میں نے سرور صاحب کے لیے ایشو کرالی۔ جب یہ کتاب انہیں ملی تو بہت دیر تک اس کتاب کی اہمیت پر اظہار خیال کرتے رہے۔

جب میں چیرمین کی حیثیت سے اردو اکاڈمی میں پہنچا تو مراۃ الشعر کے عکس کی اشاعت بھی منصوبے میں شامل کر لی گئی۔

جب میں نے پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ مکمل کر لیا اور علی گڑھ سے واپسی کا وقت آیا تو سرور صاحب نے کہا کہ آپ کلیات سودا کی تدوین پر ڈی لٹ کیوں نہیں کر لیتے۔ اسی وقت انہوں نے اس کام کے لیے سناپسس تیار کر دی اور کہا کہ کام شروع کر دیجیے۔ آپ کو جلد یا بدیر کہیں سے مالی تعاون بھی مل جائے گا۔ خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا، میں نے یو۔ پی پبلک سروس کمیشن میں مہینوں پہلے انٹرویو دیا تھا، اس میں میرا اسلیکشن ہو گیا اور گورنمنٹ رضا ڈگری کالج میں میری پوسٹنگ ہوئی۔ میں رام پور چلا گیا اور سرور صاحب کی مرتب کی ہوئی سناپسس کو، جو آج بھی میرے پاس موجود ہے، کارآمد نہیں کر سکا۔

میں سرور صاحب کی شرافت نفس، تبحر علمی اور انتظامی معروفیات کے باوصف ان کی علم دوستی کا قائل ہوں۔ بہت سے لوگوں نے ان سے امیدیں وابستہ کر رکھی تھیں لیکن قرعۂ فال تو ہر ایک کے نام نہیں نکل سکتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ مایوسیوں کے شکار حضرات ان کی مخالفت پر آمادہ ہو جاتے تھے۔

علی گڑھ سے میں رام پور چلا گیا اور پھر چند ماہ کے بعد میرا تقرر گورکھ پور یونیورسٹی میں ہو گیا، وہاں کی سلیکشن کمیٹی میں سرور صاحب اکسپرٹ کی حیثیت سے شریک تھے۔ انہوں نے مجھ سے کیا توقعات وابستہ کر رکھی تھیں، ان کا علم مندرجہ ذیل خط سے ہو سکتا ہے:

۲۱۔ دسمبر ۱۹۷۲ء

''احتشام کے اچانک ساتھ چھوڑ جانے کا رنج وغم تازہ ہے۔ ہائے کیا دوست اور ساتھی بچھڑ گیا۔ میں بھی اب آفتاب لب بام ہوں اور آپ جیسے نوجوانوں سے امید ہے کہ ہمارے سلسلے کو آگے بڑھائیں گے۔''

میں نے سرور صاحب کے مشوروں پر کس حد تک عمل کیا، اس کے جواب میں میرے پاس عرق انفعال کے علاوہ اور کچھ نہیں۔

☆☆☆

www.taemeernews.com

کبیر احمد جائسی*

مؤسسِ اقبال انسٹی ٹیوٹ — سرورؔ صاحب

سرورؔ صاحب نے اپنی خودنوشت ''خواب باقی ہیں'' میں تحریر فرمایا ہے۔

''میری پیدائش ۱۵ رمضان المبارک ۱۳۲۹ھ کی ہے، تقویم کے مطابق یہ ۹ر ستمبر ۱۹۱۱ء ہوتی ہے۔''[۱]

انہوں نے اس بات پر روشنی نہیں ڈالی کہ یہ ۱۹۱۱ء کس طرح ۱۷ جنوری ۱۹۲۱ء کو جب کہ ان کا نام پہلی بھیت کے ایک اسکول میں لکھوایا گیا ۱۹۱۲ء میں تبدیل ہوگیا اور یہی سنہ ان کا سرکاری سنہ پیدائش قرار پایا۔ اس کے مطابق ۱۹۷۲ء میں ان کی عمر ساٹھ سال کی ہوگئی تھی۔ اس زمانے میں یونیورسٹی اساتذہ کی مدت ملازمت میں توسیع ایک عام سی بات تھی چنانچہ سرورؔ صاحب کو بھی ۱۹۷۲ء میں ایک سال کی توسیع دے دی گئی۔ ان زمانے میں پروفیسر عبدالعلیم صاحب وائس چانسلر تھے۔ ان سے اور سرور صاحب سے ایک عرصے سے گہرے تعلقات تھے اور دونوں ہی اردو کی ترقی پسند ادبی تحریک میں شانہ بہ شانہ ایک دوسرے کے معاون و مددگار تھے۔ امید تھی کہ عبدالعلیم صاحب کے دور میں سرورؔ صاحب کی ملازمت میں اور توسیع ہوگی اور وہ پینسٹھ سال کی عمر تک علم و ادب کی روشنی بکھیرتے رہیں گے۔ ۱۹۷۲ء وہ سنہ ہے جب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا وہ نیا ایکٹ اندرا گاندھی کی حکومت نے نافذ کیا جس کی مخالفت برسوں تک علی گڑھ کے طلبہ اور اساتذہ کرتے رہے۔ سرورؔ صاحب بھی نئے ایکٹ کے مخالف تھے اور اپنی تقریروں اور تحریروں میں برملا اپنی مخالفت کا اظہار کررہے تھے۔ ''اوپر'' کا دباؤ اس طرح پڑا کہ پروفیسر عبدالعلیم صاحب اپنے پرانے دوست کو ایک سال کے بعد ایک دن کی بھی توسیع نہ دے سکے اور سرورؔ صاحب ۱۷/ اکتوبر ۱۹۷۳ء کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی ملازمت سے سبکدوش ہوگئے۔

یونیورسٹی کی ملازمت سے سبکدوشی کے بعد انہوں نے اپنی پوری توجہ انجمن ترقی اردو ہند کو مزید فعال بنانے میں صرف کرنی شروع کی، وہ بلا ناغہ انجمن کے دفتر جاتے اور دوپہر تک انجمن کے کاموں کی نگرانی کے ساتھ ساتھ لکھنے پڑھنے کا کام بھی انجام

---

*پروفیسر و سابق ڈائرکٹر انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، علی گڑھ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

www.taemeernews.com

دیتے۔ جنرل سکریٹری کی حیثیت سے ان کو انجمن سے برائے نام اعزازیہ ملتا جو یونیورسٹی کی ملازمت سے سبکدوشی کے بعد ان کے لیے قطعی ناکافی تھا پھر بھی وہ اکتوبر ۱۹۷۳ء سے مارچ ۱۹۷۴ء تک انجمن سے منسلک رہے۔

مارچ ۱۹۷۴ء میں سرور صاحب انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ایڈوانسڈ اسٹڈیز شملہ کے فیلو ہو کر چلے گئے۔ جہاں وہ ۱۹۷۷ء تک کام کرتے رہے وہاں رہ کر انہوں نے کیا کیا کام کیے اس کی تفصیل ہمارے موضوع سے خارج ہے اس لیے اس سے صرف نظر کیا جاتا ہے۔ اس زمانے میں سرور صاحب کے سینٹ جانس کالج آگرہ کے ساتھی اور دوست سید رضی الحسن چشتی صاحب کشمیر یونیورسٹی سری نگر کے وائس چانسلر تھے، انہوں نے سرور صاحب کو فون کیا کہ کشمیر یونیورسٹی میں ایک اقبال چیئر قایم ہوئی ہے، شیخ محمد عبداللہ کی خواہش ہے کہ وہ اس چیئر پر کام کرنے کے لیے آجائیں۔ خود سید رضی الحسن صاحب چشتی نے بھی اصرار کیا کہ وہ اس پیش کش کو قبول کرلیں۔[۲] سرور صاحب ۱۹ مئی ۱۹۷۷ء کو علی گڑھ سے سری نگر کے لیے روانہ ہوئے اور ۲۰ مئی کی شام کو سری نگر پہونچ گئے۔ دوسرے ہی دن انہوں نے اپنے نئے عہدے کا چارج لے لیا۔ انہوں نے اپنی آپ بیتی "خواب باقی ہیں" میں لکھا ہے:

> "۲۱ مئی ۱۹۷۷ء کو میں نے اس نئے عہدے (اقبال چیئر) کا چارج لے لیا۔ دفتر کوئی نہ تھا صرف ایک کلرک اور ایک چپراسی ملا تھا۔ چنانچہ گھر کے ایک کمرے میں دفتر قایم کیا اور اللہ کا نام لے کر زندگی کے اس نئے باب کا آغاز کردیا۔"[۳]

اقبال چیئر کس طرح اقبال انسٹی ٹیوٹ میں تبدیل ہوئی اس کی روداد بھی سرور صاحب ہی کے الفاظ میں پیش کی جارہی ہے:

> "۱۹۷۸ء میں میں نے اقبال چیئر کا دفتر لائبریری کی عمارت میں قایم کیا۔ اکتوبر ۱۹۷۸ء میں اقبال اور مغرب کے عنوان پر ایک سیمنار کیا جس میں ملک کے کئی سر برآوردہ ادیب شریک تھے شیخ عبداللہ نے اس کا افتتاح کیا، اس موقع پر میں نے اقبال انسٹی ٹیوٹ قایم کرنے کی تجویز ان کے سامنے رکھی۔ چنانچہ ۱۹۷۹ء کے شروع میں انسٹی ٹیوٹ قایم ہوگیا اور اس میں ایم۔ فل اور پی۔ ایچ۔ ڈی کی تربیت کی اجازت مل گئی۔ ایک فیلو کی تقرری کی اجازت پہلے ہی مل گئی تھی۔ پھر ایک ریڈر اور ایک لکچرر کے تقرر کی منظوری ملی۔ ۱۹۷۹ء میں پہلے لکچرر کی جگہ پر امین اندرابی کا تقرر ہوا جو ڈاکٹر زور کے شاگرد رہ چکے تھے۔"[۴]

میں اس زمانے میں جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں فارسی کا لکچرر تھا۔ سرور صاحب کے حکم پر میں نے اقبال انسٹی ٹیوٹ کے ریڈر کی اسامی پر درخواست دے دی، جون ۱۹۸۰ء میں میرا انٹرویو ہوا

www.taemeernews.com

اور یکم نومبر ۱۹۸۰ء کو میں جامعہ ملیہ اسلامیہ سے کشمیر یونیورسٹی سری نگر آ گیا۔[۵]

اقبال انسٹی ٹیوٹ قایم ہونے کے تقریباً پونے دو سال بعد ہی مجھے سرور صاحب کی نیابت اور متعدد باران کی قایم مقامی کا موقع ملا جس کو میں نے اپنی انتہائی خوش نصیبی گردانا اور ۳۱ دسمبر ۱۹۸۳ء تک نہ صرف سرور صاحب کے کاموں میں ان کا معاون رہا بلکہ ان کا سایہ بن کر کشمیر کے مخصوص انداز اور مزاج کو جھیلنے میں ان کی مدد کرتا رہا۔

اس زمانے میں وادیٔ کشمیر کا کیا حال تھا اور کسی نو وارد ''باہری'' ملازم کو کن کن مصایب و مسائل سے دوچار ہونا پڑتا تھا اس کو پوری طرح سمجھے بغیر نہ تو اقبال انسٹی ٹیوٹ کے کاموں کو سمجھا جا سکتا ہے اور نہ ہی سرور صاحب کی باغبانیٔ صحرا کو۔ یہاں پر ناگزیر ہے کہ میں اس زمانے کی کشمیر یونیورسٹی کے مخصوص حالات اور اس کے اشخاص کا مختصر تذکرہ کروں اور اس تذکرہ میں یہ بھی ناگزیر ہے کہ ''میں'' کا ذکر بھی آئے جس کے لیے معذرت کی چنداں ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

جب میں نے اس وادیٔ گل میں قدم رکھا تھا اس زمانے میں پوری وادی تقریباً جرائم ناآشنا تھی، عام لوگ سیدھے سادے مگر تن آسان تھے، اسی تن آسانی کی وجہ سے خود کشمیر کے لوگ محنت مزدوری کے کاموں کے لیے غیر کشمیریوں کو ترجیح دیتے جو خواہ کسی صوبے کے ہوں پنجابی (پ کے زیر کے ساتھ) کہلاتے۔ ہم سب اساتذہ جو شمالی ہند کے میدانوں سے گئے تھے اسی زمرے میں شامل تھے۔

شیخ محمد عبداللہ صاحب حیات تھے۔ اگرچہ یہ ان کی زندگی کا آخری دور تھا مگر کشمیر کی عوام پر ان کی گرفت انتہائی مضبوط تھی، اس زمانے میں ان کے سیاسی مخالفین کی تعداد خاصی ہو چکی تھی مگر ان کی قد آور شخصیت کے سامنے سب کے سب بونے لگتے تھے۔

شمالی ہند بالخصوص مرکزی یونیورسٹیوں سے کشمیر یونیورسٹی جانے والوں کے لیے وہاں کی ہر چیز نئی تھی۔ سب سے زیادہ پریشان کن بات یہ تھی کہ انتظامیہ کا ہر رکن خواہ وہ ہیڈ کلرک ہی کیوں نہ ہو ''افسر'' کہا جاتا اور سارے اساتذہ خواہ وہ پروفیسر صاحب ہی کیوں نہ ہوں اس کے ماتحت سمجھے جاتے۔

مقامی اساتذہ کا معاملہ یہ تھا کہ ان میں سے ہر ایک کے پاس یا تو سیب اور بادام کے باغات تھے، بڈشاہ اور لال چوک میں ٹیلی ویژن یا بید کے سامان کی دوکان تھی، کسی کا اصل کام کشمیری شالوں کی برآمد تھا، گاؤں میں شالی (دھان) کے سونا اگلتے کھیت تھے، تعلیم و تعلم کا پیشہ مقامی اساتذہ کے لیے ثانوی درجہ رکھتا اور وہ لوگ یہ ملازمت صرف علامتِ رتبہ (Status Symbol) کے طور پر اختیار کرتے۔

کاغذ پر یونیورسٹی کے کام کرنے کا وقت دس بجے دن سے چار بجے شام تک تھا مگر مقامی اساتذہ نے یہ وطیرہ بنا رکھا تھا کہ وہ دس بجے گھر سے نکلتے، بسوں میں دھکے کھاتے گیارہ بجے کے لگ بھگ اپنے اپنے شعبے پہونچتے، شعبہ میں کچھ دیر بیٹھ کر ''رجسٹری'' (رجسٹرار آفس) روانہ ہو جاتے اور وہاں کے کلرکوں سے اٰہنز (ہاں) نِہز (نہیں) کِہز (کیا ہے) کرتے شعبہ واپس آجاتے اور تین سوا تین بجے

www.taemeernews.com

تک شعبہ سے رخصت ہو کر چار بجتے بجتے اپنے گھر میں داخل ہو جاتے۔ مرکزی یونیورسٹیوں سے جانے والوں کے لیے یہ عجیب صورت حال تھی جس کے خوگر وہ خاصے دن گزر جانے کے بعد بھی نہ ہو پاتے۔ کشمیری اساتذہ کی اسی روش کی بنا پر شیخ محمد عبداللہ صاحب غیر کشمیری اساتذہ کا تقرر کرواتے۔ اس کی وجہ سے ان کی درپردہ مخالفت بھی کی جاتی اپنے انتقال سے تقریباً ایک سال قبل اقبال انسٹی ٹیوٹ کے ایک سیمنار کا افتتاح کرتے ہوئے انہوں نے کہا تھا ''مجھکو معلوم ہے کہ لوگ میری مخالفت اس لیے کرتے ہیں کہ میں باہر کے اساتذہ کا تقرر کرتا ہوں میں کشمیر کے اساتذہ سے اس موقع پر یہ کہنا چاہوں گا کہ وہ پہلے اپنے کو اس قابل تو کریں کہ ان کو ترقی دی جائے۔'' شیخ صاحب کی اس صاف گوئی سے مقامی اساتذہ سکتے میں آ گئے تھے۔

جب میں نے یکم نومبر ۱۹۸۰ء کو اقبال انسٹی ٹیوٹ میں ریڈر کی حیثیت سے کام کرنا شروع کیا اس وقت پروفیسر رئیس احمد صاحب وائس چانسلر تھے، رجسٹرار کون تھا اب یاد نہیں۔ ۲۲ دسمبر ۱۹۸۰ء سے تعطیل سرما کا آغاز ہوا۔ یکم مارچ ۱۹۸۱ء کو جب یونیورسٹی کا نیا سیشن شروع ہوا تو پروفیسر وحید الدین ملک صاحب وائس چانسلر کی حیثیت سے کام کر رہے تھے اور غلام نبی صدیقی رجسٹرار کی حیثیت سے۔ یہ رجسٹرار تھے تو وجیہ اور لچھے دار باتیں کرنے والے مگر کام دھام سے ان کو کم ہی سروکار تھا۔ رجسٹرار آفس کا بلا شرکت غیرے مالک ایک قدرے بھینگا پستہ قد مقامی آدمی تھا جس کو مقامی اساتذہ اور کارکن ہنس لال کہتے اس کی ''بالائی آمدنی'' کے بہت سے قصے مشہور تھے، حقیقت حال اللہ جانے۔ ہنس لال کا کام دشواریاں پیدا کرنا تھا (ہماری طالب علمی کے زمانے میں مسلم یونیورسٹی میں بھی ایک ''بزرگ'' تھے جو اسی خصوصیت کی وجہ سے ڈین ڈی فی کلٹیز کہلاتے) سرور صاحب اور پروفیسر مقبول احمد صاحب کا چونکہ شیخ صاحب سے براہ راست تعلق رہتا اس لیے ہنس لال ان دونوں حضرات کے شعبوں کے لیے کوئی نہ کوئی قانونی شق نکال کر دشواریاں پیدا کرنے کی کوشش کرتا، اس نے اپنے ایک ماتحت کو، جس کا نام مجھ کو یاد نہیں مگر اس کی گوت کول (مسلمان بھی کول ہوتے ہیں) تھی، اپنے رنگ ڈھنگ میں ڈھال رکھا تھا جو ہنس لال کی شرانگیزی کا مواد فراہم کرتا رہتا۔ اکیڈمک معاملات ایک اسسٹنٹ رجسٹرار ڈار دیکھتا۔ اس کی خاص عادت یہ تھی کہ بورڈ آف اسٹڈیز کی روداد بدل دیا کرتا، اس بات پر ایک بار پروفیسر مقبول احمد صاحب کو اور دوسری بار مجھ کو سب کے سامنے ڈانٹنا پڑا تھا مگر جب بھی اس کو موقع ملتا اپنی حرکت سے باز نہ آتا۔ اس زمانے میں یونیورسٹی کے تمام دفتروں میں رشوت کی گرم بازاری تھی۔ یہاں تک کے میٹر پڑھنے والا ملازم (غالباً شعبان نام تھا) کچھ رقم لے کر ریڈنگ کا اندراج کچھ اس طرح کرتا کہ آدھے سے بھی کم رقم دینی پڑتی۔ اس سلسلہ کی جو عبرت ناک مثال مجھ کو نظر آئی وہ یہ تھی کہ ایک پروفیسر صاحب کی بیگم صاحبہ اقبال انسٹی ٹیوٹ کے کلرک کو رشوت دے کر اپنی اسکالر شپ نکلوایا کرتیں۔ مذکورہ پروفیسر صاحب بعد میں فیکلٹی آف

www.taemeernews.com

سوشل سائنس کے ڈین بھی ہو گئے تھے۔ رشوت صرف ''نقدزرائن'' ہی کی شکل میں قبول نہ کی جاتی اس کی مختلف شکلیں تھیں، محتاط ترین اور بے ضرر شکل یہ تھی کہ ''آکھ پیال چاے زہ سموس'' (ایک پیالی چائے دو سموسے) پر بھی کام ہو جایا کرتا۔ غیر کشمیری اساتذہ کو اس صورت حال سے نپٹنے میں بڑی دقت ہوتی۔

ان پریشانیوں کے علاوہ سرور صاحب کی ایک اور پریشانی تھی۔ اس پریشانی کا سبب اس زمانے کے وائس چانسلر کا احساسِ کمتری تھا۔ ان کو شکایت تھی کہ بی۔ کے۔ نہرو (گورنر اور یونیورسٹی کے چانسلر) اور شیخ عبداللہ (وزیر اعلیٰ اور پرو چانسلر) ان کو نظر انداز کر کے سرور صاحب سے نہ صرف مشورے کرتے ہیں بلکہ ان کے مشوروں پر عمل بھی کرتے ہیں۔ مولانا مسعودی، حکیم سعدالدین، پروفیسر حاجنی، مرزا کمال الدین شیدا، عبدالرحیم راتھر، بلراج پوری اور شمالی وجنوبی ہند سے آنے والے ادیب، شاعر اور دانشوران سے ملے بغیر سرور صاحب کے پاس چلے جاتے ہیں۔ علاوہ بریں چند ادبی لکڑ ہارے اور مچھیرے خواہی نہ خواہی اقبال انسٹی ٹیوٹ کی بالعموم اور سرور صاحب کی بالخصوص مخالفت کرتے رہتے، ایسے لوگوں کا سرغنہ ایک احسان فراموش مسخرہ بقال تھا جس کو سرور صاحب نے پروفیسر بنوایا تھا کچھ چھٹ بھیے بھی اس کی لے میں لے ملایا کرتے۔ غرض کہ ہر طرح اس بات کی کوشش کی گئی کہ اقبال انسٹی ٹیوٹ کی کارکردگی کو منجمد کر کے سرور صاحب کو وادی سے رخصت کر دیا جائے مگر یہ حالات سرور صاحب کے لیے مہمیز کا کام دینے لگے۔ سرور صاحب نے اقبال انسٹی ٹیوٹ میں جو کارنامے انجام دیے ان کی تفصیل یہ ہے۔

انسٹی ٹیوٹ کے قیام کے بعد اقبال پر باقاعدہ تحقیقی کاموں کی ابتدا ہوئی اور اقبال پر کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ سمیناروں اور توسیعی خطبات میں مزید اضافہ ہوا۔ انڈر گریجویٹ طلبہ کی ذہنی تربیت کے لیے سری نگر کے مختلف کالجوں میں مضمون نویسی کے مقابلوں، مباحثوں اور بیت بازی کا اہتمام کیا جانے لگا۔ ان کاموں کی وجہ سے مختصر سے عرصے میں اندرونِ ملک ہی نہیں بلکہ بیرونی ممالک کے اصحاب علم اور ادارے انسٹی ٹیوٹ اور اس کی کارکردگی کی طرف متوجہ ہونے لگے۔ میرے قیام سری نگر کے دوران جن لوگوں نے اقبال شناسی پر کام کر کے پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری لی ان کے نام اور موضوعات یہ تھے۔

۱۔ محمد امین اندرابی ''مکاتیب اقبال کا تنقیدی جائزہ''

۲۔ نصرت اندرابی ''حالی اکبر اور اقبال کی پیامی شاعری کا تقابلی مطالعہ''

۳۔ شفیقہ رسول ''اقبال اور ہیومنزم''

۴۔ بلقیس سراج ''اردو نظم میں اقبال کا کارنامہ''

جہاں تک یاد پڑتا ہے دوسرے سال صرف دو داخلے ہوئے تھے۔ فریدہ بانو کو ''اقبال اور کشمیر'' کا موضوع دیا گیا تھا اور زاہدہ پروین کو ''غالب کے فکر وفن کا اقبال پر اثر'' میرے سامنے دونوں نے ایم۔ فل کر لیا تھا، فریدہ پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ لکھ رہی تھیں گمان غالب ہے کہ انہوں نے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کر لی ہوگی۔ زاہدہ کو ایم۔ فل کرتے ہی

www.taemeernews.com

محکمۂ تعلیم میں ملازمت مل گئی تھی معلوم نہیں کہ انہوں نے پی۔ایچ۔ڈی کا کام مکمل کیا یا نہیں۔

اس کے بعد تین داخلے دیے گئے نذیر احمد شیخ کو ''اقبال اور سوشلزم'' کا موضوع دیا گیا تھا۔ بشیر احمد نحوی کو ''اقبال اور تصوف'' اور طالعہ افروز کو ''اقبال اور فنون لطیفہ''۔ نذیر احمد شیخ اور بشیر نحوی نے میری نگرانی میں ایم۔فل کیا تھا، ان دونوں نے پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری کشمیر سے میرے واپس آنے کے بعد سرور صاحب کی نگرانی میں حاصل کی تھی۔ طالعہ نے ایم۔فل اور پی ایچ۔ڈی دونوں ڈگریاں پروفیسر مسعود حسین خاں صاحب کی نگرانی میں حاصل کیں۔ آخری بیچ جو میرے سامنے اقبال انسٹی ٹیوٹ میں داخل ہوا تھا، اس میں بھی تین طلبہ تھے۔ نثار حسین مسعودی کو ''اقبال اور مولانا روی'' کا موضوع دیا گیا تھا۔ مسعودی سے یہ کام نہ ہو سکا انہوں نے میرے قیام کے دوران ہی اقبال انسٹی ٹیوٹ آنا ترک کر دیا تھا۔ سجاش چندرائنہ کو ''اقبال اور جدید اردو شاعری'' کا موضوع دیا گیا تھا اور محمد شفیع سنبلی کو ''اقبال کا اثر کشمیری شعرا پر''۔ سری نگر سے میرے واپس آنے کے بعد ان دونوں نے پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کر لی تھی اس کے بعد سرور صاحب کے دور میں تین بیچ اور داخل ہوئے ہوں گے ان کے بارے میں مجھے کوئی علم نہیں ہے اس لیے ان طلبہ کے ذکر سے صرف نظر کیا جاتا ہے۔

ان تحقیقی کاموں کے علاوہ اقبال انسٹی ٹیوٹ میں ہر سال کئی سمینار منعقد ہوتے اور ہر سال ۲۱ر اپریل کو یوم اقبال منایا جاتا۔ ۱۹۸۱ء کے یوم اقبال کو شیخ محمد عبداللہ صاحب نے خطاب کیا تھا اور ۱۹۸۲ء کے یوم اقبال کا افتتاح فاروق عبداللہ نے۔ اقبال انسٹی ٹیوٹ کے سمناروں میں وادیٔ کشمیر کے علاوہ ملک کے دیگر حصوں سے بھی اصحاب علم تشریف لاتے اور مقالات پیش کرتے۔ اقبال انسٹی ٹیوٹ نے یک روزہ سمناروں کے علاوہ بہت سے دو روزہ، سہ روزہ اور شش روزہ سمنار بھی کیے۔ ''اقبال اور تصوف'' اور ''اقبال اور مغرب'' کے عنوان سے جو دو سمنار ہوئے تھے وہ ''اقبال چیئر'' کے زمانے کے تھے۔ اقبال انسٹی ٹیوٹ بننے کے بعد جو سمنار میرے سامنے ہوئے ان کے موضوعات یہ تھے۔

۱۔ اقبال — شاعری اور شعریات
۲۔ تشخص کی تلاش کا مسئلہ اور اقبال
۳۔ اقبال اور جدیدیت
۴۔ عصر حاضر میں اقبال کی معنویت
۵۔ اقبال کا فن
۶۔ اسلام میں حیات نو
۷۔ جدید دنیا میں اسلام ___ مسائل اور امکانات
۸۔ فانی بدایونی
۹۔ حسرت موہانی
۱۰۔ جوش ملیح آبادی
۱۱۔ فراق گورکھپوری
۱۲۔ اقبال اور گوئٹے
۱۳۔ اقبال کی سیاسی فکر
۱۴۔ ہندوستان میں تصوف

میرے سری نگر سے واپس آنے کے بعد

www.taemeernews.com

تقریباً ساڑھے تین برسوں تک سرور صاحب اقبال انسٹی ٹیوٹ میں رہے، ان ساڑھے تین برسوں میں بہت کم سیمنار ہو سکے اور جو ہوئے بھی ان کو کچھ زیادہ شہرت نہیں ملی۔

ان سیمناروں میں شریک دانش وروں، ادیبوں اور نقادوں نے جن افکار و آرا کا اظہار کیا ان کا احاطہ ممکن نہیں ہے البتہ اتنا عرض کرنا بے محل نہ ہوگا کہ پندرہویں صدی ہجری تقریبات کے سلسلے میں اقبال انسٹی ٹیوٹ نے ریاستی حکومت کے اشتراک سے جو شش روزہ سیمنار کیا تھا اس کا افتتاح شیخ محمد عبداللہ صاحب نے کیا تھا اور اس زمانے کے مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر سید حامد صاحب نے صدارت کی تھی۔ سرور صاحب کا کارنامہ یہ تھا کہ انہوں نے وادی میں شیخ عبداللہ صاحب کے سب سے بڑے مخالف میر واعظ مولوی فاروق صاحب اور شیخ صاحب کو ایک ہی ڈائس پر بٹھا رکھا تھا اور شیخ محمد عبداللہ صاحب کی موجودگی میں مولوی فاروق صاحب کا مقالہ پڑھوایا تھا۔ جہاں تک یاد پڑتا ہے اس سیمنار میں چالیس مقالے پڑھے گئے تھے جن میں اُنیس اردو میں لکھے گئے تھے اور اکیس انگریزی میں۔ وادیٔ کشمیر کے مقتدر اہل علم حضرات اور کشمیر یونیورسٹی کے اساتذہ کے علاوہ جن بیرونی عالموں، دانش وروں اور استادوں نے شرکت کی تھی ان میں سے ان حضرات کے نام مجھ کو یاد رہ گئے ہیں۔

۱۔ بدرالدین طیب جی ۲۔ سید حامد ۳۔ مولانا مجیب اللہ ندوی ۴۔ مولانا اخلاق حسین قاسمی ۵۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن ۶۔ خواجہ حسن ثانی نظامی ۷۔ شفیع اگوانی ۸۔ ضیاء الحسن فاروقی ۹۔ مشیر الحق ۱۰۔ سید الظفر چغتائی ۱۱۔ محب الحسن ۱۲۔ امتیاز احمد ۱۳۔ بلراج پوری اور ۱۴۔ سید شہاب الدین دسنوی۔

سیمناروں کے انعقاد کے ساتھ ساتھ اقبال انسٹی ٹیوٹ میں توسیعی خطبات بھی ہوتے رہتے۔ جن خطبات کا انعقاد میرے ذہن میں محفوظ رہ گیا ہے ان کے موضوعات اور صاحب خطبہ کا نام تحریر کیا جا رہا ہے تاکہ کچھ دنوں تک ہی سہی ان خطبات کی یاد باقی رہے۔

۱۔ پروفیسر ایس کے گھوش (شانتی نکیتن) نے تین توسیعی خطبات دیے جسے "Tagore, Aurobindo and Iqbal" کے نام سے انسٹی ٹیوٹ نے شائع کر دیا تھا۔

۲۔ پروفیسر دیا کرشن (راجستھان یونیورسٹی) نے دو توسیعی خطبات "Poetry and Philosophy" اور "Philosophy and Poetry" کے عنوانات سے دیے تھے۔ یہ خطبات اس زمانے میں شائع نہ ہو سکے تھے۔ بعد میں شائع ہوئے یا نہیں اس کا مجھے علم نہیں ہے۔

۳۔ خوشونت سنگھ نے "The Problem of Translating Iqbal into English" کے عنوان سے ایک بہت ہی دلچسپ اور پر مغز خطبہ دیا تھا۔ غالباً یہ بھی ابھی تک شائع نہیں ہو سکا ہے۔

۴۔ امریکن سنٹر، نئی دہلی اور کولمبیا یونیورسٹی سے وابستہ پروفیسر اے۔ ٹی ایمبری نے ایک فکر انگیز توسیعی خطبہ "Modernization and

www.taemeernews.com

"Westernization" کے عنوان سے دیا تھا، یہ خطبہ بھی میرے قیام سری نگر کے زمانے تک شائع نہیں کیا جا سکا تھا۔

۵۔ پروفیسر عالم خوندمیری (عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد) نے چار توسیعی خطبات "Some Aspects of Iqbal's Poetic Philosophy" کے عنوان سے دیے تھے۔ یہ خطبات اسی عنوان سے اقبال انسٹی ٹیوٹ نے شائع کر دیے تھے۔

۶۔ فلسفہ کے مشہور عالم اور عثمانیہ یونیورسٹی کے سابق صدر شعبۂ فلسفہ پروفیسر سید وحید الدین نے اقبال کی فکر پر دو توسیعی خطبات دیے تھے۔ ان خطبات کو اقبال انسٹی ٹیوٹ نے ''اقبال اور مغربی فکر'' کے عنوان سے شائع کر دیا تھا۔

۷۔ جرمن نژاد مشہور مستشرق، پروفیسر انا ماری شمل جو اس وقت ہارورڈ یونیورسٹی سے منسلک اور اقبال انسٹی ٹیوٹ سری نگر کی وزٹنگ پروفیسر تھیں، انسٹی ٹیوٹ کی دعوت پر سری نگر تشریف لائیں اور تین توسیعی خطبات ''گوئٹے اور اقبال''، ''مولانا روم'' اور ''حلاج'' کے عنوانات سے دیے۔ میرے قیام سری نگر تک یہ خطبات شائع نہ ہو سکے تھے، بعد میں ان کا کیا حشر ہوا معلوم نہیں۔

۸۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے بھی اپنی تشریف آوری سے اقبال انسٹی ٹیوٹ کو نوازا تھا اور ایک پرمغز، فکر انگیز اور دل و دماغ کو منور کر دینے والا توسیعی خطبہ ''عصر حاضر میں اسلام کی معنویت'' کے عنوان سے دیا تھا۔ اس کی اشاعت اقبال انسٹی ٹیوٹ سے نہیں کسی دوسرے ادارے سے ہوئی تھی۔

۹۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے پروفیسر مشیر الحسن نے ایک توسیعی خطبہ "Islam and Nationalism with Special Reference to the Role of Nationalist Muslims" کے عنوان سے دیا تھا۔ جہاں تک یاد پڑتا ہے اقبال انسٹی ٹیوٹ سے یہ خطبہ شائع نہ ہو سکا تھا۔

۱۰۔ مولانا سعید احمد اکبرآبادی نے بھی اقبال انسٹی ٹیوٹ کو نوازا تھا اور سری نگر میں رہ کر چار توسیعی خطبات دیے تھے۔ یہ توسیعی خطبات ''خطبات اقبال پر ایک نظر'' کے عنوان سے اقبال انسٹی ٹیوٹ نے شائع کر دیے تھے۔

۱۱۔ پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے دو توسیعی خطبات ''اقبال کا تصور مرد کامل'' اور '' اقبال اور مستشرقین'' کے عنوان سے دیے تھے۔ ان خطبات کا مسودہ اشاعت کے لیے پریس جا چکا تھا امید ہے سری نگر سے میرے واپس آنے کے بعد یہ کتاب چھپ کر آ گئی ہوگی۔

تحقیق اور توسیعی خطبات کے انعقاد کے ساتھ ساتھ اقبال انسٹی ٹیوٹ نے اس بات کی بھی کوشش کی تھی کہ اس کی علمی سرگرمیاں عام ہوں اور جو لوگ بُعد مکانی کی وجہ سے اقبال انسٹی ٹیوٹ کے سیمناروں اور توسیعی خطبات میں شرکت نہیں کر پاتے وہ انسٹی ٹیوٹ کی مطبوعات کے ذریعے ان سرگرمیوں کی ایک جھلک دیکھ سکیں۔ اس خیال کو مدنظر رکھتے

www.taemeernews.com

ہوئے انسٹی ٹیوٹ نے اپنا ایک ترجمان ''اقبالیات'' کے نام سے نکالنا شروع کیا تھا اور اسی کے ساتھ ساتھ کتابوں کی اشاعت کا کام بھی۔ یونیورسٹی کی طرف سے اس زمانے میں کتابوں کی طباعت کے لیے صرف اٹھارہ ہزار روپے کی حقیری سی رقم ملتی تھی اس لیے ایک سال میں اوسط ضخامت کی تین چار ہی کتابیں شائع ہو پاتیں۔ انسٹی ٹیوٹ کی شائع کردہ کتابوں کی خاصی پذیرائی ہوئی۔ مدت ہوئی بہت سی کتابیں نایاب ہو چکی ہیں مگر سرور صاحب کی سری نگر سے واپسی کے بعد کسی ڈائرکٹر کو اس بات کی توفیق نہیں ہوئی کہ اقبال انسٹی ٹیوٹ کی مطبوعات کی طباعت ثانی کی طرف دھیان دے۔ بہر حال میرے سامنے اقبال انسٹی ٹیوٹ کی جو کتابیں شائع ہو کر منظر عام پر آ گئی تھیں ان کا چند سطری خاکہ درج ذیل ہے:

۱۔ **اقبال کے مطالعے کے تناظرات**

از پروفیسر آل احمد سرور:

یہ کتابچہ سرور صاحب کا وہ خطبۂ افتتاحیہ ہے جو انہوں نے ۲۵/ جولائی ۱۹۷۷ کو اقبال چیئر کے قائم ہونے کے بعد یونیورسٹی اور سری نگر شہر کے برگزیدہ اصحاب علم کے سامنے پڑھا تھا۔ جس جلسے میں یہ خطبہ پڑھا گیا تھا اس کی صدارت اس وقت کے نائب وزیر اعلیٰ جناب مرزا محمد افضل بیگ نے کی تھی۔ اس پر مغز خطبۂ افتتاحیہ میں سرور صاحب نے اس بات پر خاص زور دیا تھا کہ ''اقبال کے مطالعے کا تناظر اب تک خاصہ یک رخا رہا ہے'' اس لیے اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ اس یک رخے پن کو ختم کر کے ''مکمل اقبال'' کو تلاش کرنے کی کوشش کی جائے۔

۲۔ **اقبال اور تصوف:** مرتبہ آل احمد سرور:

اقبال چیئر کی طرف سے اکتوبر ۱۹۷۷ء میں اقبال اور تصوف کے عنوان سے جو سیمنار ہوا تھا اس میں انگریزی مقالات کے علاوہ پندرہ مقالے اردو میں بھی پڑھے گئے تھے۔ اس سیمنار میں پڑھے جانے والے مقالوں پر جو بحث ہوئی تھی افادۂ عام کے لیے اس کا ایک خلاصہ بھی اس کتاب میں شامل کر دیا گیا ہے۔ کشمیر یونیورسٹی اور وادیٔ کشمیر کے اہل علم حضرات کے علاوہ جن بیرونی مقالہ نگاروں نے مقالے پڑھے تھے ان میں سرور صاحب کے علاوہ مولانا سعید احمد اکبرآبادی، پروفیسر جگن ناتھ آزاد اور پروفیسر عالم خوندمیری کے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ اس سیمنار میں شریک مقالہ نگاروں نے ''اقبال اور تصوف'' کے ہر پہلو کا احاطہ کر کے اس موضوع پر کام کرنے والوں کو ایک نئی سمت سفر دکھائی ہے۔

۳۔ **اقبال اور مغرب**۔ مرتبہ پروفیسر آل احمد سرور:

۳/ تا ۵/ اکتوبر ۱۹۷۸ء کو اس عنوان سے اقبال چیئر کی طرف سے دوسرا سیمنار منعقد ہوا تھا۔ اس سیمنار میں کل اٹھارہ مقالات پڑھے گئے تھے، جن میں سے بارہ اردو میں تھے اور چھ انگریزی میں۔ اقبال انسٹی ٹیوٹ قایم ہو جانے کے بعد اردو مقالوں کا مجموعہ ''اقبال اور مغرب'' کے نام سے شائع کر دیا گیا تھا۔ اس سیمنار میں جن ادیبوں اور ناقدوں نے اپنے مقالے پڑھے ان میں سرور صاحب کے علاوہ علی سردار جعفری، پروفیسر اسلوب احمد انصاری، پروفیسر شمیم حنفی، پروفیسر غلام رسول ملک اور پروفیسر جگن ناتھ آزاد کے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

www.taemeernews.com

مقالہ نگار حضرات نے جن موضوعات کو اپنے مخصوص مطالعے کا ہدف بنایا تھا ان میں سے چند یہ ہیں۔ اقبال اور ورڈز ورتھ، اقبال اور نئی مشرقیت، اقبال اور کمیونزم، تصور خودی اور مغربی اثرات۔ اس مجموعے کے مطالعے سے اس بات کی تفہیم آسان ہو جاتی ہے کہ اقبال نے مغرب سے کیا کیا لیا اور اس کے کن کن اقدار سے گریزاں یا آمادۂ پیکار رہے۔ اس مجموعۂ مقالات میں بھی آخر میں خلاصۂ بحث شائع کر دیا گیا تھا۔

۴۔ اقبال اور مغربی فکر — از پروفیسر وحید الدین:

فلسفہ کے مشہور استاد پروفیسر وحید الدین صاحب نے جون ۱۹۸۰ء میں ''اقبال، گوئٹے اور نطشے'' اور ''اقبال کے فلسفیانہ افکار کی تشکیل میں مغربی فکر کا حصہ'' کے عنوان سے دو توسیعی خطبات دیے تھے۔ یہ مجموعہ انہیں خطبات پر مشتمل ہے۔ ان خطبات کی سب سے اہم بات یہ ہے کہ ان میں فلسفہ کے دقیق مسائل کو اتنے آسان انداز اور شگفتہ زبان میں پیش کیا گیا ہے کہ ادبیات کا مبتدی بھی کسی دقت کے بغیر ان سے استفادہ کر سکتا ہے۔

اقبال اپنے اشعار میں جن دو شعراء کا بار بار حوالہ دیتے ہیں وہ مولانا روم اور گوئٹے ہیں۔ اس کتاب کے پہلے مقالے میں پروفیسر وحید الدین صاحب نے ان اثرات کو بڑی خوبی سے واضح کیا ہے جو اقبال نے گوئٹے اور نطشے سے قبول کیے ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ انہوں نے اس بات کی بھی نشاندہی کی ہے کہ اقبال نے کن کن مقامات پر گوئٹے اور نطشے کے افکار و خیالات سے انحراف یا گریز کیا ہے۔ دوسرے مقالے میں پروفیسر وحید الدین صاحب نے اقبال کے فلسفیانہ افکار کا تجزیہ کر کے ان عناصر کی نشاندہی کی ہے جو اقبال نے مغربی فکر سے اخذ کیے ہیں۔

۵۔ اقبالیات — ۱۔ مرتبہ پروفیسر آل احمد سرور:

اقبالیات کا یہ پہلا شمارہ تین حصوں پر مشتمل تھا۔ پہلے حصے میں وہ تیرہ مقالات ہیں جو ''اقبال، شاعر اور شعریات'' کے عنوان سے منعقد سیمنار میں پڑھے گئے تھے۔ جن بیرونی حضرات نے اس سیمنار میں اپنے مقالے پڑھے تھے ان میں پروفیسر مسعود حسین خاں، پروفیسر اسلوب احمد انصاری، پروفیسر جگن ناتھ آزاد، پروفیسر گوپی چند نارنگ اور جناب وارث علوی کے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ اس کے دوسرے حصے میں وہ پانچ تجزیاتی مقالات شریک اشاعت ہیں جو یوم اقبال کے مختلف جلسوں میں پڑھے گئے تھے۔ تیسرا حصہ متفرق مقالوں پر مشتمل ہے۔ اقبالیات کا یہ شمارہ اپنی جگہ ایک مکمل کتاب کی حیثیت رکھتا ہے۔

۶۔ اقبالیات — ۲۔ مرتبہ پروفیسر آل احمد سرور:

اقبالیات کا یہ شمارہ تین گوشوں، گوشۂ اقبال، گوشۂ حسرت، گوشۂ فانی پر مشتمل ہے۔ گوشۂ اقبال میں وہ نو مقالات ہیں جو ۲۱/اپریل ۱۹۸۱ء کے منعقدہ سیمنار میں ''عصر حاضر میں اقبال کی معنویت'' کے موضوع پر پڑھے گئے تھے۔ گوشۂ فانی میں پانچ اور گوشۂ حسرت میں چھ مقالات شائع کیے گئے ہیں۔ یہ گیارہ مقالے فانی اور حسرت کی یاد میں منعقد کردہ یک روزہ سیمناروں میں پڑھے گئے تھے۔ اس شمارے کی اہمیت یہ ہے کہ اس میں اقبال کے دو ایسے

www.taemeernews.com

معاصروں پر بھی مقالات شائع کیے گئے ہیں جن کی ادبی حیثیت اپنی اپنی جگہ مسلّم ہے۔

۷۔ علامہ اقبال مصلح قرن آخر۔مترجم کبیر احمد جائسی:

یہ کتاب مشہور ایرانی مفکر اور انقلابی ڈاکٹر علی شریعتی کی فارسی تقریر کا ترجمہ ہے جس کو کیسٹ کے ذریعے محفوظ کر لیا گیا تھا اور انقلاب ایران کے بعد ایران اور امریکہ وغیرہ میں کتابی شکل میں شائع کیا گیا تھا۔ اس کتاب پر روشنی ڈالتے ہوئے پروفیسر شارب رودولوی نے جنوری ۱۹۸۳ء کے ''آج کل'' میں لکھا تھا:

''زیر نظر کتاب میں ڈاکٹر علی شریعتی نے اقبال کو دنیا کے عظیم انقلابی اور تاریخ ساز کی شکل میں پیش کیا ہے۔ ان کے خیال میں اقبال ایک مصلح ہیں لیکن اس اصطلاح کو انہوں نے عام معنوں سے ہٹ کر اُن معنوں میں استعمال کیا ہے جن میں تدریجی اور ظاہری تبدیلی کے ساتھ انقلاب کے اصل معنی بھی مضمر ہیں اور اسی لیے انہوں نے اقبال کو سرسید احمد خاں یا ہندوستان کی اصلاحی تحریک کے دوسرے علما سے مختلف قرار دیا ہے۔

اقبال کی شاعری شخصیت اور سیاسی و مذہبی فکر کے بارے میں ہندوستان و پاکستان میں بہت کچھ لکھا گیا ہے اور لکھا جا رہا ہے لیکن علی شریعتی کا یہ مطالعہ ایک نئے رخ اور نئی جہت کو پیش کرتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ڈاکٹر علی شریعتی نے فکر اقبال کی تاویل ایرانی تحریک آزادی کے پس منظر میں کی ہے اور ان کے افکار و خیالات کی تشریح کے ذریعے اپنے ہم وطنوں میں جوش اور اسلامی انقلاب کی ہم نوائی کا جذبہ بیدار کرنے کی کوشش کی ہے جو اقبال کی عالمی معنویت اور آفاقیت کی نشاندہی کرتی ہے۔

ڈاکٹر کبیر احمد جائسی بہت اچھے اور ذمہ دار مترجم ہیں انہوں نے بڑی دقت نظر کے ساتھ اس کتاب کا ترجمہ کیا ہے۔''

۸۔ "Tagore, Sri Aurobindo and Iqbal" از سسر کمار گھوش:

پروفیسر سسر کمار گھوش صاحب نے اقبال انسٹی ٹیوٹ کی دعوت پر مئی ۱۹۷۹ء میں تین توسیعی خطبات دیے تھے۔ پہلے خطبے میں انہوں نے ٹیگور کی شاعری کا احاطہ کرتے ہوئے اس کی اہمیت اور معنویت کو اجاگر کیا ہے۔ دوسرا خطبہ سری آربندو کی شاعری کے لیے مختص ہے جس میں انہوں نے سری آربندو کی شاعری کے اسرار و رموز کو بے نقاب کیا ہے۔ تیسرا خطبہ اقبال پر ہے جس کا عنوان انہوں نے ''اقبال ایک بیگانے کی نظر میں'' رکھا ہے۔ یہ تیسرا خطبہ اس لحاظ سے بے حد اہم ہے کہ اس خطبے میں اقبال کو ٹیگور اور آربندو کی شاعری سے سمجھنے اور سمجھانے کی سعی کی گئی ہے اگرچہ اقبال اور آربندو ایک دوسرے کے معاصر ہونے کے باوجود کبھی ایک دوسرے سے مل نہ سکے تھے تاہم دونوں کی فکر کے

www.taemeernews.com

بعض اجزا ایسے ہیں جو دونوں کو ایک دوسرے سے بالکل قریب لے آتے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ مطالعہ ایک انتہائی اہم اور مفید موضوع کا احاطہ کرتا ہے جو بصیرت افروز بھی ہے اور مسرت افزا بھی۔

۹۔ "Some Aspects of Iqbal's Poetic Philosophy" از پروفیسر عالم خوندمیری:

پہلے لکھا جا چکا ہے کہ اقبال انسٹی ٹیوٹ کی دعوت پر پروفیسر عالم خوندمیری نے توسیعی خطبات دیے تھے یہ کتاب انہیں خطبات پر مشتمل ہے۔ ان خطبوں میں سے دو کا موضوع اقبال کا تصور زماں ہے۔ تیسرا خطبہ ''اقبال اور وجودی فکر'' کے موضوع پر ہے اور چوتھا ''انقلاب اور اقبال'' کے موضوع پر۔ اِن خطبوں میں پروفیسر عالم خوندمیری نے شاعر اقبال کے فلسفیانہ افکار کا احاطہ کر کے شاعر اقبال اور فلسفی اقبال دونوں کو بہم دگر اس طرح جذب و پیوست کر دیا ہے کہ ایک دوسرے کو جدا کرنا ممکن نہیں رہ جاتا۔ یوں تو اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں اقبال کے فلسفے اور فلسفیانہ شاعری پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے تاہم اس کتاب کی اہمیت یہ ہے کہ یہ ایک فلسفہ کے استاد کے قلم سے نکلی ہے جو ادب آشنا ہی نہیں ادب کا پارکھ بھی تھا۔

۱۰۔ محمد اقبال — مترجم کبیر احمد جائسی:

عوامی جمہوریہ تاجکستان کے سابق صدر میر سید میر شکر بیسویں صدی کے تاجکستان کے ایک اہم ادیب اور شاعر تھے۔ میر شکر نے اقبال کی شاعری کو بھی اپنے مخصوص مطالعے کا ہدف بنایا تھا اور ایک مقالہ'' محمد اقبال'' کے عنوان سے سپرد قلم کیا تھا۔ درج بالا کتاب اسی مقالہ کا اردو ترجمہ ہے۔ میر سید میر شکر کے افکار و خیالات کو سمجھنے کے لیے مترجم نے ایک طویل مقدمہ بھی لکھا ہے جس میں ان کے تمام افکار و خیالات کا بھرپور احاطہ کر کے ان کی بہت سی تاویلات سے اختلاف بھی کیا گیا ہے۔ کتاب کے آخر میں تعلیقات کا اضافہ کیا گیا ہے تاکہ متن میں جن لوگوں کا حوالہ دیا گیا ہے اُن سے بھی اس کتاب کے پڑھنے والے واقف ہو سکیں۔ اس کتاب کے مطالعے سے اس بات کا علم ہوتا ہے کہ تاجکستان کے لوگ اقبال کی شاعری کو کس نظر سے دیکھتے ہیں۔

پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے ۱۹۸۷ء کے 'مریخ' پٹنہ میں ایک طویل مقالہ اس کتاب پر تحریر کیا تھا۔ خودستائی کے طور پر نہیں امر واقعہ کے اظہار کے لیے اس کے یہ چند جملے نقل کر دینا ناگزیر محسوس ہوتا ہے:

> ''اس امر کا اعتراف ضروری ہے کہ کبیر احمد جائسی صاحب نے اس کتاب کا ترجمہ کرنے میں جو محنت صرف کی ہے قابل تعریف ہے۔ بالخصوص ہم جب یہ دیکھتے ہیں کہ اصل فارسی کتاب روسی رسم الخط میں چھپی ہے۔ جائسی صاحب نے اس ہفت خواں کو کن کن مشکلوں سے طے کیا ہوگا اس کا اندازہ آسان نہیں کیونکہ پہلے یہ ساری کتاب فارسی رسم الخط میں منتقل ہوئی اور پھر اردو میں ترجمہ ہوئی۔''

۱۱۔ "The Islamic Resurgence" مرتبہ پروفیسر آل احمد سرور:

www.taemeernews.com

جولائی ۱۹۷۹ء میں ''اسلام میں حیات نو'' کے موضوع پر اقبال انسٹی ٹیوٹ نے ایک سیمنار کا انعقاد کیا تھا جس کا افتتاح جموں کشمیر کے وزیر شیخ محمد عبداللہ نے کیا تھا۔ اس سیمنار میں جو مقالے انگریزی زبان میں پڑھے گئے تھے وہ اس میں یک جا کر دیے گئے ہیں۔ جو حضرات اس میں شریک ہوئے تھے ان میں بدرالدین طیب جی، رضا علوی (کلچرل کاؤنسلر، سفارت خانہ ایران، دہلی)، پروفیسر شفیع اگوانی، ڈاکٹر پروفیسر مقبول احمد اور پروفیسر عالم خوندمیری کے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ بدرالدین طیب جی کا کلیدی خطبہ اور سیمنار میں ہوئی بحثوں کا ایک خلاصہ بھی کتاب میں شامل ہے۔ اپنے موضوع پر یہ ایک منفرد کتاب ہے۔

۱۲۔ خطبات اقبال پر ایک نظر

از پروفیسر سعید احمد اکبرآبادی:

اقبال انسٹی ٹیوٹ کا ایک اہم پروگرام یہ بھی تھا کہ مذہبی فکر پر دانشوروں اور علما سے مونوگراف لکھوا کر شایع کیے جائیں۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے مولانا سعید احمد اکبرآبادی کو دعوت دی گئی تھی کہ وہ خطبات اقبال کا ایک ناقدانہ جائزہ لیں۔ مولانا سعید احمد اکبرآبادی ایک روشن خیال عالم دین ہونے کے ساتھ ساتھ علوم جدیدہ پر بھی ایک محرمانہ نظر رکھتے تھے۔ اقبال انسٹی ٹیوٹ کی دعوت پر انہوں نے جو توسیعی خطبات دیے تھے یہ کتاب انہیں کا مجموعہ ہے۔ اس کتاب کی اہمیت یہ ہے کہ پہلی بار ایک عالم دین نے اقبال کی مذہبی فکر کا ہمدردانہ مطالعہ کرتے ہوئے اقبال کے ناقدین کے اعتراضات کا مدلل جواب ہی نہیں دیا ہے بلکہ اقبال کی مذہبی فکر کی گرہیں بڑی کامیابی کے ساتھ کھولی ہیں۔

۱۳۔ اقبال کی نظری اور عملی شعریات

از پروفیسر مسعود حسین خاں:

اقبال کی فکر پر اردو کے دانشوروں اور عالموں نے کئی اہم اور گراں قدر کتابیں لکھی ہیں مگر اقبال کے فن پر کوئی اہم اور بنیادی کام نہیں ہوا تھا اسی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے سرور صاحب نے پروفیسر مسعود حسین خاں سے یہ کتاب لکھوائی تھی۔ کتاب کے دو حصے ہیں، پہلے حصے میں اقبال کی نظری شعریات کو مثالوں کے ذریعے واضح کیا گیا ہے جس سے اس بات کا علم ہو جاتا ہے کہ اقبال کے نزدیک شعریات کو کن کن خصوصیات کا حامل ہونا چاہیے۔ دوسرے حصے میں اقبال کی عملی شعریات سے بحث کی گئی ہے جو بقول سرور صاحب ''خاص طور سے توجہ چاہتا ہے'' اس حصے میں مسعود صاحب نے اقبال کی لسانی صلاحیت اور شعور پر جو بحث کی ہے اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اقبال کے یہاں ''فارسیت شعری آہنگ میں ہے صوتی آہنگ میں نہیں'' اس کتاب کے مطالعہ سے اقبال کی شعریات کا عرفان حاصل ہوتا ہے۔

دسمبر ۱۹۸۳ء کے آخری دن جب میں نے اقبال انسٹی ٹیوٹ کو خیر باد کہا تو ''عصر حاضر میں اسلام، مسائل اور امکانات'' مرتبہ پروفیسر آل احمد سرور پریس میں تھی جو بعد میں شائع ہو کر مقبول ہوئی اس کے علاوہ ''اقبال اور جدیدیت''

www.taemeernews.com

مرتبہ پروفیسر آل احمد سرور۔ ''تشخص کی تلاش کا مسئلہ اور اقبال'' مرتبہ پروفیسر آل احمد سرور۔ ''اقبال اور مستشرقین'' از پروفیسر جگن ناتھ آزاد۔ "Iqbal and the West" مرتبہ پروفیسر آل احمد سرور۔ "Islam in the modern world Problems and Prospects". مرتبہ آل احمد سرور پریس میں جانے والی تھیں۔ ان میں سے بعض تو شائع ہو چکیں بعض شاید ابھی تک غیر مطبوعہ ہیں۔

اقبال انسٹی ٹیوٹ میں سرور صاحب کا ایک اور کارنامہ اس کی بہتر لائبریری کا قیام ہے۔ سرور صاحب کی ذاتی دلچسپی اور کوششوں سے اس لائبریری میں اقبالیات پر نادر ذخیرہ جمع ہو گیا تھا، شاید اب اور کتابوں کا اضافہ ہو گیا ہو۔ اس وقت تک ہندوستان اور پاکستان کی تقریباً تمام کتابیں جو اقبال پر لکھی جا چکی تھیں انسٹی ٹیوٹ کی لائبریری میں آ چکی تھیں۔ علاوہ بریں لائبریری میں فلسفہ، شعریات اور اسلامیات کی بھی چیدہ چیدہ اہم اور بنیادی کتابیں جمع کی گئیں تھیں تاکہ اقبال پر کام کرتے وقت مواد کی کمی کا احساس نہ ہو۔ سرور صاحب نے اس لائبریری کے لیے تگ و دو کر کے مجلّہ اقبال اور اقبال ریویو کی فائلیں جمع کیں جن سے اقبال پر کام کرنے والوں کو بڑی سہولت ہوتی ہے۔ شاید ہی ہندوستان کی کسی یونیورسٹی کی لائبریری میں ان دونوں مجلوں کی مکمل فائل موجود ہوں صرف اقبال انسٹی ٹیوٹ کی لائبریری کو ہی یہ شرف حاصل ہے کہ وہ اس خزانے کو محفوظ کیے ہوئے ہے۔ ۱۹۸۳ء میں اقبال انسٹی ٹیوٹ کی لائبریری میں دو ہزار سے کچھ زیادہ کتابیں جمع کی جا چکی تھیں۔ اس کے علاوہ دو سو جلدیں مختلف معیاری رسالوں کی بھی تھیں۔ گمان غالب یہ ہے کہ اب یہ تعداد کہیں سے کہیں پہنچ چکی ہوگی۔

اقبال انسٹی ٹیوٹ کے قیام کے ایک سال کے اندر ہی اندر سرور صاحب نے یونیورسٹی انتظامیہ سے ایک وزیٹنگ پروفیسر کی اسامی منظور کروالی تھی۔ افسوس ہے کہ صرف تین حضرات ہی اس حیثیت سے انسٹی ٹیوٹ میں کام کر سکے پھر یہ سلسلہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔ تینوں وزیٹنگ پروفیسروں کا ذکر سرور صاحب کی زبانی یہ ہے:

> ''۱۹۸۰ء میں میں نے پروفیسر عالم خوند میری کو سال بھر کے لیے وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے بلایا۔ اپنے قیام کے زمانے میں انہوں نے اقبال پر کئی لکچر دیے اور اس کے علاوہ اسکالروں کے کام میں بھی مدد کی۔ ۱۹۸۰ء ہی میں مشہور مستشرق اور اسکالر پروفیسر اینی میری شمل میری دعوت پر سری نگر آئیں اور انہوں نے اقبال، گوئٹے، منصور حلاج اور رومی پر تین بصیرت افروز لکچر دیے۔ ۱۹۸۱ء اور ۱۹۸۲ء میں پہلے تین مہینے کے لیے اور پھر ایک سال کے لیے پروفیسر مسعود حسین خاں میری دعوت پر وزیٹنگ پروفیسر ہو کر آئے۔ ۱۹۸۵ء میں پروفیسر سراج الدین چار مہینے کے لیے تشریف لائے۔''[۱۶]

۱۹۸۶ء میں سرور صاحب پچھتر سال کے

www.taemeernews.com

ہو گئے تھے۔ کئی برسوں پہلے سے ان کی آنکھوں میں پانی اترنا شروع ہو گیا تھا۔ وہ جب تک ہو سکا آپریشن ٹالتے رہے مگر جب لکھنے پڑھنے کے علاوہ چلنے پھرنے میں بھی دقت محسوس کرنے لگے تو آپریشن پر آمادہ ہو گئے۔ ایک طرف کشمیر کے سیاسی حالات تیزی سے بدل رہے تھے دوسری طرف ان کی تمام کوششوں کے باوجود اقبال انسٹی ٹیوٹ میں ان کی پسند کے مطابق کام نہیں ہو رہا تھا اس لیے انہوں نے یہ بھی طے کیا کہ آپریشن کے بعد وہ اقبال انسٹی ٹیوٹ کی سرپرستی سے دستکش ہو جائیں گے انہوں نے اپنے فیصلے کا ذکر اس زمانے کے وائس چانسلر پروفیسر مشیر الحق صاحب سے کر دیا تھا۔ انہوں نے سری نگر میں اپنی واپسی کا ذکر صرف دو جملوں میں کر کے بات ختم کر دی۔

"میں آخر مارچ ۱۹۸۷ء میں
آنکھوں کا آپریشن کرانے علی گڑھ آیا تھا
پھر ستمبر میں وہاں گیا اور کتابیں اور
سامان لے کر اکتوبر ۱۹۸۷ء میں
علی گڑھ آیا۔"[۷]

یہاں پر ایک واقعہ کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اس کے ناقل محمد یوسف ٹینگ صاحب ہیں جنہوں نے یہ آنکھوں دیکھی امین اندرابی صاحب کو بتلائی تھی انہیں کی زبانی یہ بات عام ہوئی اور اس کا شہرہ علی گڑھ تک ہوا تھا۔ واقعہ کچھ یوں تھا جب فاروق عبداللہ صاحب سے سرور صاحب کی واپسی کا ذکر کیا گیا تو وہ اپنی عادت کے مطابق خوب اچھلے کودے انہوں نے وہاں موجود لوگوں سے کہا کہ سرور صاحب کیسے جا سکتے ہیں میں ان کو گود میں اٹھا لاؤں گا، اگر مر جاتے ہیں تو ان کی قبر بابا (شیخ عبداللہ) کی بغل میں بنواؤں گا۔ میں ان کو کشمیر سے جانے نہیں دونگا۔ سرور صاحب خاموشی سے سری نگر سے علی گڑھ آ گئے۔ وہاں سے واپسی کے بعد وہ تقریباً پندرہ برسوں تک زندہ رہے۔ ان پندرہ برسوں میں فاروق عبداللہ صاحب متعدد بار علی گڑھ آئے دو تین بار تو سرور صاحب کے مکان کے پاس سے بھی گزرے مگر ان کو کبھی یہ یاد نہ آیا کہ اس مرد بیمار کو دیکھ لیں جس کی قبر وہ اپنے بابا کی قبر کے پہلو میں بنوانا چاہتے تھے۔

سری نگر سے جب سرور صاحب کی واپسی ہوئی تھی اس زمانے میں پروفیسر مشیر الحق مرحوم کشمیر یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔ انہوں نے سرور صاحب سے مشورہ کیا کہ ان کا جانشین کون ہو۔ ان کے مشورے پر صبیح احمد کمالی مرحوم کا اس جگہ پر تقرر ہوا۔ کمالی صاحب نہ تو کشمیر یونیورسٹی کی ریشہ دوانیوں کو جھیل سکے اور نہ ہی وہاں کے موسم کو۔ وہ جلدی ہی واپس آ گئے ان کے بعد انسٹی ٹیوٹ کے سب سے پرانے استاد امین اندرابی صاحب اقبال انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر مقرر کیے گئے۔ وہ مارچ ۲۰۰۰ء تک انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر رہے۔ سیاسی حالات کے بگڑ جانے اور خون خرابے کی وجہ سے امین صاحب کے دور میں کوئی خاص کام نہ ہو سکا۔ جو کتابیں ان کے زمانے میں شائع ہوئیں وہ سب سرور صاحب کے زمانے کی ہیں اگرچہ اس پر مرتب کی حیثیت سے نام امین صاحب کا شائع

www.taemeernews.com

کیا گیا ہے۔ مارچ ۲۰۰۰ء سے یعنی امین صاحب کے سبکدوش ہونے کے بعد سے اب تو اقبال انسٹی ٹیوٹ کا نام بھی سننے میں نہیں آتا، ڈائرکٹر کون ہے کسی کو خبر نہیں۔ اب اقبال انسٹی ٹیوٹ کیا ہے مرجھایا ہوا پودا ہے۔ سرور صاحب کا لگایا ہوا پودا اتنی جلد مرجھا جائیگا اس کا تو وہم وگماں بھی نہ تھا۔

حواشی

۱۔ خواب باقی ہیں، آل احمد سرور، اشاعت ثانی، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۲۰۰۰ء ص ۱۴

۲۔ ایضاً، ص ۲۶۶

۳۔ ایضاً، ص ۲۶۷

۴۔ ایضاً، ص ۲۷۸

۵۔ تفصیل کے لیے میرا مقالہ ''سرور صاحب'' مشمولہ ''آل احمد سرور۔ شخصیت اور فن'' مرتبہ امتیاز احمد مطبوعہ ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ۷۷۔۱ ملاحظہ ہو۔

۶۔ خواب باقی ہیں، ص ۲۷۹

۷۔ خواب باقی ہیں، ص ۲۹۵

☆☆☆

www.taemeernews.com

اصغر عباس*

میرے استاد محترم۔ سرور صاحب

دسمبر ۲۰۰۱ء کی آخری تاریخوں میں سرور صاحب اپنے داماد کی تعزیت کے لیے دہلی گئے تھے وہیں سے ۹رفروری ۲۰۰۲ء کو رات ڈیڑھ بجے وہ وہاں چلے گئے جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا۔ یہ صحیح ہے کہ ان کی عمر اکیانوے برس سے تجاوز کر چکی تھی اور وہ دنیا پر ڈوبتے ہوئے سورج کی طرح آخری نظریں ڈال رہے تھے لیکن مجھے یہ خیال نہ آتا تھا کہ یہ روشنی جو علی گڑھ کے در و بام کو روشن کیے ہوئے ہے اتنی جلدی چلی جائے گی۔ علی گڑھ کے سچے دوستوں اور اس کے صاحب علم پروفیسروں کی فہرست میں سرور صاحب کا نام نہایت اونچی جگہ کا مستحق ہے۔ وہ موجود تھے تو علمی اور ادبی معاملات میں علی گڑھ کی رائے کو اہمیت دی جاتی تھی۔ وہ ہماری یونیورسٹی کے لئے سرمایۂ افتخار و نازش تو تھے ہی لیکن ان کے جیسا مجمع الصفات دانشور یہاں دور دور تک نظر نہیں آتا۔ اسی لیے ان کا جانا ہمارے لیے ایک سانحہ ہے اور برصغیر کے معروف تعلیمی مرکز کے لیے ایک المیہ!

سرور صاحب سے میری شاگردانہ ارادت کی عمر پینتیس برس سے زیادہ ہے۔ اس میں وہ مدت بھی شامل ہے جس میں شعبۂ اردو میں ان کے رفیق کار کی حیثیت سے مجھے کام کرنے کا موقع ملا۔ یہ بات بھی میرے دل منت شناس کے لیے باعث طمانیت ہے کہ سرور صاحب سے میرا شاگردانہ تعلق اس عرصہ میں برابر قائم رہا اور آخر تک اس میں کوئی پیچ نہیں پڑا۔

یہ تو یاد نہیں کہ سرور صاحب کا نام پہلی بار کب سنا تھا لیکن اپنے گھر میں ان کا نام اکثر سنتا تھا۔ گرمیوں کی تعطیل میں جب علی گڑھ کے شعبۂ اردو کے استاد ڈاکٹر محمد عزیز اپنے وطن بی بی پور جو اعظم گڑھ ضلع میں ایک شرفا کی بستی تھی آتے، جہاں ہمارے مکانوں کا فاصلہ دیوار بہ دیوار تھا تو وہ بھی سرور صاحب کا ذکر کرتے۔ میں جب ثانوی درجات میں پہنچا تو اردو کے نصاب میں سرور صاحب کی مرتب کردہ کتاب ''اردو سیپارے'' بھی تھی جس میں ان کے مضمون کو میں نے مزے لے لے کر پڑھا تھا اور ان کی دلکش نثر کے اکثر جملے مجھے یاد بھی

---

* پروفیسر، سابق صدر شعبۂ اردو، ڈائرکٹر سرسید اکیڈمی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

www.taemeernews.com

ہو گئے تھے۔ علی گڑھ میگزین میں ان کی تصویر بھی دیکھ چکا تھا لیکن پہلی بار میں نے انہیں اس وقت دیکھا جب وہ ایم۔اے کا زبانی امتحان لینے گورکھپور یونیورسٹی آئے تھے اور ڈاکٹر محمود الٰہی، صدر شعبۂ اردو کے ساتھ ان سے باتیں کرتے ہوئے اس کمرے کی جانب چلے آ رہے تھے جہاں زبانی امتحان ہونا تھا۔ میں اپنے ہم سبق ساتھیوں کے ساتھ سہما ہوا کھڑا تھا۔ میں نے سرور صاحب کو ڈرتے ہوئے دیکھا کیونکہ ان کے متعلق مشہور تھا کہ تعلیمی کاموں کے پرکھنے میں وہ بہت احتیاط سے کام لیتے ہیں اور کوئی خوش قسمت ہی ہوتا ہے جسے ان کے ہاتھوں سے فرسٹ ڈویژن نمبر ملتے ہیں۔ لیکن میری مسرت اور حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے یہ سنا کہ انہوں نے مجھے سب سے زیادہ نمبر دیے ہیں۔ اب تک یاد ہے کہ وہ پوری آستین کی بشرٹ اور پتلون پہنے ہوئے تھے۔ ان کے چہرے بشرے سے ایک ساحرانہ شکوہ کا اظہار ہو رہا تھا۔ ان کی رنگت انار دانے جیسی تھی اور آنکھوں پر عینک اور ہونٹوں پر پان کی سرخی عیاں تھی، ہاتھ میں ایک کتاب بھی تھی، بعد میں اندازہ ہوا کہ ''فسانہ عجائب'' تھی جس کے کچھ اجزاء انہوں نے زبانی امتحان کے دوران مجھ سے پڑھوا کر سنے تھے۔

یہی زبانی امتحان بعد میں میرے لیے ریسرچ کی تقریب بن گیا۔ علی گڑھ سے لائبریری سائنس میں ڈگری لینے کے بعد پی۔ایچ۔ڈی میں داخلے کے خیال سے ایک روز صبح ہی صبح میں سرور صاحب کے گھر پہنچ گیا۔ وہ اس زمانے میں ا۔شبلی روڈ پر رہتے تھے۔ وہاں انہوں نے ذرا بھی التفات نہ برتا اور یہ کہہ کر دروازہ بند کر دیا کہ آپ شعبہ میں ملیے۔ چند روز بعد انہوں نے میرے لیے ''سرسید کی صحافت کا تحقیقی اور تنقیدی جائزہ'' کا موضوع پی۔ایچ۔ڈی کے لیے منتخب کیا اور کام کی نگرانی بھی اپنے ذمہ رکھی۔ یہ موضوع خاصا محنت طلب تھا۔ تقریباً پینتیس ہزار جہازی سائز کے صفحات کا جائزہ لینا تھا اسی لیے مجھ سے پہلے کئی حضرات اس موضوع کو بھاری پتھر کی طرح چوم کر چھوڑ چکے تھے۔ لیکن جب تحقیقی کام میں سرور صاحب نے میری مستعدی اور انہماک دیکھا تو دھیرے دھیرے مجھ پر اعتماد کرنے لگے اور انجمن ترقی اردو (ہند) کے ہفتہ وار اخبار ''ہماری زبان'' اور سہ ماہی رسالہ ''اردو ادب'' کا کام جس کے وہ ایڈیٹر تھے میرے سپرد کر دیا جسے کئی برس تک میں ان کی رہنمائی میں انجام دیتا رہا۔ ۱۹۶۹ء میں جب وہ چھ ماہ کے لیے وزیٹنگ پروفیسر ہو کر شکاگو یونیورسٹی گئے تو انہوں نے وہاں سے ۱۵؍اکتوبر کو یہ خط لکھا جو میرے نام ان کا پہلا شفقت نامہ ہے۔ مکتوب بجنسہ درج ہے:

۲۰۲۔شکاگو بیچ ہوٹل،
۵۱۰، کارنل۔شکاگو۔۱۵ آئی ایل

ڈیئر اصغر عباس۔ تمہارا ۶؍اکتوبر کا خط مجھے پرسوں ۱۳؍اکتوبر کو ملا۔ میں نے ۲؍اکتوبر کو اپنے بھائی کو خط لکھا تھا غالباً یہ خط ۸ یا ۹ تک ملا ہوگا۔ عام طور پر چھ سات دن خط پہنچنے میں لگ جاتے ہیں مگر دہلی سے میری لڑکی کا خط چوتھے دن آ گیا۔ تمہارا خط ملنے پر خوشی ہوئی۔

www.taemeernews.com

میں یہاں آرام سے ہوں، اپارٹمنٹ اچھا ہے۔ دروازے سے یونیورسٹی کی بس جاتی ہے۔ یونیورسٹی کوئی سو امیل دور ہے۔ وہاں کا ماحول بہت پسند آیا۔ لوگ ہمدرد اور ملنسار ہیں مگر دخل کوئی نہیں دیتا۔ کام کرنے کی پوری آزادی ہے جی چاہے تو گھر پر بھی کام کر سکتے ہیں۔ ہاں جس دن سیمینار یا لکچر ہو اس دن آنا ضروری ہوتا ہے۔ میں فی الحال غالب پر ایک سیمینار ہفتہ میں دو دفعہ لے رہا ہوں، ایک نشست ڈیڑھ گھنٹے کی ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ اس سہ ماہی میں یونیورسٹی میں تین لکچر دوں گا۔ صبح نو بجے نکلتا ہوں۔ بیوی کی تنہائی کے خیال سے پونے تین یا تین بجے تک واپس آجاتا ہوں۔ امید تو ہے کہ سیمینار کے سلسلے میں نوٹس بڑھ کر غالب پر انگریزی میں کتاب بن جائیں گے۔ اگلے کوارٹر میں اقبال پر بھی لکچر ہوں گے۔ کچھ باہر کی یونیورسٹیوں سے بھی دعوت آئی ہے۔ اب تک موسم معتدل تھا۔ اب خاصی سردی شروع ہوگئی ہے۔ میری صحت اچھی ہے۔ بیوی بھی ٹھیک ہیں۔ طبیعت لگ گئی ہے۔

تم پریشان نہ ہونا۔ کوئی بات مشورہ طلب ہو تو بے تکلف لکھو۔ کوشش کرو کہ میری واپسی تک تمہارے مقالے کا پہلا ڈرافٹ تیار ہو جائے۔ اب تمہارا مقالہ تیار ہو جانا چاہیے۔ سرسید پر یہاں جو کام ہوا ہے اس کے متعلق معلوم کر کے لکھوں گا۔ مل سکا تو لے لوں گا۔ میں تمہیں بہت عزیز رکھتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ تم جلد پی۔ ایچ۔ ڈی کر لو اسی وجہ سے مناسب سمجھا کہ سیمینار کا کام کرتے رہو تا کہ مالی دشواریاں حائل نہ ہوں۔ ایسا معمول کر لو کہ سیمینار کے علاوہ لائبریری میں روزانہ کچھ وقت ضرور گذارو۔ امید ہے کہ علی گڑھ کی فضا ٹھیک ہوگی۔ کبھی کبھار خط لکھتے رہو۔

یہاں یونیورسٹی کے ماحول سے متاثر ہوا۔ ہر شخص اپنے کام میں لگا رہتا ہے۔ کچھ لوگ صبح سے آتے ہیں اور شام تک رہتے ہیں۔ ویسے رات کو بھی کام کرنے کی آسانی ہے۔ سب کمروں میں ٹیلی فون ہے اور سینٹرل ہیٹنگ ہے۔ برامدے میں ''کافی'' تیار ملتی ہے صرف پانچ سنٹ خرچ کرنے پڑتے ہیں۔ ابھی تک شکاگو میں زیادہ گھوم پھر نہیں سکا صرف ایک میوزیم دیکھا ہے۔ ہمارے علاقے میں سفید فام اور سیہ فام لوگ مل جل کر رہتے ہیں۔ دوسرے حصوں میں تناؤ رہتا ہے۔ آج یہاں بڑے پیانے پر ویتنام کے خلاف مظاہرہ ہوا۔ اس میں طلباء اور اساتذہ پیش پیش تھے۔ بیوی تمہیں دعا کہتی ہیں۔ پرسان حال سے خیریت کہہ دینا۔

مخلص

آل احمد سرور

سفر و حضر میں بھی سرور صاحب کے ساتھ میں رہا ہوں۔ کشمیر یونیورسٹی میں جب ان کی نگرانی میں اقبال انسٹی ٹیوٹ قایم ہوا جو ہندوستان میں اقبال پر علمی کام کا سب سے بڑا ادارہ ہے اس کے ابتدائی دنوں میں تقریباً ایک مہینے تک میں اور اہلیہ ان کے مہمان رہے۔ اب بھی یاد ہے کہ ہمیں جموں سے سرینگر پہنچنے میں خاصی تاخیر ہوگئی تھی۔ جب ہماری ٹیکسی کشمیر یونیورسٹی میں سرور صاحب کے بنگلے پر پہنچی تو باوجودیکہ یخ بھری ہوائیں چل رہی تھیں اور رات

www.taemeernews.com

بھی کسی قدر بھیگنے لگی تھی لیکن سرورؔ صاحب ازراہ انس ومحبت برآمدے میں ٹہلتے ہوئے ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ ہمارے پہنچنے پر ان کے چہرے پر طمانیت کے آثار دکھائی دیے۔ انہوں نے بڑی خندہ پیشانی سے ہمیں خوش آمدید کہا اور ہمیں اپنے مکان کے اس کمرے میں لے گئے جہاں ہمارے قیام کا انتظام تھا۔ سری نگر پہنچنے سے پہلے انہوں نے مجھے جو خط لکھا تھا وہ تمام وکمال یہاں نقل کر رہا ہوں:

کشمیر یونیورسٹی،
سرینگر۔۲۲۔ستمبر ۱۹۷۸ء

ڈیئر اصغر عباس۔ تمہارا رجسٹری شدہ خط اور ''افکار'' کے مضمون کا اقتباس ملا۔ ان حضرت نے تو کمال کر دیا۔ ایسا سفید جھوٹ بولتے ہیں کہ بقول شخصے ''معاذ اللہ کی پناہ'' ان صاحب کے ساتھ میں نے جو کیا سب پر روشن ہے اب اس کے بعد ان کی طرف سے یہ ارشادات عالیۂ ناطقہ سربگریباں کہ اسے کیا کہیے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا ''افکار'' کو اس سلسلے میں اس مضمون کا جواب میں دوں یا خاموش رہوں۔ جواب نہ دینے سے کچھ لوگوں کو یہ خیال ہوسکتا ہے کہ یہ سب لن ترانیاں صحیح ہیں۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ تم یا کوئی اور جواب دے۔ اگر میں لکھوں تو بجائے ان کے لہجے میں جواب دینے کے صرف واقعات بیان کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ بہرحال تم اپنی رائے لکھو تو فیصلہ کروں۔

تم کب تک یہاں آرہے ہو۔ آنے کی تاریخ لکھو۔ میں ۳ر سے ۵ر اکتوبر تک ''اقبال اور مغرب'' پر سیمنار کر رہا ہوں، علی گڑھ سے اسلوب کو بھی بلایا ہے، دہلی سے شمس الرحمٰن آئیں گے۔ عالم، سردار، جگن ناتھ آزاد اور وارث علوی کو بھی بلایا ہے۔ دیکھیں یہ سب لوگ پہنچ بھی پاتے ہیں یا نہیں۔

میں ۱۵ر کو ترقی اردو بورڈ کی مجلس عاملہ کے سلسلے میں دہلی گیا تھا، علی گڑھ کا پھیرا کرنے کا بھی خیال تھا مگر راستے کی گڑبڑ کی وجہ سے ارادہ ملتوی کرنا پڑا۔ اب ۱۰ر اکتوبر کو علی گڑھ میں ایک میٹنگ کے سلسلے میں جاؤں گا۔

بہتر یہ ہوگا کہ تم سیمنار سے پہلے آجاؤ۔ بہرحال اپنا پروگرام جلد لکھو۔ یہاں اب سردی شروع ہوگئی ہے۔ رات کو کمبل اوڑھنا پڑتا ہے۔ دن خوشگوار ہوتا ہے۔ اب کے سردی کچھ جلدی شروع ہوگئی۔ بیگم کو دعا۔ بیوی تم دونوں کو دعا کہتی ہیں۔ اگر تمہارے پاس 'مکاتیب اقبال'/ 'نذیر نیازی' ہو تو لیتے آنا۔ دہلی میں سنا تھا کہ خورشید صاحب واپس آگئے ہیں۔

مخلص
آل احمد سرورؔ

میرے نام سرورؔ صاحب کے جو خطوط ہیں ان کا شمار تو میں نے نہیں کیا لیکن پینتیس برس کی مدت تک پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ خطوط شکاگو، شملہ، بوڈاپسٹ، ہنگری، سرینگر، دہلی اور علی گڑھ سے لکھے گئے ہیں۔ سرورؔ صاحب کا خط پڑھنا آسان نہیں ہے، میں ایک عرصے تک ان کے مضامین کے مسودہ کو مبیضہ کرتا رہا ہوں اس لیے مجھے ان کا خط پڑھنے میں چنداں دشواری نہیں ہوتی۔ مولوی عبدالحق نے سرورؔ صاحب کے

www.taemeernews.com

سواد خط کے بارے میں یہ دلچسپ بات لکھی ہے کہ آپ کی تحریر پڑھنے کے لیے اردو رسم الخط سے واقفیت کافی نہیں، کچھ ذہانت کی بھی ضرورت ہے۔

۱۹۹۹ء کے اوائل میں مجھے ہیلری اور ٹرینٹی ٹرم کے لیے آکسفورڈ جانے کا ایک وزیٹنگ فیلوشپ ملا۔ یاد پڑتا ہے کہ میرے نام سرور صاحب کا اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا یہ آخری خط تھا جو انہوں نے آکسفورڈ میں میری رہائش گاہ۔ ا۔ مارش لین۔ ہیڈنگٹن کے پتے پر لکھا تھا۔ یہ خط بھی من وعن یہاں نقل کر رہا ہوں:

سر سید نگر،
علی گڑھ۔ ۹۹/۴/۶ء

مائی ڈیئر اصغر عباس

تمہارا ۱۴/ مارچ کا لکھا ہوا خط مجھے آخر مارچ میں مل گیا تھا۔ اب تک تو تم وہاں کی بوڈلین لائبریری دیکھ چکے ہوگے۔ وہاں ہوسکتا ہے کہ سرسید کے متعلق کوئی نیا مواد دستیاب ہو۔ جب موقع ملے تو انڈیا آفس، برٹش میوزیم اور کیمبرج اور اڈنبرا کی لائبریریاں بھی دیکھنا۔ ضرور وہاں کچھ کام کی چیزیں مل جائیں گی۔ یہ بہت اچھا موقع ہے۔ وہاں کے سارے علمی ادارے دیکھ لینا اور اہم شخصیتوں سے بھی مل لینا۔ انیسہ کا دل بھی رفتہ رفتہ لگ جائے گا۔ لندن جاؤ تو بی بی سی بھی ضرور جانا۔

میری صحت ویسی ہی ہے۔ دواؤں اور ورزش کا سلسلہ جاری ہے۔ اب گرمی خاصی پڑنے لگی ہے کہا جاتا ہے کہ اب کے زیادہ ہی گرمی ہوگی۔ خیر اللہ مالک ہے، بیگم صاحبہ کی صحت بھی ویسی ہی ہے وہ بھی خاصی کمزور ہوگئی ہیں۔ میں تو اب چراغ سحری ہوں۔

رالف رسل کا خط اردو میں قومی آواز میں چھپا تھا۔ انگریزی میں ''پولیٹیکل'' ویکلی جو بمبئی سے نکلتا ہے اس میں آیا ہے۔ میں نے دہلی قومی آواز میں جواب دے دیا تھا اب انگریزی میں بھی جواب لکھوا دوں گا۔ مجھے تو یہ کوئی سازش معلوم ہوتی ہے۔ خیر دیکھیں گے۔ شہاب الدین ثاقب آتے رہتے ہیں، پچھلے ہفتے کچھ بیمار تھے اب ٹھیک ہیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے لکھا تھا کہ ان کے یہاں بھی تمہارا خط آیا تھا۔ تم نے انہیں لکھا تھا کہ گھر یاد آتا ہے۔ امید ہے کہ اب وہاں دل لگ گیا ہوگا۔ بیگم تمہاری اور انیسہ کی خیریت دریافت کرتی ہیں۔ اپنی مصروفیات کے بارے میں لکھتے رہنا۔ ابھی تو تمہیں وہاں کئی مہینے رہنا ہے، وہاں کے تاثرات لکھتے رہنا۔ بعد میں چھپوا دینا۔ غالباً جون کے آخر تک تمہاری واپسی ہوگی۔

مخلص

آل احمد سرور

میں جن دنوں سری نگر میں سرور صاحب کے پاس تھا تو ان کے شب و روز قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ اکثر دیر تک ان کے پاس بیٹھنا ہوا، ان کی باتیں سننا ایسا ہی تھا جیسے کسی درس میں شامل ہونا۔ ان کی مجلس میں ایسے لمحات بیشتر آتے جس سے یہ محسوس ہوتا کہ مخاطب کو کچھ مل رہا ہے اس کا وقت ضائع نہیں ہو رہا ہے۔ وہ علی گڑھ کے ان خوش نصیبوں میں تھے جن

www.taemeernews.com

کے پاس پایانِ عمر تک علم کے جویا اور رموز ادب و تنقید کے متلاشی آتے رہے اور شاید ہی انہیں تنہائی کا بھی احساس ہوا ہو۔

سرور صاحب نے انگریزی ادب میں ایم۔ اے اس وقت کیا اور اول آئے جب علی گڑھ میں انگریز یا اہل زبان انگریزی کے پروفیسر ہوتے تھے۔ سرور صاحب کو انگریزی اور اردو دونوں زبانوں پر عبور تھا۔ انگریزی کے پرتو سے انکی اردو جگمگاتی تھی، وہ اردو کے بھی اچھے مقرر تھے۔ ان کے زمانۂ طالب علمی سے رشید صاحب ان کی اردو خطابت کے قائل تھے۔ سرور صاحب انگریزی کے بھی فصیح البیان مقرر تھے۔ ان کی تقریروں میں گھن گرج اور شور شرابے کے بجائے نرم سیر دریا کا انداز رہتا جس طرح ان کے مضامین پڑھ کر اکتاہٹ، تکان یا بے کیفی کا احساس نہیں ہوتا اسی طرح ان کی انگریزی اور اردو تقریریں بیان کی خوبی، دلائل کی پختگی اور درستگیٔ معلومات کا نمونہ ہوتی تھیں۔ علی گڑھ میں پروفیسر عبد العلیم کی وائس چانسلری کا زمانہ تھا۔ انہیں آل انڈیا لائبریری سائنس کے مندوبین کی کانفرنس کا افتتاح کرنا تھا لیکن عین افتتاح سے کچھ دیر پہلے انہوں نے سرور صاحب کو کہلا دیا کہ مذکورہ کانفرنس کا وہ افتتاح فرمادیں۔ سرور صاحب جلسے میں گئے اور انگریزی میں ایسی تقریر کی جس کی لذت میرے گوش و ہوش میں اب تک برقرار ہے۔ ان کا لب ولہجہ ایسا دلکش، الفاظ کا انتخاب ایسا عام فہم اور دلنشین اور مطالب ایسے پر مغز تھے کہ جلسہ کے عام سامعین ہی نہیں لائبریری سائنس کے ماہرین اور علی گڑھ کے خود پسند بھی گرویدہ تقریر ہو گئے۔

برصغیر میں سرور صاحب کے ہم عصروں میں کم ایسے ہونگے جن کا مطالعہ اتنا وسیع اور علم ایسا مستحضر ہو۔ وہ غیر معمولی قوت حافظہ کے حامل تھے۔ برسوں کی پڑھی ہوئی چیزیں ان کے ذہن میں محفوظ رہتیں۔ اردو کا قدیم ادب ہو یا عصری ادب وہ اس کے ہر میلان اور ہر کروٹ سے بخوبی آگاہ رہتے۔ تازہ ترین اہم ادبی تصانیف، علمی اور ادبی مسائل، اہم شعرا اور مصنفین سے خواہ ان کا دنیا کے کسی علاقے اور ادب سے تعلق ہو وہ واقف رہتے۔ مطالعہ ان کے لیے لازمۂ زندگی تھا۔ جب وہ شکاگو یونیورسٹی سے واپس آرہے تھے تو انہوں نے یونیورسٹی لائبریری کو تین سو کتابیں واپس کی تھیں اور بعض کتابیں مدت سے زیادہ رکھنے پر یونیورسٹی لائبریری کو تاوان بھی دیا تھا۔

سرور صاحب جب کسی سیمنار، ریڈیو یا رسالے کے لئے مضمون لکھتے تو اسے آخر وقت تک ٹالتے رہتے اور اس وقت مضمون لکھنے بیٹھتے جب موعودہ وقت مقررہ میں ذرا بھی گنجائش باقی نہ رہتی۔ جب شعبۂ اردو نے رشید صاحب کی یاد میں ''رشید احمد صدیقی آثار و اقدار'' کے عنوان سے ایک کتاب کی اشاعت کا منصوبہ بنایا تو اس کے لیے سرور صاحب نے لکھنے کا وعدہ کر لیا لیکن جب کافی دن گذر گئے اور کتاب پریس جانے لگی تو میرے بار بار کے اصرار کے بعد ایک روز شام کو ایک نشست میں ''رشید صاحب: ایک ذاتی تاثر'' کے

www.taemeernews.com

عنوان سے پورا مضمون مجھے املا کرا دیا۔ وہ سرینگر جانے کے لیے پا بہ رکاب تھے اس لیے مضمون پر انہیں نظر ثانی کا موقع بھی نہ ملا۔ وہ زیادہ تر قلم برداشتہ لکھتے، وہ مضمون کے لیے نہ تو پہلے سے کوئی خاکہ تیار کرتے نہ ضروری یادداشتوں کو ترتیب دیتے نہ مآخذ کا تعین کرتے۔ وہ صرف اپنے برق وش حافظہ، اپنی نکتہ رس طبیعت اور اپنے بہار آفریں قلم پر بھروسہ کرتے، اس کے باوجود ان کے ذہن میں تنقیحات واضح اور کام کی باتیں اپنی صحیح جگہ پر آتیں اسی لیے ان کے چھوٹے چھوٹے مضامین ہی نہیں 'ہماری زبان' کے اداریے جسے وہ ہر ہفتے لکھتے، موضوع کے نئے نئے گوشوں اور پتے کی باتوں سے مملو رہتے۔ وہ نقلی نقادوں اور علمائے سو کی طرح محض فنی اصولوں پر کسی ادب پارے کو ناپ تول کر ختم نہیں کرتے بلکہ اس کی کوشش کرتے ہیں کہ فن پارے کے تجزیے کے رد وقبول میں جمالیاتی احساس اور عقل دونوں متفق ہو جائیں۔

سرور صاحب کو اللہ نے شہرت کی دولت سے خوب نوازا تھا۔ ان کے جاننے والوں کا حلقہ ان تمام مقامات پر پھیلا ہوا تھا جہاں اردو زبان وادب کے سمجھنے والے ہیں۔ اردو کے علاوہ مختلف علوم وفنون کے علما اور طلبا بھی ان کے یہاں برابر آتے رہتے اور وہ ان سے بڑی شان بے نیازی سے ملتے۔ وہ تعلقات عامہ کے آداب سے قطعی بے بہرہ تھے۔ وہ اپنے علم وعرفان کو معمولی نعمتوں اور ادنیٰ مقاصد کے حصول کے لیے کبھی کام میں نہیں لائے۔ ان میں ایسی خود اعتمادی تھی کہ انہیں تعلقات عامہ کی حاجت باقی نہیں رہ گئی تھی۔ انہوں نے عالمانہ رکھ رکھاؤ سے اپنی ساری عمر گذار دی۔ یہی وجہ ہے کہ علی گڑھ میں یا کشمیر یونیورسٹی میں انہوں نے اپنے بچوں کے سلسلے میں کسی کی ملازمت کے لئے کبھی کوئی تحریک نہیں کی۔

فروری ۲۰۰۲ء کے یونیورسٹی کانوکیشن کے موقع پر میں نے شعبہ اردو کی طرف سے یونیورسٹی کے ارباب بست وکشاد کی خدمت میں پروفیسر آل احمد سرور اور شمس الرحمٰن فاروقی کا نام ڈاکٹر آف لٹریچر کی اعزازی ڈگری کے لئے پہلی بار تحریک اور تجویز کیا لیکن مجھے آج تک اس کا تعجب بھی ہے اور افسوس بھی کہ یونیورسٹی کے ارباب حل وعقد نے سرور صاحب کا نام حذف کر دیا، شاید سرور صاحب اگر تعلقات عامہ کے گُوں کے ہوتے تو یہ صورت حال پیش نہ آتی۔

میرے لیے وہ لمحات ناقابل فراموش ہیں جب مسلم یونیورسٹی کے شعبہ اردو نے آل احمد سرور دو روزہ قومی سمینار کے منصوبے کو آخری شکل دی۔ مسلم یونیورسٹی کی تاریخ میں یہ پہلا سمینار تھا جو کسی زندہ شخصیت پر ہو رہا تھا۔ مجوزہ سمینار کے انعقاد سے چند روز پہلے میں نے سرور صاحب سے التجا کی کہ آپ کی شرکت سے سمینار کے وقار میں غیر معمولی اضافہ ہوگا۔ وہ مسکرائے لیکن کوئی جواب نہ دیا، وقت مقررہ پر میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور آخر کار وہ شرکت کے لئے راضی ہو گئے۔ انہوں نے اپنے مخصوص اسلوب کے ساتھ سمینار کو خطاب کیا۔ اراکین محفل کے علاوہ صدر محفل جناب سید حامد صاحب چانسلر ہمدرد یونیورسٹی نے خوشی کا اظہار کیا کہ عمر کی اس منزل میں بھی سرور صاحب میں پہلے

www.taemeernews.com

سا دم خم باقی ہے۔ اسی سیمنار میں انہیں حکومت مدھیہ پردیش کا اقبال سمان اور انجمن ترقی اردو کی جانب سے تحائف پیش کیے گئے تھے۔

سرور صاحب صاحب علم تو تھے ہی ساتھ ہی وہ صاحب ثروت بھی تھے لیکن دھن دولت کو پلکوں سے اٹھانے کا اہتمام انھوں نے کبھی نہ کیا۔ میں نے انھیں ان کے کاغذات سے نکال کر ایسے بہت سے چیک دیے ہیں جن کی مدت ختم ہو چکی تھی۔ ڈپٹی نذیر احمد اور وحید الدین سلیم کی طرح انہیں بھی اپنی راحت کا چنداں خیال نہ رہتا۔ ان کی طرز بود و ماند دیکھ کر اکثر میر تقی میر اور آصف الدولہ کا مکالمہ یاد آ جاتا تھا۔ وہ اپنی دنیا میں آپ مگن رہتے تھے۔ جب موڈ میں ہوتے تو اقبال کے اشعار پڑھتے، ان کی خوشنوائی سننے سے تعلق رکھتی تھی۔ ان کی شخصیت قدیم و جدید کا مجموعہ تھی۔ عادتیں اکثر پرانی، خیالات بہت سے نئے، سرور صاحب خوش بھی ہوتے تھے، ان پر افسردگی بھی طاری ہوتی تھی اور انہیں غصہ بھی آتا تھا لیکن ہر حال میں وہ اعتدال اور توازن کے دائرے میں رہتے۔ منشی پریم چند کی طرح انہیں کبھی میں نے فلک شگاف قہقہے لگاتے نہیں دیکھا۔ غصہ بھی ناگواری کی حد تک رہتا۔ اتنے دنوں میں ان کے کسی مخالف کے لیے ان کی زبان سے میں نے کبھی کوئی نا ملائم لفظ نہیں سنا۔ اختلاف برداشت کرنے کی جیسی صلاحیت ان میں تھی وہ میں نے کہیں اور نہیں دیکھی۔ میں نے ان میں وہ ذہنیت بھی نہیں پائی جو اپنے حریفوں کو رسوا کر کے مزے لیتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ سرور صاحب علی گڑھ کے ساختہ پرداختہ تھے۔ انہوں نے علی گڑھ کی روایات کے منتخب اجزا کو اپنے اندر سمو لیا تھا۔ اسی عطر مجموعہ کا دوسرا نام آل احمد سرور ہے۔

سرور صاحب کے تنقیدی اکتسابات کا میں نے جائزہ نہیں لیا ہے لیکن اتنا ضرور کہنا چاہونگا کہ پچھلی صدی کے وسط میں جب تنقید کا بازار گرم ہوا اور بہت سے چھوٹے بڑے نقاد سامنے آئے تو ان میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جس نے سرور صاحب کے اثرات قبول نہ کیے ہوں۔ علامہ شبلی نے سر سید کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا تھا کہ ملک میں آج بڑے بڑے انشا پرداز موجود ہیں جو اپنے اپنے دائرۂ مضمون کے حکمراں ہیں لیکن ان میں ایک شخص بھی ایسا نہیں ہے جو سر سید کے بار احسان سے گردن اٹھا سکتا ہو۔ بعض ان کے بالکل دامن تربیت میں پلے ہیں بعض نے دور سے فیض اٹھایا ہے، بعض نے مدعیانہ اپنا الگ رستہ نکالا ہے تاہم سر سید کی فیض پذیری سے بالکل آزاد کیونکر رہ سکتے تھے۔ مولانا شبلی کے یہی اقوال تنقید کے سیاق و سباق میں سرور صاحب پر بھی صادق آتے ہیں۔

☆☆☆

www.taemeernews.com

محمد انصار اللہ*

لائے کہاں سے دنیا مثل و نظیر اس کا

نویں دسویں جماعت میں ہم نے پروفیسر آل احمد سرور صاحب کی مرتب کردہ کتابیں ''ہمارا ادب حصہ نثر'' اور ''ہمارا ادب حصہ نظم'' پڑھی تھیں۔ کم و بیش اسی زمانے میں اعظم گڑھ کے ایک پرانے مشاعرے کا حال بھی سنا تھا جس میں سرور صاحب نے صدارت فرمائی تھی اور ان کی طرف اشارہ کر کے نشور واحدی صاحب نے یہ مصرع پڑھا تھا ع

یہ باتیں راز کی ہیں قبلۂ عالم بھی پیتے ہیں

پہلی مرتبہ سرور صاحب سے میرے رابطہ کی صورت یہ ہوئی کہ ایم۔ اے پریویس (اردو) کے زبانی امتحان کے موقع پر بوجوہ میں نے یہ طے کیا کہ فائنل کے زبانی امتحان کے لیے جو بھی ممتحن آئے گا وہ میرے نام سے ضرور واقف ہوگا اس مقصد سے پروفیسر خواجہ احمد فاروقی کے شائع کردہ تذکرۂ سرور سے متعلق میں نے ایک مضمون لکھ کر مدیر ''ہماری زبان'' کو بھیجا۔ یہ محض حسن اتفاق تھا کہ فائنل کے ممتحن کی حیثیت سے سرور صاحب ہی تشریف لائے۔ میں نے کمرے میں داخل ہونے کے بعد جب اپنا نام بتایا تو سرور صاحب نے صدر شعبہ ڈاکٹر محمود الٰہی سے آہستہ سے پوچھا: ''کیا وہی تذکرۂ سرور والے؟'' اس وقت مجھے جو خوشی حاصل ہوئی اس کے بیان کی ضرورت نہیں۔ بعد میں محمود الٰہی صاحب نے ذکر کیا کہ سرور صاحب نے چلتے چلتے اسٹیشن تک تعریف کی اور وہ مجھے علی گڑھ بلانا چاہتے ہیں۔ میں نے بوجوہ اس ذکر کو لائق اعتنا نہیں سمجھا۔

کوئی دو برس بعد محمود الٰہی صاحب کا خط ملا کہ سرور صاحب آپ کو علی گڑھ بلائیں گے۔ آپ ان سے کہہ دیں کہ آپ فارسی جانتے ہیں۔ میں نے جواب میں لکھا کہ یہ بات تو آپ بھی جانتے ہیں کہ میں فارسی نہیں جانتا۔ کئی مہینوں کے بعد سرور صاحب کا خط ملا جس میں یہ ذکر تھا کہ وہ مجھے بلائیں گے۔ ایک برس تک میرا کام دیکھیں گے اور پھر کوئی بات سوچیں گے۔ اسی دوران انجمن ترقی اردو (ہند) میں اکاونٹنٹ کی جگہ خالی ہوئی۔ میں نے اس کے لیے درخواست دی۔ معتبر لوگوں سے سنا کہ سرور صاحب نے اسے پھاڑ کر پھینک دیا۔ کوئی ایک برس بعد سرور

*سابق پروفیسر، شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

www.taemeernews.com

صاحب کا خط ملا جس میں کہا گیا تھا کہ آپ علی گڑھ آ کر مجھ سے ملاقات کر لیں۔

میں علی گڑھ میں ڈاکٹر نذیر احمد صاحب کے یہاں ٹھہرتا تھا۔ اس بار بھی وہیں مقیم ہوا۔ اتفاق سے نذیر صاحب ان دنوں کشمیر گئے ہوئے تھے۔ جس وقت میں سرور صاحب کے دولت کدے پر پہنچا وہ اپنے مطالعے کے کمرے میں تھے۔ انہوں نے خود ہی دروازہ کھولا۔ میں نے دیکھا کہ ماہنامہ "قومی زبان" کراچی کا تازہ شمارہ زیر مطالعہ تھا۔ جو صفحہ کھلا ہوا تھا اس پر تدوین سے متعلق میرا مضمون چھپا تھا۔ کچھ واجبی سی گفتگو کے بعد سرور صاحب نے فرمایا کہ "آپ جائننگ رپورٹ لکھ دیں" اس پر میں بھونچکا رہ گیا۔ خود کو سنبھال کر عرض کیا کہ:

"نہ میری کوئی درخواست ہے، نہ آپ کی طرف سے تقرری کا کوئی حکم نامہ ہے پھر یہ جائننگ رپورٹ کیسی؟"

فرمایا کہ "جو کہا گیا ہے آپ وہ کریں۔ میں نے تعمیل کی۔ پھر فرمایا کہ اس کا کسی سے ذکر نہ کریں اور کل شعبہ میں آ جائیے"۔

دوسرے دن میں شعبہ میں پہنچا تو مجھے ایک کمرہ مل گیا۔ "علی گڑھ تاریخ ادب اردو" کی پہلی جلد کا ایک نسخہ عنایت کیا اور فرمایا کہ آپ کو اس کی تصحیح کرنی ہے۔ میں نے اپنے کمرے میں آ کر اسے الٹ پلٹ کر دیکھا اور پھر سرور صاحب کی خدمت میں پہنچ کر عرض کیا کہ: "میری نظر میں تو اس کا پہلا جملہ ہی تصحیح طلب ہے۔"

وہ تحریر خود سرور صاحب کی تھی۔ میں نے اپنی بات کی وضاحت کی۔ سرور صاحب نے غور سے سنا اور فرمایا کہ آپ جہاں چاہیں بے تکلف تصحیح کر دیں۔ اس جملے نے سرور صاحب کے احترام کو میرے دل میں راسخ کر دیا۔

دو تین دن بعد ریسرچ فیلو کی حیثیت سے تقرری کا مجھے باضابطہ حکم نامہ مل گیا۔ سرور صاحب نے "علی گڑھ تاریخ ادب اردو" کی پانچوں جلدوں کے تمام مضامین کے اصل مسودے مجھے دیئے۔ ایک دن میں نے قاضی عبدالودود صاحب کے ایک مضمون پر ایک دو حاشیے لکھ کر سرور صاحب کی خدمت میں پیش کیے۔ یہ پہلا اور آخری موقع تھا جب میں نے سرور صاحب کو فکر مند دیکھا۔ کہنے لگے کہ "یہ مضمون قاضی صاحب کا ہے۔" میں نے عرض کیا کہ:

"مضمون کسی کا بھی ہو، ایڈیٹر کو اگر ضرورت ہو تو، اختلاف کا حق حاصل ہے۔" سرور صاحب نے ان حاشیوں پر مکرر غور کیا اور پھر فرمایا: "ٹھیک ہے، آپ اپنا کام کریں۔"

چند روز بعد سرور صاحب کے حکم سے میں نے سادہ کاغذ پر لکھ کر لکچرر کے لیے درخواست دے دی۔ انٹرویو ہوا اور میں کل ستائیس دن ریسرچ فیلو رہ کر اٹھائیسویں روز عارضی لکچرر ہو گیا۔

دو تین مہینوں کے بعد سرور صاحب نے پوچھا کہ آپ نے جنرل سلیکشن کمیٹی کے لیے درخواست دی یا نہیں۔ عرض کیا کہ "نہیں"۔ پوچھا: کیوں؟ میں نے کہا کہ آپ نے ایک برس تک میرا کام دیکھنے کے لیے فرمایا تھا اور ابھی تو صرف دو تین ہی مہینے ہوئے ہیں۔ کہا کہ آج ہی آپ درخواست دے دیں۔

www.taemeernews.com

درخواست دی۔ انٹرویو ہوا۔ اس انٹرویو کا ایک یادگار واقعہ یہ ہے کہ (جگر والے) ڈاکٹر محمد اسلام صاحب بھی امیدوار تھے۔ وہ انٹرویو کے بعد باہر نکلے تو اپنی تصانیف کے بنڈل کو میز پر پٹک کر بولے "یہ سب ردّی ہیں"۔ مجھے اس جملے کی صداقت کا بار بار تجربہ ہوا۔

ایک بار سرور صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ مجھے دیکھ کر فرمایا: ''ہر شخص نے طرح طرح سے انٹرویو کا نتیجہ معلوم کرنے کی کوشش کی لیکن آپ نے ایک بار بھی نہیں پوچھا۔ کیوں؟ کیا آپ کو نفسِ مطمئنہ حاصل ہے؟'' عرض کیا ''میں نے آپ کے حکم سے درخواست دی تھی اس لیے کامیابی کی پوری توقع ہے۔ ناکامی کی وجہ صرف یہ ہوسکتی ہے کہ آپ کے سامنے کوئی مجبوری آگئی ہو۔ اگر خدانخواستہ ایسا ہوا ہے تو میرے پوچھنے سے آپ کو خفت ہوگی اور آپ کی خفت مجھے کسی حال میں گوارہ نہیں ہے۔ پھر یہ بھی کہ ابھی مجھے یہاں ایک سال نہیں ہوا ہے۔'' یہ سن کر فرمایا: ''ہم نے آپ کو موقع دے دیا۔ اب ہم یہ چاہتے ہیں کہ آپ ایمانداری اور محنت سے کام کرتے رہیں۔'' دوسرے دن مجھے تقرری کا حکم نامہ مل گیا۔ اللہ کا شکر ادا کیا۔

اس موقع پر میرے ساتھ پانچ اور لوگوں کا بھی تقرر ہوا تھا۔ ان تقرریوں پر شعبہ میں کچھ کچھ چہ می گوئیاں ہوئیں اس لیے سرور صاحب نے ہم سب کو شعبہ کے جلسوں میں ایک ایک مضمون پڑھنے کا حکم دیا۔ اس حکم کی تعمیل میں سب سے پہلے ''تدوین کے اصول و مدارج'' کے عنوان سے میں نے ایک مضمون پڑھا جو بحمد اللہ بہت پسند کیا گیا۔ یہ میرا پہلا اور آخری مضمون تھا جو شعبہ میں پڑھا گیا۔ میرے علاوہ تین اور دوستوں نے بھی اپنے مضمون پڑھے۔ دو ساتھی ایسے بھی تھے جو سرور صاحب کے حکم کی تعمیل نہ کرسکے۔

ایک دن میں ڈاکٹر خورشید الاسلام کے کمرے میں بیٹھا تھا میاں خاں نے آکر کہا کہ آپ کو سرور صاحب نے یاد کیا ہے۔ اس سے خورشید صاحب خاصے بدحظ نظر آئے۔ میں ان سے اجازت لے کر سرور صاحب کی خدمت میں پہنچا۔ پوچھا کیا کر رہے تھے۔ عرض کیا کہ ''خورشید صاحب میرے استاد ہیں۔ انہوں نے بلایا تھا۔'' فرمایا'' خورشید صاحب آپ کے استاد ہیں۔ ان کے احترام میں اگر کبھی کمی آئیگی تو مجھے شکایت ہوگی لیکن شعبہ میں آپ کی توجہ فرائضِ منصبی کی طرف ہونی چاہیے۔''

ایک دن پوچھا: '' آپ مسلمان ہیں؟''

میں حیران ہوا کہ یہ سوال کیوں کیا جا رہا ہے۔ اس پر دوسرا سوال کیا: '' آپ جانتے ہیں کہ مسلمان کا عمل کیا ہوتا ہے؟'' اس پر حیرانی زیادہ ہوئی۔ فرمایا ''مسلمان وہ ہے جو مانتا سب کی ہے لیکن عمل ایک کے حکم پر کرتا ہے۔'' دل نے کہا کہ ہمارا مذہب کتنا اچھا اور قابلِ عمل ہے۔ اگر اسی ایک بات پر عمل کیا جائے تو کتنے ہی فتنوں اور پریشانیوں سے آدمی محفوظ رہے گا۔

شعبہ کے مشاعرے کے سلسلے میں نشور واحدی صاحب تشریف لائے۔ وہ پرانے مہمان خانے میں مقیم تھے۔ میں وہیں ان سے ملنے گیا۔ ایک کمرے سے گلاسوں کے کھنکنے کی آوازیں آرہی تھیں دوسرے کمرے سے نشور صاحب نکلے۔ مجھے دیکھ کر بولے:

www.taemeernews.com

"تم یہاں کہاں آ گئے۔ اٹھو اٹھو۔ یہاں سے چلو تمہارا صدر شعبہ سن لے گا تو ناراض ہو جائیگا۔" اس قسم کی باتیں کہتے ہوئے وہ شعبہ میں آ گئے۔

ایک دن تمسخر کے انداز میں ڈاکٹر وحید اختر نے سرور صاحب سے کہا کہ "وہاں سارے کمیونسٹ جمع ہیں۔"

رمضان کا مہینہ تھا۔ سرور صاحب کے کوئی بے تکلف ہندو دوست تشریف لائے۔ کچھ دیر بعد بولے: "سرور! میں جب بھی آتا تھا تمہارے یہاں ایک پیالہ چائے ملتا تھا۔ آج کیا بات ہے کہ ابھی تک چائے نہیں آئی۔" سرور صاحب نے اپنے مخصوص انداز سے مسکراتے ہوئے فرمایا کہ: "رمضان کا مہینہ ہے۔" وہ صاحب اچک کر بولے: "تمہیں رمضان سے کیا مطلب؟" سرور صاحب نے کہا: "ٹھیک ہے، میں روزے نہیں رکھتا لیکن رمضان کا احترام تو مجھ پر بھی واجب ہے۔"

ایک دن میاں خاں آئے۔ فرمایا کہ صاحب نے یاد کیا ہے۔ میں پہنچا تو دیکھا کہ ڈین فیکلٹی تشریف رکھتے ہیں اور اس وقت انہیں کی خدمت میں میری طلبی ہوئی ہے۔ معاملہ یہ تھا کہ کسی طالب علم کی حاضریاں کم تھیں۔ ڈین صاحب چاہتے تھے کہ میں اس کی حاضریاں بنا دوں۔ میں نے سرور صاحب سے پوچھا! "کیا یہ آپ کا حکم ہے۔ انہوں نے کہا کہ نہیں۔ اس پر میں نے کہا کہ میں غلط حاضری نہیں بناتا۔ ڈین صاحب نے کہا کہ "بھئی وہ حج کے لیے گیا تھا"۔ میں نے عرض کیا کہ حج کے لیے دن مقرر ہیں پورا سال نہیں لگتا۔"

سرور صاحب وقت کے نہایت پابند تھے۔ باقاعدگی سے کلاس لیتے تھے اور مقررہ وقت تک شعبہ میں موجود رہ کر اپنے کاموں میں مصروف رہتے تھے۔ اکثر چھٹیوں میں بھی دفتر کھلواتے تھے۔ چھوٹے سے چھوٹے کام کو بھی خود دیکھتے تھے۔ ہر استاد کے بارے میں مفصل معلومات رکھتے تھے۔ اور خود اپنی معلومات کی روشنی میں عمل کرتے تھے۔

ایک استاد جن کا تقرر عارضی تھا، ان کے بارے میں سرور صاحب کی رائے منفی تھی۔ انہیں بھی حالات کا اندازہ ہو گیا تھا۔ میرے پاس آئے اپنی پریشان حالیوں کا بیان کیا۔ میں نے ان کی باتوں پر یقین کر کے سرور صاحب سے گفتگو کا وعدہ کر لیا۔ جب میں نے ان کا ذکر کیا تو سرور صاحب نے ان کے بارے میں چند ایسی باتیں بتائیں کہ میں حیران رہ گیا۔ سرور صاحب کا کہنا تھا کہ ایسا شخص معلمی کے پیشہ کے لائق نہیں ہے۔ میرے پاس سرور صاحب کی ایک بات کا بھی جواب نہیں تھا لیکن مجھے اپنے ساتھی کی پریشان حالی کا بھی خیال تھا۔ میں نے عرض کیا کہ: "سرور صاحب، آپ کی ایک ایک بات درست ہے مگر معاملہ یہ ہے کہ وہ نوجوان ہے اور اس عمر میں ہر قسم کی غلطیاں ہو جاتی ہیں۔ آپ اسے برطرف کر دیں گے تو اس کے بیوی بچے پریشان ہو جائیں گے۔ آپ ہمارے بزرگ ہیں، با اختیار ہیں۔ اسے معاف کر دیں اور اس کو مستقل کر دیں۔ امید ہے کہ وہ اپنی اصلاح کر لے گا اور بہتر استاد ثابت ہوگا۔ سرور صاحب نے مجھے غور سے دیکھا اور بولے "خیر آپ کہتے ہیں تو یہ بھی سہی۔" اور وہ

www.taemeernews.com

صاحب مستقل کر دیئے گئے۔

جب لیکچرر کی حیثیت سے میں مستقل ہو گیا تو ایک دن سرور صاحب نے فرمایا کہ ''اپنے کسی ایسے دوست کا نام بتایئے جس کا آپ کی جگہ ریسرچ فیلو کے طور پر تقرر کیا جا سکے۔'' میں نے عرض کیا کہ کوئی نہیں ہے۔ سرور صاحب کے اصرار پر میں نے ڈاکٹر حنیف نقوی کا نام لیا۔ سرور صاحب نے ان کا پتہ معلوم کیا اور اسی وقت ان کے نام خط تحریر کر دیا۔

ایک دن مناسب موقع پا کر میں نے عرض کیا: ''سرور صاحب، کیا وجہ ہے کہ اکثر لوگ آپ کی برائی کرتے ہیں؟'' سرور صاحب نے مسکرا کر کہا: ''بھئی یہ تو بالکل صاف بات ہے۔ فرض کرو ایک جگہ مشتہر ہوئی۔ اس کے لیے دس درخواستیں آئیں۔ نو کے واسطے سفارشیں بھی آئیں۔ ہم نے سفارش نہیں مانی اور جو لائق تھا اس کا تقرر کیا۔ نتیجہ کے طور پر نو درخواست دہندہ اور کم سے کم نو ان کے سفارشی ناراض ہوئے اور جس کا تقرر ہوا، وہ چونکہ لائق تھا اس پر ہمارا کوئی احسان نہ ہوا۔

سرور صاحب امتحان کے نمبروں کو امانت سمجھتے تھے اس لیے بے جا زائد نمبر نہیں دیتے تھے۔ میں نے سنا تھا کہ زبانی امتحان میں جسے ساٹھ نمبر دے دیتے تھے اسے ہمیشہ یاد رکھتے تھے۔ ایک دفعہ ایک صاحب تشریف لائے جو علی گڑھ میں ریسرچ کرنا چاہتے تھے، انہیں کوئی وسیلہ نہیں مل رہا تھا۔ اتفاق سے وہ میرے پاس آ گئے۔ میں نے پوچھا کہ زبانی امتحان کے لیے آپ کا ممتحن کون تھا؟ بولے: سرور صاحب، پھر میں نے پوچھا کہ کتنے نمبر ملے تھے؟ جواب ملا: ساٹھ۔ میں نے کہا آپ میرے ساتھ آیئے۔ ہم دونوں سرور صاحب کے پاس پہنچے۔ اس وقت حسب معمول وہ کچھ لکھ رہے تھے۔ عبارت پوری کرنے کے بعد سر اٹھایا۔ ہم دونوں کو دیکھا۔ میں نے ان کا تعارف کرایا اور ان کا مقصد عرض کیا۔ سرور صاحب نے ان سے پوچھا کہ وادا میں کتنے نمبر ملے تھے؟ انہوں نے کہا: ساٹھ۔ اس کے بعد سرور صاحب نے ان کی موجودہ مصروفیتوں اور دلچسپیوں کا حال معلوم کیا اور پھر کہا کہ ''ٹھیک ہے۔'' وہ باہر چلے گئے تو مجھ سے فرمایا ''ان سے کہیے اطمینان سے کام کریں۔ ان کا داخلہ بھی ہو جائیگا اور کسی وظیفہ کے لیے بھی کوشش کی جائیگی۔''

ایک دن قصیدوں کی بات نکلی میں نے عرض کیا کہ بعض شعر غلط چھپے ہیں اور ہم ان کو اسی طرح پڑھاتے ہیں۔ مثلاً ذوق کے قصیدے کا ایک شعر اس طرح چھپا ہے:

رخسارۂ گلچیں کا ہے سرخی سے یہ عالم
جوں وقتِ غضب چہرۂ ترکانِ خطائی

پہلا مصرع صحیح اس طرح ہے: ع

رخسارِ گل آچیں کا ہے سرخی سے یہ عالم

سرور صاحب نے سنا اور بے ساختہ فرمایا: ''صحیح ہے۔ ہمارے بدایوں میں بھی گل آچیں کی مسجد ہے۔''

ایک دن سرور صاحب امتحان کے پرچوں

www.taemeernews.com

پر نظر ثانی (ماڈریشن) کر رہے تھے۔ اتفاق سے میں پہنچ گیا۔ جب میرا پرچہ دیکھا تو اس میں لفظ ''سایل'' آیا۔ سرور صاحب نے فرمایا: ''ہمزہ نہیں بنایا؟'' وہ بتانا چاہتے تھے کہ میں نے عرض کیا: ''میں ہمزہ نہیں بناتا'' سرور صاحب نے فوراً قلم روک لیا۔ خیال کرنے کی بات ہے کہ یہ وہ آل احمد سرور تھے جنہوں نے ایک دن مجھ سے فرمایا تھا کہ ''جتنی آپ کی عمر ہے اس سے زیادہ میرا ٹیچنگ اکسپریئنس ہے۔'' سرور صاحب واقعی غیر معمولی شخص تھے۔

لائے کہاں سے دنیا مثل و نظیر اس کا

☆☆☆

www.taemeernews.com

محمد یٰسین*

پروفیسر آل احمد سرورؔ: کچھ یادیں اور تاثرات

۹ فروری ۲۰۰۲ء کو دلی میں پروفیسر سرورؔ کے انتقال سے اردو دنیا ایک صاحب فکر عالم، اچھے استاد، صاحب طرز شاعر و نقاد اور اردو تحریک کے قائد سے محروم ہوگئی۔ علی گڑھ تحریک اور سرسید کے تعلیمی مہمات سے متاثر اور مولانا آزاد اور پنڈت نہرو کے سیاسی افکار و نظریات کے حامی سرورؔ صاحب اپنی ذات سے ایک انجمن تھے۔ ۱۹۵۶ء میں انہوں نے رشید احمد صدیقی کے بعد شعبۂ اردو کی صدارت سنبھالی۔ یہی وہ زمانہ ہے جب وائس چانسلر بشیر حسین زیدی کے زیر قیادت یونیورسٹی کی تاریخ میں علم و ادب کے فروغ، شعبہ جاتی توسیعات اور فاضل ترین اساتذہ کے تقرر سے تعلیم و تعلم، تحقیق و تدقیق اور تصنیف و تالیف کے ایک سنہرے دور کا آغاز ہوا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین نے انگریزی میں پروفیسر بوس، شعبۂ معاشیات میں ڈی۔ پی۔ مکھرجی، فزکس میں پروفیسر گل کو لاکر تقسیم ہند کے جلو میں بیشتر اساتذہ کے پاکستان ہجرت کرنے کی تلافی کردی تھی۔ زیدی صاحب نے اپنی ہمہ جہت مساعی سے یونیورسٹی کو ترقی کی نئی منزلوں تک پہونچا دیا۔ انہیں کے دور میں سید حسین ریسرچ پروفیسر سرور صاحب صدر شعبہ مقرر ہوئے۔ موصوف علی گڑھ کے لیے کوئی اجنبی نہیں تھے۔ انہوں نے مسلم یونیورسٹی سے پہلے انگریزی ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کی اور کچھ عرصہ تک اسی شعبہ سے وابستہ رہے۔ بعد ازاں اردو میں سند حاصل کرکے وہ شعبہ کے محبوب و مقبول اساتذہ کی محفل میں شریک ہوگئے۔ رام پور اور لکھنؤ یونیورسٹی میں ملازمت کے دوران انہوں نے اپنی تنقیدی تصانیف کی بدولت خاصی شہرت حاصل کرلی۔ راقم الحروف کو سرور صاحب سے غائبانہ تعارف ''تنقیدی اشارے'' اور ''نئے پرانے چراغ'' کے ذریعہ ہوا۔ سنٹ اینڈریوز کالج گورکھ پور میں استاد محترم مجنوں گورکھپوری اپنے طالب علموں کو معروف نقادوں کے ساتھ سرور صاحب کے مضامین سے استفادہ کی تلقین کرتے تھے۔ اب سے تقریباً پچاس سال پہلے موصوف کے تنقیدی مضامین میرے جیسے مبتدی کے لیے مشعل راہ ثابت ہوئے۔

سرور صاحب یونیورسٹی میں درس و تدریس

---

* سابق پروفیسر، شعبۂ انگریزی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

www.taemeernews.com

کی ذمہ داریوں کے ساتھ اعلیٰ انتظامیہ سے بھی وابستہ رہے لیکن اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود انہوں نے انجمن ترقی اردو (ہند) کی سکریٹری شپ کے دوران سہ ماہی رسالہ ''اردو ادب'' اور ہفتہ وار جریدہ ''ہماری زبان'' کی ادارت کی اہم ذمہ داری بدرجۂ احسن انجام دی۔ راقم الحروف نے اپنی ادبی زندگی کی ابتدا 'ہماری زبان' میں ''شعر و شاعری: مغربی تنقید کے آئینہ میں'' کے زیر عنوان سلسلۂ مضامین سے کی۔ ان مضامین کے ذریعہ افلاطون، ارسطو، فلپ سڈنی، ڈاکٹر جانسن، ورڈ سورتھ، آرنلڈ اور ایلیٹ وغیرہ کے تنقیدی نظریات کو اردو داں حلقہ سے متعارف کرانے کی کوشش کی گئی تھی۔ سرور صاحب نے نہ صرف میری ہمت افزائی کی بلکہ انجمن کے اشاعتی پروگرام کے تحت ایک اہم علمی کام کے لیے بھی فرمائش کردی۔ ''انگریزی ادب کی تاریخ'' لکھنے کا کام کچھ آسان نہیں تھا۔ مجھے زبان و بیان پر کوئی خاص قدرت نہیں حاصل تھی۔ شعبۂ انگریزی میں عارضی ملازمت اور ریسرچ کی مشغولیات کے پیش نظر میں کچھ دنوں پس و پیش میں رہا لیکن بالآخر اپنی آمادگی ظاہر کی اور سرور صاحب نے اس مہم میں ہر طرح میری مدد کی۔ مجنوں صاحب نے ازراہ کرم مسودہ پر نظر ثانی کر کے کتاب کی اہمیت بڑھادی۔ ۱۹۶۳ء میں کامن ویلتھ اسکالر شپ پر انگلستان جانے سے پہلے مسودہ سرور صاحب کے حوالے کردیا تھا لیکن انجمن ترقی اردو (ہند) نے اسے کتابی شکل ۱۹۷۰ء میں دی۔

''ہماری زبان'' میں سرور صاحب کے اداریے دلچسپ، معلومات افزا اور اکثر اوقات فکر انگیز ہوتے تھے۔ وہ یوں تو اعتدال پسند تھے لیکن کبھی کبھی متنازع موضوعات پر مضامین شائع کرنے میں پس و پیش نہیں کرتے تھے۔ ان کے دور ادارت میں ادبی اور اردو کے توسط سے نیم سیاسی مضامین برابر شائع ہوتے رہے۔ یوپی میں اردو کا حال زار، مرکزی سرکار کی اردو پالیسی، سہ لسانی فارمولہ، گجرال کمیشن رپورٹ پر تبصرے جمہوریت میں آئینی حقوق کی روشنی میں کیے جاتے تھے۔ ''ہماری زبان'' میں کبھی رباعی کے فن پر بحث چھڑتی تو کبھی طنزیات و مضحکات اور جدیدیت کے مختلف پہلوؤں کو موضوع سخن بنایا جاتا۔ سرور صاحب کے قلمی معاونین میں نسیم قریشی، خلیل الرحمن اعظمی، وارث کرمانی اور شہریار کے علاوہ کئی دیگر نوجوان اساتذہ شامل تھے۔ سہ ماہی ''اردو ادب'' کے مضامین سنجیدہ، وقیع اور محققانہ ہوتے تھے۔ سرور صاحب کی تحریک پر راقم سطور نے امریکی ادب پر کئی تعارفی مضامین لکھے جن کی کچھ حلقوں میں پذیرائی بھی ہوئی۔ ۶۴-۱۹۶۳ء میں انگلستان میں قیام کے دوران مجھے انجمن کے دونوں جریدے باقاعدہ سمندری ڈاک سے ملتے رہے۔ کبھی کبھار ہمارے کچھ پاکستانی دوست یونیورسٹی ڈاک سے انہیں پہلے ہی اڑا لیتے مگر پڑھ کر واپس کرتے ہوئے سوال کرتے ''کیا ہندوستان میں اردو ادب بھی زندہ ہے''۔ چار دہائیوں کے بعد آج بھی یہ سوال ہمارے سامنے ہے۔

سرور صاحب کی انتظامی صلاحیتوں کو دیکھ کر حیرت ہوتی تھی کہ وہ شعبہ اردو کی اہم ذمہ داریوں

www.taemeernews.com

کے علاوہ سمیناروں، کانفرنسوں کے انعقاد سے لے کر انجمن ترقی اردو (ہند) اور ساہتیہ اکادمی میں کس طرح اردو دانشوروں کی نمائندگی کرتے تھے۔ نئی نسل کی رہنمائی اور نوجوان ادیبوں کی تربیت ان کی ما بہ الامتیاز خصوصیت تھی۔ 'ہماری زبان' میں خلیل الرحمٰن اعظمی ایک عرصہ تک ''لکیریں'' کالم لکھتے تھے۔ کبھی کبھار ان کالموں میں باہمی چشمک کی جھلکیاں بھی نظر آتیں۔ کہتے ہیں کہ برہمن، شاعر اور نقاد ظاہری طور پر ایک دوسرے کے متعلق کچھ بھی کہیں لیکن دل ہی دل میں حریفانہ جذبہ بھی رکھتے ہیں۔ وامق جونپوری اور خلیل الرحمٰن اعظمی میں باہمی چشمک رہتی تھی۔ اپنے مضمون ''منافق کونپوری'' میں موخرالذکر نے اپنے حریف کو دلچسپ انداز میں نشانہ بنایا تھا۔ سرور صاحب کی صدارت کے دوران اردوئے معلیٰ کے تحت شعبہ کے اساتذہ، دوسری یونیورسٹیوں سے آئے ہوئے مہمان اور دانشور پابندی سے اپنے مقالے پیش کرتے رہے۔ اس زمانہ میں یونیورسٹی کیمپس میں علمی و ادبی ماحول تھا۔ انگریزی اور اردو کی لٹریری سوسائٹیوں میں علم دوست اور ادب نواز حضرات کا تعاون اس دور کی خصوصیت تھی۔ سرور صاحب بیشتر ادبی پروگراموں کے روح رواں تھے۔ نئی نسل کے ادیبوں کو ان سے بہت کچھ سیکھنے کی توفیق ہوئی۔

انجمن ترقی اردو (ہند) کے سلطان جہاں منزل دفتر میں سرور صاحب نے کچھ عرصہ تک ماہانہ ادبی نشست کا بھی اہتمام کیا تھا۔ ان جلسوں میں موصوف کے علاوہ ڈاکٹر عابد حسین، مجنوں گورکھپوری، خلیل الرحمٰن اعظمی اور دیگر حضرات پابندی سے شریک ہوتے۔ شعبہ اردو کے استاد مسعود علی ذوقی ان جلسوں کے کنوینر ہوا کرتے تھے۔ یہاں نوجوان ادیب اور یونیورسٹی کے اساتذہ اپنے مقالے اہتمام سے پڑھتے تھے۔

انجمن کی ایک مخصوص نشست کی یاد آج بھی حافظہ میں موجود ہے۔ ایک نوجوان استاد نے اپنی تحقیقی مہمات کے زعم میں اپنا پُر مغز مقالہ پڑھنا شروع کیا۔ فائل کے اوراق کھلنے پر اندازہ ہوا کہ یہ ادب پارہ تقریباً پچاس فل اسکیپ صفحات پر محیط تھا اور اوراق منتشر میں جا بجا بے ربطی اور تکرار کی کیفیت نمایاں تھی۔ اس علمی یلغار کی زد میں سامعین پہلو بدلتے رہے۔ ذوقی صاحب نے حاضرین کو گھیرے رکھنے کے لیے چائے کے کئی دور چلائے۔ پھر اس کے نتیجے میں کچھ بزرگوں کو ملحق باتھ روم کے پھیرے بھی لگانے پڑے۔ مضمون نگار کو اپنی عالمانہ خودسری کے لیے کچھ کھری کھوٹی باتیں بھی سننی پڑیں۔ ایک بزرگ نے سرور صاحب سے کہا کہ بھئی ایسے مدر مضامین پر نظر ثانی سے آپ کو کس نے روک رکھا ہے؟ محفل میں ہمارے جیسے کچھ ایسے سامع بھی تھے جو 'مدر' کے معنی سے ناواقف تھے۔ موصوف نے تشریح کی ــــــ ''پیشاب آور''۔ لیجیے صاحب آپ ''خواب آور'' نظموں اور غزلوں سے تو واقف ہی ہوں گے، نثری کارناموں میں پیشاب آور مضامین کا بھی اضافہ کرلیجیے۔ ہمارے اکثر بین الاقوامی سمیناروں میں انہیں مقالات کی بدولت کم معروف شرکا کے مضامین ''پڑھ لیے گئے'' (TAKEN AS READ) کے کالم میں آجاتے ہیں۔

www.taemeernews.com

سرور صاحب نے "علی گڑھ تاریخ ادب اردو" اسکیم کے لیے ملک کے معروف ادیب و نقاد مجنوں گورکھپوری (سابق صدر شعبہ اردو، گورکھپور یونیورسٹی) کو علی گڑھ آنے کی دعوت دی۔ وائس چانسلر زیدی صاحب نے بھی ڈپٹی ڈائرکٹر کے عہدہ پر ان کے تقرر پر خوشی اور اطمینان کا اظہار کیا۔ راقم السطور کو گورکھپور میں طالب علمی کے زمانہ ہی سے مجنوں صاحب کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تھا لہذا کبھی کبھی ذہن میں یہ خدشہ بھی رہا کہ پتہ نہیں علی گڑھ کا ماحول انہیں راس آئے یا نہیں۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ موصوف ۱۹۳۶ء میں یہاں استاد رہ چکے تھے۔ بہر حال تاریخ نویسی کا کام بڑے طمطراق سے شروع ہوا جس میں ملک کے فاضل ترین ادیبوں، مورخوں اور نقادوں کو مختلف عنوانات کے تحت مضامین لکھنے کے لیے مدعو کیا گیا۔ مضامین بر وقت نہ آنے سے تشویش پیدا ہونے لگی۔ اس زمانہ میں سرور صاحب پر سب سے بڑا الزام یہ عائد کیا گیا کہ انہوں نے علی گڑھ سے باہر ایسے حضرات سے تعاون کی امید باندھی جو خواجہ خضر کی عمر کو پہنچ چکے تھے یا جنہوں نے سرکاری عہدوں پر فائز رہتے ہوئے اس کام کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پہلی جلد کے لیے مقامی معاونین کی تلاش شروع ہوئی۔ بدقسمتی سے تقسیم کار کے سلسلہ میں نظریاتی اختلافات بھی پیدا ہو گئے۔ خدا خدا کر کے جب پہلی جلد شائع ہوئی تو حسب روایت علی گڑھ لعن طعن کا سلسلہ دراز ہوا۔ سرسید کی اس علمی بستی میں مسلکی اور نظریاتی اختلافات کوئی نئی چیز نہیں لیکن "تاریخ ادب اردو" کے سلسلہ میں شدت پسندی نے ہمیشہ کے لیے اجتماعی کام کرنے والوں کے حوصلے پست کر دیے۔

مجنوں صاحب تاریخ ادب اسکیم سے چند سال وابستہ رہے۔ بعد ازاں ۱۹۶۷ء تک شعبہ اردو میں بحیثیت ریڈر خدمات انجام دیتے رہے۔ سبکدوشی کی عمر تک پہونچنے کے بعد بھی وائس چانسلر زیدی صاحب، طیب جی اور نواب علی یاور جنگ نے ان کی ملازمت میں توسیع بلکہ بقول شخصے ان کی ناز برداری کی۔ اس کے باوجود انہیں اس بات کا قلق رہا کہ وہ جس مشن پر علی گڑھ آئے تھے وہ پورا نہ ہو سکا۔ اس ادبی سانحہ کی بدولت مجنوں صاحب اور پروفیسر سرور کے تعلقات بھی ایک حد تک کشیدہ ہو گئے۔ پاکستان ہجرت کر جانے کے بعد موصوف نے "ارمغان مجنوں" میں علی گڑھ کی ادبی و علمی بساط پر شطرنج کے کھیل کی دلچسپ منظر کشی کی ہے۔

سرور صاحب ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ تنقیدی بصیرت کے ساتھ قدرت نے انہیں شعری صلاحیتوں سے بھی نوازا تھا۔ علی گڑھ میں شعبۂ اردو کی صدارت کے دوران وہ سمیناروں اور کانفرنسوں کو منعقد کرنے کے علاوہ یوم آزادی اور یوم جمہوریہ کے موقع پر خصوصی مشاعروں کا اہتمام کرتے اور خود بھی اپنا کلام پیش کرتے۔ اس دور میں معین احسن جذبی، مسعود حسین خاں، خورشید الاسلام اور خلیل الرحمن اعظمی وغیرہ نہ صرف اچھے استاد بلکہ بالغ نظر نقاد اور حساس شاعر کی حیثیت سے پہچانے جاتے تھے۔ ان حضرات کی شاعری پر محاکمہ کا یہ موقع نہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ بیسویں صدی کی ساتویں دہائی تک ان کی بدولت یونیورسٹی میں شعر و نغمہ کی صالح روایت قائم ہو گئی جو

www.taemeernews.com

ایک حد تک آج بھی برقرار ہے۔ مبالغہ نہ ہوگا اگر کہا جائے کہ سرور صاحب نے اپنی مختلف النوع ادبی خدمات سے نہ صرف اہل اردو کو نئی تنقیدی سمتوں سے آگاہ کیا بلکہ جدید مغربی میلانات و رجحانات سے بھی استفادہ کی تلقین کی۔

سرور صاحب کا حلقۂ احباب کافی وسیع تھا۔ ان کے دور میں ادبی مذاق رکھنے والے چھوٹے بڑے شعبۂ اردو کے دعوت ناموں کے منتظر رہتے۔ موصوف نے اپنے عہد اقتدار میں ادبی رابطہ کو بین شعبہ جاتی تہذیبی سطح تک پہونچا دیا۔ شعبہ کی ادبی محفلوں میں انگریزی، فارسی، عربی اور ہندی کے استادوں کے علاوہ میڈیکل کالج کے ڈاکٹر تسیم انصاری، فزکس ڈپارٹمنٹ کے ڈاکٹر سعید الظفر چغتائی اور شعبۂ معاشیات کے ڈاکٹر اولاد احمد صدیقی بھی نظر آتے۔ پروفیسر سرور کی مرنجاں مرنج شخصیت ان کی نرم مزاجی اور ''سخن دلنواز'' سے ممیز تھی۔ وہ اپنے مرقع میں ہر قسم کی تصویروں کو شامل کرنے کے قائل تھے اور اپنے ادبی اور سیاسی نظریات کی وضاحت ''جلوۂ صد رنگ'' کی روشنی میں کرتے تھے۔

ہے رنگ لالہ و گل و نسریں جدا جدا
ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیے

زندگی اور ادب میں یہ صالح نظریہ ہے۔ خدا کی بنائی کائنات میں ہی نہیں ادبی دنیا میں بھی سب کو حسب مرتبہ زندہ رہنے کا حق ہے۔ مشکل تب پیش آتی ہے جب جدت پسندوں اور قدامت پرستوں کے درمیان اختلاف سے مزاج المومنین کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ سرور صاحب زندگی اور ادب میں انسانی اقدار اور جدید افکار کے حامی تھے اور اثباتیت و رجائیت کی بنیاد پر انسانیت کے لیے بہتر مستقبل کی بشارت دیتے۔ اس کے ساتھ وہ اس حقیقت سے بھی آشنا تھے کہ بقول

ہر سہانی آرزو اب تک ہے دیوانے کی بات

مجنوں گورکھپوری جب ۱۹۵۷ء میں علی گڑھ تشریف لائے تو ان کی پہلی قیام گاہ اولڈ بوائز لاج کا ایک کمرہ تھا جہاں وہ شام کے وقت یونیورسٹی کے بزرگ و نوجوان اساتذہ اور دیگر اصحاب سے ملاقات کرتے۔ سرور صاحب بھی اکثر بدر باغ میں اپنے مکان سے ٹہلتے ہوئے آجاتے تھے۔ خلیل الرحمن اعظمی، راہی معصوم رضا، شہریار اور ہمارے جیسے لوگ بھی کبھی کبھار شریک محفل ہوتے۔ فراق صاحب جب کبھی دلی جاتے ہوئے مجنوں صاحب سے ملاقات کی خاطر علی گڑھ وارد ہوتے تو یہ لطف دو آتشہ ہو جاتا۔ دونوں گورکھپوری دوستوں کے درمیان معمولی بات چیت بھی اکثر اوقات سیاسی و نظریاتی مباحث میں بدل جاتی۔ اس دوران سرور صاحب اسم با مسمّیٰ عدل و توازن کا دامن تھامے رہتے اور اپنی خوش بیانی سے رنگ محفل بدل دیتے۔ ان کی یہی خوبی تھی کہ میں بدر باغ سے کوٹھی نمبر ایک تک ان کے قیام کے دوران اکثر شام کو ملاقات کے لیے حاضری دیتا رہا۔ شعبۂ اردو سے موصوف کے سبکدوش ہو جانے کے بعد ایک دن میں انجمن ترقی اردو (ہند) کے دفتر پہونچا۔ حسب معمول میری خیریت معلوم کی اور اپنی دوسری فرمائش ''مغربی کلاسیکی تنقید'' (مطبوعہ ۱۹۷۵ء) کے متعلق دریافت کیا۔ دوران

www.taemeernews.com

گفتگو میں نے عرض کیا سرور صاحب ہم لوگوں کو امید تھی کہ آپ کی عظیم خدمات کے صلہ میں چند برسوں کے لیے آپ کی ملازمت میں توسیع ہوگی۔ فرمایا...... ''وحدہ لاشریک (اشارہ پروفیسر علیم، وائس چانسلر کی طرف تھا) کی یہی مرضی تھی''۔ شملہ اور سری نگر سے جب وہ مستقل طور پر علی گڑھ واپس آگئے تو میرا ان کے یہاں آنا جانا کم ہوگیا لیکن ادبی محفلوں، سیمناروں اور مشاعروں میں دعا سلام کے مواقع میسر آتے۔ ۲۴ر فروری ۲۰۰۱ء کو آل احمد سرور دو روزہ قومی سیمنار کے موقع پر ان سے آخری مصافحہ کی سعادت نصیب ہوئی تھی۔

سرور صاحب کی شخصیت اور کردار پر ان کے طلباء اور رفقائے کار کے علاوہ دیگر حضرات نے بھی بخوبی روشنی ڈالی ہے۔ ۲۴-۲۵ فروری ۲۰۰۱ء کو مسلم یونیورسٹی میں شعبہ اردو کے ڈی۔ ایس۔ اے پروگرام کے تحت دو روزہ قومی سیمنار میں بھی ان کی شخصی، علمی، انتظامی اور قائدانہ صلاحیتوں کو اجاگر کیا گیا۔ ''ارمغان سرور'' (سیمنار کے مضامین کا مجموعہ) میں شرکائے سیمنار نے ان کی ہمہ جہت شخصیت کو بدرجہ احسن نمایاں کیا ہے۔ عرض کر چکا ہوں کہ میں گذشتہ صدی کی پانچویں دہائی سے نئے ہزارے (MILLENIUM) کے ابتدا تک سرور صاحب کا مداح ومعتقد رہا۔ ۱۹۶۱ء کی بات ہے۔ تقریباً پانچ سال عارضی ملازمت کی بھٹی میں تپانے کے بعد جب مجھے شعبہ انگریزی میں مستقل لکچر شپ ملی تو حسب روایت اپنے بزرگوں، محسنوں، استادوں اور شعبہ کے رفقائے کار کو ظہرانہ کی دعوت دی۔ معزز مہمانوں میں وائس چانسلر بشیر حسین زیدی، پرو وائس چانسلر یوسف حسین خاں، پروفیسر سرور صاحب اور مجنوں گورکھپوری تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب یونیورسٹی میں نظریاتی اختلافات کافی شدت اختیار کر چکے تھے اور سرور صاحب کے تعلق سے سید حسین ریسرچ چیئر کے کارناموں اور ''علی گڑھ تاریخ ادب اردو'' کے سلسلہ میں چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں۔ کھانے کے بعد کافی کا دور چلنے کو تھا کہ ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے اپنے مخصوص انداز میں سرور صاحب کو نشانہ بنایا مگر موصوف نے نہایت متانت اور معروضیت کے ساتھ تمام اعتراضات کا جواب دیا۔ مجنوں صاحب خاموش رہے لیکن زیدی صاحب نے معاملہ رفع دفع کر دیا۔

سرور صاحب کی علمی اور تدریسی خدمات کے علاوہ ان کی صحافتی خدمات کا بھی اعتراف ضروری ہے۔ ''علی گڑھ میگزین'' اور رسالہ ''سہیل'' کی ادارت کے بعد انہوں نے انجمن ترقی اردو (ہند) کے معروف سہ ماہی رسالہ ''اردو ادب'' اور ہفتہ وار ''ہماری زبان'' کی ادارت کے فرائض تقریباً چوتھائی صدی تک بحسن وخوبی ادا کیے۔ ان کی حالیہ تصانیف ''اردو تحریک'' اور ''افکار کے دیے'' ہماری زبان کے اداریوں پر مشتمل ہیں۔ سرور صاحب نے انجمن کے رسالہ اور اخبار کے لیے راقم الحروف کو لکھنے کی تلقین کی اور میرے مضامین کی ظاہری خامیوں کے باوجود ان کی اشاعت میں پس وپیش نہیں کی۔ موصوف نے یونیورسٹی مجلّہ ''فکر ونظر'' کے اڈیٹر کی حیثیت سے بھی شخصیت کی چھاپ چھوڑی۔ ادارہ فکر ونظر نے ''ناموران علی گڑھ'' کے سلسلہ کی

www.taemeernews.com

تین جلدیں شائع کی ہیں جن میں زندگی کے ہر شعبہ کے اکابرین (جن کا کسی نہ کسی طور پر علی گڑھ سے تعلق رہا) کے کارناموں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ رسالہ کی موجودہ ایڈیٹر پروفیسر آزرمی دخت صفوی قابل مبارکباد ہیں کہ انہوں نے علی گڑھ کے ایک نامور فرزند پر خصوصی نمبر نکالنے کا منصوبہ بنایا ہے۔ ان کی فرمائش پر مجھے بھی سرورؔ صاحب سے متعلق چند یادوں اور کچھ تاثرات پیش کرنے کی توفیق ہوئی۔

علی گڑھ میں تقریباً نصف صدی کے قیام کے دوران راقم الحروف کو اکثر دانشوروں، ادیبوں، شاعروں اور نقادوں سے ملنے اور ان کی صحبت سے فیض اٹھانے کے مواقع نصیب ہوئے۔ مجھے یہ کہنے میں عار نہیں کہ اپنی کچھ بشری یا منصبی کمزوریوں کے باوجود سرورؔ صاحب میرے محترم بزرگ اور مربی رہے۔ یونیورسٹی میں ان کے مداحوں اور ناقدوں کی کمی نہیں رہی لیکن مجموعی طور پر موصوف کے نیازمندوں کی تعداد ان کے ناقدوں سے زیادہ ہی رہی ہے۔ میرے بزرگ دوست پروفیسر ریاض الرحمٰن شیروانی نے اپنے مضمون ''پروفیسر آل احمد سرورؔ: شخصیت اور کردار'' (تہذیب الاخلاق، اپریل ۲۰۰۲ء) میں سرورؔ صاحب کے متعلق ایک خاص زاویہ سے اظہار خیال کیا ہے:

''پروفیسر آل احمد سرورؔ مرکز اقتدار سے قریب رہنا پسند کرتے تھے۔ ہمارے صوفیائے کرام میں دونوں طرح کے بزرگ گذرے ہیں۔ وہ جو کسی بادشاہ یا فرماں روا سے صرف اتنا چاہتے تھے کہ ان کی دھوپ نہ روکے اور وہ جو دربار سے وابستہ رہ کر اصلاح حال کی کوشش کرتے تھے۔ سرورؔ صاحب دوسرے طبقہ کے صوفیائے کرام کے ہم خیال اور پیرو معلوم ہوتے تھے۔ یہ دراصل نیت کا معاملہ ہے اور اگر نیت بخیر ہو تو کمزوریاں خوبی میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔''

☆☆☆

www.taemeernews.com

سلطان احمد*

پروفیسر آل احمد سرورؔ اور علی گڑھ

پہلے مجروحؔ سلطان پوری پھر علی سردار جعفری کے سانحۂ ارتحال سے اردو دنیا میں غم و ماتم کا جو طوفان بپا ہوا تھا وہ ابھی تھما بھی نہ تھا کہ ایوان اردو کا ایک ستون اور گرا۔ استاذ الاساتذہ، پروفیسر ایمریٹس، پدم بھوشن پروفیسر آل احمد سرورؔ نے طویل علالت کے بعد ۹/ فروری ۲۰۰۲ء کی شب اپنی جان حزیں جان آفریں کے سپرد کر دی۔ اِنَّا لِلّٰہ وَاِنَّا اِلَیہ رَاجِعُون

پروفیسر آل احمد سرورؔ ایک ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے۔ وہ ادیب بھی تھے اور صحافی بھی، شاعر بھی تھے اور نقاد بھی، نکتہ سنج بھی تھے اور نکتہ شناس بھی، مفکر بھی تھے اور دانشور بھی، مبصر بھی تھے اور مدبّر بھی، ان سب کے علاوہ وہ ایک لائق احترام استاد، بہترین منتظم اور ایک اچھے انسان تھے۔ غرض ان کی شخصیت اور خدمات کا دائرہ مختلف جہات پر محیط ہے۔ وہ اپنی ذات میں ایک انجمن تھے بلکہ یہ کہا جائے کہ ان کی شخصیت کئی انجمنوں کا مجموعہ تھی تو بے جا نہ ہوگا۔ ان تمام اوصاف حمیدہ اور خدمات جلیلہ کا کسی ایک مضمون میں احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا سہولت کی خاطر میں نے سرورؔ صاحب کی زندگی کے صرف ایک پہلو کو اپنے مقالے کا موضوع بنایا ہے۔

سرورؔ صاحب، سرسید تحریک کے بے لوث مبلغ اور علی گڑھ کے سچے عاشق تھے۔ ایک ایسے عاشق جن کے نام کو پہلے علی گڑھ نے اردو دنیا سے متعارف کرایا، پھر یہ ہوا کہ علی گڑھ اپنے اس چاہنے والے کے نام سے جانا جانے لگا۔ سرور صاحب نے اس اٹوٹ رشتے کو تا حیات حرز جاں بنائے رکھا۔ اور یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ علی گڑھ اپنے اس دیوانے کو تا دیر بھلا نہ سکے گا۔ وَاللہ اعلم بِالصّواب

انقلاب ۱۸۵۷ء کے ساتھ ہی حکومت مغلیہ کا آفتاب ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا اور ہندوستانی مسلمان جان و مال، تجارت و معیشت، تہذیب و معاشرت اور تعلیمی اعتبار سے تباہ حال ہو گئے۔ سرسید نے اس غیر یقینی صورت حال سے نبرد آزما ہونے کے لیے مسلمانوں کو فاتح قوم سے مفاہمت، عصری تعلیم کے حصول اور جہدِ مسلسل کا درس دیا۔ لیکن یہ واقعہ

* شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

www.taemeernews.com

ہے کہ اس حیات افروز پیغام کی پذیرائی کم، مخالفت زیادہ ہوئی۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ سر سید کا عزم واستقلال متزلزل نہ ہوا اور وہ اپنے مشن کی تبلیغ و اشاعت میں جان وتن سے لگے رہے۔ جس کا حسین پہلو یہ سامنے آیا کہ ان کے مخالفین بھی ان کے ہم خیال اور ہم نوا ہو گئے۔ اکبر الہ آبادی جو سر سید کے سخت مخالف تھے، قوم کے تئیں سر سید کی تڑپ اور خلوص نے انہیں اپنے موقف پر نظر ثانی کرنے پر مجبور کیا اور انہیں یہ کہنا پڑا :

جی میں آتا ہے علی گڑھ جا کے سید سے کہوں
مجھ سے چندہ لیجئے مجھ کو مسلماں کیجئے

سرور صاحب کا خانوادہ بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں رہا۔ ان کے اسلاف میں مولوی علی بخش شرر، سر سید کے سخت مخالف تھے۔ یہ سرور صاحب کے نانا مولوی حامد بخش کے چچا تھے۔ سرور صاحب نے ایک مضمون ''مولوی علی بخش شرر: سر سید کے ایک مخالف'' کے عنوان سے رسالہ ''اردو'' ۱۹۴۰ء میں شائع کیا تھا۔ اس عناد و مخالفت کی روایت کو توڑنے کا سہرا سرور صاحب کے دادا حافظ محمد احمد کے سر جاتا ہے۔ انہوں نے اپنے بیٹے کرم احمد کو سر سید کے ایم۔ اے۔ او کالج میں داخل کیا۔ یہی سرور صاحب کے والد بزرگوار تھے۔ کرم احمد نے اپنے بڑے بیٹے ابن احمد کو تحصیل علم کی خاطر علی گڑھ بھیجا۔ ان کے علاوہ سرور صاحب کے خالہ زاد بھائی ابرار حسن قادری یہیں سے فارغ تحصیل ہو کر ملازم ہو گئے تھے۔ اس طرح سرور صاحب کو سر سید اور علی گڑھ سے محبت اور شغف ورثہ میں ملا۔ یہ اور بات ہے کہ انہیں اس چشمۂ فیض سے سیراب ہونے کا زریں موقع قدرے بعد کو نصیب ہوا۔ دراصل ان کے والد محترم ڈاک کے محکمہ میں ملازم تھے، اکثر ان کا تبادلہ ہوتا رہتا تھا۔ جہاں والد رہتے تھے سرور صاحب کو وہیں کسی اسکول میں داخل کرنا پڑتا تھا۔

سرور صاحب کی ابتدائی تعلیم بدایوں، میرٹھ، پیلی بھیت، بجنور، سیتاپور اور گونڈہ میں ہوئی۔ بعد ازاں ان کے والد کا تبادلہ غازی پور ہو گیا۔ جہاں سرور صاحب کا داخلہ سر سید کے قائم کردہ کوئن وکٹوریہ اسکول کی ساتویں جماعت میں ہوا۔ اردو زبان و ادب سے ان کی دلچسپی کے ابتدائی نقوش اسی زمانہ میں رونما ہونے لگے تھے۔ نصاب کے علاوہ بہت سی نظمیں اور غزلیں یاد ہو گئی تھیں جنہیں وہ دوستوں کی صحبت میں سنایا کرتے تھے۔ اسکول کی تقریبات اور بحث و مباحثے میں بھی حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔

دسمبر ۱۹۲۵ء میں ایم۔ اے۔ او کالج علی گڑھ کی گولڈن جبلی منائی جا رہی تھی اس زمانہ میں سرور صاحب کے بڑے بھائی ابن احمد اور خالہ زاد بھائی افضال حسن قادری یہاں کے طالب علم تھے۔ بڑے بیٹے کے اصرار پر مولوی کرم احمد نے سرور صاحب کو غازی پور کے بعض اولڈ بوائز کے ہمراہ علی گڑھ جانے کی اجازت دے دی۔ ابن احمد منٹو سرکل کے کرشنا آشرم میں رہتے تھے۔ افضال سے سرور صاحب کی بڑی بے تکلفی تھی۔ سرور صاحب نے انہیں کے ساتھ جبلی کی تقریبات میں شرکت کی۔ ان کے لیے یہ خوشگوار موقع تھا جس کی یادیں خوشبو

www.taemeernews.com

کی طرح تا حیات ان کے ساتھ رہیں۔

پہلے والد محترم، پھر بڑے بھائی اور دوسرے عزیز و اقارب کا سرسید کے چشمۂ فیض سے خوشہ چینی نیز جبلی کی تقریبات میں بہ نفس نفیس شرکت اور اس سے اثر پذیری، یہ وہ حقائق ہیں جن کے پیش نظر یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ سرور صاحب کو یقینی طور پر اس دیار علم و دانش سے کسب فیض کی تڑپ اور خلش رہی ہوگی۔

۱۹۲۸ء میں سرور صاحب نے کوئن وکٹوریہ اسکول سے میٹرک کا امتحان پاس کیا اور اسی سال سینٹ جانس کالج آگرہ میں فرسٹ ایر سائنس سے داخلہ لیا۔ بعد از اں یہیں سے ۱۹۳۲ء میں بی۔ ایس۔ سی کا امتحان پاس کیا۔ آگرہ میں انہیں نصابی کتابوں کے علاوہ انگریزی اور اردو زبان و ادب سے بھی گہرا شغف رہا اور کالج میگزین میں ان کی تخلیقات شائع ہوئیں۔ ان کے ادبی ذوق کے پیش نظر انہیں کالج کے ''انجمن اردوئے معلیٰ'' کا سکریٹری نامزد کیا گیا، جس کے تحت ادبی اور ثقافتی تقریبات پابندی سے ہوتی تھیں۔ انجمن کے سالانہ مشاعرہ میں سرور صاحب کی ملاقات فانی بدایونی، یاس یگانہ چنگیزی، میکش اکبرآبادی، سیماب اکبرآبادی، مخمور اکبرآبادی اور مانی جائسی جیسے باکمال شعرا سے ہوئی۔

علی گڑھ سے دور رہ کر بھی سرور صاحب یہاں کی تعلیمی، تہذیبی اور ثقافتی سرگرمیوں سے بے خبر نہیں رہے۔ سینٹ جانس کالج کی پارلیمنٹ کے زیر اہتمام انعامی مباحثہ کا انعقاد ہوا۔ جس میں علی گڑھ سے ڈاکٹر ہادی حسن اور خواجہ غلام السیدین کی سربراہی میں یہاں کے طلباء نے حصہ لیا۔ تقریری مقابلے کا پہلا انعام علی گڑھ کے طالب علم انصار ہروانی کو ملا تھا جبکہ دوسرا انعام سرور صاحب کو۔ علاوہ ازیں بحیثیت صدر جلسہ کے خواجہ غلام السیدین کی گہر افشانی اور مہمان مندوب کی حیثیت سے ڈاکٹر ہادی حسن کی گل افشانی گفتار سے پورے مجمع کو مسحور ہوتے بہ چشم خود دیکھا تھا۔

بہرکیف سرور صاحب کو بی۔ ایس۔ سی کے امتحان میں سکنڈ ڈویژن پر اکتفا کرنا پڑا۔ جس کا ردعمل یہ ہوا کہ انہوں نے انگریزی میں ایم۔ اے کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ دریں اثنا ان کے والد کا تبادلہ علی گڑھ ہو گیا۔ اس طرح سرور صاحب کو شہر سرسید میں قیام کی دیرینہ خواہش کی تکمیل کی صورت نکل آئی اور وہ اپنے والد کے پاس علی گڑھ آگئے۔ یہ جولائی ۱۹۳۲ء کا زمانہ ہے۔

سرور صاحب کی علی گڑھ کی زندگی کے مطالعہ کو آسانی کے لیے تین ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلا جولائی ۱۹۳۲ء تا مارچ ۱۹۴۵ء، دوسرا یکم دسمبر ۱۹۵۵ء تا ۷ اکتوبر ۱۹۷۳ء اور آخری اکتوبر ۱۹۸۷ء سے تادم حیات۔

سرور صاحب جولائی ۱۹۳۲ء میں علی گڑھ آئے جہاں ان کے والد صدر ڈاک خانے میں پوسٹ ماسٹر تھے۔ شروع میں ان کا قیام اپنے والد کے ساتھ ڈاک خانے کے ایک حصے میں رہا۔ ان دنوں یونیورسٹی جولائی سے ستمبر تک بند رہتی تھی۔ یونیورسٹی کھلنے پر سرور صاحب نے ایم۔ اے پریوئس (انگریزی) میں داخلہ لیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب علی گڑھ

www.taemeernews.com

مسلم یونیورسٹی اپنی تعلیمی، تہذیبی اور ثقافتی سرگرمیوں میں امتیازی شان رکھتی تھی، اور یہ سب کچھ یہاں کے اساتذہ اور طلبا کے دم سے تھا۔ درس و تدریس کے علاوہ یونین کا سالانہ مشاعرہ، بحث و مباحثہ، ڈیبیٹ اور ڈسکشن یہ سبھی پروگرام نہایت تزک و احتشام سے ہوتے تھے جن سے طلبا کی شعری، ادبی، تہذیبی اور ثقافتی ذوق کی تربیت بھی ہوتی تھی اور ترجمانی بھی۔ سرور صاحب نے ان سرگرمیوں سے بھرپور استفادہ کیا۔ بقول ان کے ''ایک جوش، فخر و مباہات اور سرخوشی کا عالم تھا۔''

خواجہ منظور حسین شعبۂ انگریزی میں ریڈر تھے اور سرور صاحب کے ٹیوٹر بھی۔ علاوہ ازیں وہ علی گڑھ میگزین (اردو) کے نگراں بھی تھے۔ انہوں نے سرور صاحب کے ادبی ذوق کے پیش نظر انہیں علی گڑھ میگزین (اردو) کا ایڈیٹر مقرر کیا۔ حالانکہ ان کو یونیورسٹی میں آئے ہوئے صرف ایک مہینہ ہوا تھا۔ انہوں نے مضامین کی فراہمی کے سلسلے میں یونیورسٹی کے ممتاز اساتذہ سے ملاقاتیں کیں، ان میں پروفیسر رشید احمد صدیقی اور خواجہ غلام السیدین قابل ذکر ہیں۔ رشید صاحب کی شخصیت ان کے لیے محتاج تعارف نہیں تھی لیکن بالمشافہ ملاقات کا یہ پہلا موقع تھا۔ علی گڑھ میگزین ابتدا سے منتقل نکلتی تھی۔ لیکن ۱۹۳۰ء کے بعد اس کی اشاعت میں بے قاعدگی در آئی، چنانچہ یہ فیصلہ ہوا کہ آئندہ سے میگزین سہ ماہی نکلا کرے گی۔ سرور صاحب نے بڑی محنت اور کوشش سے اس بے قاعدگی کو دور کیا اور اپنے زمانۂ ادارت میں چار کامیاب شمارے نکالے۔

اس زمانہ میں یونیورسٹی میں ہفتہ وار ڈبیٹ اور ڈسکشن کے علاوہ اردو اور انگریزی میں سالانہ آل انڈیا ڈبیٹ بھی ہوتا تھا۔ سرور صاحب کو آل انڈیا اردو ڈبیٹ میں یونیورسٹی کی نمائندگی کا موقع ملا جس کا موضوع ''سرمایہ داری اسلام کی تعلیم کے منافی ہے'' تھا۔ انصار ہروانی کو موضوع کی حمایت میں جبکہ سرور صاحب کو مخالفت میں بولنا تھا۔ اس تقریب کے ججیز پروفیسر رشید احمد صدیقی، ڈاکٹر اشرف اور بشیر ہاشمی تھے۔ سرور صاحب نے اپنی مبسوط اور مدلل گفتگو سے سب کو متاثر کیا۔ بعد میں جب ان کی ملاقات رشید صاحب سے ہوئی تو انہوں نے تقریر کی تعریف کی جس سے ان کی حوصلہ افزائی ہوئی۔ اس کے بعد وہ اکثر رشید صاحب کے یہاں آنے جانے لگے اور رفتہ رفتہ دونوں ایک دوسرے سے قریب ہو گئے۔

سرور صاحب کے ادبی ذوق اور استعداد کے اعتراف میں انہیں شعبۂ انگریزی کے راے لٹریری کلب کا سکریٹری نامزد کیا گیا۔ انہوں نے اپنے زمانے میں متعدد تقریبات کا اہتمام کیا۔ کلب کے ایک جلسے میں سرور صاحب نے سمویل جانسن پر ایک سیر حاصل مقالہ پیش کیا۔ طلباء یونین کے زیر اہتمام اپریل ۱۹۳۳ء میں سالانہ انعامی مباحثے ہوئے، سرور صاحب نے ان تمام مباحث میں نہایت خود اعتمادی سے حصہ لیا جس کے طفیل میں انہیں تین اوّل انعام اور دو دوئم انعام ملے۔

ایم۔ اے سال اوّل کے امتحان کے بعد سرور صاحب، افضال حسین قادری اور دوسرے

www.taemeernews.com

ساتھیوں کے ہمراہ کشمیر کی سیاحت پر گئے۔ وہاں کے قدرتی مناظر، باغات، ندی، نالے، آبشار، خوبصورت جھیلوں اور فلک بوس پہاڑوں سے متاثر ہو کر انہوں نے متعدد نظمیں کہیں جو ان کے پہلے مجموعہ کلام ''سلسبیل'' (۱۹۳۵ء) میں شامل ہیں۔

اس زمانہ میں طلباء یونین کا انتخاب شروع دسمبر میں ہوتا تھا۔ موسم گرما کی تعطیلات کے بعد یونیورسٹی کھلتے ہی انتخابی سرگرمیاں شروع ہو گئیں۔ سرور صاحب کو علی گڑھ آئے ابھی ایک سال ہوا تھا لیکن بعض معتبر دوستوں کے مشورے سے انہوں نے نائب صدر کے انتخاب میں حصہ لیا۔ اس زمانے میں یونین کا صدر پرو وائس چانسلر ہوتا تھا۔ بہر صورت سرور صاحب کو معین الحق چودھری کے مقابلے میں کامیابی نصیب ہوئی۔ جنوری ۱۹۳۴ء میں رسم تنصیب کے بعد انہوں نے بحیثیت نائب صدر کے عہدہ سنبھال لیا۔

فروری ۱۹۳۴ء کے آغاز میں سر آغا خاں علی گڑھ تشریف لائے۔ ان کے اعزاز میں اسٹریچی ہال میں جلسہ ہوا۔ حسب روایت بحیثیت نائب صدر کے سرور صاحب استقبالیہ خطبہ پیش کرنے کے لیے کھڑے ہوئے تو یونین کے تمام سابق عہدہ داران کے ساتھ مولانا شوکت علی اور ڈاکٹر ذاکر حسین بھی کھڑے ہو گئے۔ یہ اس زمانے کی روایت اور طلباء یونین کے نائب صدر کا وقار تھا۔

یونین کی مصروفیات اور دوسری سرگرمیوں کے باوجود سرور صاحب نے ایم۔ اے (فائنل) کا امتحان امتیاز کے ساتھ پاس کیا۔ ان کے والد کی خواہش تھی کہ وہ آئی۔ سی۔ ایس کریں۔ لیکن ڈاکٹر ذاکر حسین نے انہیں بحیثیت استاد کے علی گڑھ کی خدمت کرنے کا مشورہ دیا۔ اسی زمانے میں شعبۂ انگریزی کے استاد غلام سرور صاحب دو سال کی چھٹی پر انگلستان جا رہے تھے۔ صدر شعبۂ انگریزی ہیڈ و ہیرس نے سرور صاحب کو ان کی جگہ تقرری کی پیش کش کی جسے انہوں نے قبول کر لیا۔ اور اکتوبر ۱۹۳۴ء میں بحیثیت لیکچرر کے شعبۂ انگریزی میں جوائن کر لیا۔ بعد ازاں ذاکر صاحب کے مشورہ سے انہوں نے ۱۹۳۶ء میں اردو میں امتیاز کے ساتھ ایم۔ اے کیا اور جولائی ۱۹۳۶ء میں ان کی تقرری شعبۂ اردو میں لیکچرر کی اسامی پر ہو گئی۔ اس سے قبل رشید صاحب کی ایما پر انہوں نے رسالہ ''سہیل'' کے از سرِ نو اجراء کے لیے مضامین جمع کیے۔ یہ رسالہ چار سو صفحات کی ضخامت پر مشتمل جنوری ۱۹۳۶ء میں شائع ہوا۔ جس کی ادبی حلقوں میں پذیرائی ہوئی۔ اس کے ایڈیٹر رشید احمد صدیقی اور جوائنٹ ایڈیٹر سرور صاحب تھے۔ ''سہیل'' کے اس خاص نمبر میں سرور صاحب نے متعدد کتابوں اور رسالوں پر تبصرہ کیا تھا جس کی مولوی عبدالحق نے تعریف کی۔

اگست ۱۹۳۶ء میں سرور صاحب کی شادی زاہدہ خاتون سے قرار پائی۔ یہ وہ زمانہ ہے جب انہیں ریڈیو پر تقریر کے لیے بلایا جانے لگا تھا۔ بقول سرور صاحب ۱۹۳۸ء کے بعد تو مجھے ہر مہینے کسی نہ کسی موضوع پر تقریر کے لیے بلایا جاتا تھا۔ ریڈیو پر کی گئی ان کی تقاریر کا مجموعہ ''تنقیدی اشارے'' ۱۹۴۳ء میں زیور طبع سے آراستہ ہوا۔

اکتوبر ۱۹۳۶ء میں علی گڑھ میں اردو کانفرنس

www.taemeernews.com

کا انعقاد ہوا۔ اس موقع پر سرور صاحب کو جن ادیبوں اور دانشوروں سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا ان میں بابائے اردو مولوی عبدالحق اور پریم چند قابلِ ذکر ہیں۔ دریں اثنا ان کے والد کا تبادلہ بمبئی ہو گیا۔ لہٰذا سرور صاحب والدہ کے ساتھ ڈاک خانہ کے سامنے ایک مکان میں منتقل ہو گئے۔ اپریل ۱۹۳۷ء میں جلیل قدوائی صاحب نے شعبۂ اردو سے استعفیٰ دے دیا تو ان کی جگہ سرور صاحب کو لکچرر گریڈ دوم کی مستقل جگہ مل گئی۔ اسی زمانے میں سید سجاد ظہیر کی تحریک پر علی گڑھ میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی شاخ قائم ہوئی۔ جس کا سکریٹری سرور صاحب کو بنایا گیا۔

۱۹۳۷ء کی موسم گرما کی تعطیلات میں سرور صاحب پہلے والد کے پاس بمبئی پھر وہیں سے حیدرآباد گئے جہاں مولوی عبدالحق، عبدالقادر سروری، ڈاکٹر محی الدین قادری زور اور ہاشمی فرید آبادی سے ملاقاتیں رہیں۔ ۱۹۳۷ء کے اواخر میں یونیورسٹی میں توسیعی خطبات کا اہتمام ہوا جس میں سرور صاحب نے ''جدید اردو شاعری کے میلانات'' پر لکچر دیا، جو بعد میں رسالہ ''جامعہ'' میں شائع ہوا۔ اس زمانے میں انسٹی ٹیوٹ گزٹ پابندی سے نکلتا تھا۔ رحم علی الہاشمی اس کے اسسٹنٹ ایڈیٹر تھے وہ ایک سال کی چھٹی پر شملہ چلے گئے تو ان کی جگہ ڈاکٹر ضیاء الدین (وائس چانسلر، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) نے رشید صاحب کو گزٹ کا نگراں اور سرور صاحب کو اسسٹنٹ ایڈیٹر مقرر کیا۔

گزٹ میں یونیورسٹی کی خبریں، مختصر مضامین اور علمی کوائف شائع ہوتے تھے علاوہ ازیں سرور صاحب انگریزی میں اداریہ لکھتے تھے۔ لیکن حادثاتی طور پر انہیں گزٹ سے مستعفی ہونا پڑا، ہوا یہ کہ ڈاکٹر ضیاء الدین نے شملہ میں بعض انگریز افسران اور ہندوستانی عمائدین کی دعوت کی تھی، وہ چاہتے تھے کہ گزٹ میں اس دعوت کی تفصیل شائع ہو۔ لیکن سرور صاحب نے یہ کہہ کر صاف انکار کر دیا کہ گزٹ یونیورسٹی کی خبریں چھاپنے کے لیے ہے شملہ کی دعوت کی روداد کے لیے نہیں اور احتجاجاً استعفیٰ دے دیا۔

اگست ۱۹۳۸ء میں مولانا احسن مارہروی سبکدوش ہوئے تو ان کی جگہ سرور صاحب کی تقرری بحیثیت سینئر لکچرر کے ہوئی۔ اور اکتوبر میں وہ یونیورسٹی کے ذکاء اللہ روڈ پر ایک وسیع مکان میں منتقل ہو گئے۔ اسی زمانہ میں انہیں فیض آباد میں اردو ادب پر لکچر کے لیے بلایا گیا جہاں انہوں نے بالترتیب اقبال اور سرسید پر دو لکچر دیے۔

مولوی عبدالحق نے ۱۹۳۸ء میں انجمن ترقی اردو کا دفتر حیدرآباد سے دہلی منتقل کیا اور مستقبل کے لائحہ عمل کو حتمی شکل دینے کی غرض سے جن اہم اشخاص کو بحیثیت مشیر کے دہلی آنے کی دعوت دی ان میں سرور صاحب بھی شامل تھے۔ انجمن کے زیر اہتمام ۱۹۳۹ء میں کل ہند کانفرنس دہلی میں منعقد ہوئی جس میں انہوں نے ''علی بخش شرر: سرسید کے ایک مخالف'' کے عنوان سے مضمون پڑھا تھا۔

سرور صاحب کو بحیثیت لکچرر کے شعبۂ اردو میں ۲۷ گھنٹے پڑھانے پڑتے تھے۔ اور انتظامی امور میں صدر شعبہ رشید احمد صدیقی کو ہمہ وقت ان کی اعانت شامل حال رہتی تھی۔ علاوہ ازیں اسٹاف کلب جانا، ٹینس کھیلنا اور رات میں کچھ دیر رشید صاحب

www.taemeernews.com

کے یہاں گزارنا ان کے معمولات میں شامل تھا۔ رات میں کھانے کے بعد دیر رات گئے تک مطالعہ کرتے اور صبح دیر سے اٹھتے تھے۔ بقول سرور صاحب طالب علمی کے زمانے سے مطالعہ کا یہی معمول تھا۔

سرور صاحب کو مطالعہ کا بہت شوق تھا۔ ان کا اکثر وقت لائبریری میں گذرتا تھا۔ جہاں لائبریرین بشیر الدین صاحب کے یہاں رشید احمد صدیقی، خواجہ منظور حسین، مولانا عبدالعزیز میمن، ڈاکٹر ہادی حسن، محمود حسین اور خواجہ غلام السیدین پابندی سے جمع ہوتے تھے اور علمی و ادبی موضوعات کے علاوہ نئی کتابوں پر گفتگو ہوتی تھی۔ سرور صاحب نے اس علمی صحبت سے بھرپور استفادہ کیا۔

۱۹۴۱ء میں یومِ سرسید کے موقع پر سرور صاحب نے علی گڑھ پر ایک نظم پڑھی تھی جس کا ایک شعر تھا:

کتنوں کو کیا باب حکومت پہ نچھاور
تھی جن کی ضیاؤں سے نگاہوں میں جوانی

جس کا مطلب یہ نکالا گیا کہ اس میں ڈاکٹر ضیاء الدین پر طنز ہے۔ حالانکہ بقول سرور صاحب:

''اعتراض کسی شخص پر نہ تھا بلکہ انگریز پرستی کی پالیسی پر تھا''۔

اس سے قبل ڈاکٹر ضیاء الدین نے سرور صاحب کو ڈپٹی رجسٹرار کی حیثیت سے تقرری کی پیش کش کی تھی لیکن انہوں نے معذرت کر لی تھی۔ جس کے سبب ڈاکٹر ضیاء الدین ان سے دل برداشتہ ہو گئے تھے، اس واقعے نے انہیں اور بدظن کر دیا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب سرور صاحب یونیورسٹی کی کم و بیش تمام شعبہ ھائے زندگی میں سرگرمی سے حصہ لیتے تھے۔ اسٹاف کلب سے ان کی دلچسپی کے پیش نظر ۱۹۴۴ء میں انہیں کلب کا جوائنٹ سکریٹری مقرر کیا گیا۔ اس زمانہ میں ڈاکٹر ضیاء الدین کو میڈیکل کالج قائم کرنے کی دھن سوار تھی۔ ڈاکٹر ہادی حسن اس تحریک کے بڑے مبلغ تھے۔ انہوں نے یونیورسٹی کے اساتذہ پر یہ الزام لگایا کہ وہ حسابا یومیہ ڈیڑھ گھنٹہ پڑھاتے ہیں، لیکن میڈیکل کالج کے چندہ کی مہم میں تعاون نہیں کرتے۔ یہ بات اساتذہ کے لیے اہانت آمیز تھی۔ چنانچہ اپنے ردّعمل کے اظہار کے لیے اسٹاف ایسوسی ایشن نے ڈاکٹر موصوف کو ایک ایٹ ہوم پر مدعو کیا۔ ایسوسی ایشن کے سکریٹری حیدر خاں کے استقبالیہ کلمات کے بعد ڈاکٹر موصوف نے اساتذہ کو خطاب کرتے ہوئے اساتذہ سے اپنی سابقہ شکایت کا اعادہ کیا۔ بعد ازاں سرور صاحب نے سکریٹری سے اس بات کی اجازت لی کہ اظہار تشکر وہ خود کریں گے۔ ابتداء میں انہوں نے مہمان مندوب کی تشریف آوری پر مسرت کا اظہار کیا پھر منصور حلاج کے تاریخی واقعہ کے توسط سے فرمایا کہ اساتذہ کو قوم کے بہت لوگ برا بھلا کہتے ہیں اور چونکہ وہ ناواقف ہیں اس لیے ہم ان کے اعتراض کی پرواہ نہیں کرتے۔ لیکن آپ تو خود استاد رہے ہیں آپ کا اعتراض ہمارے لیے بہت تکلیف دہ ہے۔ انہوں نے یہ بھی فرمایا کہ یونیورسٹی کی ترقی کے منصوبوں میں تعاون ہمارا فرض ضرور ہے مگر ہمارا بنیادی کام درس وتدریس، تحقیق وتدقیق اور طلباء کی تعلیم وتربیت ہے۔ انہوں نے اپنی بات جوش ملیح آبادی کے اس شعر پر ختم کی تھی:

www.taemeernews.com

ذرا آہستہ لے چل کاروانِ کیف و مستی کو
کہ سطحِ ذہنِ عالم سخت ناہموار ہے ساقی

اس تقریر کا یونیورسٹی میں بہت دنوں تک چرچا رہا۔

سرشاہ سلیمان کے انتقال (۱۹۴۰ء) کے بعد ڈاکٹر ضیاء الدین دوبارہ وائس چانسلر مقرر ہوئے۔ اس زمانے میں ایک طرف یونیورسٹی میں مسلم لیگ کی لہر چل پڑی تھی تو دوسری طرف مسلم اسٹوڈینس فیڈریشن کا قیام عمل میں آچکا تھا اور اس کا ترجمان اخبار ''بیداری'' جاری ہوا۔ سرور صاحب نے ''بیداری'' میں ایک مضمون بعنوان ''سرسید کا حقیقی پیغام اور علی گڑھ میں ایک ذہنی انقلاب کی ضرورت'' لکھا تھا۔ مضمون کے آخر میں یہ کہا گیا تھا ''اگر ہم نے سرسید کے پیغام کو ملحوظ نہ رکھا تو ہم پر اقبال کا یہ شعر صادق آئے گا:

میراث میں آئی ہے انہیں مسندِ ارشاد
زاغوں کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن

مضمون کا منصۂ شہود پر آنا تھا کہ ڈاکٹر ضیاء الدین کے حواریوں نے یہ پروپگنڈہ کیا کہ مضمون وائس چانسلر کے خلاف ہے اور انہیں زاغ کہا گیا ہے۔ ڈاکٹر موصوف، صاحب مضمون سے پہلے سے خفا تھے اس واقعہ نے زخم پر نمک کا کام کیا۔ انہوں نے اگز یکوٹو کونسل میں سرور صاحب کے خلاف تادیبی کارروائی کی تجویز پیش کی لیکن طے یہ ہوا کہ پرووائس چانسلر انہیں یہ باور کرائیں کہ وہ مستقبل میں اس طرح کی تحریر سے گریز کریں۔ پرووائس چانسلر اے۔ بی۔ اے حلیم نے سرور صاحب کو کونسل کے فیصلے سے آگاہ کیا۔ انہوں نے اپنے ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا کہ:

''میں شعبۂ اردو میں لکچرر ہوں
اور میرا کام لکھنا پڑھنا ہے اگر آپ
چاہتے ہیں کہ میں لکھنا پڑھنا چھوڑ دوں تو
یہ میرے لیے ممکن نہیں، البتہ ملازمت
سے سبکدوش ہوسکتا ہوں۔''

اس برجستہ جواب سے حلیم صاحب نرم پڑ گئے۔

اس زمانے میں سرور صاحب نے درس و تدریس اور دوسری سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ لکھنے پڑھنے کا اپنا محبوب مشغلہ بھی جاری رکھا۔ یہ واقعہ ہے کہ ''سلسبیل'' کی اشاعت کے بعد انہوں نے اپنی پوری توجہ نثر نگاری بطور خاص نقد ادب کی طرف مبذول کر دی اور مختلف عنوانات کے تحت مضامین تحریر کیے۔ دریں اثنا مولوی عبدالحق نے عزیز احمد کا نئی اردو شاعری کا انتخاب ''انتخاب جدید'' کے نام سے سرور صاحب کی رائے کے لیے بھیجا۔ جس میں انہوں نے کچھ ترمیم و اضافہ کی تجویز پیش کی۔ بعد ازاں مولوی عبدالحق کے اصرار پر انہوں نے پورے مسودے پر نظر ثانی کی۔ اس طرح یہ انتخاب ۱۹۴۴ء میں انجمن سے عزیز احمد اور سرور صاحب کے نام سے شائع ہوا۔ جس میں ۱۹۱۴ء سے ۱۹۴۰ء تک کی شاعری کا انتخاب شامل تھا۔ ان ہی دنوں سید الطاف علی بریلوی نے ایک ادارہ ''مصنف'' کے نام سے قائم کیا تھا۔ یہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سپرنٹنڈنٹ تھے۔ ''مصنف'' کا جلسہ باقاعدگی سے ہوتا تھا جس میں کوئی نہ کوئی ممبر اپنا مقالہ پیش کرتا تھا اور اس پر بحث ہوتی تھی۔ سرور صاحب

www.taemeernews.com

بھی اس کے ممبر تھے اور انہوں نے ''اکبر اور سرسید'' کے عنوان سے مقالہ پیش کیا تھا۔

ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے رشید احمد صدیقی کو اردو کانگریس میں شرکت کی دعوت دی ۔ یہ کانگریس ۱۹۴۴ء میں حیدرآباد میں ہوئی تھی۔ انہوں نے اس شرط پر دعوت قبول کی کہ ان کے ہمراہ سرور صاحب بھی ہوں گے ۔ اور ان کے سفر، قیام اور طعام کا انتظام بھی زور صاحب کے ذمہ ہوگا۔ سرور صاحب نے اردو کانگریس میں ''اسٹائل کیا ہے؟'' کے عنوان سے اپنا مقالہ پیش کیا تھا۔ اس موقع پر حیدرآباد ریڈیو سے ان کی تقریر بھی نشر ہوئی تھی۔

حیدرآباد سے واپسی پر ابھی زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ ڈاکٹر ذاکر حسین نے سرور صاحب سے رام پور جانے کو کہا۔ جہاں رضا انٹر کالج میں پرنسپل کی جگہ خالی تھی۔ چنانچہ وہ بحیثیت پرنسپل کے مارچ ۱۹۴۵ء میں رام پور چلے گئے۔ سرور صاحب کے علی گڑھ میں قیام کا یہ اولین دور کم و بیش ۱۳ سال پر محیط ہے۔ انہوں نے اپنی خودنوشت ''خواب باقی ہیں'' میں اس دور کے ممتاز اساتذہ اور ہونہار طلباء کو بہت یاد کیا ہے۔ اساتذہ میں...... پروفیسر محمد حبیب (تاریخ)، خواجہ غلام السیدین اور پروفیسر حبیب الرحمن (تعلیم)، مولانا عبدالعزیز میمن (عربی)، ڈاکٹر ہادی حسن، ڈاکٹر ضیاء الدین بدایونی اور کیپٹن حمید الدین خاں (فارسی)، مولانا سلیمان اشرف (صدر شعبۂ دینیات)، ابو بکر شیث فاروقی (ناظم دینیات)، پروفیسر ایل۔ کے۔ حیدر (کیمسٹری)، عبدالمجید قریشی، اور رحمت اللہ (ریاضی)، ڈاکٹر ظفر الاسلام (فلسفہ)، رشید احمد صدیقی، ظہیر الدین علوی اور مولانا احسن مارہروی (اردو) اور خواجہ منظور حسین، محمود حسین، حامد علی اور پی۔ اے۔ خاں (انگریزی) قابل ذکر ہیں۔ شاگردوں میں خواجہ شبیر حسن، عشرت عثمانی، اور عبید الرحمن ٹونکی (انگریزی میں) اور حسن عبداللہ، مبشر علی، مسعود حسین خاں، مسعود علی ذوقی، جاں نثار اختر، نور الحسن ہاشمی، رشید مودودی، عبدالرؤف، نور محمد، صدیق احمد صدیقی، ساجد علی خاں، سلیمہ سلطانی اور سلمیٰ سلام الحق (اردو میں) قابل ذکر ہیں۔

علی گڑھ میں قیام کے پہلے دور میں سرور صاحب نے اپنے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ''نئے اور پرانے چراغ'' مرتب کر لیا تھا جو جون ۱۹۴۶ء میں اشاعت پذیر ہوا۔

مارچ ۱۹۴۵ء سے اگست ۱۹۴۶ء تک

سرور صاحب رضا انٹر کالج رام پور میں بحیثیت پرنسپل کے خدمات انجام دیں۔ دریں اثنا مولوی عبدالحق کی کوششوں سے ان کی تقرری لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو و فارسی میں بحیثیت ریڈر کے ہو گئی۔ رام پور میں ان کا قیام ایک مختصر مدت کے لیے رہا لیکن ان کی خدمات کو بہت سراہا گیا۔

سرور صاحب بحیثیت ریڈر کے ۲۱ر اگست ۱۹۴۶ء کو لکھنؤ یونیورسٹی چلے گئے ۔ جہاں درس و تدریس کے ساتھ ساتھ وہ مختلف تحریکوں اور تنظیموں سے وابستہ رہے۔ ترقی پسند مصنفین کا جلسہ ان کے گھر پر ہوتا تھا۔ ادبی محفلوں، شعری نشستوں، مجالس عزا اور عمائدین کی صحبتوں میں شریک ہونا ان کا وطیرہ تھا۔ علاوہ ازیں ان کی تقریریں ریڈیو پر پابندی سے نشر

www.taemeernews.com

ہوتی تھیں گویا سب کچھ حسب حال تھا، لیکن جب صدر شعبۂ اردو پروفیسر مسعود حسن رضوی سبکدوش ہوئے تو وائس چانسلر نے یوسف حسین موسوی کو صدر شعبہ مقرر کر دیا۔ جبکہ شعبہ میں سرورؔ صاحب سینئر ریڈر تھے اور ضابطے سے وہی صدر شعبہ کے مستحق تھے۔ لہٰذا انہوں نے احتجاجاً استعفیٰ دے دیا۔ یہ نومبر ۱۹۵۵ء کا واقعہ ہے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین نے سرورؔ صاحب کو اطلاع دی کہ ان کے ایک رفیق عطاء اللہ درانی (جو امریکہ میں مقیم تھے) نے دیوان غالب کا انگریزی میں ترجمہ اور نول کشور پر کتاب لکھنے کے لیے ایک عطیہ دیا ہے۔ اس غرض سے علی گڑھ میں سید حسین ریسرچ پروفیسر کی جگہ قائم ہو رہی ہے۔ انہوں نے یہ خواہش ظاہر کی کہ سرورؔ صاحب علی گڑھ آ جائیں۔ سرورؔ صاحب نے لکھنو سے تن بہ تقدیر استعفیٰ دیا تھا۔ ایسی صورت میں ذاکر صاحب کی یہ پیش کش ان کے لیے نعمت غیر متوقع سے کم نہ تھی۔ چنانچہ انہوں نے بغیر تامل کے اسے منظور کر لیا اور علی گڑھ آ گئے۔ اس سے قبل (۱۹۴۹ء) ذاکر صاحب انجمن کے صدر مقرر ہوئے تو وہ سرورؔ صاحب کو انجمن کا جنرل سکریٹری بنانا چاہتے تھے۔ لیکن انہیں انجمن کا کل وقتی کارکن ہونا منظور نہ تھا۔ البتہ انہوں نے یہ وعدہ کیا کہ علی گڑھ آنے کی صورت میں وہ اعزازی خدمت ضرور انجام دیں گے۔ بعد ازاں ۱۹۵۰ء میں مولانا ابوالکلام آزاد کی ایما پر ذاکر صاحب نے قاضی عبدالغفار کو انجمن کا سکریٹری اور سرورؔ صاحب کو لائف ممبر اور ''اردو ادب'' کا ایڈیٹر نامزد کیا۔

لکھنو کے زمانہ قیام میں سرورؔ صاحب کے تنقیدی مضامین کے دو مجموعے ''تنقید کیا ہے؟'' (۱۹۴۷ء) اور ''ادب اور نظریے'' (۱۹۵۴ء) کے علاوہ ایک شعری مجموعہ ''ذوق جنوں'' (۱۹۵۵ء) شائع ہوا۔ انہوں نے لکھنو کے علمی اور ادبی ماحول، ممتاز اساتذہ اور طلباء کا اپنی خودنوشت (خواب باقی ہیں) میں ذکر خیر کیا ہے۔

سرورؔ صاحب بحیثیت سید حسین ریسرچ پروفیسر کے یکم دسمبر ۱۹۵۵ء کو علی گڑھ آ گئے۔ انہی دنوں شاہ سعود علی گڑھ آ رہے تھے۔ اولڈ بوائز لاج میں جگہ نہ ملنے کی صورت میں ذاکر صاحب نے سرورؔ صاحب کے قیام و طعام کا انتظام اپنے ساتھ رکھا۔ دریں اثنا انجمن ترقی اردو کے سکریٹری قاضی عبدالغفار کا دل کے عارضہ میں انتقال ہو گیا۔ بعد ازاں ذاکر صاحب کے اصرار پر سرورؔ صاحب نے ۱۹ جنوری ۱۹۵۶ء کو انجمن کے سکریٹری کی ذمہ داری سنبھال لی۔

شعبۂ اردو میں سرورؔ صاحب کو بحیثیت سید حسین ریسرچ پروفیسر کے غالب کے دیوان کا انگریزی میں ترجمہ اور نول کشور کی خدمات پر کام کرنے والے فیلو کی نگرانی کرنا تھا۔ شروع میں نسیم قریشی کو فیلو مقرر کیا گیا، لیکن جلد ہی ان کی تقرری شعبۂ اردو میں بحیثیت لکچرر کے ہو گئی، لہٰذا ان کی جگہ نادر علی خاں کا انتخاب ہوا۔ بقول سرورؔ صاحب:

> ''انہوں نے بڑی محنت سے تین سال میں اردو میں نول کشور کی خدمات پر خاصہ مواد جمع کر دیا جسے انگریزی میں

www.taemeernews.com

ترجمہ کرنا تھا۔ سرور صاحب کے مطابق
یہ کام بھی انجام پا گیا تھا۔''
لیکن مشہور یہی ہے کہ سرور صاحب نے یہ کام کر کے نہیں دیا۔ پروفیسر گیان چند نے اپنے ایک مضمون ''سرور صاحب کی خودنوشت: خواب باقی ہیں'' میں تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''اگر انہوں نے (سرور صاحب) یہ ترجمہ مکمل کیا اور درّانی نے شائع نہیں کیا تو سرور صاحب کو کسی ادارے سے شائع کر دینا چاہیے تھا۔''

''پروفیسر آل احمد سرور: شخصیت اور ادبی خدمات'' (کتاب نما کا خصوصی شمارہ ۱۹۹۲ء، ص ۱۶)

شعبۂ اردو سے وابستگی کے زمانے میں سرور صاحب کا معمول یہ تھا کہ وہ صبح ۹ بجے سے ۲ بجے تک شعبہ میں رہتے تھے دوپہر کے کھانے کے بعد تھوڑی دیر آرام فرما کر سہ پہر ۳ بجے انجمن کے دفتر جاتے جہاں ۶ بجے تک مصروف رہتے تھے۔ انجمن کے فرائض کے تحت ''ہماری زبان'' اور ''اردو ادب'' کی باقاعدہ اشاعت، مطبوعات اور اردو تحریک ان تمام امور پر توجہ کرنی پڑتی تھی۔

۷ر اکتوبر ۱۹۵۶ء کو کرنل بشیر حسین زیدی نے بحیثیت وائس چانسلر کے ذاکر صاحب سے چارج لیا۔ انہوں نے سرور صاحب کو سرسید ہال کا پرووسٹ نامزد کیا جس سے ان کی مصروفیات کا دائرہ وسیع تر ہو گیا۔

ذاکر صاحب نے بحیثیت وائس چانسلر کے یو۔ جی۔ سی کو جنرل ایجوکیشن کی ایک اسکیم بھیجی تھی۔ جس کی منظوری زیدی صاحب کے زمانے میں ملی۔ ڈاکٹر عابد حسین کو اس کا ڈائرکٹر اور ڈاکٹر مونس رضا، ڈاکٹر ابو سالم اور ڈاکٹر خورشید الاسلام کی ان کے معاون کی حیثیت سے ریڈر گریڈ میں تقرری ہوئی۔ بقول سرور صاحب:

''عابد صاحب کی نگرانی میں اس ٹیم نے نہایت قیمتی مواد تیار کیا لیکن عابد صاحب چاہتے تھے کہ انگریزی، اردو اور ہندی کا نصاب جنرل ایجوکیشن کے اصولوں پر تیار ہو اور ان مضامین کی تدریس بھی جنرل ایجوکیشن کے ذمہ ہو۔''

سرور صاحب کو اس سے اختلاف تھا۔ انہوں نے زیدی صاحب کو یہ باور کرایا کہ یہ اسکیم ذاکر صاحب کی رہینِ منت ہے، لہٰذا اس معاملے میں ان کی رائے معلوم کرنا واجب ہے۔ ذاکر صاحب اس وقت بہار کے گورنر تھے۔ وہ جب علی گڑھ آئے تو اس سلسلے میں ایک مشاورتی میٹنگ ہوئی جس میں عابد صاحب اور سرور صاحب دونوں نے اپنا اپنا موقف پیش کیا۔ ذاکر صاحب نے سرور صاحب کی رائے سے اتفاق کیا اور یہ طے ہوا کہ جنرل ایجوکیشن ایک علاحدہ لازمی مضمون کی حیثیت سے پڑھایا جائے گا۔ لازمی انگریزی، اردو اور ہندی کا نصاب متعلقہ شعبے بنائیں گے اور وہی اس کی تدریس کے مجاز ہوں گے۔

سرور صاحب نے جولائی ۱۹۵۷ء میں انجمن ترقی اردو کے زیر اہتمام سہ روزہ آل انڈیا اردو کانفرنس کا انعقاد کیا۔ جس میں انجمن کے کاموں کا جائزہ اور

www.taemeernews.com

مستقبل کا لائحہ عمل مرتب کیا گیا۔

اپریل ۱۹۵۸ء میں رشید احمد صدیقی کے سبکدوش ہونے پر سرور صاحب نے بحیثیت صدر شعبہ کے یکم مئی ۱۹۵۸ء کو چارج لیا۔ رشید صاحب کے سبکدوش ہونے سے جو جگہ خالی ہوئی تھی اس کا اشتہار ہوا تو سرور صاحب نے قصداً فارم جمع نہیں کیا۔ اس کے باوجود انہیں انٹرویو میں بلایا گیا پھر بھی وہ شریک نہیں ہوئے۔ سلیکشن کمیٹی نے نہ صرف Inabsentia انہیں بحیثیت پروفیسر کے تقرری دی بلکہ ساتھ ساتھ دو Increment کی بھی سفارش کی۔ اس طرح سرور صاحب یکم اگست ۱۹۵۸ء سے باضابطہ پروفیسر ہو گئے۔ اسی زمانہ میں یو۔ جی۔ سی نے شعبۂ اردو کو ایک اسکیم کے تحت ''علی گڑھ تاریخ ادب اردو'' مرتب کرنے کی خاطر گراں قدر عطیہ فراہم کیا تھا۔ بحیثیت صدر شعبہ کے سرور صاحب اس کے ڈائرکٹر قرار پائے۔ اسسٹنٹ ڈائرکٹر کی حیثیت سے پہلے ڈاکٹر نذیر احمد کی تقرری عمل میں آئی۔ بقول سرور صاحب ''انہوں نے پہلی جلد کا سارا مواد تیار کر دیا تھا، لیکن ان کا تقرر شعبۂ فارسی میں ریڈر کی اسامی پر ہو گیا۔ ان کی جگہ احمد صدیق مجنوں گورکھپوری کی تقرری ہوئی۔

یہ واقعہ ہے کہ ''علی گڑھ تاریخ ادب اردو'' کی پہلی جلد منصۂ شہود پر آئی تو اس پر سخت ردعمل سامنے آیا۔ بقول سرور صاحب:

''پہلی جلد کی طباعت کا سارا کام ٹائپ میں ہوا تھا۔ اس کے پروف توجہ سے نہ پڑھے گئے چنانچہ طباعت کی بہت سی غلطیاں رہ گئیں۔ اشاریہ بھی بہت ناقص تھا۔ جب ۱۹۶۲ء میں کتاب شائع ہوئی تو طباعت کے اغلاط اور اشاریہ کی خامیوں پر رشید حسن خاں نے ''تحریک'' میں ایک مضمون لکھا۔ پہلی جلد کے سارے مضامین مستند محققین اور ناقدین سے لکھوائے گئے تھے اور مجموعی طور پر اس میں جو نقشہ پیش کیا گیا تھا وہ خاصا جامع تھا۔ مگر ان اعتراضات سے جو بڑی حد تک طباعت کے اغلاط اور اشاریہ کی خامی اور ترجمے میں بعض اصطلاحوں سے متعلق تھے، میں بڑا دل برداشتہ ہوا اور میں نے کتاب کی فروخت روک دی''

(خواب باقی ہیں۔ ص ۱۹۶)

لیکن یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اشاریہ ناقص تھا اور ترجمہ میں اصطلاحات کی خامی تھی، ایسی صورت میں سرور صاحب نے اس کی طباعت کی اجازت کیوں دی؟ بحیثیت صدر شعبہ اور ڈائرکٹر کے انہیں اس کام کو ترجیح دینی چاہیے تھی اور صبر و تحمل سے کام لیتے ہوئے پہلی جلد کی صحت پر نظر ثانی کے ساتھ ساتھ باقی جلدوں کو بہتر صورت میں شائع کرنے کی فکر کرنی چاہیے تھی۔ لیکن ہوا یہ کہ انہوں نے رشید حسن خاں کے تبصرہ کو اپنے انا کا مسئلہ بنا لیا اور اپنا فریضہ بھول گئے۔ جس کے پاداش میں شعبۂ اردو کا وقار اور خود سرور صاحب کی شخصیت مجروح ہوئی۔

پروفیسر گیان چند نے تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''علی گڑھ تاریخ ادب اردو کی پہلی

www.taemeernews.com

جلد کے بعد کوئی جلد نہ نکلی اور رشید حسن خاں کے تبصرے کی وجہ سے پہلی جلد کی فروخت بھی روک دی گئی۔ سرور صاحب نے مجنوں گورکھپوری کو اسسٹنٹ ڈائرکٹر مقرر کیا تھا۔ یہ انتخاب بالکل غلط تھا...... تاریخ ادب کو تیار کرنا صرف مجنوں صاحب بلکہ خود سرور صاحب کی بھی صلاحیتوں سے ماورا چیز ہے۔ اگر سرور صاحب اس کی ذمہ داری اپنے شعبہ کے ریڈر ڈاکٹر مسعود حسین خاں پر ڈال دیتے تو مجھے یقین ہے کہ وہ بعد کی جلدیں بھی تیار کرا دیتے۔ جہاں تک تجزیے تنقید کا تعلق ہے میں کہوں گا کہ رشید حسن خاں کے جملہ اعتراضات کے باوجود علی گڑھ تاریخ ادب اردو میں بیش قیمت معلومات موجود ہیں۔ پہلی جلد کی فروخت اسی صورت میں روکنی چاہیے تھی جب اس کو نظر ثانی کرا کر شائع کرنا یقینی ہوتا، ورنہ اس کے بالکل غیاب سے تو اس کی ناقص ہیئت ہی زیادہ مفید تھی۔ معترض کے اعتراض کو ایک چیلنج سمجھ کر بعد کی جلدوں کو اور بہتر شکل میں پیش کرنا چاہیے تھا۔ میدان چھوڑ کر بھاگ جانا کوئی ہنر نہیں۔"

(سرور صاحب کی خود نوشت: خواب باقی ہیں۔ مشمولہ "پروفیسر آل احمد سرور: شخصیت اور ادبی خدمات۔ کتاب نما۔ نئی دہلی ۱۹۹۲ء ص ۲۰)۔

بہرصورت زیدی صاحب نے ۱۹۵۸ء میں سرور صاحب کو یونیورسٹی کی تہذیبی سرگرمیوں کا نگراں مقرر کیا۔ ان کی صدارت کے زمانہ میں مونس رضا اور ڈاکٹر خورشید الاسلام بالترتیب ایک ایک سال سکریٹری رہے۔ اس زمانہ میں یونیورسٹی سے کئی اچھے فنکار ابھرے، ان میں نصیر الدین شاہ کا نام قابل ذکر ہے۔ ان کے علاوہ کلچرل کمیٹی کی سرگرمیوں میں ڈاکٹر منیب الرحمٰن، خواجہ مسعود علی ذوقی اور زاہدہ زیدی نے اہم رول ادا کیا۔

حکومت ہند کی جانب سے سرور صاحب نے اگست ۱۹۶۰ء میں انٹرنیشنل اورینٹلسٹ کانگریس ماسکو (روس) کے اجلاس میں شرکت کی۔ جس میں انہوں نے "جدید اردو ادب کے میلانات" پر انگریزی میں مقالہ پیش کیا۔ واپسی پر دسمبر ۱۹۶۰ء میں انہیں آفتاب ہال کے پرووسٹ کی ذمہ داری سپرد ہوئی اور ۱۹۶۱ء کے شروع میں یونیورسٹی کے Executive Council کے رکن نامزد ہوئے۔ اس سے قبل ۱۹۶۰ء میں انہیں اتفاق رائے سے اسٹاف اسوسی ایشن کا صدر منتخب کیا گیا تھا۔ اس زمانہ میں اساتذہ کے گریڈ پر نظر ثانی ایک اہم مسئلہ تھا۔ اس سلسلے میں سرور صاحب کی سربراہی میں ایک وفد نے یو۔ جی۔ سی کے صدر ڈاکٹر سی۔ ڈی۔ دیش مکھ سے مل کر ایک میمورنڈم پیش کیا۔ جس میں اساتذہ کی تنخواہ حکومت کے اول گریڈ کے مطابق دینے کی سفارش کی گئی تھی، جسے صدر نے منظوری دے دی۔

۱۹۶۴ء میں سرور صاحب کو ساہتیہ اکیڈمی کا اردو کنوینر نامزد کیا گیا اور اسی سال انہیں فیکلٹی آف آرٹس کے ڈین کی ذمہ داری تفویض ہوئی۔

www.taemeernews.com

اب ان کی مصروفیات کا دائرہ مزید وسیع ہو گیا۔
نواب علی یاور جنگ بحیثیت وائس چانسلر کے اپریل ۱۹۶۵ء میں علی گڑھ آئے۔ ان کے متعلق یہ افواہ تھی کہ انہوں نے عثمانیہ یونیورسٹی (حیدر آباد) میں اپنی وائس چانسلری کے زمانے میں مسلم طلباء کے حقوق کو نظر انداز کیا ہے۔ ۲۵/ اپریل ۱۹۶۵ء کو کورٹ کی میٹنگ میں ان کے خلاف مظاہرہ ہوا۔ طلباء نے یونین ہال پر پتھراؤ کیا جس سے ہال کے تمام شیشے ٹوٹ گئے۔ وائس چانسلر اور دوسرے اساتذہ کو سخت چوٹیں آئیں۔ سرور صاحب کو ایک گروپ نے گھیر لیا۔ وہ سر میں پیچھے سے اور پیشانی پر پتھر لگنے سے پوری طرح لہولہان ہو گئے۔ ایک دوسرے طالب علم نے ان کی انگلی مروڑ دی جو تاحیات کام کے لائق نہیں رہی۔ ان کے کسی شاگرد نے انہیں طلباء کے ہجوم سے نکالا۔ وہ جوں توں اسٹاف کلب پہنچے جہاں انکے داماد ڈاکٹر عبدالجلیل اور ان کے دوست ڈاکٹر انس ان کی تجسس میں تھے۔ دونوں انہیں سہارا دے کر ان کے گھر ا۔ شبلی روڈ لائے اور مرہم پٹی کی۔ بقول سرور صاحب ہفتوں بعد طبیعت سنبھلی لیکن اس حادثے کا میرے اعصاب پر گہرا نقش مرتب ہوا۔

۱۹۶۶ جون ۱۹۶۶ء میں کابل (افغانستان) میں بین الاقوامی ترجمہ سمینار منعقد ہوا۔ اس وقت کے وائس چانسلر علی یاور جنگ کی تحریک پر سرور صاحب نے اس سمینار میں بحیثیت مشاہد (Observer) کے شرکت کی۔ یہ سمینار ادارہ فرانکلن کے زیر اہتمام کابل یونیورسٹی میں منعقد ہوا جس کا موضوع ''فارسی میں تراجم کی صورت حال'' تھا۔ ستمبر ۱۹۶۹ء میں سرور صاحب بحیثیت وزیٹنگ پروفیسر کے شکاگو یونیورسٹی (امریکہ) گئے جہاں چھ ماہ تک جنوبی ہند کی زبانوں کے مرکز میں کام کیا۔ ابھی وہ شکاگو میں تھے کہ حکومت ہند نے انہیں کلچرل اکسچنج پروگرام (Cultural Exchange Programme) کے تحت ہنگری اور پولینڈ جانے کی دعوت دی۔ چنانچہ وہ وہیں سے آخر مارچ ۱۹۷۰ء میں مانٹریال کے لیے رخصت ہو گئے۔ چند روز مانٹریال میں قیام کیا پھر لندن ہوتے ہوئے اپنے بیٹے جاوید احمد سے ملنے جرمنی گئے۔ اس سفر میں سرور صاحب کی اٹلی دیکھنے کی خواہش بھی پوری ہوئی۔ اس طرح وہ کم وبیش آٹھ ماہ بعد ۲۸/ اپریل ۱۹۷۰ء کو علی گڑھ آ گئے۔

سرور صاحب حکومت ہند کی تحریک پر دوسری بار کلچرل اکسچنج پروگرام (Cultural Exchange Programme) کے تحت ۱۹۷۲ء میں رومانیہ، ہنگری، اور سوویت یونین کے دورے پر گئے۔ اسی سال انہیں ملازمت میں ایک سال کی توسیع دی گئی۔ سرور صاحب کو عبدالعلیم صاحب (وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) سے یہ حسن ظن تھا کہ وہ انہیں عرصے سے جانتے ہیں اور ان کی خدمات سے بھی واقف ہیں، لہذا ملازمت میں توسیع کا سلسلہ آئندہ بھی چلتا رہے گا، لیکن ایسا ہوا نہیں۔ ۱۹۷۲ء میں وزیر تعلیم ڈاکٹر نورالحسن نے یونیورسٹی کا نیا ایکٹ نافذ کیا۔ بقول سرور صاحب ''جس میں نامزدگی پر زیادہ زور دیا گیا تھا اور انتخاب پر کم'' سرور صاحب نے اس کے خلاف احتجاج کیا اور

www.taemeernews.com

نیشنل ہیرالڈ میں سخت مضمون لکھا۔ علاوہ ازیں انہوں نے اسٹاف اسوسی ایشن کے بعض ممبران کے ہمراہ وزیر اعظم، صدر جمہوریہ اور وزیر تعلیم سے ملاقات کی لیکن نتیجہ کچھ بھی نہ نکلا۔ البتہ یہ ضرور ہوا کہ انہیں ملازمت میں مزید توسیع نہیں ملی۔ اس طرح سرور صاحب ۷/اکتوبر ۱۹۷۳ء کو شعبۂ اردو سے سبکدوش ہو گئے۔

سرور صاحب نے اپنے زمانہ سربراہی میں شعبۂ اردو کی ہمہ جہت ترقی کی کوشش کی۔ ان کی خصوصی توجہ اور محنت سے اگست ۱۹۶۸ء میں شعبہ کو لسانیات کے پروفیسر کی جگہ تفویض ہوئی جس پر ڈاکٹر مسعود حسین خاں کی تقرری عمل میں آئی۔ بعد ازاں ان کی مساعی جمیلہ سے لسانیات کا الگ شعبہ قائم ہوا۔ سرور صاحب نے اپنے زمانہ اقتدار میں متعدد سمینار کا انعقاد کیا، ان میں ''نثر کا اسلوب''، ''تنقید کے بنیادی مسائل''، ''جدیدیت اور ادب''، ''غالب''، ''اردو فکشن'' اور ''اقبال'' قابل ذکر ہیں۔ ان میں پہلے اور آخری موضوع سے قطع نظر باقی تمام سمینارس کے مقالات کو کتابی صورت میں شائع کیا۔ جن کی ادبی حلقوں میں پذیرائی ہوئی۔

شعبۂ اردو سے وابستگی کا یہ دوسرا دور (یکم دسمبر ۱۹۵۵ء تا ۷/اکتوبر ۱۹۷۳ء) مصروفیات کے اعتبار سے سرور صاحب کی زندگی کا طوفانی دور تھا۔ اس کے باوجود انہوں نے لکھنے پڑھنے کا اپنا محبوب مشغلہ جاری رکھا اور مختلف موضوعات کے تحت اپنے افکار کے دیے روشن کرتے رہے۔ جو بعد میں کتابی صورت میں ''نظر اور نظریے'' (۱۹۷۳ء) اور 'مسرت سے بصیرت تک'' (۱۹۷۴ء) شائع ہوئے۔

شعبۂ اردو سے سبکدوشی کے بعد سرور صاحب نے ساری توجہ انجمن کی طرف مبذول کر دی۔ انہوں نے انجمن کے صدر آنند نرائن ملا کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ اگر وہ ایک ہزار روپیہ ماہانہ مشاہرہ طے کر دیں تو وہ (سرور صاحب) انجمن کی کل وقتی خدمت کریں گے۔ لیکن انہوں نے انجمن کی مالی حالت کے پیش نظر معذرت کر لی۔ دریں اثنا سرور صاحب کی تقرری بحیثیت وزیٹنگ فیلو کے انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ایڈوانسڈ اسٹڈیز شملہ میں ہو گئی جہاں انہیں اردو ادب پر انگریزی ادب کے اثرات پر کام کرنا تھا۔ انہوں نے انجمن سے استعفیٰ دے دیا اور صدر کے مشورہ سے انجمن کی ذمہ داری ڈاکٹر خلیق انجم کے سپرد کر دی۔ انجمن سے وابستگی کے زمانہ میں دوسرے کاموں کے علاوہ ''ہماری زبان'' کے لیے ہر ہفتہ اداریہ لکھنا اور ''اردو ادب'' مرتب کرنا ان کے فرائض میں شامل تھا۔

سرور صاحب ابھی شملہ میں تھے کہ سید رضی الحسن چشتی (وائس چانسلر، کشمیر یونیورسٹی) کا پیغام آیا کہ کشمیر یونیورسٹی میں اقبال چیر قائم ہو رہی ہے، شیخ عبداللہ (وزیر اعلیٰ کشمیر) کی خواہش ہے کہ آپ کشمیر آ جائیں۔ لہٰذا وہ مئی ۱۹۷۷ء میں بحیثیت اقبال پروفیسر کے کشمیر یونیورسٹی چلے گئے۔ بعد ازاں ۱۹۷۹ء میں وہاں اقبال انسٹی ٹیوٹ قائم ہوا تو سرور صاحب اس کے اوّلین ڈائرکٹر مقرر ہوئے۔ جہاں انہوں نے ستمبر ۱۹۸۷ء تک خدمات انجام دیں۔ دریں اثنا انہوں نے بین الاقوامی اقبال کانگریس لاہور (پاکستان) میں بالترتیب دسمبر ۱۹۷۷ء اور ۱۹۸۳ء میں شرکت

www.taemeernews.com

کی۔ اور دسمبر ۱۹۷۸ء میں انہیں صدر پاکستان کا طلائی تمغہ برائے اقبالیات سے سرفراز کیا گیا۔ بعد ازاں وہ اکتوبر ۱۹۸۷ء میں باضابطہ علی گڑھ آ گئے۔ کشمیر میں قیام کے زمانے میں سرور صاحب کو اقبالیات پر یکسوئی سے کام کرنے کا زریں موقع ہاتھ آیا۔ جس کا بیّن ثبوت یہ ہے کہ اس زمانے میں ان کی متعدد کتابیں منظر عام پر آئیں۔ ان میں ''عرفان اقبال'' (۱۹۷۷ء) اقبال اور ان کا فلسفہ'' (۱۹۷۷ء) ''اقبال کے مطالعہ کے تناظرات'' (۱۹۷۸ء) ''اقبال نظریہ اور شاعری (نظام خطبات، دہلی یونیورسٹی ۱۹۷۹ء) '' ہندوستان کدھر'' ۱۹۸۳ء '' جدید دنیا میں اسلام'' (۱۹۸۳ء) ''اردو میں دانشوری کی روایت'' (۱۹۸۵ء) ''اقبال، فیض اور ہم'' (اردو مرکز، لندن ۱۹۸۵ء) اور ''اقبال کی معنویت'' (۱۹۸۶ء) قابل ذکر ہیں۔

کشمیر سے واپس آنے پر سرور صاحب نے اپنے مضامین، مسودے، اشعار اور مشاہیر کے خطوط کو جمع کرنا شروع کیا۔ ان کی خواہش تھی کہ ان میں جو جواہر ریزے ہیں وہ کتابی صورت میں آ جائیں۔ ان کی یہ کوشش بارآور ثابت ہوئی اور ''پہچان اور پرکھ (۱۹۹۰ء)'' ''خواب باقی ہیں'' ''خود نوشت) (خواب اور خلش'' (شعری مجموعہ ۱۹۹۱ء) ''فکر روشن'' (۱۹۹۴ء) '' کچھ خطبے کچھ مقالے'' (۱۹۹۴ء) '' دانشور اقبال'' (۱۹۹۴ء) ''مجموعہ تنقیدات'' (۱۹۹۴ء) '' اردو تحریک'' (۱۹۹۹ء) اور '' افکار کے دیئے'' (۲۰۰۰ء) زیور طبع سے آراستہ ہوئے۔ علاوہ ازیں ''خواب اور خلش'' کے بعد کی شاعری کو انہوں نے ''لفظ'' کے نام سے مرتب کر لیا تھا لیکن افسوس کہ ان کی ناگہانی موت کے سبب یہ مجموعہ شائع نہیں ہو سکا۔

سرور صاحب ایک عرصے سے صاحب فراش تھے، لکھ نہیں سکتے تھے لیکن دل و دماغ کے اعتبار سے چاق و چوبند تھے۔ انہیں کسی نئی اور اہم کتاب کا علم ہوتا تھا تو اسے بلا تاخیر پڑھنے کی فکر کرتے تھے اور اپنے لخت ہای جگر کو ڈکٹیٹ کرا کر صفحۂ قرطاس پر نقش کراتے رہے۔ دریں اثنا ان کی مجموعی خدمات کے اعتراف میں کشمیر یونیورسٹی نے ۱۹۸۹ء میں انہیں ڈی۔ لٹ کی اعزازی ڈگری سے مشرف کیا۔ جبکہ ۱۹۹۰ء میں انہیں شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں پروفیسر ایمرٹیس مقرر کیا گیا۔

سرور صاحب ان چند خوش نصیب اشخاص میں سے تھے جن کی شخصیت اور خدمات کا اعتراف ان کی حیات میں کیا گیا۔ شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس کے زیر اہتمام سرور صاحب کے اعزاز میں نہایت تزک و احتشام سے دو روزہ (۲۴۔۲۵ر فروری ۲۰۰۱ء) قومی سمینار کا انعقاد ہوا۔ جس میں ملک کے ممتاز ادیبوں اور دانش وروں نے شرکت کی۔ صدر شعبہ پروفیسر اصغر عباس کی خصوصی توجہ سے سمینار میں پڑھے گئے مقالات کا مجموعہ '' ارمغان سرور'' کے نام سے منظر عام پر آ چکا ہے جسے سرور شناسی کی راہ میں ایک اہم اضافہ تسلیم کیا جاتا ہے۔

سرور صاحب کی علمی اور ادبی خدمات کے اعتراف میں حکومت ہند اور مختلف اکیڈمیوں نے

www.taemeernews.com

انعامات اور اعزازات سے ان کی عزت افزائی کی، ان میں ''اتر پردیش اردو اکیڈمی انعام'' (بالترتیب چار بار ۱۹۵۱ء، ۱۹۷۳ء، ۱۹۷۴ء اور ۱۹۷۸ء) ساہتیہ اکیڈمی انعام (۱۹۷۴ء) پدم بھوشن (۱۹۹۲ء) اور حکومت مدھیہ پردیش کا سب سے بڑا ادبی انعام ''اقبال سمان'' (۲۰۰۱ء) قابل ذکر ہیں۔

سرور صاحب کی زندگی کے آخری چند سال نہایت تکلیف دہ اور صبر آزما ثابت ہوئے۔ پہلے ان پر فالج کا حملہ ہوا جس سے وہ صاحب فراش ہو گئے تھے، پھر جواں سال بیٹے جاوید احمد کے انتقال کے غم سے وہ اُبر بھی نہ سکے تھے کہ جنوری ۲۰۰۲ء میں داماد ڈاکٹر عبدالجلیل کا سانحہ ارتحال پیش آ گیا۔ ان پے در پے حادثات اور صدمات سے وہ بجھ سے گئے تھے۔ آخرش ۹ر فروری ۲۰۰۲ء کی شب پیغام اجل آ پہنچا اور آسمانِ علم و دانش کے اس درخشاں ستارہ کو ہمیشہ کے لیے گہن لگ گیا۔ سرور صاحب نہ رہے لیکن انہوں نے کم و بیش سات دہائیوں پر محیط علمی، ادبی، صحافتی، تہذیبی اور ثقافتی میدان میں جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں وہ اردو زبان و ادب کا ایک قابل فخر سرمایہ ہے۔ جس کی روشنی سے ایوانِ اردو میں ہمیشہ چراغاں رہے گا۔

☆☆☆

نقد و نظر ←

www.taemeernews.com

شمس الرحمن فاروقی*

غالب، جدید ذہن اور آل احمد سرور

یہ بات شاید غلط نہ ہو کہ گذشتہ پچاس ساٹھ برس میں ہم لوگوں نے جس شاعر کو سب سے زیادہ پڑھا ہے وہ غالب ہیں اور جس شاعر کے بارے میں سب سے زیادہ پڑھا ہے وہ بھی غالب ہیں۔ اس کے کئی اسباب ہیں جن میں ہماری قومی سیاست، ادبی تہذیب و تاریخ اور ادبی سیاست کے بعض اہم پہلوؤں کے علاوہ ہماری ادبی تاریخ کے کچھ اتفاقات بھی یقیناً شامل ہوں گے۔ مثلاً یہ اتفاق ہی تھا کہ مومن اور ذوق دونوں ہی انقلاب ۱۸۵۷ء کے پہلے اللہ کو پیارے ہوئے (مومن، ۱۸۵۲ء اور ذوق ۱۸۵۴ء)۔ اس طرح ۱۸۵۷ء کے بعد کی نئی دنیا میں غالب کے لیے میدان خالی ہو گیا تھا اور یہ بھی اتفاق تھا کہ حالی نے غالب کی شاگردی اختیار کی اور پھر وہ شیفتہ اور ان کے بعد محمد حسین آزاد، ڈاکٹر لائٹنر، اور کرنل ہالرائڈ کے اثر میں آئے۔ اور یہ سب سے بڑا اتفاق تھا کہ حالی کے مزاج کو سیرت نگاری سے لگاؤ تھا۔ بصورت دیگر وہ ''یادگار غالب'' نہ لکھتے، اور غالب کی ''دریافت'' یا ''دریافت نو'' کے لیے ہمیں خدا معلوم کتنی مدت انتظار کرنا پڑتا۔ یہ سب صحیح، لیکن ان سب سے بڑھ کر ایک واحد سبب ہمارے زمانے میں غالب کی مسلسل اور ہمہ گیر مقبولیت کا یہ ہے کہ غالب کی اردو نظم ونثر (نظم زیادہ نثر کم لیکن پھر بھی بہت حد تک) نئے زمانے کے ذہن، اور ذہن ہی نہیں، نئے زمانے کے حالات کی آئینہ دار معلوم ہوتی ہے۔ اور اب تو غیر اردو حلقے بھی اکثر اس بات کو تسلیم کرنے لگے ہیں کہ ہندوستان کے پہلے جدید شاعر غالب ہیں۔ غالب کے یہاں جدید ذہن کی واضح یا مضمر پیش آمد، اور پیش آمد ہی نہیں، جدید ذہن کے باقاعدہ اظہار کے بارے میں گذشتہ پچاس ساٹھ برس میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ لیکن ''یادگار غالب'' (۱۸۹۷ء) سے غالب پر تحریروں کا جو سلسلہ شروع ہوا اس نے یہ بات فوری طور پر ثابت کر دی تھی کہ غالب ایسے شاعر ہیں جن پر نئے لوگ نئے انداز میں گفتگو کر سکتے ہیں۔ یہ مرتبہ میر کو بہت بعد میں ملا۔ مندرجہ ذیل مختصر فہرست پر غور کیجیے:

---

* مشہور نقاد، ادیب، شاعر، محقق و دانشور، ۲۹، ہیسٹنگ روڈ، الہ آباد۔

www.taemeernews.com

مقدمہ شعر و شاعری از حالی، ۱۸۹۳ء
یادگارِ غالب از حالی، ۱۸۹۷ء
حل مشکلات غالب از شوکت میرٹھی، ۱۸۹۹ء
شرح دیوان غالب از نظم طباطبائی، ۱۹۰۰ء
نظم ''مرزا غالب'' از اقبال، ۱۹۰۵ء کے پہلے
مضمون، Ghalib:An Appreciation
از صلاح الدین خدا بخش، ۱۹۱۲ء
مضمون، ''غالب کا فلسفہ'' از عبدالماجد دریابادی، ۱۹۱۳ء
محاسن کلام غالب از عبدالرحمٰن بجنوری، ۱۹۱۸ء، ۱۹۲۱ء
Ghalib: A Critical Appreciation of his Life and Urdu Poetry
از سید عبداللطیف، ۱۹۲۸ء
غالب نامہ، از شیخ محمد اکرام، ۱۹۳۶ء
مضمون، ''غالب کی بت شکنی'' از سید احتشام حسین، ۱۹۴۷ء
مضمون، ''غالب کی عظمت'' از آل احمد سرور، ۱۹۴۹ء
مضمون، ''غالب کا تفکر''، از سید احتشام حسین، ۱۹۵۰ء

ان سب تحریروں میں، حتیٰ کہ ''یادگارِ غالب'' میں بھی، غالب کے بارے میں جو باتیں کہی گئی ہیں وہ غالب سے پہلے کسی شاعر کے بارے میں نہیں کہی گئیں۔ اس بات سے قطع نظر کریں کہ وہ باتیں صحیح ہیں یا غلط، آپ صرف یہ ملاحظہ کریں کہ ''نکات الشعرا'' (۱۷۵۲ء) سے تنقید کی روایت ہمارے یہاں شروع ہوتی ہے، اور اس کا اختتام (اور ایک نئی روایت کا آغاز) ''آبِ حیات'' میں نظر آتا ہے۔ اس پوری روایت میں جس قسم کی تنقید، تحسین، تنقیص لکھی گئی، اس میں حسب ذیل طرح کی باتیں نظر نہیں آتیں۔ ان باتوں کے پس پشت جو مفروضات ادب کے بارے میں ہیں ان کا بھی کوئی سراغ ہمارے تذکروں میں نہیں ملتا ہے۔ میں ''یادگارِ غالب'' سے چند عبارتیں پیش کرتا ہوں۔ سب اقتباسات شیخ مبارک علی، لاہور، کے ۱۹۳۰ء کے ایڈیشن سے لیے گئے ہیں:

۱۔ [غالب کی زبان سے حالی کہتے ہیں] افسوس کہ لوگوں نے میرے کلام کی خوبی کو نہ سمجھا، اور زیادہ تر افسوس یہ کہ وہ شانِ ایزدی کی شناخت سے محروم رہے (صفحہ ۴۴)۔

۲۔ مرزا نے...... اول اردو طرح کی غزل اور اس کے بعد فارسی کی غیر طرح نہایت پر درد آواز میں پڑھی۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا مجلس میں کسی کو اپنا قدرداں نہیں پاتے (صفحہ ۵۴)۔

۳۔ جو زور ان کی تشبیہوں میں پایا جاتا ہے وہ مدح میں آکر باقی نہیں رہتا۔ مگر ہم اس کو ان کی شاعری پر محمول نہیں کرتے، بلکہ غایت درجے کی سلامت ذہن اور استقامت طبع کی دلیل جانتے ہیں۔ جھوٹی اور بے اصل باتوں کو چمکانا، اور زمین و آسمان کے قلابے ملانا اور مبالغہ و اغراق کا طوفان اٹھانا فی الحقیقت شاعر کا کمال نہیں ہے، بلکہ جس قدر اس کی طبیعت ان باتوں سے ابا کرتی ہے، اسی قدر جاننا چاہیے کہ وہ شاعری سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔ (صفحہ ۷۱)

۴۔ وہ باوجودے کہ ایسی سوسائٹی میں گھرے ہوئے تھے جس میں سلف کی تقلید سے ایک قدم تجاوز کرنا ناجائز سمجھا جاتا تھا، اپنے فن میں محققانہ چال چلتے تھے اور اندھادھند اگلوں کی تقلید نہ کرتے تھے (صفحہ ۷۸)۔

www.taemeernews.com

۵۔ مرزا کی شاعری اکتسابی نہ تھی (صفحہ ۹۶)۔

۶۔ مرزا ... عام روش پر چلنے سے ہمیشہ ناک چڑھاتے تھے (صفحہ ۱۰۴)۔

۷۔ البتہ ہم کو مرزا کے عمدہ اشعار کے جانچنے کے لیے ایک جداگانہ معیار مقرر کرنا پڑے گا (صفحہ ۱۰۷)۔

۸۔ [غالب کے ایک شعر کے بارے میں کہتے ہیں] بالکل نیا اور اچھوتا اور باریک خیال ہے.... اگر کسی کی سمجھ میں نہ آئے تو اس کی فہم کا قصور ہے (صفحہ ۱۰۹)۔

۹۔ [غالب کے دو شعروں کے بارے میں کہتے ہیں] یہ نرا خیال ہی نہیں بلکہ فیکٹ ہے... ایک فیکٹ کے بیان میں ایسے متناسب محاورات کا دستیاب ہو جانا عجیب اتفاق ہے (صفحہ ۱۱۳)۔

۱۰۔ مرزا نے استعارہ و کنایہ و تمثیل کو جو کہ لٹریچر کی جان ہے اور شاعری کا ایمان ہے، اور جس کی طرف ریختہ گو شعرا نے بہت کم توجہ کی ہے، ریختہ میں بھی اپنے فارسی کلام سے کم استعمال نہیں کیا (صفحہ ۱۱۵)۔

مندرجہ بالا اقتباسات سے جو نتائج نکلتے ہیں ان کا تجزیہ یہاں مقصود نہیں۔ یہ بات تو میں کہہ ہی چکا ہوں کہ حالی نے غالب کے بارے میں اوپر کے اقتباسات میں جو کہا ہے وہ کسی تذکرے میں، کسی کلاسیکی شاعر کے بارے میں نہیں کہا گیا۔ لطف یہ ہے کہ حالی نے یہ باتیں اس انداز میں کہی ہیں کہ ان کے مضمرات کو کسی تنقیدی نظریے، یا کسی پرانے استاد، یا کسی مستند کتاب، کی پشت پناہی کی ضرورت نہیں۔ وہ یوں گفتگو کر رہے ہیں گویا ان کی باتیں قیاس قبل تجربہ (A priori) حقائق کا حکم رکھتی ہیں۔ اس کا نتیجہ صرف یہ نہ ہوا کہ غالب کی جدیدیت قائم ہوئی، بلکہ یہ بھی ہوا کہ غالب کے علاوہ تمام اردو شاعروں کی شاعرانہ حیثیت نہیں تو شاعرانہ مرتبہ ضرور معرض شک میں آ گیا۔

مختصراً، حالی نے بعد میں آنے والوں کے لیے لائحۂ عمل، راستہ، اور طریق کار سب متعین کر دیے۔ دوسری بات یہ قابل غور ہے کہ حالی سے لے کر آل احمد سرور تک ایک طویل سلسلہ ہے، غالب پر اہم تحریریں دو چار دس برس کے وقفے سے سامنے آتی رہی ہیں۔ اور یہ تحریریں صرف اہم نہیں ہیں، بلکہ ایسی ہیں جنھیں Seminal بھی کہا جا سکتا ہے۔ ایسی تحریریں (یا خیالات) جو مزید خیالات اور افکار کی پیدائش کا بیج اپنے اندر رکھیں، انھیں Seminal یعنی تخم تیج افزا کہا جائے گا۔

لہٰذا غالب کے ذہن اور کلام میں جو جدید عناصر تھے انہوں نے حالی، اور ان کے بعد کے تمام نقادوں کو متاثر کیا۔ اور غالب کے بارے میں ہر تخم تیج افزا (Seminal) تحریر نے نئی تحریروں کے لیے راستے نکالے۔ یعنی ایک طرف تو غالب کے کلام نے جدید ذہن کو متاثر کیا، اور دوسری طرف جدید ذہن نے غالب کی تفہیم اور تنقید کو متاثر کیا۔ مثال کے طور پر، آل احمد سرور اپنے مضمون ''غالب کی عظمت'' (۱۹۴۹ء) کے پہلے ہی پیراگراف میں حالی کا نام لیتے ہیں:

> [غالب] سے پہلے کئی شاعروں کی شخصیت قابل توجہ ہے مگر کسی میں اتنی رعنائی اور رنگینی نہیں ہے۔ حالی نے

www.taemeernews.com

''یادگار غالب'' میں اسی لیے ان کی جامعیت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

یہاں تک تو استاد کی بات تھی، لیکن آل احمد سرور اگلے ہی جملے میں ایک بنیادی اصول بیان کرتے ہیں:

> اس شخصیت کے اثر سے ان کی شاعری پہلو دار اور تہ دار ہے۔

آپ اس بیان سے متفق ہوں یا نہ ہوں (میں متفق نہیں ہوں)، لیکن اس سے تین باتیں فوراً نکلتی ہیں:

۱۔ یہ بیان حالی کے بیان پر اضافہ ہے، اگر چہ ''یادگار غالب'' نہ ہوتی تو یہ بیان بھی وجود میں نہ آتا۔

۲۔ اس بیان میں نظری اور عملی تنقید [یہ بیان حالی کے بیان پر اضافہ ہے، اگر چہ ''یادگار غالب'' نہ ہوتی تو یہ بیان بھی وجود میں نہ آتا] بیک وقت موجود ہے۔ نظری بات تو یہ کہ شخصیت کا اثر شاعری پر بہت دور تک اور بہت گہرا پڑتا ہے، اور عملی تنقید یہ ہے کہ غالب کا کلام ''پہلو دار'' اور ''تہ دار'' ہے۔

۳۔ ''تہ دار'' کی اصطلاح اردو میں سب سے پہلے میر نے استعمال کی تھی۔ ''پہلو دار'' کا بھی جواز میر کے یہاں مل سکتا ہے ('طرفیں رکھے ہے ایک سخن چار چار میر')، لیکن یہ بھی ممکن ہے آل احمد سرور اسے کسی اور معنی میں استعمال کر رہے ہوں۔ لہٰذا آل احمد سرور اگر چہ نئے زمانے کے نقاد ہیں اور نئی اصطلاحیں بھی بنا لیتے ہیں لیکن وہ پرانے لوگوں کی تعریفات اور انواع (categories) کو بھی ذہن میں رکھتے ہیں۔

غالب پر جو تنقید ہمارے یہاں ہوئی اس میں کچھ تو سراسر حالی کی تقلید میں تھی اور وہ حالی کے ہی سر کیے ہوئے میدانوں میں تگ وتاز کرتی رہی۔ اور کچھ ایسی تھی جس نے حالی سے فائدہ اٹھایا، لیکن حالی پر اضافہ کیا، یا کوئی نئی بات اپنی اپج سے نکالی۔ نئی بات کی مثال آل احمد سرور کے اسی مضمون سے دیکھتے ہیں:

> ۱۔ [دور اول کے] اشعار میں ایک رومانیت جھلکتی ہے جو اس زمانے کے کلاسیکل معیاروں سے مطمئن نہیں ہے لیکن جسے ابھی زندگی کے رومان کے بجائے خیالی طلسمات پسند آتے ہیں۔

یہاں سب سے زیادہ توجہ انگیز بات یہ ہے کہ شاعری میں رومانیت (Romanticism) اور زندگی میں رومان کو دو الگ حقیقتیں مانا گیا ہے۔ زندگی کے رومان سے مراد وہ سارا تحیر، وہ ساری کش مکش، وہ مایوسیاں اور سرمستیاں، وہ کامرانیاں اور سرکشیاں ہیں جن سے انسان کی زندگی عبارت ہے۔ اور شاعری میں رومانیت سے مطلب ہے تخیل کو واقعے پر فوقیت دینا، انفرادی ادراک اور احساس کو اجتماعی یا پنچایتی ادراک اور طرز احساس پر مرجح ٹھہرانا، بلکہ پنچایتی طرز احساس و ادراک کو بالکل مسترد کر دینا۔ عبدالرحمٰن بجنوری نے اپنے مختصر اور وہ بھی نامکمل رسالے میں اپنے وقت کے قریب قریب سب کے سب مشہور، اور بعض نسبتاً کم مشہور فلسفیوں

www.taemeernews.com

کے تصورات اور غالب کے افکار میں مماثلت دیکھی ہے۔ ادیبوں اور شاعروں کے نام ان کے یہاں کم ہیں ، اور رومانی شعراء میں انہوں نے صرف ورڈز ورتھ (Wordsworth) کا نام لیا ہے۔ ہاں اگر فرانس کے علامت نگاروں کو رومانی (رومانیت سے متاثر) کہا جائے تو پھر بجنوری کی فہرست شعرائے رومانی میں ورلن (Verlaine)، رین بو (Rimbaud) اور ملارمے (Mallarme) کا اضافہ ہو سکتا ہے۔ ہائنہ (Heine) یقیناً رومانی شاعر تھا، لیکن بجنوری نے صلاح الدین خدا بخش کے مضمون کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ صلاح الدین خدا بخش نے غالب کو ہائنہ کے مماثل ٹھہرایا ہے، کہاں غالب اور کہاں ہائنہ۔ متذکرہ بالا مغربی شعراء کا ذکر بجنوری کے یہاں سرسری اور اکا دکا مثالوں (جن میں سے بعض پوری طرح مناسب بھی نہیں) پر مشتمل ہیں۔ لیکن جس مغربی شاعر کو بجنوری نے بطور خاص غالب کا ہم نگاور بتایا ہے وہ گوئٹے ہے۔ گوئٹے کے بارے میں بجنوری نے اس مضمون میں تمام مغربی شعراء سے زیادہ لکھا ہے۔ گوئٹے کو جدید زمانے میں یورپ کا سب سے بڑا کلاسیکی شاعر کہا گیا ہے۔ رومانی ادیبوں کے بارے میں اس کا مشہور جملہ ہے کہ وہ لوگ "یوں لکھتے تھے گویا وہ بیمار ہوں اور ساری دنیا ہسپتال ہو"۔

لہٰذا آل احمد سرور جب غالب کے یہاں رومانیت کا عنصر دریافت کر رہے ہیں تو یہ بالکل نئی بات اور ان کی طبیعت کی اپج سے نکالا ہوا نقطہ ہے،

بجنوری کا اس پر اثر نہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اپنے معمولہ طرز کے مطابق یہاں بھی انہوں نے "رومانیت" کی کچھ تفصیل نہیں بتائی اور غالب کے یہاں سے اس کی مثالیں نہیں پیش کیں۔ لیکن ادب میں رومانیت (Romanticism in Literature) اور (Romance of Life) کے درمیان انہوں نے جو فرق کیا وہ قابل قدر بہرحال ہے۔ اور غالب کی اوائلی شاعری میں رومانیت کی جھلکیاں دیکھنا اردو تنقید میں ایک نئی بصیرت کا داخلہ تھا۔ آل احمد سرور کی تنقید پڑھ کر مجھے کاشت کار کا خیال آتا ہے کہ وہ بیجوں کی ٹوکری ہاتھ میں لیے سارے کھیت میں بیج بکھراتا پھرتا ہے۔ وہ رک کر کسی بیج کے برگ و بار لانے کا انتظار نہیں کرتا۔ بیج سارے کھیت میں پھیلا دینا اس کا کام ہے۔ اگر وہ چند بیج ڈال کر ہی قناعت کر لے تو پورے کھیت میں بیج افگنی نہ ہو سکے گی۔ آل احمد سرور بھی اسی طرح ہر مضمون میں دلچسپ اور نئے خیالات منتشر کرتے پھرتے ہیں، گویا انہیں معلوم ہو کہ تخم ریزی میرا کام ہے اور خرمن اندوزی دوسروں کا۔ وہ اگر صبر سے بیٹھ کر اپنے دو ہی چار خیالات یا بصیرتوں کو دور تک لے جاتے، پھیلاتے، اور مثالوں اور تجزیہ کی مدد سے انہیں مزید مستحکم اور مشرح کرتے تو نظری تنقید میں ان کا مقام اور بھی اونچا ہوتا۔

میرا خیال ہے کہ سید احتشام حسین کے مضامین "غالب کی بت شکنی" (۱۹۴۷ء) اور "غالب کا تفکر" (۱۹۵۰ء) پر تنقید غالب کا وہ باب ختم ہوتا ہے جس کا افتتاح حالی نے کیا تھا۔ احتشام حسین کے مضمون "غالب کا تفکر" کو اس سلسلے

www.taemeernews.com

کی آخری بڑی تحریر قرار دیا جانا چاہیئے۔اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ اس مضمون میں غالبؔ کو کھلے طور پر مارکسی یا ترقی پسند نظریہ سے دیکھا گیا ہے۔حالیؔ کے اخلاقی اور اصلاحی گوشوارۂ عمل کے زیر اثر جو تنقید وجود میں آئی اس کی آخری کڑی ترقی پسند تنقید ہی ہے۔ حالیؔ کے یہاں کئی باتیں ایسی ہیں جنہیں ترقی پسندی نے من وعن یا تھوڑی بہت تبدیلی کے ساتھ قبول کر لیا۔ترقی پسند نظریۂ ادب کی رُو سے ادب کے مقاصد کا منتہا یہ تھا کہ وہ تاریخی اور طبقاتی شعور کا اظہار کرے۔اور جب وہ اس شعور کا اظہار کرے گا تو ان قوتوں کے شانہ بہ شانہ چلے گا جو سماج میں تبدیلی لانے کے لیے کسی (یعنی مارکسی) سیاسی اور انقلابی نظام عمل پر کار بند ہیں۔حالیؔ کے نظام نقد میں بھی ادب کو سماج کی اصلاح کے لیے سرگرم ہونا اور اس مقصد کے لیے کسی صالح اور ارتقا یافتہ نظام اخلاق (جو آخری تجزیہ میں سیاسی قوتوں کا ہی نافذ کردہ ہوتا ہے) کا پابند ہونا اور اس کو فروغ دینا ضروری تھا۔دونوں ہی اس بات پر متفق تھے کہ اردو ادب کے پرانے سانچے اور ڈھانچے جدید ضروریات کو پوری نہیں کر سکتے۔

''غالبؔ کی بت شکنی''میں سید احتشام حسین جدید (مارکسی) انقلابی انسان کے نقطۂ نظر سے غالبؔ کو پرکھتے ہیں:

> ''ایک بہتر اور آزاد زندگی کی جستجو میں، نئے اقدارِ حیات کی تلاش میں، غالبؔ بتوں کو توڑتے رہے۔لیکن ان کے پیروں میں تشکیلیت، انفرادیت، اور وقت کی زنجیریں تھیں جن سے باہر نکلنا ان کے لیے ممکن نہ تھا۔اگر مستقبل امید کی راہ دکھاتا تو غالبؔ...... زمانے سے اپنی مایوسیوں کا انتقام لیتے۔''

یعنی سید احتشام حسین کی نظر میں غالبؔ میں انقلابی انسان کی کچھ صفات تو تھیں، لیکن وہ عمل کے آدمی نہ تھے، لہٰذا وہ انقلابی انسان کا تاریخی فریضہ انجام دینے سے قاصر رہے۔یہ موقف آل احمد سرور کے موقف سے بالکل مختلف ہے، لیکن یہ موقف جدید (انقلابی) ذہن کی توقعات کے قریب تر ہے۔ اپنے دوسرے اہم مضمون '' غالبؔ کا تفکر'' میں احتشام حسین اس خیال کا اعادہ کرتے ہیں کہ انیسویں صدی کے ہندوستانی معاشرے میں کسی ایسے ''ذہن کی نشو ونما کی واضح شکل نہیں دیکھی جا سکتی جو اس وقت کے ترقی پذیر سرمایہ دار یا عوام کے عملی شعور کی نمائندگی کرے۔''لہٰذا ان کے خیال میں غالبؔ کا تفکر اپنے تاریخی حالات سے ماورا نہیں جاتا اور اس سے کسی ترقی پسند روشنی کی امید نہیں کی جا سکتی لیکن یہاں وہ غالبؔ کے دفاع، یا ان کی عذرخواہی کے طور پر یہ بھی کہتے ہیں کہ غالبؔ نے یہی بہت کیا کہ:

> ''ترقی کی علامتوں کو اور سائنس کے امکانات کو اپنے دائرۂ تخیل میں جگہ دی۔ان سے یہ مطالبہ کرنا فضول ہوگا کہ انہوں نے بادشاہت کی کھلم کھلا مخالفت کیوں نہیں کی، جاگیرداری نظام کے خلاف بغاوت کا اعلان کیوں نہیں کیا، محنت کش طبقہ کی رہنمائی کے لیے کچھ

www.taemeernews.com

کیوں نہیں لکھا۔''

سید احتشام حسین کے خیال میں غالب کے کلام میں فلسفیانہ فکر نہ سہی ، لیکن ایک فکری رجحان ضرور ہے ، مگر اس میں '' تعمیری نقطۂ نظر کا فقدان'' بھی ہے ۔'' وہ اپنے دور سے غیر آسودہ تھے ، اس کی تباہی اور بربادی کو یقینی جانتے تھے ، لیکن تاریخی اور معاشی شعور کے فقدان کی وجہ سے نہ تو وہ اس انحطاط کے اسباب سے واقف تھے اور نہ آگے کی راہ سے'' اس تجزیہ کی روشنی میں غالب ایک ناکام دانش ور ٹھہرتے ہیں ، لیکن اس ناکامی سے ان کی شاعرانہ عظمت پر کوئی حرف نہیں آتا ۔ بالفاظ دیگر ، سید احتشام حسین نے ترقی پسند فکر کے تضاد کو حل کرنے کی کوشش نہیں کی ۔ وہ تضاد یہ ہے کہ کوئی شخص ناکام دانش ور لیکن اصلی اور بڑا شاعر (یعنی ترقی پسند معیاروں پر پورا اترنے والا شاعر) آج کے تناظر میں یہ تضاد اور بھی نمایاں ہو جاتا ہے ، کیونکہ '' تخلیت '' اور '' انفرادیت '' جنہیں احتشام صاحب نے غالب کے پاؤں کی زنجیریں بتایا ہے ، انہیں پر جدید ذہن کی نظر میں شاعری کی اساس قائم ہے ۔ مارکسی فکر کے جس پہلو کی پیروی احتشام صاحب کے یہاں ان دو مضامین میں ملتی ہے ان کی جڑیں انیسویں صدی میں ہیں ، بیسویں صدی میں نہیں ۔ بیسویں صدی کا ذہن تو شاید اس لیے بھی غالب کو اپنے مزاج اور طینت کے نزدیک سمجھتا ہے کہ غالب کے یہاں کسی '' عمل '' کے لیے للکار نہیں ۔ اور عمل سے یہ عدم دلچسپی غالب کے یہاں اگر اس لیے ہے کہ ان میں '' تاریخی اور معاشی شعور '' نہ تھا (یا اگر تھا تو اس کی تربیت مارکسی فکر کے زیر سایہ نہیں ہوئی تھی) تو بھی جدید ذہن کو اس میں کچھ قباحت نہیں دکھائی دیتی ، کیونکہ ادب کی تخلیق کے لیے سیاسی ، تاریخی ، اور معاشی شعور (خواہ مارکسی خواہ غیر مارکسی) کی اتنی ضرورت نہیں جتنی '' تخلیت '' اور '' انفرادیت '' کی ضرورت ہے ۔ آل احمد سرور اس بات سے بخوبی واقف تھے ، جیسا کہ آگے واضح ہوگا ۔

سرور صاحب کا یہ نظریہ کہ غالب کی شخصیت کی دل کشی اور رعنائی ان کے کلام میں ڈھل گئی ہے ، اور یہ کہ غالب کو سمجھنے کے لیے اس عہد کو سمجھنا ضروری ہے جس میں ان کی شخصیت کی تشکیل ہوئی ، انیسویں صدی کے جدید مغربی ذہن کی پیداوار ہے احتشام صاحب کے یہاں بھی اس نظریہ کی جھلک ملتی ہے ، یہ اور بات ہے کہ ان کی ترقی پسند فکر اس نکتہ کو زیادہ دور تک لے جانے میں ممد نہ تھی ۔ لیکن ادب اور تاریخی شعور ، ادب اور طبقاتی کش مکش ، ادب بطور ہمہ گیر انقلاب ، یہ سب تصورات جو ترقی پسند فکر کے زیر اثر انہوں نے غالب پر جاری کرنے چاہے ، وہ بھی انیسویں صدی ہی کے ذہن کی پیداوار ہیں ۔ ورجینیا وولف (Virginia Woolf) نے مطایبے کے طور پر کہا کہ دسمبر ۱۹۱۰ء کے آس پاس دنیا بدل گئی ۔ لیکن اس میں حقیقت بھی تھی ، اس معنی میں کہ زندگی اور کائنات اور ادب کے بارے میں بہت سے مفروضات ، جو بیسویں صدی کی پہلی دہائی تک رائج اور توانا تھے ، پہلی جنگ عظیم کے ختم ہوتے ہوتے اپنی قوت کھونے لگتے ہیں اور دنیا میں ادب کی جگہ ادب کی معنویت اور افادیت ، ادب اور انسانی

www.taemeernews.com

فکر و احساس کے رشتے، ان مسائل پر نئے سرے سے، یا نئی بحث کا آغاز ہوتا ہے۔

غالبؔ کی خوبی، یا خوش نصیبی، یہ ہے کہ بیسویں صدی کے ذہن نے ادب سے نئے تقاضے کیے اور ادب کو نئی طرح سے دیکھنا اور سمجھنا چاہا، اور غالبؔ کا کلام جس طرح انیسویں صدی کے جدید پڑھنے والے کے لیے ادبی لطف یا فلسفیانہ معنی کا حامل تھا، اس طرح وہ بیسویں صدی کے بھی تقاضوں سے عہدہ برآ ہو سکا۔ اس کا سب سے اچھا ثبوت آل احمد سرورؔ کا مضمون ''غالب اور جدید ذہن'' ہے (مشمولہ ''پہچان اور پرکھ''، ۱۹۷۴ء، لیکن تاریخ تحریر غالباً ۱۹۶۵ء)۔ سچ پوچھیے تو صرف یہ مضمون نہیں، بلکہ اس مضمون کے شروع میں غالب کی جو نو شعروں کی غزل سرورؔ صاحب نے تین غزلوں سے اشعار نکال کر ترتیب دی ہے، وہ خود اس بات کا مکمل ثبوت ہے کہ غالبؔ کا ذہن اور وسط بیسویں صدی کا ذہن ان خطوط کی طرح ہیں جو جا بجا ایک دوسرے کو کاٹتے، ایک دوسرے سے ملتے، الجھتے اور کبھی کبھی اس طرح ایک ہو جاتے ہیں کہ دونوں میں کوئی فصل باقی نہیں رہتا۔ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ سرور صاحب کی مرتب و منتخب غزل یہاں پیش کر دی جائے۔

نسخۂ حمیدیہ میں غالبؔ کی دو غزلیں درد اور سودا کی ایک مشہور زمین میں ہیں۔ اس کے کوئی پچاس باون برس بعد (۱۸۶۷ء) انہوں نے پھر ایک غزل اس زمین میں کہی۔ اول دو غزلوں میں آٹھ آٹھ شعر ہیں، آخری غزل میں نو۔ جو شعر سرورؔ صاحب کے انتخاب میں آئے ان کی تفصیل یہ ہے:

غزل سوم، مطلع، شعر ۶، ۷، ۸، مقطع
غزل دوم، شعر ۲، ۵
غزل اول، شعر ۳، ۴

اب غزل ملاحظہ ہو:

(۳) ممکن نہیں کہ بھول کے بھی آرمیدہ ہوں
میں دشتِ غم میں آہوئے صیاد دیدہ ہوں

(۲) ظاہر ہیں میری شکل سے افسوس کے نشاں
جوں شانہ پشت دست بہ دنداں گزیدہ ہوں

(۱) میں چشم وا کشادہ و گلشن نظر فریب
لیکن عبث کہ شبنم خورشید دیدہ ہوں

(۱) سر پر مرے وبال ہزار آرزو رہا
یارب میں کس غریب کا بخت رمیدہ ہوں

(۲) ہوں گرمیٔ نشاطِ تصور سے نغمہ سنج
میں عندلیب گلشن نا آفریدہ ہوں

(۳) جو چاہیے نہیں ہے مری قدر و منزلت
میں یوسف بقیمت اول خریدہ ہوں

(۳) ہرگز کسی کے دل میں نہیں ہے مری جگہ
ہوں میں کلام نغز ولے ناشنیدہ ہوں

(۳) اہل ورع کے حلقے میں ہر چند ہوں ذلیل
پر عاصیوں کے فرقے میں میں برگزیدہ ہوں

(۳) پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسدؔ
ڈرتا ہوں آئینے سے کہ مردم گزیدہ ہوں

www.taemeernews.com

آل احمد سرور کی اس اپج کی داد ہم بعد میں دے لیں گے کہ ان ہم طرح غزلوں کا جو ہر کھینچنے کا خیال انہیں آیا اور کس خوبصورتی سے یہ جو ہر انہوں نے کھینچا۔ صرف یہی بات ان کی بے نظیر غالب فہمی کے ثبوت کے لیے کافی ہے، لیکن اس سے بڑھ کر یہ کہ اب یہ نئی غزل جو بنی ہے تو اس میں اکثر وہ مباحث اور مضامین آ گئے ہیں جو جدید ذہن کے لیے مرکزی اہمیت اور معنویت کے حامل ہیں:

''انسان کی تقدیر میں یہی لکھا ہے
کہ وہ ہر جگہ پردیسی بن کر رہے۔ اسے
کہیں گھر، یا گھر کا سا آرام نصیب نہ
ہوگا۔ چہرے پر دل کا حال لکھا ہوا ہے
یعنی بعض غم ایسے ہوتے ہیں جو انسان کے
رنگ روپ کو بھی متاثر کر دیتے ہیں۔
دنیا کی دلکشی اور تنعم سے لطف اندوزی
انسان کے لیے بس ایک لمحے کی ہے، اور
ستم یہ کہ جو لمحہ ذہن اور روح کے پورے
عروج اور فروغ کا ہوتا ہے وہی لمحہ
موت کا بھی ہے، یعنی انتہا کا دوسرا نام
زوال ہے۔ دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں
جن کی خوش بختیاں کھو جاتی ہیں۔ اظہار
کبھی شرمندۂ تکمیل نہیں ہوتا، ترسیل
ناکام رہتی ہے۔ سب سے اچھی ترسیل
محض خاموشی ہے۔ اس زمانے میں فن
کی قدر نہیں۔ فن کے ساتھ وہی معاملہ
ہوتا ہے جو صارفانہ معاشرہ میں کسی بھی
جنس کے ساتھ ہوتا ہے۔ اعلیٰ شاعری
قدر دانوں کو ترستی ہے۔ ہر چیز اضافی
ہے۔ اگر کوئی شخص زمرۂ زہاد میں ذلیل
ہے تو زمرۂ فساق میں برگزیدہ بھی ہو سکتا
ہے۔ اس زمانے میں انسانوں میں جانوروں،
خاص کر کتوں کے صفات پیدا ہو گئے ہیں۔

آل احمد سرور نے اس غزل کے بارے میں جو کہا ہے اس میں حسب ذیل باتیں توجہ طلب ہیں:

''ہم شاعر سے یہ مطالبہ نہیں کر
سکتے کہ وہ ہمیں تسلی دے یا نجات۔ اور
اگر شاعر تسلی یا نجات کی خاطر اپنے
خصوصی تجربے کو توڑتا مروڑتا ہے تو
اپنے، اور فن دونوں کے ساتھ زیادتی کرتا
ہے ...... بڑے شاعر کے لیے وقت اس
کے عہد کے خانہ میں اسیر نہیں ہوتا۔ اس
میں ماضی بھی زندہ ہوتا ہے اور پیدا ہونے
والے مستقبل کی آہٹ بھی ہوتی ہے۔''

یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ سرور صاحب کی نظر میں شاعر اور شاعری کا تفاعل انقلاب کی راہ ہموار کرنے، یا بادشاہی کے خلاف کھلم کھلا بغاوت کرنے اور جاگیردارانہ نظام کے خلاف بغاوت کرنے کے بجائے اپنی بصیرتیں بیان کرنا اور اپنی صداقتوں کے ساتھ ایمانداری اور سچائی کا معاملہ کرنا ہے۔ جدیدیت کی تمام شعریات اس تصور پر قائم ہے کہ دنیا میں آفاقی سچائیاں ہوں یا نہ ہوں لیکن شاعر کی نظر اپنے طور بعض سچائیوں کو آفاقی سمجھتی ہے، یا آفاقی بنا دیتی ہے۔ اور جدید زمانے میں شاعری کا جواز یہی ہے کہ وہ گذشتہ عہد کے میزانیاتی

www.taemeernews.com

(Totalizing) افکار اور نظام افکار کو مسترد کر کے ذاتی اور داخلی تجربات کی سچائی بیان کرتی ہے اور ہمیں جینے کا حوصلہ عطا کرتی ہے۔ غالب کے مندرجہ بالا اشعار میں جو مضامین بیان ہوئے ہیں ان میں یہ بات سب سے زیادہ اہم اور یہ موقف سب سے زیادہ نمایاں ، اور سب اشعار میں مشترک ہے کہ ''میں ہوں۔'' زندگی میں ناکام بھی اگر ہوں تو میں ہوں، اظہار پر قادر نہیں ہوں تو بھی میں ہوں۔ یعنی ہر چیز کو سمجھنے اور بیان کرنے کے لیے کلیدی وجود میرا ہے۔ بقول آل احمد سرور:

> ''فن پارہ اسی نسبت سے آفاقی ہوتا ہے جس نسبت سے اس میں خصوصی تجربہ ہوتا ہے۔ مگر یہ تجربہ فیشن یا فارمولے یا اپنے گروہ کی پاسداری کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنے دل گداختہ کو چھو کر نکلتا ہے۔''

یہ بیان ایک حد تک مغربی رومانی تصور ادب پر مبنی ہے، اور یہ رومانیت آج کی جدیدیت کا بڑا عنصر ہے، لیکن جدیدیت نے اس رومانیت میں کچھ اپنے رنگ بھی بھرے ، اور اس کی معصومیت (بلکہ سادہ لوحی) کو بڑی حد تک کم کیا۔ مغربی رومانیت یہاں تک تو پہنچی تھی کہ بقول ورڈز ورتھ :

میرا موضوع سخن
کچھ اور نہیں ،صرف قلب انسانی ہے

بیسویں صدی کی جدیدیت نے شاعر کی بصیرت کو کم و بیش مطلق حیثیت دے دی اور آل احمد سرور بصیرت کی یہی مطلقیت غالب کے یہاں دیکھتے ہیں جب وہ کہتے ہیں:

> ''فن اخلاق کا نائب نہیں ہے۔ فن خود اخلاق ہے۔ فن کسی خاص زمانے کا صحیفۂ اخلاق نہیں ہوتا مگر وہ اپنی بلندی میں ہمیشہ اخلاقی ہوتا ہے۔ اس طرح فن کو سماجی دستاویز ہونے کی ضرورت نہیں ہے، مگر فن میں ایک سماجی بصیرت ہوتی ہے، جو علوم سے حاصل کی ہوئی فکر کو انسانی تجربے سے مربوط کر کے ہمیں اپنے طور پر سماج کی روح سے آشنا کراتی ہے۔''

سید احتشام حسین کی طرح آل احمد سرور کو بھی شاعری کے سماجی تفاعل اور سیاسی معنویت کا خیال ہے، لیکن ان کی تفتیش کا نتیجہ احتشام صاحب کے نتیجے سے مختلف ہے، کیونکہ سرور صاحب کی نظر میں سماجی تفاعل اور سیاسی معنویت صرف ایک تفاعل اور معنویت تک محدود نہیں ہے۔ اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ آل احمد سرور کے یہاں شاعری کے بارے میں رومانی یا سادہ لوح کی توقعات نہیں ہیں، وہ کہتے ہیں ''کسی نظریے یا آئیڈیالوجی یا فلسفے کی پاسداری سے شاعر میں بڑائی نہیں آتی'' لیکن شاعری میں ''ہر فلسفیانہ نظریے یا آئیڈیالوجی کے عکس کی گنجائش ہے۔'' وہ شعر کے ''مقصد'' (Purpose) اور اس کے ''عمل'' یا تفاعل (Function) میں فرق کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ''شعر کا مقصد جمالیاتی ہوتا ہے۔ مگر اپنے عمل میں وہ حیاتی اور کائناتی ہوتا ہے۔''

اس آخری نکتے سے سرور صاحب یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ بڑی شاعری وہ ہے جو جمالیاتی اعتبار

www.taemeernews.com

سے بھرپور ہو اور جس میں انسانی زندگی اپنی پوری وسعت کے ساتھ جلوہ گر ہو۔ ''شعر و ادب میں بنیادی مسئلہ شعریت اور ادبیت کا ہے، یا اس کے جمالیاتی پہلو کا، اور جمالیات کے معنی خوبصورتی یا رنگینی کے نہیں، معنی خیز فارم کے احساس کے ہیں۔'' یہاں پھر سرور صاحب رواروی میں بہت بڑی اور گہری بات کہہ گئے ہیں کہ جمالیات سے مراد ہی ''خوبصورتی'' نہیں، بلکہ ایسی ہیئت کا احساس ہے جو مکمل اور معنی خیز ہو، یعنی وہ ہیئت جس کی تلاش عرب نظریہ سازوں کو تھی، کہ وہ تخلیق معنی کو شعر کا سب سے بڑا مقصد جانتے تھے۔ آل احمد سرور کی نظر میں غالب کی شاعری اس لیے بڑی شاعری ہے کہ اس میں تصدیق و تشکیک حیات اور تصدیق و تشکیک حسن بیک وقت پوری طرح موجود ہیں۔ سرور صاحب کہتے ہیں کہ اس طرح کی شاعری غالب کے اپنے عہد میں پوری طرح کبھی نہیں جا سکتی تھی:

> ''یہ نظر جس میں تشکیک ہے، زندگی کے متعلق سوالیہ نشان ہیں، شوخی ہے، بت شکنی ہے، عام حقائق کو الٹ پلٹ کر دیکھنے کی کوشش ہے، لفظ پرستوں کے ہجوم میں معنی کی طرف توجہ دلانے کا حوصلہ ہے، اپنے دور میں مقبول نہیں ہو سکتی تھی۔ لیکن آج جب ہم حقائق پر گہری نظر ڈال سکتے ہیں تو ہم غالب کی عظمت کا راز سمجھ سکتے ہیں۔ غالب کی وفاداری اپنی نظر سے تھی۔''

یہی وجہ ہے کہ آل احمد سرور کو غالب پرستوں کے عام رویے کے برخلاف اس بات کی کوئی فکر نہیں کہ غالب ''اچھے شہری'' تھے کہ نہیں۔ انہیں غالب کی طرف سے کوئی اعتذار نہیں کرنا ہے:

> ''غالب کی عظمت کو منوانے کے لیے انہیں مفکر یا صوفی یا ہندوستان کی جنگ آزادی کا مجاہد ثابت کرنا قطعاً ضروری نہیں۔ غالب نے اگر انگریزوں سے دوستی [کی]، یا دلی کی بربادی پر کوئی مرثیہ حالی یا داغ یا ظہیر دہلوی کی طرح نہیں لکھا تو اس سے غالب کی عظمت پر کوئی حرف نہیں آتا...... غالب کی دوربیں نظر صرف شمع کشتہ کے ماتم میں معروف نہ رہ سکتی تھی۔''

آگے چل کر آل احمد سرور کہتے ہیں:

> '' غالب کے بیشتر ہم عصر عام یا مانوس ردعمل (Stock Responses) کے شاعر ہیں۔ غالب نئی اور منفرد حسیت کے شاعر ہیں۔''

اور اس نئی حسیت کے نشان وہ غالب کی اس صفت کو دیکھتے ہیں کہ ان کے یہاں ''تمنا کے دوسرے قدم کی جستجو'' اور ''جنوں سے سودا کرنے'' کی ادا بیک وقت نظر آتی ہے۔ احساس، حتیٰ کہ حسن کا احساس، اور تجربہ، حتیٰ کہ عشق کا تجربہ بھی، یک رنگ نہیں ہوتا اور نہ ہی وہ خط مستقیم میں واقع ہوتا ہے۔ اس دریافت کا سہرا غالب کے سر ہے۔ جن لوگوں نے ٹی۔ ایس۔ الیٹ کی وہ تحریریں پڑھیں ہیں جو Metaphysical شعراء کے بارے میں ہیں،

www.taemeernews.com

انہیں یاد ہوگا کہ تجربے اور لہجے کی اس دورنگی کو ایلیٹ نے بہت سراہا تھا، لیکن اس سے بڑھ کر یہ کہ فرانسیسی شعراء، خاص کر لافورگ Laforge کے حوالے ایلیٹ نے اس دورنگی کو جدید شاعری کی بہت بڑی پہچان بتایا تھا۔ آل احمد سرور یہی دورنگی غالب کے یہاں دیکھتے ہیں۔

غالب کو عام طور پر مشکل شاعر کہا گیا ہے، اور خود غالب نے اظہار کی نارسائی یا تخیل کی ناکامی یا ترسیل کی ناکامی کا ذکر کثرت سے کیا ہے۔ یہ بات بھی جدید ذہن کا خاصہ ہے کہ وہ زبان کو ناکافی سمجھتا ہے، یا اپنی قوت اظہار پر اسے پورا اعتماد نہیں۔ آل احمد سرور نے یہ سوال اپنے مضمون کے شروع ہی میں پوچھا ہے کہ غالب کے یہاں اظہار کی مشکل کا مضمون بار بار کیوں وارد ہوا ہے؟ جواب میں وہ کہتے ہیں کہ سماج کے سواد اعظم کے علی الرغم، ''سماج کا ایک چھوٹا اور بیدار حصہ'' اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ ''سماج کا بڑا حصہ اپنی حالت پر قائم رہنے کی کوشش کرتا ہے''۔ لہٰذا یہ بیدار حصہ جب خود کو سماج سے ہم آہنگ نہیں پاتا تو وہ ''اپنی بستی میں اجنبی بن جاتا ہے'' اور اس کے اندر جو ''محشرستان تخیل ہے اس کے لیے اسے مروجہ زبان ناکافی محسوس ہوتی ہے'' اس طرح اظہار کی ناکامی کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔ غالب کے یہاں ناکامی اظہار، یا اپنی بات کے نہ سمجھے جانے کے مضمون کی یہ توجیہ چاہے بہت درست نہ ہو، لیکن بنیادی بات یہ ہے کہ آل احمد سرور نے غالب کی اس جدید صفت کو پہچانا۔

اب تک میں نے آل احمد سرور کے دو مضامین ''غالب کی عظمت'' اور ''غالب اور جدید ذہن'' پر مختصراً کلام کیا ہے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ایک اور مضمون ''غالب کی شاعری کی معنویت'' دیکھ لیا جائے۔ یہ مضمون بھی حالی سے شروع ہوتا ہے، اور اس میں ''سادگی، اصلیت، اور جوش'' کا معاملہ اٹھایا گیا ہے۔ خود حالی نے ''اصلیت'' کی جو تعریف متعین کی تھی وہ غالباً غالب کو نظر میں رکھتے ہوئے وضع کی تھی۔ حالی نے یہاں تک کہا تھا کہ جو چیز شاعر کے عندیے میں وجود رکھتی ہو اسے بھی ''اصلیت'' کا حامل کہا جائے گا۔ ظاہر ہے کہ یہ تعریف خود اس قدر لچک دار تھی کہ ہر چیز ''اصلیت'' کی حامل قرار دی جا سکتی تھی اور غالب کی تجریدیت اور خیال بندی کا جواز اس میں موجود تھا۔ لیکن آل احمد سرور ''اصلیت'' کی اصطلاح کو ادبی اسالیب میں محض ایک اسلوب کہتے ہیں اور ''علامت نگاری'' اور ''تجریدی آرٹ'' کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ''اصلیت'' کے علی الرغم ''علامت نگاری'' کو بھی شاعری کا ایک ''جائز اسلوب'' ماننا چاہیے۔ ''سادگی'' کے بارے میں ہم ''یادگار غالب'' سے حالی کے اقوال اوپر دیکھ چکے ہیں کہ اگر کوئی نیا اور اچھوتا خیال کسی کی سمجھ میں نہ آئے تو یہ اس کی فہم کا قصور ہے، اور یہ کہ غالب کے عمدہ اشعار کی تحسین کرنے کے لیے ہمیں ایک جداگانہ معیار مقرر کرنا ہوگا۔ لیکن یہاں بھی آل احمد سرور ''سادگی'' کے بارے میں نئی بات کہتے ہیں کہ ''شعریت کو بھی سادگی کے علاوہ زندگی کی پیچیدگی کو جذب کرنا ہوگا''۔ پھر وہ ''جوش'' کی اصطلاح کو سرے سے نظر انداز کرنے کی تلقین کرتے

www.taemeernews.com

ہیں۔ اس طرح اب وہ حالی سے کم و بیش مکمل طور پر انحراف کرتے ہیں اور حالی کی ان باتوں کو بھی نظرانداز کرتے ہیں جو اپنے وقت کے بہت آگے کی چیزیں تھیں۔

آل احمد سرور کے اس مضمون میں غالب کے حوالے سے ''مشرق'' اور ''مغرب'' کی بھی ہلکی سی بحث ملتی ہے۔ وہ غالب کی انفراد پسندی اور ذاتی بصیرت پران کے اصرار کو ان کی ''مغربیت'' سے تعبیر کرتے ہیں:

> ''مشرق بقول کوئسلر (Arthur Koestler) شخصیت اور انفرادیت کو شبہ کی نظر سے دیکھتا تھا۔ یہ مغرب کی دین ہے کہ اس نے شخصیت کی تربیت، اور شخصیت کے ذریعے انفرادی صلاحیتوں کے پھلنے پھولنے پر زور دیا۔ شخص کو یہ حق ہے کہ وہ اپنی نظر کی تربیت کرے، اپنے شعلے کی حفاظت کرے، اپنے ذہن کی آزادی پر اصرار کرے...... غالب...... نے فن کے سچ پر زور دیا، اپنی نظر سے وفاداری کی عظمت واضح کی۔ فرد کی آزاد شخصیت پر اصرار کیا۔''

غالب کے یہاں تخیل کی فراوانی کی طرف اشارہ آل احمد سرور نے گذشتہ مضمون میں بھی کیا تھا، اور اسے مغربی رومانیت کے حوالے سے سمجھانا چاہا تھا۔ اب وہ سی۔ ایم۔ بورا (C.M.Bowra) کی کتاب The Romantic Imagination کے حوالے سے غالب کے یہاں ''تخیل کے مسلک'' (The Cult of Imagination) کی بات کرتے ہیں۔

''جب لوگ جسم کے خطوط، قوسوں اور دائروں میں کھوئے رہتے ہیں وہ خیال کی قوسوں اور دائروں کے عاشق تھے۔'' ممکن ہے سرور صاحب نے مغربی (خاص کر انگریزی) رومانیت میں تخیل کی آزاد، علمی اور علمیاتی قوت کی مرکزیت، اور تخیل کو اسرار اور مافوق العادت سے منسلک کرنے کے رومانی رجحان کو غالب کے یہاں ڈھونڈ لینے میں کچھ زیادتی سے کام لیا ہو، لیکن یہ بات بھی دھیان میں رکھنے کی ہے کہ غالب کو داستان سے بہت شغف تھا، اور انگریزی کے رومانی تخیل میں داستان کے عناصر کثرت سے ملتے ہیں۔ لیکن اس میں تو کوئی شک نہیں کہ تخیل کی مرکزیت، اور ''خیال کی قوسوں اور دائروں'' سے عشق کا ذکر کرکے آل احمد سرور نے غالب کی خیال بندی کا اچھا جواز پیش کیا ہے۔ اور اگر خیال بندی کو مغربی شعریات کی رو سے سمجھانے کی کوشش ہو تو اس کوشش میں انگریزی کے Metaphysical شعراء کے علاوہ رومانی شعراء اور مصوروں میں کیٹس اور کولرج کی شاعری، اور جان مارٹن (John Martin) کی مصوری کا ذکر لازماً آئے گا۔

میں نے اوپر کہا ہے کہ غالب کے یہاں تخیل کی کارفرمائی پر زور دے کر سرور صاحب نے غالب کی خیال بندی کا جواز پیش کیا ہے، لیکن یہ بات دھیان میں رکھنے کی ہے کہ غالب کے سلسلے میں انہوں نے خیال بندی میں غالب کے فوری پیش رو ناسخ کا نام بہت سرسری طور پر، اور کم و بیش حقارت

www.taemeernews.com

کے انداز میں کیا ہے۔ ذوق اور شاہ نصیر، مصحفی اور آتش، ان کا بھی ذکر اس ضمن میں کہیں نہیں ہے۔ لہٰذا یہ بات دھیان میں رکھنے کی ہے کہ حالی ہی کی طرح سرور صاحب نے بھی غالب کی مشرقی عظمتوں کے مغربی جواز پیدا کیے ہیں، اور اس انداز میں کہ گویا مشرق میں ان کے لیے کوئی جواز تھا ہی نہیں۔

جدید ذہن کا ایک خاصہ یہ بھی ہے کہ وہ مستفسر ہے، سوال پوچھنا اس کا مشغلہ ہی نہیں، مقدر بھی ہے۔ پہلے زمانے کی تہذیب میں، خاص کر ہند اسلامی تہذیب میں علم کا سب سے مؤثر اور معتبر ذریعہ کشف تھا۔ ایک کا کشف دوسرے سے مختلف بھی ہو سکتا تھا، لیکن دونوں ہی صحیح سمجھے جاتے تھے۔ کشف کے سامنے جرح یا تفتیش کا سوال نہیں۔ معقولات میں بھی یہ معاملہ تھا کہ مسائل اور قضایا مقرر تھے، ساری تفتیش انہیں مسائل اور قضایا کے حدود میں رہ کر ہوتی تھی۔ اور تمام حدود کی حد یہ تھی کہ کوئی معقولی، چاہے وہ کتنا ہی تاویلی زور کیوں نہ لگاتا، ہستی باری تعالیٰ کا منکر نہ ہو سکتا تھا۔ یورپ میں بھی یہ صورت مدت تک رہی تھی، لیکن سولہویں سترہویں صدی سے بات کچھ بدلنے لگی تھی اور اٹھارہویں صدی کی روشن فکری (Enlightenment) نے تمام اشیا و تصورات کو اپنی تفتیش کے دائرے میں ڈال لیا۔ کشف کی اہمیت گھٹتے گھٹتے بس رومن کیتھولک گرجا کے بعض معاملات تک سمٹ کر رہ گئی۔ استفسار کے اس زور نے انسان پر سب نقابیں وا کر دینے کا بیڑا اٹھا لیا اور بیسویں صدی تک آتے آتے پرانے علوم کی کوئی شے ایسی نہ تھی جس پر سوالیہ نشان قائم نہ ہو گیا ہو۔

لیکن غالب کے معاشرے میں ابھی کشف، اور کشف کے استدلال کے ذریعہ حاصل شدہ علم ہی مرکزی اہمیت رکھتا تھا۔ سوال کی یہاں گنجائش نہ تھی اس کے برخلاف، آل احمد سرور کو غالب بہت بڑے سوالی نظر آتے ہیں۔ سرور صاحب لکھتے ہیں، ''شعر و ادب اس وقت عظیم ہوتا ہے جب وہ انکار اور عقیدہ، سوال اور جواب...... سب سے آشنا ہو...... غالب نے سوال کیے، اپنے سے، دوسروں سے، حسن سے، خدا سے۔ ان کے کلام میں کیوں، کیا، کیسے کی بھرمار ہے۔ سوال کرنا خود ایک جواب کا اشاریہ ہے۔'' غالب کے یہاں استفسار کی لے کو آل احمد سرور بدیعیاتی طرز گذاری (Rhetorical Strategy) اور معنی آفرینی کے ذریعے کے طور پر نہیں بلکہ شاعرانہ علمیات کے ایک اوزار کی طرح دیکھتے ہیں۔ سرور صاحب کے نزدیک سوال کی اہمیت اس لیے ہے کہ تشکیک ''ذہنی جستجو اور اس جستجو کی توانائی کو ظاہر کرتی ہے۔'' یہاں دلچسپ بات یہ ہے کہ سرور صاحب ایک طرف تو تھوڑی سی بے اطمینانی محسوس کرتے ہیں کہ تشکیک یا استفسار کو منفی کارروائی، یا مثبت یقین کے عدم وجود کو کسی فلسفیانہ کمزوری کا اظہار نہ سمجھ لیا جائے، تو دوسری طرف وہ انشائیہ بیان (استفسار و استفہام جس میں شامل ہیں) کی شعریات پر غور نہیں کرتے جو کہ عربی شعریات سے اردو شعریات میں آئی تھی اور طباطبائی نے اپنی شرح میں اس کا تذکرہ متعدد بار کیا ہے۔

اس مقام پر پہنچ کر ہم آل احمد سرور کی غالب فہمی کی حدوں کا بھی ذکر درمیان میں لا سکتے

www.taemeernews.com

ہیں۔ جدید ذہن اور خاص کر بیسویں صدی کے نصف دوم کی ذہنی آب وہوا اور فکری ماحول اور غالب کے درمیان مشترک منطقے دریافت کرنے، اور اس طرح جدید زمانے میں غالب کی بے مثال مقبولیت کی وجوہ بیان کرنے میں آل احمد سرور کو غیر معمولی کامیابی ہوئی۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ خود ان کا ذہن جدید تصورات اور ذہنی رویوں سے پوری طرح آشنا تھا۔ لیکن یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ ان کی تربیت بہرحال ان لوگوں کے ہاتھوں ہوئی تھی جو انیسویں صدی کے افکار کے پروردہ تھے۔ لہٰذا اگر چہ اپنی زیادہ تر بحثوں میں سرور صاحب غالب کی توجیہ اور تفہیم کرتے نظر آتے ہیں، لیکن بعض مقامات میں وہ توجیہ اور تعبیر سے زیادہ دفاع، یا اعتذار کا لہجہ اختیار کر لیتے ہیں۔ مثلاً وہ بار بار کہتے ہیں کہ ہمیں دیکھنا چاہئے کہ شاعر کی بصیرت (لہٰذا غالب کی بصیرت) ''کتنی گہری، حکیمانہ، سچی اور دور رس'' ہے۔ یعنی وہ انگریزی رومانیوں کا حوالہ درمیان میں لانے کے باوجود شعر کے ''حکیمانہ'' اور ''سچے'' ہونے کے تصور سے پوری طرح بغاوت نہیں کرتے اور ''گہری، دور رس'' بصیرت کا دفاعی فقرہ لاتے ہیں۔ شاید انہیں اس بات کی فکر ہے کہ کوئی غالب کو شعور عمل اور شعور فکر اور ''تاریخی شعور'' وغیرہ سے عاری قرار دے تو جواب میں کیا کہا جا سکتا ہے؟ وہ یہ نہیں کہنا چاہتے کہ بڑی شاعری کو ان چیزوں کی ضرورت نہیں۔ وہ شیکسپیر کا حوالہ ضرور لاتے ہیں، لیکن صاف صاف یہ نہیں کہتے کہ شیکسپیر اور غالب دونوں کی بڑائی اس بات میں ہے کہ انہیں ''سماجی شعور، تاریخی بصیرت، حکیمانہ گہرائی'' وغیرہ کے حوالے سے عظیم ثابت کرنا انہیں محدود کرنا، اور بسا اوقات ان کی غلط تعبیر کرنا ہے۔ یہ انواع (Categories) اس قدر عمومی، اضافی، اور فلسفیانہ اعتبار سے مبہم ہیں کہ ان کے ذریعہ واقعی کچھ ثابت نہیں ہو سکتا۔ یہ صفات تو ایسی ہیں کہ ان کا عروضی وجود ہی مشکوک ہے۔ سرور صاحب بار بار کہتے ہیں کہ شعر کی وفاداری اپنے آپ سے ہے، کسی خارجی شخص یا شے سے نہیں۔ لیکن سوال یہ اٹھتا ہے کہ وہ اس بات کو بیان کرنا کیوں ضروری سمجھتے ہیں کہ ''شعر کی وفاداری'' کہاں ہے؟ یہ بات تو ٹھیک ہے کہ '' فن کو سماجی دستاویز ہونے کی ضرورت نہیں'' لیکن اگلے ہی سانس میں وہ یہ کیوں کہتے ہیں، '' مگر فن میں ایک سماجی بصیرت ہوتی ہے''؟ یہ تو بات برابر کرنے کا انداز ہوا کہ دونوں طرفوں کا اعتراف کر لیا گیا۔ یہ اگر اضافیت پسندی (Relativism) نہیں تو اس کے قریب ہی کی کوئی چیز ہے۔

سید احتشام حسین ''دنیا کے سب سے بڑے انقلاب پسند لینن'' [یہ فقرہ احتشام صاحب کا ہے] کا ایک قول نقل کر کے غالب کے لیے جواز بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ احتشام صاحب کے بقول، لینن نے کہا ہے کہ شعرا پر کوئی میکانیکی اصول نہیں جاری ہو سکتا اور انہیں انفرادیت اور اپنی شخصیت کے اظہار کا موقع ملنا ہی چاہئے۔ لینن کی اس رائے کی بنا پر احتشام صاحب کی نظر میں غالب کی انفرادیت، آزاد خیالی، اور داخلیت کا جواز قائم ہو جاتا ہے۔ لیکن لینن کہاں کا نقاد یا ادب شناس تھا، اور کسی سیاسی

www.taemeernews.com

رہنما یا مفکر کے اقوال کو اگر شاعری پر جاری کرنا ٹھیک سمجھا جائے تو یہ اعزاز صرف لینن کو نہیں، ہٹلر اور بال ٹھاکرے کو بھی دینا ہوگا۔ بہر حال، احتشام صاحب غیر ادبی انواع کے سہارے اپنی ادب دوستی اور غالب پرستی کا جواز حاصل کرتے ہیں تو سرور صاحب بھی غیر ادبی معیاروں کو کچھ نہ کچھ جگہ دینے کے لیے خود کو مجبور پاتے ہیں: ''[شاعری] ایک طلسماتی دنیا ہے جو سائنسی یا معلوماتی صداقت کے بجائے جذباتی صداقت رکھتی ہے......'' یہاں تک تو بہت ٹھیک ہے، لیکن آل احمد سرور اس جملے کو یوں پورا کرتے ہیں: ''......جو صداقت اور اپیل میں معلوماتی، مادی اور منطقی دنیا سے کم نہیں ہے......'' یہاں یہ سوال پوچھنے کا تھا کہ اگر شاعری گھوم پھر کر ''معلوماتی، مادی اور منطقی'' ہی دنیا کے برابر کوئی چیز پیدا کرتی ہے تو پھر شاعری کی ضرورت ہی کیا ہے؟ پہلے سے موجود ایک شے کو بہزار خرابی و مشقت دوبارہ پیدا کرنا تو سائنس دانوں کی زبان میں ''پہیے کو دوبارہ ایجاد کرنا'' ہی ہوا۔ دوسرا سوال پوچھنے کے قابل یہ تھا کہ اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ ''معلوماتی، مادی اور منطقی'' دنیا واقعی اور حقیقی بھی ہے؟ اور ر یا اگر وہ حقیقی ہے تو کیا ہم اسے درستی کے ساتھ جان بھی سکتے ہیں؟

آل احمد سرور کی غالب فہمی کی دوسری سرحد یہ ہے کہ بجنوری کی طرح وہ بھی غالب کو بین الاقوامی تناظر میں اور عالمی ادب کے ایوان میں متمکن کرنا چاہتے ہیں۔ طریق کار دونوں کا البتہ مختلف ہے۔ بجنوری نے مغربی ادیبوں اور فنکاروں کا ذکر کثرت سے کیا ہے، سرسری ہی سہی، وہ اپنا زیادہ تر زور سطحی مماثلتوں اور عمومی بیانات پر صرف کرتے ہیں۔ لیکن ان کی تحریر سے یہ تاثر فوراً پیدا ہوتا ہے کہ ہم غالب کو عالمی ادبی برادری کی محفل میں اعلیٰ مقام پر جلوہ گر دیکھ رہے ہیں۔ بجنوری کے برخلاف، مغرب کے ادب اور افکار دونوں ہی سے آل احمد سرور کی واقفیت گہری ہے اور زیادہ پائیدار بنیادوں پر قائم ہے۔ وہ غالب کے ذہن اور ان کی تخلیقی لیاقت کو مغرب کے ذہن اور تخلیقی لیاقت کے مماثل، بلکہ دونوں کو ایک دوسرے کے قریبی پڑوسی اور کئی باتوں میں ہم خیال کے طور پر دیکھتے ہیں۔ عبدالرحمٰن بجنوری اور آل احمد سرور دونوں ہی نے غالب وار دو کی کلاسیکی شاعری، ہندوستانی شاعری، اور سبک ہندی کی فارسی شاعری کے تناظر میں دیکھنے کی کوشش نہیں کی ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ یہ کام ان کے مقاصد میں شامل نہ تھا، کیوں کہ وہ تو غالب کے کلام سے بیسویں صدی کی بزم آراستہ کر رہے تھے۔ یہ بات درست ہے، لیکن حالی کی مثال تو کچھ اور بتاتی ہے، جیسا کہ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں، حالی نے برملا کہا کہ غالب کسی کے مقلد نہ تھے، وہ دوسروں کی روش پر چلنے کو برا سمجھتے تھے، ان کی شاعری کسی اکتساب (ماحول، مطالعہ، استاد) کی مرہون منت نہیں۔ لیکن وہ جا بجا غالب کا تقابل دوسرے شعرا سے کرتے ہیں اور ''یادگار غالب'' کا معتد بہ حصہ غالب اور سبک ہندی کے شعرا کے براہ راست تقابل میں صرف کرتے ہیں۔

شاعری، خاص کر غزل کی شاعری، کسی مضمون کا اظہار نہیں، بلکہ شاعر کے اپنے حال کا اظہار ہے، یا ہونا چاہیے۔ یہ مفروضہ ہمارے یہاں

www.taemeernews.com

محمد حسین آزاد اور حالی، نے قائم کیا۔ حالی نے غالب کے بارے میں براہ راست تو یہ نہ کہا کہ وہ کم و بیش آپ بیتی لکھتے ہیں، لیکن فحوائے کلام ہمیشہ ایسا رکھا گیا گویا شاعر غالب اور شعر کا متکلم دونوں ایک ہی ہیں۔ حالی کے بعد تمام لوگوں نے اسی رسم کی پابندی کی۔ آل احمد سرور اور سید احتشام حسین کی غالب فہمی میں یہ بات جا بجا نمایاں ہے کہ وہ غالب کے ہر شعر کو غالب کی ذاتی رائے کا درجہ دے رہے ہیں۔ سرور صاحب کو غالب کے یہاں بار بار ''تضاد'' کی کارفرمائی نظر آتی ہے، اور وہ ہمیشہ اس کا دفاع اس طرح کرتے ہیں کہ یہ غالب کی نظر کی وسعت اور بصیرت کی تیزی ہے کہ وہ کاروبار عالم میں ہر طرح کی چیز دیکھ لیتے ہیں اور اس کا تجربہ کر لیتے ہیں۔ اس صفت کو وہ ''تجربے کی تہ داری'' کا نام دیتے ہیں۔ بات بالکل صحیح ہے، لیکن معاملہ صرف اتنا نہیں کہ غالب کی نظر کی ''گہرائی...... زندگی کے تضادات کو دیکھ لیتی ہے۔'' معاملہ مطالعہ کی بھی گہرائی کا ہے۔ سرور صاحب، اور سرور صاحب ہی کیوں، قریب قریب وہ سارے ہی بزرگ جن کی تحریروں کی چھوٹی سی فہرست میں نے اس مضمون کے شروع میں درج کی ہے، غالب کو یوں پڑھتے ہیں گویا غالب کے پہلے کوئی شاعر نہیں تھا، یا اگر تھا تو پڑھنے کے لائق نہیں تھا، یا پھر غالب نے اپنے کسی پیش رو کو پڑھا نہ تھا۔ بیسویں صدی نے شعریات کا ایک پرانا اصول دوبارہ دریافت کیا کہ ''شعر سے شعر بنتا ہے'' ایلیٹ کے یہاں اس طرح کی ایک بات تھی، اگرچہ اس نے اسے بہت تفصیل سے نہیں لکھا تھا۔ لیکن آل احمد سرور اور دوسرے بزرگوں نے اس معاملہ میں ایلیٹ کو نظر انداز کیا، اور اس کی اس بات کو بھی نظر انداز کیا کہ کوئی شاعر جب کثرت سے نئے پن کا اظہار کرتا ہے تو اس وقت وہ اپنے پیش رووں کے طور طریقے اور بھی شدت سے اپنا رہا ہوتا ہے۔ ہمارے یہاں جو مفروضہ زیادہ رائج تھا وہ تو یہ تھا کہ شاعری (اور خاص کر غزل کی شاعری) کم و بیش آپ بیتی ہی ہوتی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ آپ بیتی میں کسی اور کے خیالات بیان کرنے کا سوال نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب یگانہ نے غالب پر اعتراض شروع کیے کہ انھوں نے دوسرے کے مضامین چرائے ہیں تو ہر طرف سراسیمگی سی پھیل گئی اور کسی سے اس الزام کا رد ممکن نہ ہو سکا۔ یگانہ کی ''غالب شکن'' باتوں کا تذکرہ ہمارے یہاں ۱۹۷۰ء کی دہائی تک چلتا رہا۔ بلکہ میں نے ابھی حال (ستمبر، ۲۰۰۲ء) ہی کے کسی رسالے میں ایک صاحب کا قول پڑھا کہ غالب کے بارے میں یگانہ کی باتوں کا رد آج تک ممکن نہیں ہو سکا۔

غالب کے بارے میں آل احمد سرور اور ان کے پیش رووں کی تحریروں نے اس غلط تاثر کو رائج کیا کہ غالب قریب قریب وہ شے ہیں جسے suigeneris کہتے ہیں، یعنی وہ جو اپنے آپ ہی پیدا ہوا ہو، کسی اور کے قاعدوں یا نظائر کا اطلاق اس پر نہ ہو سکے۔ اس تصور میں رومانیت کی روشن لہر بھی تھی اور قومی مباہات کے لیے بھی ایک بات نکلتی تھی، اور یہ بھی کہنا چاہیے کہ اگرچہ آج کی شعریات کچھ اور کہتی ہے، لیکن بیسویں صدی کے وسط میں مغربی تصور ادب میں بھی یہی بات عام تھی کہ شاعری،

www.taemeernews.com

خاص کر وہ شاعری جسے Lyric کہا جائے (اور غزل کو بھی Lyric سمجھنے کا رجحان ہمارے یہاں عام تھا) شاعر کے اپنے تجربات اور ذاتی محسوسات پر مبنی ہوتی ہے۔لیکن آج کے پڑھنے والے کو آل احمد سرور کی غالب شناسی میں یہ کمی ضرور نظر آئے گی کہ یہاں غالب کو سمجھنے کے لیے ادبی تہذیب اور تاریخ کا کوئی تناظر نہیں فراہم کیا گیا۔

اپنے مضمون ''پورے غالب'' میں آل احمد سرور نے کئی باتیں اپنے پرانے مضامین سے قریب قریب من وعن دہرادی ہیں، لیکن انہوں نے غالب کے اسلوب کے متعلق ایک بڑے پتے کی بات بھی کہی ہے اور مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اس کا اعادہ کرلیا جائے۔اردو میں عربی فارسی عناصر کو سب نے پسند کیا ہے، لیکن کئی لوگوں کو یہ الجھن بھی رہی ہے کہ کیا عربی فارسی کے بغیر اردو قائم نہیں ہوسکتی؟ انشا نے ''رانی کیتکی کی کہانی'' میں ایک تجربہ کیا تھا، یا اپنے زمانے کے کسی رجحان کے خلاف احتجاج کیا تھا، یا محض اپنی تیزی اور قوت طبع (virtuosity) کی نمائش کی تھی، یہ بات پوری طرح صاف نہیں ہے۔انشا کے اپنے بیان سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ تیزی طبع کا مظاہرہ کررہے تھے۔بہر حال، آرزو لکھنوی کی ''خالص اردو'' اور ملا رموزی کی ''گلابی اردو'' کے پیچھے ایک اعتذار یقینا جھلکتا ہے کہ اردو بیچاری عربی فارسی کے بوجھ تلے دبی جاتی ہے، آئیے ہم دکھاتے ہیں کہ ان سے آزاد ہوکر اردو کس قدر سبک ہوجاتی ہے اور پھر بھی اس کی قوت اظہار گھٹتی نہیں۔ظاہر ہے کہ یہ ان بزرگوں کی محض زیادتی تھی۔کسی زبان سے ''غیر زبان'' کے عناصر یا عناصر نہ سہی، صرف ''بدیسی'' الفاظ کے نکال دینے کا معاملہ اتنا آسان نہیں۔سب سے پہلے تو یہ طے کرنا مشکل ہے کہ ''بدیسی'' کی تعریف کیا ہو؟ اگر لفظ کسی غیر زبان کا ہے لیکن ہمارے یہاں بالکل الگ معنی میں برتا جارہا ہے تو اسے ''بدیسی'' کہیں کہ نہ کہیں؟ مثلاً ''اثر'' عربی میں ''نشان قدم'' کے معنی میں ہے۔اس کی توسیع میں کسی نشان کو ''اثر'' کہہ دیا جاتا ہے۔اردو میں یہ معنی نہیں ہیں، صرف ایک فقرہ ''اثر خامہ'' کسی کی تحریر کے لیے کبھی کبھی بول دیا جاتا تھا، اب بہت دن سے دیکھا نہیں گیا۔اردو میں ''اثر'' بمعنی Effect, Influence ہے، اور اس کی جمع ''اثرات'' ہے، جو عربی میں نہیں ہے۔عربی میں ''اثر'' کی جمع ''آثار'' ہے، لیکن اس کے ایک معنی اردو میں ''عمارت کی بنیاد'' کے ہیں۔تو یہ الفاظ دیسی ہیں کہ بدیسی؟ اور اگر ''بدیسی'' ہیں تو کیا یہ اتنے ہی بدیسی ہیں جتنے، مثال کے طور پر ''اصطکاک'' [غالب کے یہاں ہے]، ''احتکار''، ''انزوا'' [ابو الکلام آزاد کے یہاں ہیں]، ''عسر العبور'' اور ''کلک حسپ'' [میر کے یہاں ہیں] جیسے الفاظ بدیسی ہیں؟ پھر ایسے الفاظ ہیں جو ان پڑھ لوگوں کی بھی زبان پر ہیں، اور ان کا کوئی موزوں متبادل عام زبان میں نہیں ہے۔بھلا مندرجہ ذیل الفاظ کو کس طرح بدیسی کہا جاسکے گا:

پردہ، پہلوان، تیز/تیزی، جمع، جہاز، خراب/خرابی، دروازہ، دوا، رنگ/رنگین، روز، سامان، سرکار، شہر، کرسی، کشتی، گرم/گرمی،

www.taemeernews.com

گلاب/گلابی،گلدستہ،ہوا۔

اس طرح کے صدہا لفظ ہیں جن میں سے اکثر کے بارے میں عام بولنے والا جانتا بھی نہیں کہ یہ بدیسی ہیں۔ ظاہر ہے کہ بدیسی اور دیسی میں فرق کرنا پڑے گا یعنی ''بدیسی'' کوئی مطلق اصطلاح نہیں ہے اور جب بدیسی کوئی مطلق اصطلاح نہیں ہے تو ''اردو پن/ٹھیٹھ اردو وغیرہ کا وجود محض عینی ہوگا، واقعی نہ ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ آل احمد سرور کہتے ہیں:

''اب یہ خیال ذہن سے نکال دینا چاہیے کہ غالب کے یہاں اردو پن نہیں ہے۔ غالب کے اردو پن اور آرزو کے اردو پن میں فرق ہے۔ آرزو کا اردو پن جذبے کا ساتھ دے سکتا ہے، غالب کا اردو پن انفس و آفاق کے آیات تک پہنچ سکتا ہے۔ اس لیے خواہ وہ ابوالکلام کی جزالت ہو یا اقبال کی حکمت، راشد کی فنکاری ہو یا عبدالعزیز خالد کی لفظ تراشی، یہ سب اردو پن کے ہی مختلف روپ ہیں۔''

آل احمد سرور کی غالب شناسی میں ایک جہت کی کمی کا ذکر میں نے ابھی کیا تھا، کہ وہ غالب کو ان کی روایت اور ادبی تہذیب کے فریم میں رکھ کر نہیں دیکھتے۔ یہ بات اس وقت شاید اتنی ضروری نہ تھی جب آل احمد سرور ہمیں غالب اور جدید ذہن کے درمیان مماثلت اور مساوات کے بارے میں بتا رہے تھے۔ بعد میں انہوں نے روایت کی طرف بھی تھوڑی بہت توجہ کی۔ چنانچہ اپنے مضمون ''غالب کا نظریۂ شاعری'' [مشمولہ ''پہچان اور پرکھ''، ۱۹۹۰ء] میں آل احمد سرور نے غالب کو ان کی روایت، اور خاص کر سبک ہندی کی روایت اور خیال بندی کے تناظر میں رکھ کر دیکھنے کی سفارش کی ہے۔ لیکن سچی بات یہی ہے کہ غالب کے پہلے کی اردو غزل کے بارے میں سرور صاحب کے بیانات اس مضمون میں صرف اشاروں اور عمومی باتوں تک محدود ہیں (چھوٹے سے مضمون میں زیادہ ممکن بھی نہ تھا)، اور ان کے خیالات کو تفصیل کی بہت ضرورت ہے۔ ناسخ اور ذوق کے خلاف ان کے ذہن میں کچھ تعصب آخر تک رہا۔ اس مضمون میں وہ اس بات کا اظہار کرتے ہیں کہ خیال بندی نے غالب کے شعری مزاج کی تعمیر میں اہم حصہ لیا ہے۔ سرور صاحب کے خیال میں غالب نے ''بیدل سے خیال بندی لے کر...... میر کی تندرست روایت سے اپنا صنم خانۂ فکر اور نگار خانۂ فن تعمیر کیا۔'' یہاں وہ اس بات کو بھی صاف لفظوں میں کہتے ہیں کہ غالب نے میر کی طرف رخ موڑا تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ انہوں نے میر کا اتباع مشینی انداز میں کیا۔

''غالب کی جو غزلیں میر کے رنگ میں کہی جاتی ہیں ان میں بھی غالب میر سے مختلف ہیں، کیونکہ غالب کی حسیت میر سے مختلف ہے۔''

غالب نے میر سے مضامین مستعار لیے اور انہیں اپنے رنگ میں رنگ لیا، اس حقیقت کی طرف سرور صاحب نے بہت کم اشارہ کیا ہے۔ اپنے مضمون ''غالب کی شاعری کی خصوصیات'' میں انہوں نے میر اور غالب کے دو کم و بیش ہم مضمون شعروں کا مختصر موازنہ کیا ہے۔

www.taemeernews.com

بڑھتیں نہیں پلک سے تا ہم تلک بھی آ ویں
پھرتی ہیں وہ نگاہیں پلکوں کے سائے سائے

وہ نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں یارب دل کے پار
جو مری کوتاہی قسمت سے مژگاں ہو گئیں

غالبؔ نے جہاں میرؔ سے مضمون لیا ہے وہاں کم ایسا ہوا ہے کہ ان کا شعر میر سے ہیٹا رہ گیا ہو، لیکن ایسا بھی کم ہی ہوا ہے کہ غالبؔ نے میرؔ کو پیچھے چھوڑ دیا ہو۔ عام طور پر غالبؔ نے اپنی راہ میر سے الگ نکالی ہے، یعنی مضمون تو مستعار لیا ہے، لیکن اس کو کسی نئے پہلو سے بیان کیا ہے یا اس میں کوئی نیا عنصر رکھ دیا ہے۔ مثلاً شعر زیر بحث ہی کو دیکھیے، اس میں غالب نے استفہام کے ذریعہ ایک ڈرامائیت پیدا کر دی ہے جو میر کے شعر میں نہیں ہے۔ آل احمد سرور نے میر کے شعر میں سہوا ''اٹھتی'' لکھا ہے۔ اس سہو کی بنا پر غالبؔ کے شعر میں میر سے استفادے کی ایک جہت کم ہو جاتی ہے۔ ''بڑھتیں نہیں'' یعنی ''کم رہ جاتی ہیں، کوتاہ رہ جاتی ہیں۔'' غالبؔ کا شعر میر کے شعر سے بیشک بڑھا ہوا ہے، لیکن غالبؔ نے استفادہ بھی دل کھول کر کیا ہے۔

آل احمد سرور کہتے ہیں:

> ''محبوب کی نیچی نگاہوں کے سحر کو میرؔ نے جس طرح بیان کیا ہے وہ اسی [کذا] کا حصہ ہے۔ ادبی مصوری کی معراج ہے۔ مگر غالبؔ کے یہاں اس سے آگے کی بات ہے۔ نگاہیں نیچی ہیں، گویا مژگاں میں اسیر ہیں۔ یا مژگاں ہیں، مگر اس کے باوجود دل کو بر مار رہی ہیں۔ پلکوں کے سائے کا لطف علیحدہ ہے اور مژگاں ہونے کی بلاغت علیحدہ۔ مگر مژگاں ہونے میں جو پہلوداری آ گئی ہے اور سوال کے ذریعہ سے جس بندش میں راہوں [کذا، صحیح، نگاہوں] کی طرف اشارہ کیا ہے وہ غالبؔ کا مخصوص طریقۂ کار ہے۔

آج کے زمانے میں ہمیں اس بات کا مکمل احساس ہے کہ پرانے لوگ شعر سے شعر بنانے کو برا نہیں سمجھتے تھے، بلکہ فن جانتے تھے، اور جس شاعر کے شعر سے استفادہ کرتے تھے، اسے گویا خراج عقیدت پیش کرتے تھے۔ سبک ہندی کے شعرا نے استفادہ اور جواب کی رسم کو شعریات کا ایک منطقہ قرار دیا۔ انہوں نے کسی گذشتہ یا معاصر شاعر کے کلام پر اپنا کلام مرتب کرنے، یا اس کے دیوان کے جواب میں دیوان لکھنے کو ''استقبال'' کا اصطلاحی نام دیا۔ یہ بات ظاہر ہے کہ ''استقبال'' میں دونوں معنی موجود ہیں: آگے بڑھ کر احتراماً کسی کی مشائعت کرنا، اور کسی سے آگے نکل جانا۔ غالبؔ نے یہ لفظ نہیں استعمال کیا ہے، لیکن میرؔ کے تعلق سے ان کی کارگذاری سراسر استقبال کی سی ہے۔

آل احمد سرورؔ نے لکھا ہے (''غالبؔ کی شاعری کی خصوصیات''):

> انصاف کی بات یہ ہے کہ غالبؔ میرؔ سے زیادہ ترقی یافتہ اور Sophisticated ذہن رکھتے ہیں۔...... ایک نکتہ آفرینی،

www.taemeernews.com

ایک صحت مند تشکیک، حقائق کو الٹ پلٹ
کر دیکھنے اور ایک نئی بصیرت ظاہر کرنے
کا جو ملکہ غالب کے یہاں ملتا ہے وہ
غالب کو میر سے زیادہ تسکین بخش، زیادہ
جامع، زیادہ کثیر الابعاد بنا دیتا ہے۔

اس عبارت میں کئی فقرے یا تو تفصیلی معنی
کے متحمل نہیں ہو سکتے (مثلاً ''ترقی یافتہ ذہن'')،
یا بہت مبہم ہیں، خواہ وہ سچ ہی کیوں نہ ہوں
(''نئی بصیرت''، ''صحت مند تشکیک'')، یا پھر ایسی
باتوں کو ظاہر کرتے ہیں جو میر کے یہاں بھی ہیں،
(مثلاً ''نکتہ آفرینی'')۔ آل احمد سرور نے غالب
کو یقیناً کئی باتوں میں نئے ذہن کا پیش رو، اور
نئی حسیت کا حامل ثابت کیا۔ لیکن میر اور غالب کے
موازنے میں ان کے یہاں کچھ طرفداری
بھی جھلکتی ہے، اور ٹھیک ہی ہے، کہ طرفداری کے
بغیر سخن فہمی ہوتی نہیں۔

☆☆☆

www.taemeernews.com

باقر مہدی*

پروفیسر آل احمد سرورؔ
ایک دانش ور، نقاد اور شاعر

مجھے معلوم ہے کہ ہر وہ لفظ جو دانش ور کے لیے استعمال ہوتا ہے اب وہ ذو معنی ہو گیا ہے خاص کر ایک ایسے سماج میں جو تیزی سے ماضی کی طرف جا رہا ہو۔ زمانہ گزر گیا کہ مشہور عالمی صحافی پال جانسن نے اپنی کتاب "دانشور" (اشاعت ۱۹۸۸ء) میں جی بھر کے اس لفظ کا، اس سے وابستہ افراد کا مذاق اڑایا تھا۔ میں نے سرورؔ صاحب کی خودنوشت کا سہارا لینا مناسب نہیں سمجھا ہے اس طرح میں نے اپنے لیے مسائل کو اور پیچیدہ کر دیا ہے۔ صرف اپنے مشاہدات اور ان کی دو تین کتابوں کی مدد لی ہے۔

سرور صاحب نے اپنے ذہنی ارتقاء کے لیے ڈاکٹر ذاکر حسین کی مدد نہیں لی ہے گو کہ جذبیؔ صاحب کا خیال ہے "ان کے مرشد خدا نہ بن جائیں"۔ سرور صاحب کی شاعری اور تنقید پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ ان میں "دم" نہیں ہے۔ میں اس رائے سے متفق نہیں ہوں۔ ان کی ایک نظم "کل اور آج" کا مطالعہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ گرد و پیش کے حالات سے واقف رہتے تھے اور اپنے ذہنی ارتقاء کی برابر کوشش کرتے رہتے تھے۔ میں جب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں پڑھتا تھا جب ڈاکٹر ہادی حسن، پروفیسر خواجہ منظور حسین اور پروفیسر رشید احمد صدیقی کا ذکر بہت ہوتا تھا اور انہیں "دانش ور" کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا، میری اس زمانہ میں بھی سرور صاحب سے جان پہچان تھی مگر سرسری۔ آج میں لکھنؤ کی ملاقاتوں کی بازگشت کرتا ہوں تو پتا چلتا ہے کہ پروفیسر ڈی۔ پی مکرجی اور محترمی احتشام حسین کے علاوہ میں سرور صاحب سے متاثر ہوا تھا۔ یہاں ایک واقعہ کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو قارئین کو غیر ضروری معلوم ہو مگر میرے لیے اہم ہے۔ میں اکثر اتوار کی شام سرورؔ صاحب کے گھر ان کے چھوٹے بھائی اولاد احمد صدیقی سے ملنے جاتا تھا۔ ایک شام میرے ہاتھ میں ایک کتاب دیکھ کر انہوں نے کہا "کون سی کتاب ہے جو تم چھپا رہے ہو"۔ میں نے عرض کیا اولاد صاحب کے مطالعہ کے لیے لایا ہوں اس کتاب کا نام ہے "MAN THE UNKNOWN" BY ALEXIS CARREL انہوں نے یہ کتاب

---

*معروف دانشور اور ادیب، روی درشن، کارٹر روڈ، ممبئی۔

www.taemeernews.com

مجھ سے لی اور دیکھا کہ میرے دوست اور ہم جماعت رام ناتھ بلسل نے ۳۱ راگست ۱۹۵۱ء میں مجھے دی تھی۔ انہوں نے کوئی سوال نہیں پوچھا کہ اولاد صاحب آ گئے تھے اور میں نے یہ کتاب انہیں پڑھنے کے لیے دی تھی۔ آج ۵۴ برس بعد یہ کتاب پھر میرے پاس ہے اور اس کے پڑھتے ہوئے مجھے غالبؔ کا مشہور شعر بھی یاد آ رہا ہے:

کوئی آگاہ نہیں باطن ہم دیگر سے
ہے ہر اک فرد جہاں میں ورق ناخواندہ

اس کتاب میں پنسل سے جگہ جگہ نشانات لگائے تھے آج وہ بہت مدھم ہو گئے ہیں پھر بھی اس کے چند اقتباسات پیش کرتا ہوں تا کہ پتا چل جائے کہ مجھے دانشوروں سے کتنا لگاؤ تھا۔ اسے یعنی Allexis Carrel کو ۱۹۱۲ء میں نوبل انعام بھی ملا تھا۔ یہ کتاب پہلے ۱۹۳۵ء میں شائع ہوئی تھی میرے پاس جو کتاب ہے وہ ۱۹۴۸ء کا نسخہ ہے۔ وہ اس وقت کے سماج سے برہم تھا کہ ایجادات کو آدمی کے لیے دودھاری تلوار سمجھتا تھا، وہ انکشافات سے خوش بھی تھا مگر ان کے بے جا استعمال سے نالاں بھی تھا، وہ سمجھتا تھا کہ آدمی کے پر و بال کو لاکھ عریاں کیا جائے مگر راز دروں بند ہوتا اور کھلتا رہے گا۔ وہ ایک جگہ بہت دلچسپ بات لکھتا ہے کہ اگر Beatrice دانتے کو مل جاتی تو وہ ہرگز مقدس طربیہ نہ لکھتا۔ اس کا خیال ہے کہ یہ عظیم شعری مجموعہ ''ناکام محبت کے جنون'' کا نتیجہ ہے (ص ۱۳۸)۔ وہ فرائڈ Freud کو اہم ماہر نفسیات سمجھتا ہے مندرجۂ ذیل جملے ملاحظہ ہوں:

Thought is the offspring of the endocrine glands as well as of the cerebral cortex. The integrity of the organism is indispensable to the manifestation of consciousness, Man thinks, invents, loves, suffers, admires & prays with his brain and all his organs."

آزاد ترجمہ:

''خیال کی آمد نظریاتی فکر اور عزت آوری کی خاطر ہوتی ہے یہ ایک معنی میں شخصیت کو مرکزی صورت دینے کا لازمی حصہ ہے۔ آدمی سوچتا ہے، ایجادات کرتا ہے، محبتیں کرتا ہے، مصائب سہتا ہے، وہ اپنی پسندیدگی کا اظہار بھی کرتا ہے۔ یہ سب کام دماغی بھورے مادے اور سارے اعضاء کی مدد سے کرتا ہے۔'' ALEXIS CARREL کا خیال ہے کہ سماج ایسا آلودہ ہو گیا ہے کہ دانش وری کا فروغ نہایت نازک مسائل کے در پیش ہے۔ اخبارات اور رسل و رسائل کی بہتات 'خام ادب' ریڈیو اور ناقابل اشتہارات نے انسانی ذہن کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔

میں اب ایک تنقیدی نظر سرورؔ صاحب کے پہلے شعری مجموعے پر ڈالتا ہوں۔ شاید یہ لکھنا مناسب نہ ہوگا کہ میں ''ذوق جنوں'' پر تفصیلی تبصرہ ۱۹۵۶ء میں کر چکا ہوں۔ یہ تبصرہ مشفق خواجہ کے پرچے ''تخلیق''

www.taemeernews.com

میں شائع ہوا تھا۔ آج پھر تقریباً پچاس سال بعد اس کا مطالعہ پیش کرتا ہوں تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ سرور صاحب کی شاعری نے بھی ان کی دانش وری میں نمایاں حصہ لیا تھا کیونکہ ایک طرف سرور صاحب نے تعلیمی منزلیں نہایت خوبی سے سرانجام دی تھیں دوسری طرف شاعری اور تنقیدی نثر بھی ان کے معاون رہی تھی۔

''ذوق جنوں'' میں ''میری شاعری'' کے عنوان سے سرور صاحب نے چودہ (۱۴) صفحات تحریر کیے ہیں اور والٹ وٹمین کا ایک اقتباس بھی پیش کیا ہے: ''کیا میں متضاد باتیں کہتا ہوں۔ جی ہاں میں''۔ اس کے یہ جملے بھی قابل توجہ ہیں: ''جو شاعر زندگی کے تمام پہلوؤں کو سمیٹنا اور سمونا چاہے اس کے یہاں آپ کو کچھ نہ کچھ تضاد ملے گا۔ ہمارے شعراء میں اقبالؔ کے یہاں وحدت فکر سب سے زیادہ ہے مگر تضاد کا احساس ان کے یہاں بھی ہوتا ہے''۔ یہ بھی لکھا ہے ''جی چاہتا تھا کہ ان پر اطمینان سے نظر ثانی ہو مگر ایسا نہ ہو سکا۔ مجھے ایمانداری سے یہ احساس ہوتا ہے کہ فکری شاعری کے لیے جس عرق ریزی اور بھرپور توجہ کی ضرورت ہے وہ میں نہ دے سکا''۔ میں ان جملوں کو اس لیے نقل کر رہا ہوں کہ سرور صاحب نے شروع ہی سے دانش وری کو اپنے سینے سے لگائے رکھا تھا۔ ایک اور فکر خیز جملہ پڑھیے: ''ایک بے اطمینانی، ایک تشنگی، ایک کمی کا احساس میرا پیچھا نہیں چھوڑتا''۔ یہ ایک بیدار ذہن کا وہ اعتراف ہے کہ جو ہر دانش ور کا مقسوم ہے۔ نظم ''آج اور کل'' کے چند شعر پیش کرتا ہوں جو میرے ناچیز خیال سے آج بھی اچھے ہیں:

دھوپ کے ہاتھوں لٹا جاتا ہے شبنم کا سہاگ
پھول کھلنے نہیں پاتے کہ بکھر جاتے ہیں
جام امرت کے جو ہونٹوں سے لگاتا ہے کوئی
روح میں زہر کے نشتر سے اتر جاتے ہیں

ان دو اشعار پر ذرا فکر کیجیے ''شبنم کا سہاگ'' اور ''زہر کے نشتر'' کیا ان میں کوئی شعری ندرت نہیں ہے؟ یہ ۱۹۴۹ء کی نظم ہے اور آج بھی مطالعہ کے قابل ہے اور ایک طنزیہ نظم ہے۔ عنوان کتنا معنی خیز ہے ''برابری بھی نہ ہو اور برابری بھی رہے۔'' یہ دو شعر ملاحظہ ہوں جو آج کی حقیقت بیان کرتے ہیں:

یہ جان و دل سے ہو جمہوریت کی شیدائی
اقلیت میں کچھ احساس کمتری بھی رہے
شریک بزم ہوں سب جام چند تک پہنچے
برابری بھی نہ ہو اور برابری بھی رہے

یہ نظم ایک طنزیہ انداز رکھتی ہے اور آج کے سیاسی ماحول پر چسپاں بھی ہے ـــــ ایک اور نظم 'دیوالی' ہے جو آج کوئی بھی اردو شاعر لکھنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ یہ نظم ۳۰/اکتوبر ۱۹۵۱ء میں لکھی گئی تھی۔ یہ شعر دیکھیے:

غضب ہے لیلیٰ شب کا سنگھار آج کی رات
نکھر رہی ہے عروس بہار آج کی رات

نظم کا آخری شعر بھی بڑا فکر خیز ہے:

ان آندھیوں میں بشر مسکرا تو سکتے ہیں
سیاہ رات میں شمعیں جلا تو سکتے ہیں

ایک غزل کا مقطع ملاحظہ ہو:

www.taemeernews.com

سرور حضرت انساں کا راز فاش نہیں
کہ آدمی سے ابھی آدمی کا پردہ ہے

(جون ۱۹۵۲ء)

میں ایک نظم ''عزم کوہکنی'' کا اپنے پہلے مضمون میں ذکر (اشاعت اردو زبان) کر چکا ہوں پھر بھی یہاں ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ نظم کے چند اشعار پر غور کیجیے تا کہ پتا چل جائے کہ اردو زبان کی زبوں حالی کا سرور صاحب کو بہت پہلے سے اندازہ تھا:

مورخ اپنے ہی زریں ورق کو بھول گئے
معلم آج کے کل کے سبق کو بھول گئے
جو اس کے نام کی مالا جپا ہی کرتے تھے
حکومت آئی تو اردو کے حق کو بھول گئے

یہ نظم اردو زبان کا ایک نوحہ ہے جو پڑھنے والے کو مجبور کرتی ہے کہ وہ آہ و نالہ کرے! آج کی سیاست میں کشمیر کا مسئلہ سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ سرور صاحب نے اس موضوع پر ایک نظم جون ۱۹۵۳ء میں لکھی تھی، پوری نظم تو نقل نہیں کر سکتا مگر یہ شعر ضرور لکھوں گا:

نہ جانے کتنے صحراؤں کی قسمت جاگ اٹھی اس سے
سنبھال اس کو بڑی دولت ہے ترا اشک عنابی

اور آج تک کشمیر گریاں ہے ہندوپاک کے نزاعات ختم ہی نہیں ہوتے؟ سرور صاحب کی دانش وری کے ثبوت کے لیے ان کی نظم ''دو قدریں'' کے یہ دو شعر پیش ہیں:

کتنے میخانوں کے در میرے لیے بھی وا ہیں
تشنگی میری فضیلت ہے مقدر تو نہیں

کاغذی پھولوں کی جنت سے مجھے کیا لینا
میرے افکار کی جنت کے برابر تو نہیں

یہاں سرور صاحب کی شاعری کے بارے میں تفصیلی تحریر کا موقع نہیں ہے مجھے نہیں معلوم کہ ''ذوق جنوں'' کی دوسری اشاعت ہوئی یا نہیں۔ یہ مضمون ایک دائرہ میں رہ کر لکھا جا رہا ہے، اس میں اب ''ذوق جنوں'' اور سرور صاحب کی شاعری کا زیادہ ذکر نہیں کروں گا!

مجھے دانش وری کی مختصر تاریخ نہیں پیش کرنی ہے۔ اس لفظ کا آغاز کب اور آج یہ اتنا ملعون کیوں ہے؟ نہ جانے سالہا سال ہوئے میں نے کون سی کتاب پڑھی تھی جس میں لکھا تھا کہ دانش وروں کی گنتی ناممکن ہے اس لیے اس مصنف نے لکھا تھا ہر ملک کے چھوٹے بڑے شہروں میں ان کی تعداد اتنی بڑھ گئی ہے کہ ان کا ذکر ناممکن ہے۔ اس جملے کے بعد اس نے سینکڑوں دانش وروں کے نام لکھے تھے۔ کوئی شخص جو علم و فن میں ماہر ہو اسے دانش ور کہا جا سکتا ہے، اتفاق سے میرے پاس ایک کتاب خستہ حالت میں موجود ہے یہ EDWARD SHILS کی تصنیف ہے، اس کا نقادوں نے خوب خوب مذاق اڑایا ہے افسوس کہ لوگ مصنف کے طرز تلمیح کو سمجھ نہ سکے یا سمجھنا نہ چاہتے ہوں۔ ایک زمانے میں مجھے بھی اس ''لفظ'' سے ڈر لگتا تھا اس لیے کہ مجھے چند لوگ حقارت سے انٹلکچول (Intellectual) کے نام سے یاد کرتے تھے شاید اس لیے کہ باتیں کرتے وقت میں اکثر کتابوں کا ذکر کرتا تھا۔ اس پہلو سے دیکھا جائے تو ہر ''کرم کتابی'' دانش ور کہلائے گا۔ میرے

www.taemeernews.com

دوست اختر الایمان نے میرے بارے میں ایک نظم لکھی تھی میں نے بھی اس کے جواب میں ایک نظم لکھی تھی مگر اپنی شریک حیات خیر النساء مہدی کے اصرار پر اسے شائع نہیں کیا بلکہ ان کے گذر جانے کے بعد شائع کیا تھا یہ صرف جملہ معترضہ کے طور پر لکھ رہا ہوں اس کا مضمون میں ذکر نہ ہونا چاہیے تھا۔۔۔ دوسری کتاب "دانشور کی نمائندگی" Representation of the Intellectual ہے یہ ایڈورڈ سعید کی مختصر کتاب ہے اس کے علاوہ Antonio Gramsci کی کتاب ہے۔ (بلراج مین را، نے "شعور" ایک تفصیلی ترجمہ بھی گرامچی کے بارے میں شائع کیا تھا) میرے پاس اس کی ڈائری جو ۱۹۷۱ء کی اشاعت ہے اس کا خیال ہے All men are intellectuals, one could therefore say: but not all men have in society the function of intellectuals. سب آدمیوں کو دانش ور کہا جا سکتا ہے مگر سماج میں دانش وری کا فرض چند ہی افراد انجام دیتے ہیں، گرامچی ایک مارکسی مفکر تھا پتا نہیں مفکر کو دانش ور کہا جائے گا یا صرف فلسفی؟ سرور صاحب نے اپنی ذہنی تعلیم نہایت خوش اسلوبی سے انجام دی ہے۔ پہلے انگریزی میں ایم۔اے پھر اردو میں ایم۔اے کیا تھا۔ وہ فارسی زبان و ادب سے بھی بہت واقف تھے۔ یہ میرا مشاہدہ ہے کہ میرے استاد پروفیسر ڈی۔پی مکرجی سے نہایت شائستہ انگریزی میں دیر تک گفتگو کرتے تھے۔ میں پروفیسر ڈی۔پی مکرجی کو دانش ور اس لیے کہتا ہوں کہ ایک روز وہ ہمیں پڑھا رہے تھے یعنی لکچر دے رہے تھے کہ سامنے سے استاد فیاض خاں کو جاتے ہوئے دیکھا، فوراً اپنا لکچر چھوڑ کر ان کو ہماری کلاس میں لے آئے اور ہم لوگوں سے کہا کہ ادب سے کھڑے ہو جاؤ ہم نے یہ حکم منظور کیا، آفتاب موسیقی استاد فیاض خاں نے ہم سب کو سلام کیا۔ یہ واقعہ میں اس لیے بھی لکھ رہا ہوں کہ پروفیسر ڈی۔پی مکرجی نے ایک چھوٹی سی کتاب انگریزی میں "موسیقی کا تعارف" اور بنگالہ زبان میں ناول بھی لکھے ہیں اور ان کے مضامین کا ایک مجموعہ DIVERSITIES بھی میرے پاس ہے جو پروفیسر ابو سالم نے ان سے دستخط کر کے مجھے عنایت کیا تھا۔ مجھے ان سے اتنا لگاؤ ہو گیا کہ میں ان کے لکچر سننے دور دور سے چل کر لکھنؤ یونیورسٹی آتا تھا افسوس ہے کہ ان کے ایک جملے کی وجہ سے انہیں چانسلر کے۔ ام منشی نے برخاست کر دیا تھا وہ جملہ قارئین کی نذر ہے:

Gandhiji was a great man but he lacked sense of history. (گاندھی جی ایک بڑے آدمی تھے مگر تاریخ کا علم نہ تھا)۔

ایڈورڈ سعید کا خیال ہے کہ اپنے ماحول، تاریخ، معاشیات اور ملکی تہذیب کی پوری جانکاری رکھنے والے کو بھی دانش ور کہا جا سکتا ہے وہ مارکسی مفکر THEODOR ADORNO کا حوالہ دیتا ہے:

Suspicious probing is always solutory, for a Man who no longer has a homeland, writing" become his home" p.58

www.taemeernews.com

آزاد ترجمہ:

تشکیکی چھان بین ہمیشہ ذہنی صلاحیت کے لیے ضروری ہے خواہ وہ جلاوطن کیوں نہ ہو کیونکہ تحریریں اس کا گھر ہیں (صفحہ ۵۸)۔ دوسرے صفحہ پر آسان الفاظ میں وہ یہ بھی کہتا ہے ''وہ شخص بھی دانش ور ہے جو آزادی' تحریر و تقریر اور علوم کی جانکاری کے لیے جدوجہد کرتا ہے''۔ اپنی کتاب کے آخر میں وہ NOAM CHOMSKY کی کتاب ''زبان اور ذہن'' کا حوالہ دیتا ہے اور اسے اس عہد کا بڑا دانش ور سمجھتا ہے —— غرض کہ دانشوری لاکھ مطعون ہو مگر اسے ایک طاقت (Power) بھی سمجھا جاتا ہے۔ یہاں کارل مارکس کا ایک قول نقل کرنا چاہتا ہوں (یہ جانتے ہوئے بھی کہ ترقی پسند اور ان کے دشمن دونوں مجھ سے خفا ہیں کہ میں نے مارکسزم کا مطالعہ ترک نہیں کیا ہے) To be redical is to grasp things by roots. But for the man the root is the man himself_(Pris Critique-Discovered in 1927).

آزاد ترجمہ:

''خیالات کی جڑوں کی کھوج رکھنا ایک ریڈیکل کے لیے ضروری ہے مگر اس کی جڑیں تو خود آدمی میں ہیں''۔
(تحقیق ۱۹۲۷ء)

سرور صاحب کی تنقید پر اکثر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ شعریت سے ملوث ہوتی ہیں یعنی دوسرے الفاظ میں سنجیدگی کم ہوتی ہے۔ ان لوگوں میں وہ افراد زیادہ شامل ہیں جو تنقید کو بے وقت کی راگنی سمجھتے ہیں یا تنقید کو کتابی کہتے ہیں۔ ایک صاحب نے سرور صاحب کی تنقید کو معمولی اور بے بضاعت کہنے کی جرأت کی تھی ۔ یہ صاحب حضرت وارث علوی اپنے ان خیالات کا اظہار انہوں نے ''اظہار'' (ایک مجلہ) کے پہلے شمارے میں کیا تھا۔ ایک طویل مدت کے بعد میں نے یہ مضمون آہستہ آہستہ پڑھنے کی کوشش کی مگر تحریر میں اتنی روانی، سنجیدگی اور فکر خیزی ہے کہ مجبوراً مجھے بھی چند صفحات کے بعد یہ ''سیلاب'' بہالے گیا۔ آیئے اس مضمون کے دو تین اقتباسات دیکھتے ہیں:

''وہ ایک کامیاب زندگی بسر نہ کر سکا شرافت کے خاص معیار کو گلے سے لگائے رہا مگر وہ زندگی کے حوادث میں ظرافت کی کرنیں ڈھونڈ سکتا تھا، اپنے اوپر ہنس سکتا تھا۔ اس کا اچھا اثر یہ ہوا کہ اسے اپنے اوپر بھروسہ کرتا آیا، دوسروں کی شخصیت کی نقالی میں وہ گم نہ ہو سکا —— اس نے معمول بنا لیا کہ پانچ صفحے روزانہ لکھے گا —— جب وہ ڈرامہ نویس اور صحافی کی حیثیت سے شہرت اور فراغت حاصل کر چکا تھا —— اسی وجہ سے وہ غریبی اور تہی دستی سے ایسی نفرت کرتا ہے جس کی آنچ کا جواب نہیں —— وہ ریگستانوں میں پھول کھلاتا، سمندر کے سینے کو چیرتا، فضا کو پامال کرنا چاہتا ہے —— 'شا' میں اتنی کشش تھی

www.taemeernews.com

کہ ایک مالدار دوشیزہ نے اسے اپنی طرف مائل کیا اور بالآخر دونوں کی شادی ہوگئی ـــــ وہ حسن پرست تھا مگر بوالہوس نہ تھا، وہ آزادیٔ نسواں کا حامی تھا۔ اس نے ہر قسم کی ریاکاری کے خلاف جہاد کیا۔ خصوصاً وکٹوریہ کے عہد کے نظام اخلاق سے ـــــ شا اپنے دوستوں کی حمایت میں ہمیشہ سینہ سپر رہتا تھا ـــــ جو لوگ مغالطے میں مبتلا ہیں، جنھوں نے اپنی شخصیت کا ایک بت بنا رکھا ہے، جو نرگسیت کا شکار ہیں شا کا تیر ان کے لیے ہر وقت تیار ہے ـــــ سوئفٹ کی طرح کوئی احمق اور شیطان اس کے کوڑے سے نہیں بچا، ہاں شیطان کی شیطنت میں ندرت ہے تو شا اس کی تعریف کیے بغیر نہیں رہتا۔ اقبالؔ کی طرح شاؔ کے یہاں بھی ''کارنادر'' اگر گناہ ہو تو ثواب ہے''ـــ

سرورؔ صاحب شاؔ کے ڈرامہ میں شیطان کی تقریر کا طویل اقتباس دیتے ہیں پھر غالبؔ کی طرف رجوع ہوتے ہیں آپ بھی دو تین شعر سنیے:

دراں پاک مے خانہ بے خروش
چہ گنجائی شورش نائے و نوش
بہ مستی، ابر باراں ـــــ کجا
خزاں چوں نباشد بہار ان کجا
نظر بازی و ذوق دیدار کو
بہ فردوس روزن بدیوار کو

سرورؔ صاحب شاؔ پر مضمون لکھتے ہوئے کئی نقادوں، سائنس دانوں کے نام لیتے ہیں، یہی نہیں اقبالؔ اور غالبؔ کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس خوبصورت اور دلچسپ مضمون کے آخری چند جملے پیش ہیں:

''شا کی چنگاری ہمیں غالبؔ اور اقبالؔ کی یاد دلاتی ہے جو اتنے مختلف ہوتے ہوئے بھی ایک ہی مقدس آتش کدے یعنی زندگی سے لی گئی ہے اسی لیے ادب کی دنیا میں ملک، قوم، زبان اور مذہب کی قیدیں نہیں ہیں'' (ص ۱۸۰ سے ۲۲۱ تک، نظر اور نظریہ، اشاعت ۱۹۷۳ء) میں نے شاؔ پر کوئی بھی اردو زبان میں مضمون نہیں پڑھا ہے۔ سرور صاحب سے ملنا اور گفتگو ایک تعلیمی سبق سے کم نہیں تھا۔ مجھے اس کا احساس اس وقت ہوا جب میں شام لال (ٹائمس کے مدیر اعلا) سے ملنے جاتا تھا ــــ (میں نے دو کتابیں 'نظر اور نظریہ، مسرت سے بصیرت تک' پر سرورؔ صاحب سے دستخط کرائے تھے۔ ۲۷ نومبر ۱۹۷۴ء)

اب میں سرورؔ صاحب کے غالبؔ اور اقبالؔ کے بارے میں لکھے گئے مضامین کے دو تین اقتباسات پیش کرونگا:

''اول تو آج ہم غالبؔ کے دو یا تین ٹکڑے نہیں کر سکتے بلکہ ہمیں غالبؔ کی ساری شاعری کو نظر میں رکھنا ہوگا، دوسرے ہم اس کی ابتدائی شاعری کے عرفان کو غالبؔ کے عرفان کے لیے ضروری سمجھتے ہیں، تیسرے ہم اس میں

www.taemeernews.com

زیادہ تر خزف ریزے اور چند جواہرات
نہیں دیکھتے بلکہ صرف چند خزف ریزے
اور زیادہ تر جواہرات دیکھتے ہیں اور
حالی جہاں لطف کی کمی پاتے ہیں وہاں
گنجینۂ معانی کا طلسم دریافت کر سکتے ہیں
جو فتح ہو جاتا ہے تو روح کو ایک بالیدگی
اور ذہن کو ایک شادابی بخشتا ہے''
(مسرت سے بصیرت تک، ص ۱۴۹)

یہ جملے بھی لائق توجہ ہیں:

''فن بہر حال زندگی کی ایک
معنی خیز اور نئی تنظیم ہے جو زندگی سے عشق
بھی عطا کرتی ہے اور اس کا عرفان بھی۔
یہاں تشکیک ایک نئے ایمان کی تلاش،
عقلیت گوشت میں ہڈی دریافت کرنے
کی کوشش اور نفسیاتی ژرف بینی مختلف
حقائق کو الٹ پلٹ کر ان کی تہہ تک پہنچنے
کی کوشش کا دوسرا نام بن جاتی ہے۔''
(ص ۱۵۵)

تیسرا اقتباس ملاحظہ ہو:

''ذوقؔ کا ذہن تقلیدی تھا غالب کا
باغیانہ اور کافرانہ، جب کچھ منجمد حقائق
جھوٹ بن جاتے ہیں تو سچ جنون کا
روپ اختیار کر لیتا ہے اسی کو رسلؔ نے
کذب کی ہوش مندی کہا ہے "To be
save with lies" اس کے مقابلے
میں سچ کی دیوانگی پر زور دیا ہے:

تھی نظر میری نہاں خانۂ دل کی نقاب
بے خطر جیتے ہیں ارباب ریا میرے بعد
(ص ۱۵۸)

چوتھا اقتباس:

''غالبؔ کے یہاں بھی Concretes
Absolutes, کی کثرت کے مشاہدے
سے ہی سمجھ میں آتا ہے۔ اس بات کو
ایف۔ ار۔ لیوس نے اس طرح کہا ہے
کہ آفاقیات، مخصوصیت کے ذریعے ہی
آتی ہے۔ زمین کے ہنگاموں کو سہل
کرنے کا بیڑا اقبالؔ نے اٹھایا مگر غالب
نے یہ درد سر مول نہ لیا۔ ان میں سیر
کے لیے برابر اور فضا درکار رہی اور
اس کے نظارے میں محور ہے یہی ان
کی عظمت کا راز ہے:

کیوں نہ فردوس کو دوزخ میں ملا لیں یارب
سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی

اقبالؔ نے بال جبریل کے ایک شعر میں کہا ہے۔

رہے نہ ایبک و غوری کے معرکے باقی
ہمیشہ تازہ و شیریں ہے نغمۂ خسرو

یہ خیال غالبؔ سے لیا گیا ہے اور میں اسے
غالبؔ کا کارنامہ سمجھتا ہوں کہ انہوں نے انفرادیت
کی تکمیل اور فن کے ریاض کو ایک قدر اعلا کی حیثیت
سے پیش کیا۔

www.taemeernews.com

یک بخت اوج نذر سبک باری اسد
سر پر وبال سایۂ بال ہما نہ مانگ
(ص ۱۵۹۔۱۶۰)

سرور صاحب نے غالب پر قابل مطالعہ تین مضامین لکھے تھے۔ یہ مضامین اچھے ہیں مگر غیر معمولی نہیں ہیں اس لیے کہ شروع سے وہ ''اقبالی مجرم'' تھے اور آخر تک رہے تھے۔ میں ان کے مضمون 'اقبال اور مغرب' کے چند اقتباسات پیش کرتا ہوں

......''اقبال کی مشرقیت ایک نئی مشرقیت ہے وہ اس سے بہت متاثر ہوئے ہیں۔ مغرب کے اثر سے وہ بہت کچھ بدل بھی گئے ہیں۔ مغرب کے اس اثر کو تسلیم کیے بغیر ان کی نئی مشرقیت کا پورا پورا احساس نہیں ہوسکتا وہ مشرقی بھی ہیں اور مغربی بھی''۔......

''اگر کوئی پرانڈیو ﷺ کی تقلید میں ان کی شخصیت کے اس پہلو کی کشاکش پر ایک ڈرامہ لکھے تو نہایت دلچسپ ہوگا۔ نکلسن نے کسی جگہ لکھا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے فلسفی کو پسپا کر دیا یا فلسفی نے شاعر کو۔ اقبال کے یہاں تینوں اچھی خاصی کشاکش ملتی ہے۔ اس کشاکش کی وجہ سے ان کی شاعری میں بڑی جان آگئی ہے مگر اس نے ان کے یہاں بعض متضاد باتیں بھی پیدا کر دی ہیں اور کبھی کبھی حقیقی اقبال یعنی شاعر اقبال نظر نہیں آتا اسی وجہ سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں''۔......
(ص ۱۸۸)

......ان کی مذہبیت، تصوف اور عجمی فلسفے کے مطالعے نے اور ماورائی انداز فکر نے انہیں یورپ کی روح تک نہ پہنچنے دیا۔ وہ بے دھڑک آتش نمرود میں نہ کود سکے اگر وہ کود بھی جاتے تو یقین تھا کہ یہی آگ ان کے لیے گلزار بن جاتی۔ یہاں حقیقی اقبال کو آفاقی اقبال اور مشرقی اقبال نے روک لیا اور مذہبی انسان نے فلسفی کو۔ (ص ۱۸۹)......''نٹشے اور اقبال دونوں طاقت کے پجاری ہیں اور طاقت کو حسن سمجھتے ہیں۔ دونوں فرد پرست ہیں مگر اقبال کا اسلامی تصور حیات انہیں فرد پرستی کی انتہا سے اور طاقت کی بربریت سے بچا لیتا ہے...... اس طرح واضح ہو جاتا ہے کہ اقبال نٹشے کے مقلد نہیں ہیں ہاں اس سے متاثر ضرور ہیں۔'' (ص ۱۹۱)۔ زمانہ حال کا انسان۔

عشق ناپید و خرد می گزدش صورتِ مار
عقل کو تابعِ فرمانِ نظر کر نہ سکا
ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
اپنی حکمت کے خم و پیچ میں الجھا ایسا
آج تک فیصلۂ نفع و ضرر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شب تاریک سحر کر نہ سکا

نظم بہت اچھی ہے، شاعرانہ حیثیت سے اس کی قدر و قیمت مسلم ہے مگر غور سے دیکھیے تو اس کا استدلال صحیح نہیں۔ واقعہ یہ کہ اس دور کے انسان کی ایک بڑی مشکل ہے جس پر اقبال کی نظر نہیں گئی ہے۔ فطرت کی تسخیر نے اسے لاتعداد وسائل ور سائل

www.taemeernews.com

دیے ہیں۔علم کی ترقی نے اسے طاقت، اقتدار اور ایک حد تک عرفان دیا ہے (ص ۲۰۱-۲۰۲)...... سرور صاحب کی اقبال پر میں نے فکر خیز تقاریر سنی ہیں۔ کاش وہ کبھی اقبال کے نکتہ چین بھی ہوتے مگر وہ اقبال سے تاحیات متاثر رہے۔یہ ان کی شخصیت کی کوئی خامی نہیں ہے۔وہ ایک دانشور تھے اور آخر تک اس مرتبے کے تخت نشین رہے یہ بھی ایک کارنامہ سے کم نہیں ہے۔

سرور صاحب کی وفات کے بعد ان پر کتنے ہی مضامین شائع ہوئے ہیں۔میں نے ان کے خطوط کی مدد سے ایک تاثراتی مضمون لکھا تھا جو 'ہماری زبان' میں شائع ہوا (یکم تا ۱۴ اپریل ۲۰۰۲) ایک نظم بھی کہی جو فکر و نظر کے قارئین کی نذر ہے!

''ایک دانشور کی موت'' (سرور صاحب کی وفات)

لفظوں کا کھیل فکر کے پہلو بدل گیا
حیرت کے آئینے میں کوئی غرق ہو گیا
یہ بھی نہ سوچ پائے کہ اک سانحہ ہوا
وہ مبتلائے دیر و الم تھا چلا گیا
اب سوگوار کون ہے کچھ بھی پتا نہیں
ویرانی پوچھتی ہے گلستاں کدھر گیا
روشن ہیں نقشِ پا کے نشان آج تک مگر
منزل نہ کارواں نہ مسافر سفر میں ہیں
اردو زبان کا وہ علم دار کیا ہوا
آنکھوں میں خشک اشک لیے سوچتا رہا
رونے کے واسطے میری آنکھوں کو کیا ہوا
سیلابِ غم میں ڈوب کے ساحل پہ رہ گیا

پس نوشت۔میں نے شعوری طور سے واقعہ ذکر نہیں کیا ہے جو ۲۴ مارچ ۱۹۶۹ء میں واقع ہوا تھا۔میں نے سرور صاحب کے دولت خانے پر اور ان کی صدارت میں ایک مضمون پڑھا تھا ''جدیدیت اور توازن'' میں نے یہ مضمون ان کے بھائی ڈاکٹر اولاد احمد صدیقی کے گھر میں ایک رات قلم بند کیا تھا۔ آج اس کا تفصیلی ذکر نہیں کرنا چاہتا ہوں مگر چند جملے ضرور لکھوں گا۔جس تحمل اور غور سے سرور صاحب نے اس معمولی مضمون کو سنا تھا وہ ان کے ایک اہم دانش ور ہونے کا مکمل ثبوت ہے...... حیرت ہے کہ بیشتر ترقی پسند اور کچھ جدیدیے ان سے منحرف ہیں۔ اگر لکھنؤ میں سرور صاحب اپنے مکان کے بڑے کمرے میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے جلسے نہ کرتے تو یہ انجمن بہت پہلے ختم ہو جاتی مگر یہ ان ہی کی جرأت تھی کہ انجمن کے جلسے برابر ہوتے رہے۔جہاں تک ان کی شاعری کا تعلق ہے تو پروفیسر احتشام حسین ایک تفصیلی مضمون لکھ چکے ہیں جو 'آج کل' میں شائع ہوا تھا۔ایک مشہور دانش ور کے بارے میں مختلف اور متضاد رائیں رہی ہیں...... میں نے اپنے مضمون کا آغاز ALEXIS CARREL کی کتاب سے کیا تھا مگر اس کے آخری باب کا ذکر طوالت کی وجہ سے نہیں کیا تھا اب اس کے بارے میں چند جملے لکھنا چاہتا ہوں کہ ایک بڑے پیمانے پر جنوبی افریقہ میں کانفرنس کا آغاز ہو گیا ہے۔یہ ماحول' امیری اور غریبی' معاشرتی آلودگی وغیرہ کے مسائل پر ہو رہی ہے الیکسس کیرل کا آخری باب کا عنوان ہے 'آدمی کی نئی تشکیل' REMAKING OF MAN نئی سائنسی ایجادات نے جہاں آدمی کو فراغت کے

www.taemeernews.com

لمحے دیئے ہیں وہیں تباہی کی راہیں بھی روشن کی ہیں۔ میری ناچیز رائے میں اب دنیا کا بچنا ہی دشوار نہیں ہے خود آدمی کی ذات میں بربریت کی جبلت زور پکڑتی جارہی ہے۔ آپ دو ثقافتی نظام کے تصادم کو مانیں یا نہ مانیں دشواریاں تقریباً ناقابل حل ہیں۔ دہشت گردی کے نام پر امریکی طاقت تمام عالم پر حکمرانی کرنے کے خواب دیکھ رہی ہے ایسے آتشیں ماحول میں ہم کیا کریں؟ غالب کی طرح یہ نہیں کہہ سکتے۔

ہاں اہل طلب کون سنے طعنۂ نا یافت
دیکھا کہ وہ ملتا نہیں اپنے ہی کو کھو آئے

حالات اتنے نازک اور خطرناک ہیں کہ فوری حل ڈھونڈنا تقریباً ناممکن ہے۔ کہیں اقبالؔ کا یہ خیال صحیح نہ ثابت ہو جائے۔

جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شب تاریک سحر کر نہ سکا

ناامیدی میں بھی ایک پہلو امید کا زندہ ہے کہ حکمرانی کا جنون امریکہ کو راس نہیں آئے گا۔ (شاید)

حواشی

۱۔ یہ دانشور ۱۸۷۳ء میں فرانس میں پیدا ہوا تھا یہ پانچ زبانوں سے واقف تھا۔ نومبر ۱۹۴۴ء میں اس کا انتقال پیرس میں ہوا تھا۔

۲۔ پراندیو۔ ایک اطالوی ڈرامہ نگار تھا سرور صاحب کا اشارہ اس کے ڈرامہ کی طرف ہے۔
Characters in search of the auther

☆☆☆

www.taemeernews.com

خلیق انجم*

آل احمد سرورؔ: اردو تنقید کی آبرو

پروفیسر آل احمد سرورؔ ہمارے عہد کے ایک ایسے نقاد تھے جو اپنی بیش بہا اور بصیرت افروز تنقیدی تحریروں کی وجہ سے ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ سرور صاحب نے اپنی تنقیدی تحریروں میں بڑی سلامت روی سے کام لیا ہے۔ خدا نے سرورؔ صاحب کو غیر معمولی صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ وہ ہمارے زمانے کے وہ دانشور تھے، جن کی تحریر اور تقریر، دید و دانش، ذہانت، علمی بصیرت اور تنقیدی شعور کی چنگاریاں آتش بازی کے انار کی طرح اُٹھتیں اور فضا میں رنگ برنگی روشنیاں بکھیرتی نظر آتیں۔ کون ہے جو ان کی گل افشانیٔ گفتار کا قائل نہیں اور کون ہے جو ان کے دل نشیں اندازِ تحریر پر رشک نہیں کرتا۔ سرورؔ صاحب اردو اور تنقید ہی کی نہیں بلکہ پورے اردو ادب کی آبرو تھے۔ تحصیلِ علم کے معاملے میں وہ کبھی لکیر کے فقیر نہیں رہے۔ انہوں نے سائنس کی تعلیم بھی حاصل کی۔ مشرقی اور مغربی علوم کا بھی گہرا مطالعہ کیا۔ وہ ادب اور زندگی کے بارے میں یقیناً ایک انتہائی سائنٹفک رویہ رکھتے تھے۔ یہ رویہ کسی بھی طرح کی میکانکیت کے بجائے ذوقِ جمال کے رنگ اور خوشبو میں بسا ہوا تھا اس لیے ان کی تحریریں شگفتہ اور دل نشیں ہوتی تھیں۔ انہوں نے جن لوگوں پر لکھا، ان کی خوبیوں اور خرابیوں دونوں پر متوازن انداز میں لکھا۔ ان کی تحریروں کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ ایک سخت گیر محاسب کی حیثیت سے تخلیقات کا تنقیدی جائزہ نہیں لیتے تھے۔ ان کا لب و لہجہ درشت نہیں تھا۔ وہ بہت ہی شگفتہ اور دل چسپ انداز میں اپنی بات کہا کرتے تھے۔ اگرچہ انہوں نے کوئی باقاعدہ تنقیدی کتاب نہیں لکھی لیکن ان کے تنقیدی مضامین کے مجموعے ''تنقیدی اشارے''، ''نظر اور نظریے''، ''ادب اور نظریہ''، ''نئے اور پرانے چراغ''، ''پہچان اور پرکھ''، ''مسرت سے بصیرت تک'' وغیرہ کا شمار اردو تنقید کے اعلیٰ نمونوں میں ہوتا ہے۔

اگرچہ میں علی گڑھ کا طالب علم رہا ہوں لیکن میری بدنصیبی ہے کہ مجھے سرورؔ صاحب کے سامنے زانوے ادب طے کرنے کا شرف حاصل نہیں رہا۔ اس لیے کہ سرور صاحب کے علی گڑھ آنے سے پہلے

* جنرل سکریٹری، انجمن ترقی اردو (ہند)، دہلی۔

www.taemeernews.com

میں علی گڑھ چھوڑ چکا تھا۔ چوں کہ میں اور میرے کچھ نوجوان ادبی ساتھی جن میں پروفیسر نثار احمد فاروقی اور ڈاکٹر اسلم پرویز خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں، سرور صاحب سے بہت متاثر تھے۔ ہم تینوں کا قاعدہ یہ تھا کہ جب کوئی بڑا نقاد یا محقق دہلی آتا تو ہم انہیں دہلی کے ایک ریستوراں میں چائے کی دعوت دیتے اور وہاں دو تین گھنٹے ان سے استفادہ کرتے۔ جن لوگوں کو ہم مدعو کیا کرتے تھے، ان میں پروفیسر آل احمد سرور، پروفیسر احتشام حسین، قاضی عبدالودود اور نیاز فتح پوری خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ اس وقت میں باتیں کروں گا صرف پروفیسر آل احمد سرور کی۔

ریستوراں میں بیٹھ کر دو تین گھنٹے ان سے جو بات ہوتی وہ غیر معمولی طور پر اہم ہوتی تھیں۔ ان صحبتوں میں سرور صاحب تنقید کے اہم ترین اصولوں پر ہم سے گفتگو کرتے اور ہمیں بہت سی ایسی کتابوں کے نام لکھواتے جن کتابوں کا پڑھنا ان کے خیال سے ہمارے لیے ضروری ہوتا۔ اگلی دفعہ جب سرور صاحب آتے تو پہلی بات یہی ہوتی کہ انہوں نے پچھلی ملاقات میں جن کتابوں کا ذکر کیا تھا، ان میں سے ہم نے کون کون سی کتابیں پڑھی ہیں۔ تمام کتابیں پڑھنا تو ظاہر ہے ممکن نہیں تھا لیکن جتنا کچھ بھی ہم پڑھتے تھے، اس کے بارے میں ہم سرور صاحب کو بتاتے۔ اور پھر گفتگو ہوتی۔

سرور صاحب کی ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ نئے لکھنے والوں کی بہت حوصلہ افزائی کرتے تھے۔

میں یہاں ایک واقعہ دہرانا چاہتا ہوں۔ اس سے پہلے یہ پورا واقعہ ''سرور صاحب کی انجمن میں'' بیان کر چکا ہوں۔ لیکن چوں کہ اس واقعے کی میری زندگی میں بہت اہمیت ہے اور اس سے سرور صاحب کا نئی نسل کی طرف جو رویہ تھا، اس پر روشنی پڑتی ہے۔ اس لیے ایک بار پھر اسے دہرانا چاہتا ہوں:

ایم۔اے کرنے کے بعد میں نے پی۔ایچ۔ڈی کے لیے دہلی یونیورسٹی میں اپنا رجسٹریشن کرایا۔ جیسا کہ عام طور سے ہوتا ہے کہ شعبے نے مجھ پر تحقیق کے لیے ایسا موضوع تھوپ دیا جس سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی یعنی مرزا مظہر جانجاناں۔ میں نے پی۔ایچ۔ڈی تو مکمل کر لی لیکن مجھے یہ مقالہ پسند نہیں تھا۔ اتنا طویل عرصہ گزر جانے کے بعد بھی میں نے اسے آج تک شائع کرنے کا خیال نہیں کیا۔ مجھے پی۔ایچ۔ڈی کے لیے ''مرزا محمد رفیع سودا'' کا موضوع بہت پسند تھا۔ یہ موضوع مجھے نہیں دیا گیا۔ مگر میں نے ایک ترکیب یہ نکالی کہ جب مرزا مظہر جان جاناں پر مواد اکٹھا کرنے کے لیے ہندوستان کے بیشتر کتب خانوں کا دورہ کیا تو سودا پر بھی مواد اکٹھا کرتا رہا۔ جب میری پی۔ایچ۔ڈی مکمل ہو گئی اور میں نے مقالہ یونیورسٹی میں داخل کر دیا تو سودا پر اپنی کتاب لکھنی شروع کی اور ایک ہی سال میں یہ کام بھی مکمل کر لیا۔ پروفیسر آل احمد سرور دہلی یونیورسٹی میں آئے ہوئے تھے۔ میں نے ان سے سودا پر اپنے کام کا ذکر کیا۔ سرور صاحب نے کہا کہ اگر کچھ باب لکھ لیے ہوں تو مجھے بھیج دیجیے، میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں نے دو تین دن بعد ہی دو چار باب سرور صاحب کی خدمت میں ارسال کر دیے۔ سرور صاحب کا جواب آیا کہ یہ کام مکمل کر کے مسودہ انجمن میں داخل کر دیجیے کوشش

www.taemeernews.com

کروں گا کہ یہ کتاب انجمن سے شائع ہو جائے۔ سرور صاحب کے اس خط سے میرے کام کرنے کی رفتار اور تیز ہوگئی۔ کام مکمل کر کے میں نے مسودہ سرور صاحب کی خدمت میں پیش کر دیا۔ مجھے ڈر تھا کہ شاید انجمن سات آٹھ سو صفحات کی یہ کتاب شائع کرنے کی متحمل نہ ہو سکے۔ کچھ عرصہ بعد سرور صاحب کا خط آیا کہ وہ کتاب ادبی کمیٹی سے منظور ہو گئی ہے اور مولانا امتیاز علی خاں عرشی کے پاس رائے کے لیے بھیج دی گئی ہے۔ سرور صاحب نے مشورہ دیا کہ اگر میں خود رام پور جا کر عرشی صاحب سے ملاقات کر لوں تو وہ اس کتاب کے بارے میں کچھ قیمتی مشورے بھی دے دیں گے۔ میں یہ کتاب بہت اچھی چھاپنا چاہتا تھا۔ اس لیے میں نے سرور صاحب سے درخواست کی کہ مجھے اس کی اجازت دے دیں کہ میں اس کی طباعت دہلی میں کراؤں۔ سرور صاحب نے ازراہ کرم میری یہ درخواست بھی قبول کر لی اور میں نے دہلی سے یہ کتاب چھپوالی۔ یہاں ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ چوں کہ ٹائٹل علی گڑھ میں چھپا تھا تو طباعت کے انچارج نے میرا نام ڈاکٹر خلیق انجم شائع کر دیا۔ کتاب کی پہلی جلد جب مجھے موصول ہوئی تو میں نے سرور صاحب کو تار دے کر درخواست کی کہ اس کتاب کی اشاعت روک دی جائے اور پھر خط لکھ کر سرور صاحب کو اطلاع دی کہ نام کے ساتھ ڈاکٹر مجھے پسند نہیں۔ یہ بھی سرور صاحب کی عظمت تھی کہ انہوں نے میری درخواست قبول کر لی اور ٹائٹل ضائع کر کے میری مرضی کے مطابق دوسرا چھپوا دیا۔ سرور صاحب نے اس کتاب کے پیش لفظ کا آغاز ایک ایسے فقرے سے کیا جس سے میری بہت حوصلہ افزائی ہوئی۔ آج بھی جب میں وہ پیش لفظ پڑھتا ہوں تو دلی مسرت ہوتی ہے۔ یہ خیال رکھیے کہ اس وقت میں ادب میں بالکل نیا تھا۔ سرور صاحب نے پیش لفظ کا آغاز ان الفاظ سے کیا تھا:

> ''جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اردو میں تحقیق و تنقید کا معیار گر رہا ہے انہیں خلیق انجم کی اس تصنیف کا ضرور مطالعہ کرنا چاہیے''۔

اس پیش لفظ کا اختتام انہوں نے ان الفاظ سے کیا:

> ''اس علمی تحقیقی کارنامے پر خلیق انجم مبارک باد کے مستحق ہیں۔ یہ جدید ترین تحقیقی معیاروں پر پورا اترتا ہے اور سودا کے مطالعے کے سلسلے میں اس سے استفادہ ضروری ہے''۔

پروفیسر آل احمد سرور نے انجمن سے ''مرزا محمد رفیع سودا'' چھاپ کر اور پیش لفظ میں میرے کام کی تعریف کر کے جو حوصلہ افزائی کی تھی، اس کا میرے آئندہ کاموں پر بہت مثبت اثر پڑا۔

انجمن ترقی اردو (ہند) کے پلیٹ فارم سے سرور صاحب نے اردو زبان و ادب کی اتنی خدمت کی ہے کہ اس مختصر مضمون میں اس کا بھرپور جائزہ نہیں لیا جا سکتا یہ ایک ایسا موضوع ہے جس پر خاصی ضخیم کتاب لکھی جا سکتی ہے۔

سرور صاحب اردو تنقید کی آبرو تھے اور ہمارے عہد کے سب سے قابل احترام ادیب اور شاعر بھی۔ یہ ہماری خوش بختی ہے کہ وہ لگ بھگ ایک

www.taemeernews.com

صدی ہمارے ساتھ رہے اس لیے ہم سے بچھڑ جانے کا اتنا ہی بھاری رنج بھی وہ ہمیں دے گئے ہیں۔ وفات کے وقت ان کی عمر تقریباً نوّے سال تھی۔ انہوں نے مجھے ایک بار خود بتایا تھا کہ انہیں لڑکپن ہی میں ادب سے دلچسپی ہو گئی تھی، وہ کم عمری ہی میں اپنے عہد کے بعض معیاری رسالے پڑھتے تھے اور ان کے پاس اردو شاعری اور نثر کی کتابوں کا خاصا بڑا ذخیرہ جمع ہو گیا تھا، ان میں بعض کتابیں تو ایسی تھیں جن کا مطالعہ خود بقول سرور صاحب انہوں نے اول سے آخر تک انہیں کئی بار پڑھا تھا۔ سرور صاحب کے تناظر میں یہ بات آسانی کے ساتھ اس لیے سمجھ میں آجانی چاہیئے کہ وہ عمر کے آخری لمحوں تک برابر ذہنی بلوغت کی منزلیں طے کرتے رہے چنانچہ ادب کی ایسی کتابیں جنھیں ادب کا شاہکار کہا جاسکتا ہے، ان پر وقفے وقفے سے اپنی معنویت کی نئی سے نئی پرتیں کھولتی رہیں۔ یہ ذہنی غذا سرور صاحب کی تحریر میں بھی جان ڈالتی رہی۔ ان کا کہنا تھا کہ میں نے بیس سال کی عمر میں مضامین لکھنے شروع کیے، گویا انہوں نے تین چوتھائی صدی تک ادب کی خدمت کی ہے۔

میں نے ۱۹۹۷ء میں سرور صاحب پر ایک مقالہ لکھا تھا جس میں اپنے خیال میں سرور صاحب سے متعلق اپنی بھرپور معلومات کی بنیاد پر میں نے یہ کہا تھا کہ سرور صاحب پچاس سال سے زائد عرصے سے اردو میں لکھ رہے ہیں۔ میرا یہ مقالہ پڑھ کر سرور صاحب نے مجھے بتایا کہ انہیں اردو میں لکھتے ہوئے ستر سال سے زائد ہو گئے ہیں۔ سرور صاحب کے تنقیدی مضامین کے مجموعے تو شائع ہوئے لیکن اردو تنقید کے موضوع پر ان کی کوئی مستقل کتاب نہیں ہے۔

اسے بنیاد بنا کر کچھ لوگوں نے سرور صاحب پر اعتراض بھی کیا ہے، اس اعتراض کا بہت اچھا جواب ڈاکٹر عبدالمغنی نے اپنے ایک مقالے میں دیا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ ''عصرِ حاضر کے عظیم ترین انگریزی نقاد ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ نے ادبی موضوع پر کوئی تنقیدی کتاب کبھی نہیں لکھی اور اس کا سرمایہ جو کچھ ہے، متفرق موضوعات پر مقالات میں ہے جن کا سب سے مشہور مجموعہ 'انتخاب 'Selected Essays' ہے''۔

سرور صاحب نے پہلے انگریزی میں ایم۔ اے کیا تھا۔ کچھ دن علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں انگریزی کے استاد بھی رہے لیکن اردو کی محبت میں انہوں نے اردو میں ایم۔ اے کیا اور ساری زندگی اردو ادب کی تعلیم و تدریس میں گزاری۔ آج ہر شخص یہ بھی تسلیم کرتا ہے کہ سرور صاحب کا مغربی ادب کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ پہلے پچاس ساٹھ برسوں میں انگریزی تنقید کی شاید ہی کوئی ایسی اہم کتاب ہو جو سرور صاحب کی نظر سے نہ گزری ہو۔ جس زمانے میں سرور صاحب علی گڑھ کے شعبۂ اردو میں پروفیسر تھے اور یونیورسٹی کے مختلف اعزازی عہدوں پر فائز تھے اس زمانے میں بھی انہوں نے اپنے مطالعے میں کمی نہیں کی۔

سرور صاحب کا مطالعہ یک رخا نہیں تھا۔ عام طور سے ہمارے اردو نقاد انگریزی کی تنقیدی تحریروں کا اردو میں الٹا سیدھا ترجمہ کر کے ان میں اردو کے بعض تخلیقی فنکاروں کے نام ڈال دیتے ہیں۔

www.taemeernews.com

اگر ان تحریروں کا بغور مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ چوں چوں کا مربہ ہیں، تنقید کچھ کہتی ہے اور تخلیقی ادب کچھ اور، غرض ان تحریروں کا سر ہوتا ہے نہ پیر۔ سرور صاحب کے مضامین میں یہ کیفیت نہیں ہے، اس لیے کہ انہوں نے مشرقی ادب کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ وہ اردو کے کلاسیکی اور جدید ادب پر گہری نظر رکھتے تھے۔ وہ مشرقی تنقید کی روایت سے پوری طرح واقف تھے اس لیے وہ اردو کے کسی بھی فنکار پر لکھیں ان کے ہاں توازن، فکر، بصیرت اور بھرپور تنقیدی شعور ہوتا تھا۔ وہ ہر ادب پارے کو اس کے عہد کے تخلیقی شعور، تخلیقی ادب کے پس منظر میں دیکھتے تھے۔ سرور صاحب کی تحریروں میں انگریزی ادب کے حوالے خاصی تعداد میں ملتے ہیں۔ بعض معترضین کا خیال ہے کہ سرور صاحب انگریزی ادب کے حوالے دے کر اپنی علمیت اور انگریزی ادب سے اپنی واقفیت کا رعب جماتے ہیں۔ اردو کے دوسرے درجے کے نقادوں کے ہاں یہ کیفیت ضرور ہے، مگر سرور صاحب کے ہاں نہیں ہے۔ سرور صاحب کی تحریروں میں جب مغربی نقادوں کا ذکر آتا ہے یا ان کے اقوال نقل ہوتے ہیں تو سو فیصدی فطری انداز میں۔ سرور صاحب کے ہاں ان اقوال کی صورت اس مئے ناب کی ہے جو بھرے پیالے سے چھلک جاتی ہے؟ جبکہ بیشتر اردو نقادوں کے پیالے میں بس وہی نام اور اقوال ہوتے ہیں جنہیں وہ موقع بے موقع الٹتے رہتے ہیں۔

سرور صاحب نے اردو شاعری اور نثر دونوں پر تنقیدی مضامین لکھے ہیں۔ فکشن پر ان کے مضامین: اردو ناول کا ارتقا، اردو میں افسانہ نگاری، رتن ناتھ سرشار، گورکی کا اثر اردو ادب پر، مجھے کون کون سی کہانیاں پسند ہیں، فکشن کیا، کیوں اور کیسے؟ وغیرہ بہت اہم مضامین ہیں۔ اس موضوع پر اور بھی کئی مضامین ہیں، اگر ان سب کو کتابی صورت میں شائع کر دیا جائے تو اردو فکشن پر ایک اچھی کتاب تیار ہو جائے گی۔ شاعری میں میر تقی میر، چکبست، فانی، اکبر، جوش، مولانا سہیل، اختر شیرانی، جگر مرادآبادی اور حسرت موہانی پر ان کے مضامین بہترین تنقید کا نمونہ ہیں۔

سرور صاحب کو اردو مکتوب نگاری سے دلچسپی تھی۔ انہوں نے مہدی افادی اور اقبال کے خطوط پر مضامین لکھے ہیں۔ مکتوب نگاری کے فن پر ان کا ایک مضمون ''خطوط میں شخصیت'' بہت اہم ہے اور اردو میں خطوط نگاری کے فن پر لکھے گئے چند اہم مضامین میں شمار ہوتا ہے۔ سرور صاحب نے غالب کے اردو خطوط کا ایک بہت اچھا انتخاب ''عکس غالب'' کے نام سے مرتب کیا تھا، جو ۱۹۷۳ء میں شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے شائع ہوا تھا۔

تنقید کے موضوع پر سرور صاحب نے کئی ایسے مضامین لکھے تھے جو پچھلے تقریباً چالیس پچاس برسوں سے اردو طالب علموں کی رہنمائی کر رہے ہیں: جدید اردو تنقید، تنقید کیا ہے، روایت اور تجربے اردو شاعری میں، تنقید کے مسائل، اردو میں ادبی تنقید کی صورت حال، تنقید میں انتخابی نظریے کی ضرورت وغیرہ۔ سرور صاحب کا مطالعہ وسیع تھا، ادبی مسائل پر غور کرنے اور ان کا تجزیہ کر کے مثبت

www.taemeernews.com

نتائج تک پہنچنے کی غذا نے انہیں بھرپور صلاحیت دی تھی۔ انہوں نے اپنے عہد کے ادبی مسائل پر بھی خاصی تعداد میں مضامین لکھے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کے مضامین: موجودہ ادبی مسائل، ادب میں اظہار و ابلاغ کا مسئلہ، ادب میں قدروں کا مسئلہ وغیرہ انتہائی بصیرت افروز ہیں اور ادبی مسائل پر غور کرنے والوں کو دعوت فکر دیتے ہیں۔ اسی سلسلے کی کڑی وہ مضامین بھی ہیں جو انہوں نے ترقی پسند تحریک اور جدید ادب پر لکھے ہیں۔ ترقی پسند تحریک پر سرور صاحب کا ایک ہی مقالہ میری نظر سے گزرا ہے۔ جبکہ جدیدیت پر انہوں نے دو مقالے لکھے ہیں: ''اردو میں جدیدیت کا مفہوم'' اور ''جدت پرستی اور جدیدیت کے مضمرات'' ایسے مضامین ہیں جن میں جدیدیت کی تحریک کے تمام اہم پہلوؤں کا عالمانہ اور ہمدردانہ انداز میں جائزہ لیا گیا ہے۔ سرور صاحب نے ''جدیدیت اور اردو ادب'' کے نام سے ایک کتاب بھی مرتب کی ہے جس میں مختلف نقادوں کے مضامین شامل ہیں۔ یہ کتاب ۱۹۶۹ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے شائع ہوئی تھی۔

سرور صاحب نے رتن ناتھ سرشار، مثنوی زہر عشق، مولانا سید سلیمان ندوی کی کتاب 'حیات شبلی، سجاد انصاری، یادگار حالی، نظیر اکبر آبادی، رشید احمد صدیقی، برنارڈ شا جیسے موضوعات پر بھی مقالے لکھے ہیں۔ میں نے سرور صاحب کے جن مضامین کا اب تک ذکر کیا ہے، ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے موضوعات کا کینوس بہت وسیع ہے۔ انہوں نے کلاسیکی اور جدید شاعروں اور نثر نگاروں اور مختلف ادبی مسائل پر تنقیدی مقالے لکھے ہیں۔

اب میں ان کے دو خاص موضوعات کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ سرور صاحب کو اردو کے دو شاعروں سے غیر معمولی عقیدت اور محبت ہے، وہ شاعر ہیں غالب اور اقبال۔ غالب پر ان کے مضامین ہیں: غالب کا ذہنی ارتقا، غالب اور جدید ذہن، غالب کی عظمت، غالب کی شاعری کی خصوصیات اور غالب کا نظریۂ شاعری۔ سرور صاحب نے غالب کے خطوط کا انتخاب بھی مرتب کر کے شائع کیا ہے، جس کا اوپر ذکر کیا جا چکا ہے۔ انہوں نے مختلف نقادوں کے مضامین 'عرفان غالب' کے نام سے مرتب کیے۔ شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے یہ کتاب ۱۹۷۳ء میں شائع کی۔

انجمن ترقی اردو (ہند) کے سکریٹری کی حیثیت سے سرور صاحب نے مولانا امتیاز علی خاں عرشی کا مرتبہ دیوان غالب، مولوی مہیش پرشاد کے مرتب کردہ خطوط غالب، پروفیسر مختار الدین احمد کے غالب پر مختلف نقادوں کے مضامین کے دو مجموعے ''احوال غالب'' اور ''نقد غالب'' شائع کیے۔ سرور صاحب نے ''ہماری زبان'' اور ''اردو ادب'' میں غالب کے سوانح، شخصیت اور فن پر بے شمار مضامین شائع کیے۔ ''اردو ادب'' کا غالب نمبر بھی مرتب کیا۔ غالب سے کہیں زیادہ کام سرور صاحب نے اقبال پر کیا۔ ان کے مضامین کے پہلے مجموعے ''تنقیدی اشارے'' (۱۹۴۲ء) میں، ''اقبال اور ان کا فلسفہ'' کے عنوان سے ایک مقالہ شامل ہے۔ غالباً اقبال پر ان کا یہ پہلا مقالہ ہے۔ مضامین کے دوسرے مجموعے ''نئے اور پرانے چراغ'' (۱۹۴۶ء) میں اقبال پر تین مقالے ہیں: ''اقبال اور اس کے نکتہ چیں''، ''روح اقبال''

www.taemeernews.com

اور'' اقبال اور ابلیس''۔ تنقیدی مضامین کے تیسرے مجموعے'' تنقید کیا ہے'' میں '' اقبال کے خطوط'' کے عنوان سے ایک مقالہ شامل ہے۔ اسی طرح چوتھے مجموعے'' ادب اور نظریے'' میں '' اقبال کی عظمت'' کے عنوان سے ایک مقالہ شامل ہے۔ '' مسرت سے بصیرت تک'' (۱۹۷۴ء) میں اقبال پر ایک مقالہ ''اقبال اور مغرب'' شامل ہے۔ ۱۹۷۴ء میں سرور صاحب علی گڑھ سے ریٹائر ہوگئے کچھ ہی دن بعد اقبال انسٹی ٹیوٹ سری نگر نے ڈائرکٹر کی حیثیت سے ان کی خدمات حاصل کرلیں۔ یہ کام ان کی پسند کا تھا۔ یہاں آکر انہیں اقبال کا گہرا مطالعہ کرنے کا موقع ملا، انہوں نے '' اقبال اور تصوف'' اور '' اقبال اور مغرب'' کے موضوعات پر سمیناروں کے مقالے مرتب کر کے دو کتابوں کی شکل میں ۱۹۸۳ء میں انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے شائع کیے۔ اقبال انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے ماہرین اقبال کے مضامین پر مشتمل تین کتابیں اور شائع ہوئیں ''تشخص کا مسئلہ اور اقبال''، '' جدیدیت اور اقبال'' اور '' اقبال اور اردو نظم''۔ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا کہ اقبال انسٹی ٹیوٹ سری نگر کے ڈائرکٹر ہونے کے بعد سرور صاحب کو اقبال کا وسیع مطالعہ کرنے کا موقع ملا اس لیے انہوں نے اقبال کے فن کے مختلف پہلوؤں پر بہت کچھ لکھا۔ اقبال پر ان کے تین خطبات غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں۔ پہلا خطبہ '' اقبال کے مطالعے کے تناظرات'' ہے۔ یہ خطبہ اقبال انسٹی ٹیوٹ سری نگر میں ۱۹۷۱ء میں دیا گیا تھا۔ دوسرا خطبہ '' اقبال اور جدید کاری'' کے موضوع پر پہلی بین الاقوامی کانگریس، لاہور میں ۱۹۷۷ء میں دیا گیا۔ تیسرے خطبے کا عنوان ہے '' اقبال۔ نظریہ اور شاعری'' یہ خطبہ دلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں ۱۹۷۹ء میں دیا گیا۔

انجمن ترقی اردو (ہند) کے سکریٹری شپ کے زمانے میں سرور صاحب نے غالب پر تو کئی کتابیں شائع کیں لیکن اقبال پر کوئی کتاب نہیں چھپی، ہاں '' ہماری زبان'' اور '' اردو ادب'' میں اقبال کی شخصیت اور فن کے بارے میں بہت کچھ شائع ہوا۔

سرور صاحب نے بہت سے موضوعات پر لکھا ہے لیکن اقبال اور پھر غالب پر انہیں غیر معمولی مہارت حاصل ہے۔ اردو کے ان عظیم شاعروں پر بہت کم لوگوں کی اتنی گہری نظر تھی جتنی سرور صاحب کی تھی۔ دراصل مختلف النوع موضوعات کی بھیڑ میں سرور صاحب کی یہ خصوصیت اور یہ غیر معمولی مہارت دب کررہ گئی ہے۔ ان کے مضامین اور کتابیں غالبیات اور اقبالیات میں اہم اضافے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اگر ان دونوں میدانوں میں سرور صاحب کے کام کا جائزہ لیا جائے تو وہ غالب کے اعلیٰ درجے کے نقاد اور صف اول کے ماہر اقبال قرار پائیں گے۔

☆☆☆

www.taemeernews.com

عتیق اللہ*

آل احمد سرور کی تنقید نگاری
پہلی قرأت / پہلا تاثر

آزادی کے بعد ہماری تنقید کو جن ناقدین نے توانگر کیا اور اپنے علم اور اپنی بصیرت سے جس کے وزن و وقار میں غیر معمولی اضافہ کیا نیز جسے ہماری تہذیبی زندگی کا معمول بنانے کی مہم جویانہ کوششیں کیں ان میں آل احمد سرور کا نام خاص اہمیت کا حامل ہے۔ احتشام حسین اور حسن عسکری کی اپنی حدود تھیں۔ سرور صاحب نے اپنے لیے کوئی حد مقرر نہیں کی تھی، ان کی گہری سنجیدگی کا میں بھی قایل ہوں لیکن یہ گہری سنجیدگی جسے وہ تنقید کے تفاعل میں ایک اہم کردار کے طور پر اخذ کرتے ہیں۔ اس 'گہری سنجیدگی' سے ایک علیحدہ نوعیت رکھتی ہے جس سے احتشام حسین یا کلیم الدین احمد یا حسن عسکری کے یہاں سابقہ پڑتا ہے۔ احتشام حسین کے مطالعات، تاریخ، تہذیب اور حقیقت کے تئیں ایک تیار شدہ تصور کے ساتھ خصوصیت رکھتے ہیں باوجود اس کے ان کی تشریحات میں بڑی صلابت اور تاویلات میں بڑی سنجیدگی پائی جاتی ہے۔ یوں بھی ہماری تنقید، اپنی شکم پروری میں تاویل کی طرف کچھ زیادہ ہی مائل رہی ہے۔ وہ سنجیدگی کا عنصر ہی ہے جو احتشام حسین کی تحریروں کے حبس وقبض کو حاوی کیفیت میں بدلنے سے باز رکھتا ہے۔ ادبی تنقید میں محض ادب ان کی جولان گاہ نہ ہونے کے سبب دیگر شعبۂ ہائے علوم سے جن خارجی اور ذیلی روابط کی طرف وہ توجہ دلاتے ہیں ان کی معنویت اپنی جگہ ہے۔ ایسے قاریوں کا ایک بڑا گروہ ہے جو مطالعات میں اس قسم کے غیر ادبی حوالوں کی ہمیشہ جستجو میں رہتے ہیں۔ دراصل وہ ادب میں ادبیت کو ایسی معصوم صفت خیال نہیں کرتے جسے دیگر غیر ادبی حوالوں کی شمولیت سے مسخ ہونے کا ڈر ہو۔ محض ادبیت کسی فن پارے کی کامیابی کی دلیل قرار نہیں دی جاسکتی۔ اسی طرح محض فکر، فلسفہ، تاریخ یا حقیقت کے تعلق سے ہمارے تصورات اور عقائد کو ایک قسم کی نثری منطق کے تحت نظم کرنے کے معنی شعر کے تقاضوں سے عدم فہمی کے ہیں، حقیقت دراصل ان دونوں قطبین کے درمیان معلق ہے۔

تنقید تخلیق کا عمل نہیں ہے کہ جس کی ابتدا

---

* پروفیسر وصدر شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی۔

www.taemeernews.com

خواہ شعور سے ہو، بالآخر اُس کا رخ کسی غیر محسوس لمحے میں لاشعور کی طرف ہو ہی جاتا ہے لیکن بعض اعلیٰ درجے کی تنقید کی مثالیں ایسی بھی ہیں جن میں نفسِ شعر میں بعض ایسے دقیق نکتوں اور پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہے جن تک ایک عام صورتِ حال میں محض شعور اور محض علم اور محض استدلال کے ذریعے رسائی ممکن نہیں ہوسکتی تھی بلکہ بعض ادبی شہ پاروں سے ایک خاص جمالیاتی رشتے کی راہ بھی اسی وقت ہموار ہوتی ہے جب نقاد کا تخلیقی وجدان سرگرم ہوتا ہے۔ تجربہ یہ بھی بتاتا ہے کہ اکثر نقاد تخلیقی احساس ہی سے عاری ہوتے ہیں اور جن نقادوں میں یہ استعداد پائی جاتی ہے ان میں احساس توازن کا فقدان ہے۔ آل احمد سرور کے یہاں اچھی مثالوں کے پہلو بہ پہلو بری مثالوں کی بھی کمی نہیں ہے۔ انہوں نے اکثر اپنے طریقِ نقد کے بارے میں معروضیت کا دعویٰ بھی کیا ہے۔ سوال یہی اٹھتا ہے کہ کیا ادب کی تنقید سے سروکار رکھنے والی شخصیت، اتنی معروضی ہوسکتی ہے؟ اگر وہ ہوسکتی ہے تو کیا ادب کوئی ایسا علم بھی رکھتا ہے جس کی رو سے قدیم و جدید ہر ادبی تحریر کو شماریاتی اور حتمی طور پر جانچا جاسکتا ہے؟ کیا مشرق و مغرب کے قدیم و جدید علمائے ادب، کسی ایک میزانِ فن و قدر پر متفق ہیں؟ یا کیا ہم ایسے کسی امکان کا تصور بھی کرسکتے ہیں کہ آئندہ کبھی اتفاق و ہم رائے کی کوئی صورت واقع ہوسکتی ہے؟ ظاہر ہے ادب میں جو کچھ اظہار پاتا ہے اسے اظہار کے مقابلے پر ظہور ہونے کا نام دینا زیادہ درست ہوگا۔ ادب کی جڑیں، اسی لیے سریت کی اس دھند میں پیوستہ ہوتی ہیں جو غیاب ہی غیاب ہے۔ ادب کا کام جب اتنا اسرار آگیں اور داخلی ہے تو تنقید جس کی تقدیر ہی ادب کے ساتھ مشروط ہے اس قدر معروضی کیسے ہوسکتی ہے۔ میری نظر میں نقاد کے لیے معروضیت کی ایک حد قایم کرنا ضروری ہے (ہمارے عہد میں جس کی بہترین مثال اسلوب احمد انصاری کی تنقید ہے) جہاں حد قایم نہیں کی جاتی وہاں تحلیل کے عمل کا رخ انتہائی بے روح اور حد درجہ بے جان واقع ہونا لازمی ہے۔ یہ گمان عام ہے کہ اپنے فوری پن کے باعث جذبے میں فریب کے اندیشے زیادہ مضمر ہوتے ہیں اور تعقل کا کام ہی فریب شکنی اور صداقت جوئی ہے۔ پہلے تو جذبے اور عقل کی اس تقسیم پر ہی غور کرنے کی ضرورت ہے کہ یہ کہاں تک درست ہے؟ دوسرے ضروری نہیں کہ تعقل فریب کا شکار نہ ہو۔ بلکہ تعقل جہاں فریب کھاتا ہے وہاں چند تاویلات اور جواز بھی اپنی گرہ میں رکھتا ہے۔ پھر بڑے اعتماد اور استدلال کے ساتھ سفید کو سیاہ اور سیاہ کو سفید ثابت کیا جاسکتا ہے۔

آسکر وائلڈ نے کسی جگہ لکھا ہے کہ:

> ''کسی بھی فن (یا فن پارے) سے نفرت دلانے کا سب سے مؤثر طریقہ یہ ہے کہ اس کی تحسین تعقل کی روشنی میں کی جائے۔''

لارنس ڈریل نے وائلڈ کے اس خیال کی تائید میں یہ لقمہ دیا ہے کہ اس فہرست میں ایسے بہت سے ناقدین اور اساتذہ کے نام آتے ہیں جو اپنے موضوع کو ٹکڑے ٹکڑے کرکے، اس کی عقلی تشریح کرتے ہیں جس کا مزہ بالآخر اسٹیل کے چاقو سے کٹے

www.taemeernews.com

ہوئے سیب جیسا ہی ثابت ہوتا ہے۔

ہمارے یہاں جب سے سائنسی معقولیت پسندی پر اصرار کیا جا رہا ہے اور تنقید کو شماریات میں ضم کرنے کی کوششیں کی جا رہی ہیں، تب ہی سے ہماری تنقید میں خشکی، روکھا پن، ایک تکلیف دہ قسم کی بے لوثی، بر خود غلط نوع کی انا کوشی بلکہ خودرائی کی وہ صورتیں پیدا ہو گئیں ہیں جو پڑھنے والوں کے ذہنوں کو بنجر اور بصیرتوں کو کند کرنے میں زیادہ دلچسپی رکھتی ہیں۔آل احمد سرور کی تنقید یہ بتاتی ہے کہ تخلیق کے ساتھ کیسے بسر کیا جا سکتا ہے، تخلیق بھی اپنے منہ میں زبان رکھتی ہے جس سے ایک باہم مکالمے کی راہ روشن ہوتی ہے۔ آل احمد سرور کی تنقید اس معنی میں تخلیق سے مکالمے ہی کی ایک صورت ہے۔ سرور صاحب اپنے محاکمات میں قاری کی شمولیت کے قصد کو اولین ترجیح کے طور پر اخذ کرتے ہیں کہ محض شعر کی رفاقت کے حوالے پر ہی ان کی تنقید کا مقصد پورا نہیں ہو جاتا بلکہ اکثر اپنے قاری کو اس کے اوہام، غلط اندیشیوں، خوش گمانیوں اور بے خبری کی دھند سے باہر نکالنا اور اس کے تیقّنات کو ایک بہتر تناظر مہیا کرنا اور اس کی قرأتوں کو ایک نئی ترتیب اور ایک نئے معنی بخشنا بھی ان کی ذہنی تگ ودو کا ایک اہم منصب ہوتا ہے۔اس طرح سرور صاحب قاری کی توجہ کو برانگیخت کرتے ہیں کہ انہیں اگر کوئی شعر / شاعر پسند ہے تو اس پسندیدگی کی وجوہ کیا ہیں؟ وہ کیوں کر ہمیں اپنی طرف رجوع کرتا ہے؟ وہ کون سے ادبی یا غیر ادبی عناصر ہیں جو اسے دوسروں سے ممتاز کرتے ہیں؟ اس میں کس قدر بالیدگی اور مزید نشو ونمو کا امکان موجود ہے؟ وہ تا کے ہماری رفاقتوں کو تازہ دم رکھ سکتا ہے؟ ادبی تاریخ ہی نہیں ہماری یادداشتوں میں بھی اس کا مقام کیا ہے؟ یا کیا ہو سکتا ہے؟ ہمارے دور کے بعض دوسرے نقادوں کی طرح ان کا اصرار اس بات پر نہیں ہوتا کہ کسی شاعر کو کیوں نہیں پڑھنا چاہیے؟ بجائے اس کے وہ یہ بتاتے ہیں کہ فلاں شاعر کو اگر انہوں نے اپنا حوالہ بنایا ہے تو اس لمحے کی کیا قیمت ہے؟ اسے کیوں پڑھنا اور اس کے ساتھ بسر کرنا چاہیئے۔ میرے نزدیک تنقید کا یہ ایک بہتر کردار ہے، جس سے نقاد کی کشادگی نفس ظاہر ہوتی ہے۔

آل احمد سرور نے 'مسرت سے بصیرت تک' کے پیش لفظ میں اپنے اس موقف کا ان لفظوں میں اظہار بھی کیا ہے:

> '' ادب میری محبت ہے اور ادب کی تدریس صرف میرا مشغلہ ہی نہیں، میری عبادت بھی رہی ہے۔کہا جاتا ہے کہ کسی آدمی یا ادارے یا قوم کو پہچاننے کے لیے پہلے اس سے محبت ضروری ہے (میری مراد طفلانہ محبت سے نہیں) یہی محبت عرفان کی منزل تک لے جائے گی اور محبوب کی خوبیوں اور خامیوں دونوں سے آگاہ کرے گی۔ یہ زندگی کو اس کے ہر رنگ میں دیکھے گی اور دکھائے گی اور اپنی تنظیم اور خیال انگیزی کی وجہ سے زندگی کی نئی تنظیم کی طرف مائل کرے گی۔ اگر ہم اپنے پورے شعری سرمائے پر نظر ڈالیں تو ہمیں اس کے رنگا رنگ حسن،

www.taemeernews.com

اس کی گہرائی اور گیرائی اور اس کے بدلتے رہنے اور اس بدلتے رہنے کے باوجود اپنے منصب سے وفادار رہنے کا احساس ہو جائے گا اور یہ احساس ہمیشہ مسرت بھی دے گا اور بصیرت بھی۔''

ادبی نقاد بنیادی طور پر ایک خاص قسم کا قاری ہوتا ہے۔ جس کے لیے اپنے مطالعات کو اپنے طور پر ترتیب دینے اور اپنے علم و بصیرت کو منطبق کرنے کے دوران ذہن و ضمیر کی آزادی کی بڑی قیمت ہوتی ہے۔ آل احمد سرورؔ کی تنقید ذہن وضمیر کی آزادی کا اعلامیہ ہے۔ ان کے یہاں مختلف تصورات نقد کی پرچھائیاں تو دیکھی جا سکتی ہیں لیکن پرچھائیوں کو محیط اثر کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ فلسفہ سے انہیں کوئی خاص رغبت نہیں تھی۔ اردو کے علاوہ انگریزی ادب اور اس کی تاریخ کے مطالعے نے ان کے ادراکات پر غیر معمولی جلا کاری کی تھی۔ ان کی جوانی کے دنوں میں ترقی پسند ادبی تحریک کے دعوے ایک شور میں بدل چکے تھے۔ جن کی نامانوسیت اور نئے پن کا ان کی حسیّت پر بھی اثر ضرور ہوا اور وہ ادبیت کے ساتھ سماجی متعلقات اور ان کے اجبار کو بھی ایک خاص اہمیت دینے لگے۔ تاہم حیات و کائنات نیز مابعد الطبیعات کے تعلق سے جو ذہنی تجربے میسّر آتے ہیں اور جن سے ہمارے ادراکات کو ایک نئی تنظیم اور زندگی فہمی کا جو ایک مختلف اسلوب حاصل ہوتا ہے، سرورؔ صاحب کو اس کی اہمیت کا بخوبی احساس تھا۔

سرور صاحب کی تنقید پر کوئی بھی رائے قائم کرنے کے دوران ہمیں یہ سمجھنا چاہیے کہ بیسویں صدی کے نصف اول میں ہم نے اپنے کلاسیک مثلاً میر اور غالب اور جدید ادوار کے بعض اہم شعراء مثلاً اقبال، فانی، حسرت اور فیض وغیرہ کے بارے میں انہیں محاکموں پر اپنی رایوں کی بنیاد رکھی تھی۔ وجہ تھی سرور صاحب کا وہ طریق فہم جو ہر شاعر کو ایک علیحدہ کرہ میں دیکھتا اور دکھاتا ہے، ہر شاعر کے ساتھ ان کے انداز رسائی ہی میں نہیں ان کے انداز تخاطب میں بھی تبدیلی محسوس کی جا سکتی ہے۔ (میر اور اقبال کے محاکموں ہی کی مثال کافی ہے) مقصود یہ کہ سرور صاحب ایک ہی منطق سے ہر شاعر کا قد ناپنے کی سعی نہیں کرتے بلکہ ہر شاعر کے تجربے کی نوعیت، اس کی زندگی فہمی کے اسلوب، اس کی فکر کے ابعاد، ادبی روایتوں سے اس کے ذہنی روابط اور اس کی تاکید کے ان محوروں پر بھی وہ غور کرتے ہیں جن میں شخصیت بھی شامل ہے اور تہذیب بھی۔ مابعد جدید تنقید ان فنی ترکیبی عوامل پر بالخصوص غور کرنے سے عبارت ہے جن سے شعر نے ترکیب پائی ہے۔ آل احمد سرور کا مدعا یہ بھی ہوتا ہے کہ ہم شعر کے مضمرات ہی سے معیار نقد اخذ کریں اور یہ دیکھیں کہ شاعر اپنی اصل جستجو یعنی کسی بھی متن کو ادبی متن میں بدلنے کی جستجو میں کس حد تک کامیابی کے ساتھ عہدہ برآ ہوا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''فن کا مقصد مذہب یا اخلاق یا سیاست یا سماج کے کسی نظریے کی تلقین نہیں بلکہ فن کو تلقین سے بیر ہے۔ ہاں فن کے نتیجے کے طور پر ہمیں جو بصیرت حاصل ہوتی ہے اس میں کوئی اخلاقی میلان، کوئی سماجی شعور یا کوئی مذہبی یا متصوّفانہ نظریہ

www.taemeernews.com

سبھی مل سکتے ہیں۔ مقصد کو نتیجے سے مخلوط
نہیں کرنا چاہیے۔''
''ادب میں اخلاق، ادب میں مذہبی
تصورات، ادب میں تصوف، ادب میں سماجی
قدریں۔ ادب میں انسان دوستی کے ہر
نظریے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ادب کا
مقصد ان میں سے کسی نقطۂ نظر کی ترجمانی
یا اشاعت ہے۔ مگر ادب تلقین نہیں تخلیق
ہے۔ یہ SAYING نہیں MAKING

ہے۔ ادب کی قدر و قیمت اس بات سے
متعین نہیں ہوتی کہ وہ صحیفۂ اخلاق یا
سماجی دستاویز ہے۔ ادب خود اخلاق
ہے اور وہ اپنے طور پر سماجی بصیرت بھی
دیتا ہے۔ ادب کا کوئی تعلق نہ پروپیگنڈے
سے ہوتا ہے نہ لوگوں کی ہدایت کرنے سے،
نہ راہ نجات سے، نہ فوری عمل کے لیے
اکسانے سے، اس کا مقصد تخلیقی تجربے
کی ترسیل ہے۔''

II
دوسری قرأت/دوسرا تاثر

ہم ایسے بہت سے تخلیق کاروں کے بارے میں جانتے ہیں جو اپنی تخلیقی کارکردگی کے اعتبار سے یقیناً ایک بڑا مرتبہ رکھتے ہیں، لیکن جب اپنے فکر و فن اور ذہنی تناظر کے سلسلے میں ان سے سوال کیا جاتا ہے تو اکثر ان کے دعوے ان کے فن کو اور ان کا فن ان کے دعوں کو جھٹلاتا ہے۔ خیر تخلیق کار سے ہمیں یہ امید کرنا بھی نہیں چاہیے کہ جب اس کے تعلق سے خود اس سے کوئی سوال کیا جائے تو وہ تھوڑا اپنے آپ سے پرے ہو کر اس گفتگو کو کوئی بہتر معنی فراہم کر سکے، علی الرغم اس کے ایک تنقید نگار سے ہم یہ ضرور توقع کرتے ہیں کہ اپنی تنقید کے منصب اور تفاعل نیز تصورات نقد کے بارے میں کچھ زیادہ ہی یقین کے ساتھ ہماری رہ نمائی کر سکتا ہے۔ اس کے کیسے میں زبان اور علم کی قوت ہوتی ہے۔ وہ دوسروں کے مقابلے میں ایک بہتر شناخت کی فہم بھی رکھتا ہے۔

اپنے ذہنی سفر کے ان مراحل کا اسے بخوبی علم ہوتا ہے جن سے گذر کر اس نے اپنے یقین اور اپنے اعتماد کو پختہ تر کیا ہے۔ آل احمد سرور جس پائے کے نقاد ہیں ہم ان سے بجا طور پر ایسی ہی توقع کرتے ہیں۔ حیرت کا مقام ہے کہ سرور صاحب کے وہ دعوے جو انہوں نے اپنے طریق نقد کے بارے میں کیے ہیں ان کے اطلاق اور انطباق میں وہ بے حد کم زور واقع ہوئے ہیں۔ مثلاً انہوں نے بارہا تنقید میں معروضیت پر اصرار کیا ہے اور یہ کہ معروضیت کا سبق انہوں نے سائنس سے سیکھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''سائنس نے مجھے معروضیت سکھائی۔
سائنس نے اس سوال کو پس پشت ڈال دیا
کہ میں کیا چاہتا ہوں یا کیا پسند کرتا
ہوں۔ بلکہ یہ سکھایا کہ یہ کیا اور کیسا ہے؟
سائنس نے مجھے خوبیوں اور خامیوں

www.taemeernews.com

کو پرکھنا سکھایا۔ سائنس نے بنیادی اور جزوی
باتوں میں فرق کرنا سکھایا ___ اور تنقید میں
مجھے اس سے بڑی مدد ملی ہے۔''

آگے چل کر وہ پوری وضاحت کے ساتھ یہ دعویٰ بھی کرتے ہیں کہ:

''اس عمل کو سامنے رکھا جائے تو یہ سمجھ
میں آ جائے گا کہ میں کیوں تصویر کے
دونوں رخ دیکھنے کی کوشش کرتا ہوں،
کیوں میرے یہاں ترجمانی کی کوشش اور
تجزیے کی فکر اس قدر ہے، کیوں میں
دوسرے کو تھوڑی دیر کے لیے اپنی زبان
اور اپنا قلم دے دیتا ہوں مگر اس کے ساتھ
میں بالکل کھلونا نہیں بن جاتا بلکہ خود بھی
نمودار ہوتا ہوں۔ یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ
میری تنقیدوں میں میری جھلک نہیں ہے۔''

پہلی بات یہ کہ سائنس کے ساتھ نتھی کر کے آل احمد سرور جس نوع کی معروضیت پر زور دے رہے ہیں، اس میں قطعیت کا پہلو مفقود ہے اور قطعیت سرور صاحب کا شیوۂ گفتار ہے ہی نہیں، جیسا کہ انہوں نے 'دونوں رخ' دیکھنے کی بات کی ہے یہ چیز بھی ان کے تجزیوں میں بہ مشکل ہی راہ پاتی ہے۔ کبھی کبھی تنقید نگار کو اپنی شخصیت کے اس جز کو سختی کے ساتھ مار رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے جو ہمیشہ دردمندی، وسیع المشربی اور اخلاص کا دم بھرتا ہے۔ سرور صاحب اپنے معروض کے ساتھ دردمندی ہی سے پیش نہیں آتے بلکہ انہوں نے انہی شعراء کو اپنا موضوع و معروض بنایا ہے جن سے ذہنی اور جذباتی طور پر انہیں ایک نسبت خاص تھی۔ وہ تحسین APPRECIATION کو ایک معنی میں داخلی تنقید سے موسوم کرتے ہیں۔ اور داخلی تنقید ان کے نزدیک ناقص تنقید ہے۔ دوسری جگہ وہ لکھتے ہیں:

''یہ (تنقید) تخلیق پر عرف عام میں عمل جراحی
بھی کرتی ہے۔ مگر یہ عمل شاعرانہ طور پر ہوتا ہے
اور اسی فضا کے اندر رونما ہوتا ہے۔''

سرور صاحب نے عمل تحسین کو ناقص قرار دیا ہے آئرنی یہ کہ یہی وہ عمل ہے جس پر ان کی تنقید اپنی بنائے ترجیح رکھتی ہے۔ جو میری نظر میں نہ تو ناقص ہے اور نہ داخلی۔ جس طرح عیب جوئی یا تنقیص کسی کے لیے سب سے آسان تر کام کی حیثیت رکھتی ہے اسی طرح دوسرے کے لیے تنقیص ایک مشکل ترین کام ثابت ہو سکتا ہے۔ تنقید کی نوعیت تنقید نگار کی شخصیت کا آئینہ ہوتی ہے۔ سرور صاحب کے اسلوب نقد میں وضع داری اور رواداری نے ایک حاوی رجحان کی صورت اختیار کر لی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تادم آخر تذبذب اور گومگو کی کیفیت سے چھٹکارا نہیں پا سکے۔ تنقیص، تنقید کا عیب نہیں ہے لیکن تذبذب تنقید کا سب سے بڑا عیب ہے۔ حالانکہ سرور صاحب نے سطور بالا میں تنقید کے لیے عمل جراحی کو ضروری قرار دیا ہے مگر دوسرے جملے ہی میں وہ اس عمل جراحی کے لیے شاعرانہ کی شرط لگا دیتے ہیں یعنی جراحی میں بھی لطف کا سامان پنہاں ہونا چاہیئے۔ ظاہر ہے اس قسم کی جراحی یا تجزیہ کاری سے تنقید کا کوئی منصب پورا نہیں ہوتا اور نہ ہو سکتا ہے۔

سوال یہ نہیں ہے کہ آل احمد سرور کا دعویٰ

www.taemeernews.com

یا دعوے کیا ہیں۔ سوال یہ ہے کہ انہوں نے اپنی تنقید کے طریق اور تصور یا مجموعاً تنقید کے منصب اور تفاعل کے تعلق سے جو دعوے کیے ہیں ان کی تنقید کس حد تک ان پر پورا اترتی ہے؟ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ سرور صاحب کے قول اور فعل دونوں میں کوئی تال میل دکھائی نہیں دیتی۔ ان کی تنقید اپنے دعووں میں جس بلند کوشی کا مظاہرہ کرتی ہے اور بار بار اس کے تخاطب کے طریق میں جس طرح آہنگ بلند ہو جاتا ہے، قدر رنجی میں جذباتیت جس طور پر کہیں آہستہ اور کہیں بڑی سرعت کے ساتھ حاوی ہوتی چلی جاتی ہے۔ یا محالیوں PARADOXES میں خود نقیضی کی جو کیفیت با تکرار واقع ہوتی ہے، اسمائے صفات کی چمک دمک جس طرح خود صاحب نقد کے قایم کردہ تصور کو مسخ کرنے کے درپے ہوتی ہے، اس سے چیزوں کو پہچاننے کا عمل بہت پیچھے رہ جاتا ہے۔ تخلیق کار کے مقابلے میں تنقید نگار کو زبان کے اس خودرو عمل کا زیادہ علم ہونا چاہیئے جو نثر کی منطق کے تئیں بہت بڑے خطرے کا حکم رکھتا ہے۔ میں یہ مانتا ہوں کہ تنقید شبہات کو دور ہی نہیں کرتی نت نئے شبہات کو جنم بھی دیتی ہے لیکن محض شبہات سازی کے ساتھ وہ مشروط نہیں ہے۔ سرور صاحب خود اپنے فیصلوں پر شبہ کی مہر لگاتے ہوئے چلتے ہیں۔ جہاں انہیں سنگ دلی کے ساتھ جانبداری کا ثبوت دینا چاہیئے وہاں وہ زبان کی فریب دینے کی صلاحیتوں سے بھرپور فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ عمل ان کی کلمہ بندی میں اتنی تکرار کے ساتھ واقع ہوا ہے کہ سرور صاحب کے اسلوب خاص کی پہچان ہی اس سے قایم ہو گئی ہے۔ جو تلفیظ اپنی بنت میں مترادفات، قریب الاصوات اور متضاد لفظوں، لفظی رعایتوں، نفیس اور مسجع لفظی خوشوں، نیز شاعرانہ ترکیبوں پر زیادہ سے زیادہ مشتمل ہو وہاں تنقید اپنے قصد اور اپنے مرکز سے پرے ہو جاتی ہے۔ اسلوب کی پرستاری نہ صرف یہ کہ قاری بلکہ خود نقاد کو بھی بڑے دھوکے میں رکھتی ہے۔ وہ اپنے مرصّع جملوں، فقروں اور مشابہتی کلمات کو بار بار پڑھ کر اور خود کو سنا کر جس طور پر لطف اندوز ہوتا ہے، وہ لطف اندوزی کسی نشے سے کم نہیں ہوتی۔ اردو ادب کا قاری خود بھی اسلوب کا پرستار واقع ہوا ہے۔ لہٰذا تنقید اور تنقید میں وہ فرق کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتا۔ اسے گمان تک نہیں ہوتا کہ تنقید نے کہاں خطابت کا چولہ بدل لیا ہے اور زبان کی وہ تابع مہمل بن گئی ہے اور کہاں محض تشریح اور ترجمانی کے اُس یک سطحی عمل نے ترجیح کی صورت اختیار کر لی ہے جس کے لیے نطشے نے کہا تھا:

THERE ARE NO FACTS , ONLY INTERPRETATIONS

آل احمد سرور کی تشریح کا عمل کسی نئے تحت المعنی کی دریافت کی کوشش سے عبارت نہیں ہوتا کیوں کہ موجود متن کی کشود کاری کے بجائے اپنے ذہنی تجربوں کی پیوند کاری میں ان کی رغبت زیادہ ہوتی ہے۔ مستزاد یہ کہ زبان کو آزادی کے ساتھ کھل کھیلنے کے مواقع فراہم کر کے وہ صاحب تخلیق کی طرح طمانیت بھی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ وہ خود بھی لکھتے ہیں کہ 'بڑی تنقید تخلیقی ادب سے کسی طرح

www.taemeernews.com

کم تر نہیں ہوتی بلکہ وہ خود تخلیق ہو جاتی ہے، یا یہ کہ ''اچھی تنقید تخلیقی ادب کی طرف مائل کرتی ہے وہ خود بھی تخلیقی ہوتی ہے''۔ پھر دوسرے مقام پر وہ خود یہ کہہ کر اپنے ہی دعوے کو باطل ٹھہرا دیتے ہیں کہ ''جس گہرائی اور سپردگی کی تخلیق میں ضرورت ہوتی ہے، تنقید کو اس سے ابھرنا بھی ہوتا ہے''۔ جس بلند آواز اور پختہ اعتماد کے ساتھ وہ یہ تھیسس قائم کرتے ہیں کہ ''تنقید کا کام فیصلہ ہے۔ تنقید دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر دیتی ہے۔ تنقید وضاحت ہے، تجزیہ ہے۔ تنقید قدریں متعین کرتی ہے، ادب اور زندگی کو پیمانہ دیتی ہے۔ تنقید انصاف کرتی ہے۔ ادنیٰ اور اعلیٰ، جھوٹ اور سچ، پست اور بلند کے معیار قائم کرتی ہے۔ تنقید ہر دور کی ابدیت اور ابدیت کی عصریت کی طرف اشارہ کرتی ہے''۔ اتنے طول طویل محاکمہ کے فوراً بعد پھر ان کا یہ بیان سارے ارشادات کو بے اوقات ٹھہرا دیتا ہے کہ 'یہ اور اس قسم کی بہت سی باتیں کہی جا سکتی ہیں اور ان میں سے کوئی بات بالکل غلط نہیں ہے۔' یعنی اگر ان میں سے کچھ باتیں غلط بھی ہیں تو وہ قطعاً غلط نہیں ہیں۔ سرور صاحب کا قاری ان سے یہ سوال پوچھ سکتا ہے کہ پھر وہ کون سی باتیں ہیں جو کسی حد تک غلط بھی ہیں اور اگر صحیح ہیں تو کس حد تک صحیح بھی ہیں؟ جب کہ جواب کے ضمن میں وہ کوئی تکلیف نہیں اٹھاتے۔ تنقید اگر محض سوال کرتی ہے اور جواب دہی کی ذمہ داری قاری کے سر منڈھتی ہے تو وہ تنقید کو پڑھنے میں سرہی کیوں کھپائے۔ میں نے اسی لیے نقاد کو ایک خاص قسم کا قاری کہا ہے کہ عام قاری اور نقاد قاری میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ تنقید جیسا کام ہاتھوں میں لے کر ایک نقاد خود بہت سی ذمہ داریاں اپنے سر لے لیتا ہے۔ سرور صاحب نے غالب فہمی اور اقبال فہمی میں یہ ذمہ داری ضرور نبھائی ہے اور ان کے کئی مضامین میں بعض عبارتیں، اعلیٰ تنقید کے منصب پر پوری اترتی ہیں۔ ان کی بعض آرا اپنا ایک جداگانہ تشخص بھی رکھتی ہیں جو توقع ساز بھی ہیں اور عموی توقع شکن بھی۔ میں نے اپنے مضمون کے پہلے حصہ میں ان کی تنقید کے بارے میں جو ایک بہتر تصور قائم کیا تھا اس کی بنیاد بھی ایسی ہی خوش آثار مثالوں نے قائم کی تھی۔ سرور صاحب کی تنقید کے بارے میں کوئی ایک رائے قائم کرنا میرے لیے بھی بہت مشکل کام ہے۔ جس طرح ان کی تنقید تذبذب اور تعلیق میں ڈالے رکھتی ہے اسی طرح سرور صاحب کی تنقید کے بارے میں ہماری رایوں میں بھی بڑی تعلیق ہے۔ جس کے ذمہ دار خود سرور صاحب اور ان کا انداز نقد ہے۔ وہ لوگ ابھی باقی ہیں جن کے ساتھ ان کے ذہنی اور جذباتی اور معاملاتی رشتے قائم تھے اور یہ رشتے باہمی تعاون کی بنیاد پر تا بہ آخر استوار اور برقرار رہے۔ وقت کی یہ دھند جب چھٹ جائے گی تو آئندہ نسل اپنے تجزیوں کی بنیاد پر یہ نتیجہ ضرور اخذ کرے گی کہ آل احمد سرور نے اتنی بڑی تنقید نہیں لکھی جتنے بڑے وہ نقاد ہیں۔

☆☆☆

www.taemeernews.com

قاضی افضال حسین*

سرور صاحب کا تصور نقد

تنقیدی معروضیت/ دیانت کا تقاضا تو یہ ہے کہ فنکار یا تنقید نگار کے بنیادی تصورات کی شناخت کے لیے اس کے مرتب کیے گئے تمام متون کا مطالعہ کیا جائے اور ان میں ان اوصاف و امتیازات کی جستجو کی جائے جو اس کے تمام متون کی شیرازہ بندی کرتے ہیں تا کہ یہ معلوم ہو سکے کہ بحیثیت ادیب یا نقاد وہ اپنے ادب کے لیے کن اوصاف کو لازمی تصور کرتا ہے اور اس کی کن روایات کو عزیز رکھتا ہے۔ ان اوصاف و امتیازات کی نشاندہی کے بعد اس کے بنیادی تصورات/ مقدمات کا تجزیہ کیا جائے تا کہ ادب میں اس کی خدمات (Contribution) اور معاصر منظرنامے میں اس کی جگہ متعین کی جا سکے۔ مگر ہوتا یہ ہے کہ نقاد اپنی ذاتی پسند یا اپنے اختیار کردہ نظریاتی بنیادوں پر ہر فنکار یا نقاد کا جزوی مطالعہ کرتا ہے اور اس کے متن میں صرف وہی خوبیاں اور خامیاں دیکھتا ہے، جو اس کے پسندیدہ معیار پر پوری اتریں۔ یہ ممکن ہے کہ تخلیقی متون کے لیے حزبی تحفظات کے پابند مطالعہ کا کوئی کمزور یا غلط جواز پیش بھی کیا جا سکے لیکن تنقید لکھنے والے کا ایسا یک طرفہ مطالعہ اس لیے ناکافی بلکہ غیر دیانت دارانہ ہے کہ اپنے منصب سے واقف نقاد خود اپنا ایک مرتب نظام افکار اور بہت سوچا سمجھا طریقۂ کار رکھتا ہے۔ ہم اس کے پورے نظام فکر کو رد کر سکتے ہیں یا اس کے تنقیدی طریقۂ کار کی بنیادی خامیوں کی نشاندہی کر کے اس کے تنقیدی تصورات اور ان کے اطلاق کے درمیان تضاد یا غیر ہم آہنگی کو واضح کر سکتے ہیں۔ لیکن اس کی تحریروں میں بعض بیانات کے درمیان تضاد کی نشاندہی یا اس کے دیباچوں سے ظاہر ہونے والی خود پسندی کی بنیاد پر اس کو رد کرنے کا کوئی جواز نہیں اور یہ ستم اس شخص پر کیا گیا ہے جو ساری زندگی میانہ روی، مطالعہ کی وسعت اور فکر کے توازن پر زور دیتا رہا۔ بیان میں تضاد اور تنقیدی محاورے کی خامیوں پر وقت صرف کرنے کے بجائے یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ وہ کون سے ادبی/تنقیدی تصورات ہیں جو سرور صاحب کو عزیز ہیں اور جو ان کے پہلے مجموعے سے آخری مجموعے تک بتواتر دہرائے گئے ہیں۔ مثلاً

* پروفیسر، شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

www.taemeernews.com

نقاد کی حیثیت سے مطالعۂ سرور کی پہلی منزل یہ دریافت کرنا ہے کہ ان کے نزدیک تنقید کیا ہے؟ اس کے فرائض کیا ہیں، اور خود سرور صاحب کا طریقۂ نقد کیا ہے؟ اگر سرور صاحب کے تمام تنقیدی مضامین کا صرف اس ایک نقطۂ نظر سے مطالعہ کیا گیا ہوتا تو ہم پر یہ حقیقت کھلتی کہ تنقید کے منصب اور اس کے طریقۂ کار کے متعلق سرور صاحب کے تمام مجموعوں میں ایک ہی موقف تقریباً یکساں الفاظ میں دہرایا گیا ہے۔ تعجب ہے کہ سرور صاحب کے تنقیدی تصورات میں اس تواتر کا ذکر کبھی نہیں کیا جاتا، یہ اقتباسات پڑھیے:

۱.۱ ''......اب بھی کچھ لوگ صرف قدیم ادب یا صرف جدید ادب کے پرستار ہیں۔ یہ بات ایک اچھے نقاد کے منصب کے خلاف ہے۔ وہ اپنے آپ کو اس طرح خانوں میں نہیں بانٹ سکتا...... وہ جانب دارانہ ہوگا۔ ایمانداری سے اپنے خیالات کا اظہار کرے گا۔ اس کا پہلا کام ترجمانی ہے پھر انصاف......۔
لفاظی، جانب داری، سطحیت اور قطعیت کا اس کے یہاں گذر نہ ہوگا۔''
(تنقیدی اشارے؛ کچھ اس کتاب کے متعلق؛ اشاعت ۱۹۴۲ء)

۱.۲ ''میں ادب میں پہلے ادبیت دیکھتا ہوں، بعد میں کچھ اور، گو یہ جانتا ہوں کہ ادب میں جان زندگی سے ایک گہرے اور استوار تعلق سے آتی ہے...... میں محض نیا یا پرانا کہلانا پسند نہیں کرتا میں نیا بھی ہوں اور پرانا بھی۔ لیکن قدرتی طور پر اپنے دور کے میلانات و خیالات سے متاثر ہوں......
میں سمجھتا ہوں کہ نقاد کا فیصلہ فوجداری کی عدالت کا فیصلہ نہیں ہے نہ نقاد کی حیثیت ایک ہوشیار وکیل کی ہے۔ رچرڈس نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ''ایک اچھے نقاد میں تین خوبیاں ہونی چاہئیں۔ اس کیفیت ذہنی تک پہنچنا جو مصنف یا تصنیف کی ہے، تجربات اور تجربات میں امتیاز کرنا تاکہ ان کی قدر و قیمت کا اندازہ ہو سکے، قدروں کا نباض ہونا'' اسی اصول پر چلنے کی میں نے کوشش کی ہے۔''
(نئے پرانے۔ چراغ؛ دیباچہ ص ۷۔۸؛ اشاعت ۱۹۴۶ء)

۱.۳ ''تنقید کے لیے کوئی ایک جامع اصطلاح وضع کی جا سکتی ہے یا نہیں میرے خیال میں اس کے لیے ''پرکھ'' کا لفظ سب سے موزوں ہے، اس میں تعارف، ترجمانی اور فیصلہ سب آ جاتے ہیں۔ پرکھ کے لفظ کے ساتھ ہمارے ذہن میں ایک کسوٹی آتی ہے۔ نقاد کے ذہن میں ایک ایسا معیار ضروری ہے۔ پرکھنے اور تولنے کے لیے ترجمانی اور تجزیہ ضروری ہے۔ مبصر یا پارکھ اپنا فیصلہ منوانے کے درپے نہیں ہوتا۔''
(تنقید کیا ہے؛ تنقید کیا ہے ص ۲۴۳۔۲۱۲ اشاعت ۱۹۴۷ء)

www.taemeernews.com

۱.۴ ''تنقید ادب کی ایک شاخ ہے۔ ادب میں مسرت اور بصیرت دونوں کا احساس ضروری ہے...... تنقید نہ وکالت ہے نہ عدالتی فیصلہ۔ یہ پرکھ ہے۔ نقاد مبصر ہوتا ہے مبلغ یا مفتی نہیں ہوتا۔ وہ بعض رنگوں کا مداح ہوسکتا ہے اور بعض کا مخالف۔ مگر وہ یک طرفہ نہیں ہوسکتا۔''

(ادب اور نظریہ؛ دیباچہ ص ۷۔۵؛ اشاعت ۱۹۵۴)

۱.۵ ''تنقید بہر حال فن پاروں کی خصوصیات کی وضاحت اور ذوق کی صحت کا نام ہے اس میں تجربات کی پرکھ اور قدروں کا تعین دونوں پہلوؤں کے ساتھ انصاف ضروری ہے۔'' (ص ۱۰۸)

''بدلتے ہوئے ذہن کے ساتھ بدلتی ہوئی زبان اور اس کے بدلتے آہنگ کی پرکھ کا تنقید کو احساس ہو، اس لیے صرف سیاہ و سفید والی تنقید ہمارے لیے گمراہ کن ہے بلکہ ہمیں ایک ایسے نظریے کی ضرورت ہے جو تمام رنگوں کا عرفان دے سکے۔'' (ص ۱۲۵)

(نظر اور نظریے ص ۱۲۵/۱۰۸؛ اشاعت ۱۹۷۳ء)

۱.۶ ''روایت کا علم ہی نہیں عرفان بھی ضروری ہے اور اس کے بعد تجربے سے ہمدردی اور تجربے کے لیے آغوش وا رکھنا بھی۔ شاعری کی مسرت اور اس کے نتیجہ میں بصیرت بڑا مرتب ذہن، بڑی غائر نظر اور بڑا حساس مزاج چاہتی ہے......''

(مسرت سے بصیرت تک پیش لفظ ص ۹۔۸؛ اشاعت ۱۹۷۴ء)

۱.۷ ''......ادب کا مطالعہ اس لیے کہ وہ ادب ہے اس کا مخصوص طریقۂ کار ہے اس کی مخصوص بصیرت ہے جو کسی علم کی بصیرت سے نہ کمتر ہے نہ بہتر مگر ہے قابل قدر۔ پہلے فنکار کی شخصیت کا مطالعہ جس حد تک وہ فن کے مطالعہ میں مدد دے۔ ماحول کا علم جو ادب کو تناظر دے سکے۔ اس سماج کا احساس جس میں وہ ادیب سانس لیتا ہے اور اس پس منظر کے ساتھ فن کا غائر مطالعہ، اس کی ہیئت، جس میں مواد ایک مخصوص نامیاتی فارم میں جلوہ گر ہے۔ لفظ کی وہ جادوگری جو لفظ کی تہہ داری اور پہلوداری کے ذریعہ اسے کائنات بناتی ہے۔ وہ تنظیم و تناسب جو فن کا جوہر ہے اور وہ بصیرت جو اس کا انعام ہے۔ آپ چاہیں تو اسے ایک انتخابی نظریہ کہہ لیں، مگر مجھے نظریہ سے زیادہ نظر سے سروکار ہے۔''

(پہچان اور پرکھ۔: کچھ اس کتاب کے بارے میں؛ ص ۱۶ اشاعت ۱۹۹۰ء)

۱.۸ '' ادب کو زندگی کی طرح تغیر پذیر نہ سمجھیں، حرکت اور ارتقاء کے فطری قانون

www.taemeernews.com

کو بھول جائیں، لکیر کے فقیر بنے رہیں۔ اس بغاوت کو جو بالآخر نئی روایتوں کو جنم دیتی ہے، اہمیت نہ دیں۔ تقلید کو سب کچھ سمجھیں اور اجتہاد کی ضرورت سے انکار کردیں۔ یہ اپنا اور پرایا پن، یہ شرق و غرب کا سطحی اور سستا تصور، یہ ادب اور زندگی کو خانوں میں بانٹنے کا ادعا کج بینی اور کم فہمی ہے۔''

(فکر روشن: حالی کے مقدمہ شعر و شاعری کی معنویت: ص ۸۷؛ اشاعت ۱۹۹۵ء)

۱.۹ ''تنقید علوم سے مدد لیتی ہے، مگر اسے کسی مخصوص علم کی شاخ نہیں بنانا چاہیے اس کا کام ادب کے رمز و ایما سے آشنا ہونا، اس کی مسرت اور بصیرت کا رمز شناس ہونا اور روح انسانی کے سفر کا محرم ہونا ہے۔''

(کچھ خطبے کچھ مقالے: اردو تنقید ایک جائزہ؛ ۲۷؛ اشاعت ۱۹۹۶ء[1])

''تنقیدی اشارے'' (۱۹۴۲ء) سے ''کچھ خطبے کچھ مقالے'' (۱۹۹۶ء) تک تقریباً چپن سال کی طویل مدت سے منتخب ان اقتباسات میں وہ کون سے خیالات ہیں جو ایک دوسرے سے متضاد ہیں؟ یا وہ کون سا بیان ہے، جو اس سے پہلے یا بعد کے تنقیدی مجموعوں میں دہرایا نہ گیا ہو؟ اور اگر کہیں کوئی تضاد نظر بھی آتا ہے تو وہ تنقید کے بنیادی تصور یا طریقہ کار کے بجائے اس کی توضیح یا تعبیر میں ہے جو اصلاً ایک بیدار ذہن نقاد کا ناگزیر فطری ارتقا ہے۔ بنیادی مقدمات کی بدلتی ہوئی تعبیر اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ تنقید نگار، اپنی روایت، اپنے معاصر ادبی ماحول اور اپنے ارد گرد کی زندگی کی سمت و رفتار سے باخبر ہے۔ اپنے معاصرین میں سرور صاحب کا امتیاز یہ ہے کہ انہوں نے اپنی پوری ادبی زندگی میں ہمیشہ معاصر فکری و ادبی تصورات کا ہمدردی سے مطالعہ کیا اور دانشورانہ ذہنی لچک کے سبب اپنے نقطۂ نظر سے مفید تصورات کو اپنے بنیادی ادبی تصورات کے فریم میں مناسب جگہ دیکر خود اپنے موقف کی توسیع کرتے رہے۔ سرور صاحب کی زبان میں اس کے لیے نظریے سے زیادہ اپنی نظر پر اعتماد کی ضرورت ہے اور وہ خود اپنی نظر پر اس اعتماد کی سب سے روشن مثال ہیں۔

سرور صاحب کے تنقیدی نظام میں ''تجربے'' کی شناخت اور اس کا عرفان، متن کی تنقیدی قرات کی پہلی منزل ہے۔ حالی کے زمانے سے سرور صاحب کے بعد ''جدیدیت'' تک ''تجربے'' کا مفہوم مغرب میں ادب کے رومانی تصورات سے متاثر رہا ہے۔ جس کے مطابق ''تجربہ'' شخصی/ انفرادی اور شاعر کی ذات سے نمو کرنے والا وہ تخیلی مواد ہے جو متن کی ایک مخصوص ہیئت میں موضوع یا مضمون کی حیثیت سے مرتب ہوتا ہے۔ شاعری کے افادی تصور کی ضرورت کے مطابق حالی نے اس تجربے کو اخلاق اور فطرت سے مربوط کیا، لیکن اس سے ذات اور تخیل کے بنیادی رومانی ربط پر حرف نہیں آتا۔ ترقی پسندوں نے اخلاق کی جگہ مادی و معاشرتی

[1] سرور صاحب کے تنقیدی تصورات کے لیے مزید اقتباسات حوالوں میں دیکھیے۔

www.taemeernews.com

حوالوں کو رکھ کر تجربے کے اجتماعی تصور پر زور دیا۔ اور جدیدیت کی تحریک شروع ہونے سے پہلے ہی میراجی کے یہاں تجربے کی 'انفرادیت پر اصرار سے ان وجودی تصورات کے لیے راہ ہموار ہوئی جو چند برسوں بعد ''جدیدیت'' کی فکری اساس کا ناگزیر جز بننے والے تھے۔ جدیدیت کے بعد تجربے کے تصور میں آئی تبدیلی سرورؔ صاحب کی فعال ادبی زندگی کے فوراً بعد کا واقعہ ہے اس لیے سرورؔ صاحب کی تنقیدوں میں تجربے کے مفہوم کو حالی سے جدیدیت تک کے فکری و ادبی تناظر میں دیکھنا چاہیے۔ صاف ہے کہ سرورؔ صاحب تنقیدی اشارے کے فوراً بعد تجربے کے اس مفہوم کو قبول کر لیتے ہیں جو ترقی پسند ادبی تصورات کے زیر اثر فروغ پا رہا تھا۔ یعنی فرد اور معاشرے کے درمیان باہم ربط و اثر پذیری سے مرتب ہونے والا وہ مواد جو ایک فرد کو اس کے معاشرے سے مربوط کرتا ہے۔[۱۵] اور اس ربط کے حوالے سے افادی ہوتا ہے۔ سرورؔ صاحب نے افادی کے اس تصور کی تعبیر میں ترقی پسندوں سے خاصا اختلاف کیا۔[۱۶] لیکن تجربے کے معاشرتی پس منظر سے اس زمانے میں انہیں اتفاق تھا۔ جدیدیت کی تحریک نے ''تجربے'' کے تصور میں جو تبدیلی کی، اس نے سرورؔ صاحب کی ''معاشرے'' کی ترقی پسند تعریف سے بے اطمینانی کو ایک جواز فراہم کیا اور پھر سرورؔ صاحب کے لیے ''تجربے'' کے معنی وہ نہیں رہے جو ''ادب اور نظریہ'' تک ان کی تحریروں میں غالب نظر آتے ہیں۔ ان کے یہاں تجربہ انفرادی ہوتا گیا ہے اور بدلتے ہوئے زمانے کی مناسبت سے اس کی پیچیدگی شاعری کی ایک قدر کا مرتبہ حاصل کرنے لگی ہے۔

شاعری میں عظمت اور تعین قدر کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے سرورؔ صاحب نے بار بار T.S.Eliot کے اس قول کا حوالہ دیا ہے کہ ''ادب کی عظمت صرف ادبی معیاروں سے نہیں جانچی جا سکتی۔ اگرچہ یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ ادب کے عدم اور وجود کو صرف ادبی معیاروں سے ہی پرکھا جا سکتا ہے۔'' ادب کی عظمت کے غیر ادبی معیاروں کا یہ تصور سرورؔ صاحب کو بہت پرکشش معلوم ہوتا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ان غیر ادبی معیاروں کے سلسلے میں سرورؔ صاحب کا موقف متواتر ارتقاء پذیر رہا ہے۔ وہ شروع تو ادب کے معاشرتی حوالوں سے کرتے ہیں اور پھر فلسفیانہ افکار و تہذیبی اقدار کی منزل سے گذر کر بالآخر مسرت سے بصیرت تک میں ان غیر ادبی معیاروں کو بھی ادبی نقطۂ نظر سے دیکھنے لگتے ہیں:

> ''فن کی سچائی تو واضح ہو گئی مگر فن کی بڑائی کس چیز میں ہے، الیٹ نے کہا تھا فن کو پرکھا تو ادبی معیاروں سے جائیگا مگر اس کی بڑائی دوسرے معیاروں سے متعین ہوگی اور غالباً یہ معیار اخلاقی اور سماجی ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ ان معیاروں کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ الیٹ یہاں زندگی کی بصیرت کی بات کرتا ہے اس کے نزدیک فن میں بڑائی اس نظریۂ زندگی سے آتی ہے جو قاری کو مربوط پختہ اور حقیقی تجربے پر مبنی معلوم

www.taemeernews.com

ہو۔ یعنی سوال کسی اخلاقی یا سماجی نظریہ
سے اتفاق کا نہیں ہے بلکہ اس کی پختگی
اور گہرائی اور اس میں پوری طرح غرق
ہونے کا ہے۔ یعنی بڑی شاعری، مذہبی،
سماجی، متصوفانہ، اخلاقی، فلسفیانہ بھی کچھ
ہو سکتی ہے۔ مگر اپنے من میں ڈوبنے کی
وجہ سے نہ کہ کسی بڑے فلسفے یا نظریہ کی
وجہ سے۔ میرے نزدیک فن کی بڑائی
اوّل تو تجربے کی 'تہہ داری میں ہے' یعنی
اس تجربے کی کئی تہیں ہوں اور ان میں
سے کسی تہہ سے لوگ متاثر ہو سکتے ہوں یا
ایک تہہ کے آج روشن ہونے اور دوسرے
کے کل، یہ بڑائی تجربے کی پیچیدگی
میں ہے......'' [۴]

اس کے بعد سرؔور صاحب کے یہاں دو تجربوں کے درمیان تقابل اور ان کی معنویت کے تجزیے کی منزل آتی ہے۔ یہاں بھی صورت حال یہ ہے کہ جب تجربے کی کوئی جامد تعریف سرؔور صاحب قبول ہی نہیں کرتے تو پھر تقابل اور معنویت کے تعین کا معیار بھی ان کی تحریروں میں رفتہ رفتہ بدلتا جاتا ہے۔ جس سے تنقید کی تیسری اور آخری منزل تعین قدر بھی متاثر ہوتی ہے۔
سرؔور صاحب متن کی معنویت کو فرد کی ذات کے امتیازات اور معاشرے کی ترجیحات کے درمیان باہم اثر پذیری کی روشنی میں دیکھتے ہیں۔ یعنی ان کے نزدیک شاعر کا وہ تجربہ قیمتی ہوگا جو انفرادی ہوتے ہوئے بھی اجتماعی احساسات کی ترجمانی کرتا ہو۔ متن جتنا انفرادی، شخصی اور Specific ہوگا وہ اسی مناسبت سے زیادہ سے زیادہ لوگوں کے لیے بامعنی اور پر اثر ہوتا جائے گا۔ ''ادب اور نظریہ'' کے بعد سرؔور صاحب کے یہاں تجربے کی معنویت میں پیچیدگی کے عنصر کا اضافہ ہو جاتا ہے، وہ بہت واضح الفاظ میں کہتے ہیں کہ انسانی ذہن کا ارتقاء سادگی سے پیچیدگی کی طرف ہوا ہے۔ اس لیے ادبی متون کی معنوی پیچیدگی اس کے حسن اور قدر میں اضافے کا سبب ہے۔ [۵]
ایک اچھے نقاد کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس پیچیدگی کو سمجھے انہیں ممکن حد تک حل کرنے کی کوشش کرے اور اس پیچیدگی میں ہی وہ اوصاف دریافت کرے جو فن پارے کی قدر و قیمت متعین کریں گے:

''اس لیے فکر و فن میں آزادی
میرے نزدیک سب سے بڑی قدر ہے۔
یہ آزادی مکمل آزادی نہیں ہے، بلکہ
رائج، مقبول، وقتی اور محدود وفاداریوں
سے آزادی ہے تاکہ فنکار اور ادیب
زندگی کے تجربات کو نئے معنی اور مفاہیم
دے سکے یا نئے حقائق کو ازلی اور ابدی
صداقتوں سے مربوط کر سکے۔'' [۶]

''نقاد وہ قاری ہے، جس کا ذہن
زیادہ مہذب، مرتب اور بیدار ہے اپنی
تنقید کے ذریعہ وہ ذہنوں کو بیدار کرتا
ہے، جذبات کی تہذیب و تنظیم کرتا ہے
اور پڑھنے والوں کو تجربے اور تجربے
میں فرق کرنے کی صلاحیت دیتا ہے۔
تاکہ وہ ادبی اقدار کا عرفان حاصل
کر سکیں اور اس طرح ادب کے ذریعہ

www.taemeernews.com

سے زندگی کی معنویت کو سمجھ سکیں۔''ے

زندگی کے متعلق پہلے سے متعین فلسفے یا نظریے کی روشنی میں ''قدر'' کی شناخت سے خود فنی اقدار کے حوالے سے زندگی کی تہذیب تک 'قدر' کے تصور میں سرور صاحب نے ایک طویل سفر طے کیا ہے۔ ان کے فکر کی بلوغت کے آثار 'نظر اور نظریے' سے ظاہر ہونا شروع ہو جاتے ہیں اور 'پہچان اور پرکھ' تک آکر بالکل واضح طور پر قدر کی مرکزیت، معاشرتی زندگی یا تہذیب سے نکل کر خود ادب کے بنیادی حوالے تک آجاتی ہے۔ اس منزل پر ادب کی تخلیق اور پھر اس کی قرأت سے ہی تجربے کی تنظیم وترتیب اور اس سے نمو کرنے والی معنویت وہ مرکزی قدر بن جاتی ہے، جس کی روشنی میں ہم اپنی زندگی اور معاشرت کا تنقیدی جائزہ لے سکتے ہیں۔ اب سرور صاحب کے لیے حسن کی اپنی صداقت ہی اصل خیر ہے۔ جو زندگی کو معنی دیتی ہے۔'' کچھ خطبے کچھ مقالے'' میں سرور صاحب ادب کے ذریعہ زندگی کی تزئین میں بشر دوستی کے وسیع تر تصور کو شامل کرتے ہیں کہ بالآخران کے نزدیک یہی ادب کا مقصد ہے۔

جس طرح سرور صاحب کی تحریروں میں تجربہ، پرکھ' معنویت اور قدر کے تصورات میں واضح ارتقاء دکھائی دیتا ہے اسی طرح تنقید کی بعض منفی صفات ایسی بھی ہیں جن سے انہوں نے اپنی ادبی زندگی کے کسی بھی مرحلے پر مفاہمت نہیں کی۔ وہ یک رخے پن، سطحیت اور تنقید میں قطعیت کے سخت مخالف ہیں۔ سرور صاحب کی پہلی تنقیدی کتاب کی اشاعت سے ''ادب اور نظریہ'' تک کا زمانہ ایک طرف تو ترقی پسند ادبی تصورات کے فروغ، ان کی مقبولیت اور اس کے نتیجے میں مارکسی مبلغوں کی ادعائیت کا زمانہ ہے اور دوسری طرف وہ نقاد ہیں جو یا تو ادب کے متعلق صرف مغربی افکار وتصورات کی مغربی تعبیر اور اس کے براہ راست اردو ادب پر اطلاق کے داعی ہیں یا پھر عربی اور مشرقی علوم کے وہ عالم جو روایتی مشرقی تنقید کے بار بار دہرائے گئے مباحث سے آگے بڑھنے کو تیار نہیں۔ سرور صاحب کے داہنے اور بائیں دونوں طرف سطحیت، یک رخے پن اور قطعیت کے وہ خاردار جنگل ہیں، جن سے وحشیانہ ادعائیت کا وہ شور اٹھ رہا ہے جو صرف اپنی آواز کے volume سے ادب میں انفرادیت، پیچیدگی، اور ہمہ جہتی کے تصور پر غالب آنا چاہتا ہے۔ اس ماحول میں یک رخے پن اور سطحیت سے سرور صاحب کا واضح الفاظ میں انکار ان کی دانشورانہ جرات کی خبر دیتا ہے اور یہ کلمۂ انکار ان کی بالکل ابتدائی تحریروں میں بھی ہے۔ تصور تنقید کے متعلق تنقیدی اشارے کے پیش لفظ سے مقتبس جملے پھر پڑھیے اور دیکھیے کہ چالیس کی دہائی میں جب ترقی پسند تحریک کی ادعائیت، اپنی مقبولیت کے سبب شدید سے شدید تر ہوتی جارہی تھی، سرور صاحب اس یک رخے پن اور قطعیت سے صریح انکار کرتے ہیں۔ اس رجحان کی تردید ان کی بعد کی تحریروں میں بھی نمایاں ہے:

''ہمارے سخن فہم بڑے یک طرفہ ذہن رکھتے ہیں''۵ے

''روایت کو ماننے والے اور انہیں یک قلم ترک کرنے والے دونوں سطحیت،

www.taemeernews.com

سہل پسندی اور یک رخی کے شکار ہیں۔'' ۹

تنقید میں یک رخے پن، سطحیت اور قطعیت سے بالجبر انکار، سرور صاحب کی سلامت روی اور Sanity (ہوشمندی) کا ثبوت ہیں، مگر قابل قدر بات یہ ہے کہ اس جوابی کاروائی میں غور و فکر کی صلاحیت یا ان کی طبیعت کا توازن ان کا ساتھ نہیں چھوڑتا۔ چنانچہ ان منفی صفات سے صریح انکار کے باوجود وہ ایک جگہ ''قطعیت کی دو قسموں میں فرق بھی کرتے ہیں:

''ہمارے یہاں قطعیت ہے مگر وہ
قطعیت نہیں جو واضح خیال اور گہرے علم سے
پیدا ہوتی ہے بلکہ وہ قطعیت جو یک طرفہ
رائے اور سطحی علم کی پہچان ہے۔ ہم میں وکیل
اب بھی زیادہ ہیں، مبصر یا پارکھ کم......'' ۱۰

اور تخلیقی زبان کے حوالے سے یہ اقتباسات ملاحظہ ہوں:

''شاعری کی زبان بہ یک وقت
زیادہ وجدانی (اور اس لیے مبہم) اور
زیادہ قطعی ہوتی ہے۔'' ۱۱

''ابہام شعر کا حسن ہے اور اس ابہام
میں معنی کی کئی تہیں ہوتی ہیں۔ قطعی زبان
سائنس کی زبان ہے، مبہم زبان شاعری کی
زبان ہے مگر اس ابہام میں ایک نئی قطعیت
ہوتی ہے تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اس
شاعری میں معنی نہیں ہوتے، اس کے معنی
دو اور دو چار والے نہیں ہوتے۔'' ۱۲

ان اقتباسات میں پہلے تو سرور صاحب تنقید اور تخلیق کی قطعیت میں فرق کرتے ہیں، پھر تنقید کی قطعیت میں بھی دو جہتیں ہیں۔ سرور صاحب کا اعتراض اس قطعیت پر ہے جو یک طرفہ ذہن یا کسی سیاسی، مذہبی یا ادبی فکر کی غیر مشروط اتباع میں ادعائیت سے پیدا ہوتی ہے۔ تخلیقی زبان کی قطعیت شاعر کے وجدان سے نمو کرتی ہے اور اس میں قطعیت کا مفہوم ''تجربے'' کی تمام جہات پر زبان کے حاوی ہونے کا ہے نہ کہ دو یا زیادہ جہتوں میں سے کسی ایک جہت کے قبول کرنے کا۔ ''قطعیت'' کی یہ درجہ بندی ان کے معاصرین کے لیے یقیناً نا قابل فہم رہی ہوگی کہ ایک طرف سیاسی نظریہ کا ادعا تھا تو دوسری طرف مغربی ادب سے واقفیت کا ناروا اظہار۔ اب یہ دونوں آوازیں اپنا اثر کھو چکی ہیں اور ان کے شور کو کم کرنے میں نئے قاری کی ترقی کرتی ہوئی وسعت نظر کے علاوہ سرور صاحب کی تحریروں کا بھی دخل ہے۔

مطالعۂ ادب کے اس طویل ذہنی سفر میں سرور صاحب کے سامنے دو بڑی منزلیں آئیں۔ ایک بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں ترقی پسند ادبی تحریک کا فروغ جو خود سرور صاحب کے پڑھنے اور اپنے آپ کو مرتب کرنے کا زمانہ تھا اور دوسری 'جدیدیت' کی تحریک، جو چھٹی دہائی میں بڑی حد تک ترقی پسند تحریک کے ردِ عمل، اور جنگِ عظیم کے بعد مغرب میں ابھرنے والے فلسفوں کی بنیاد پر شروع ہوئی ان دونوں تحریکوں کے فیشن یا ان کی مقبولیت سے متاثر ہونے کے بجائے انہوں نے ان کا ہمدردی کے ساتھ دیانت دارانہ مطالعہ کیا۔ دونوں تحریکوں کے ان پہلوؤں کی تعریف کی جو ادب کے لیے مفید تھے اور بالکل واضح الفاظ میں ان نقائص کی نشاندہی بھی کی جو ان کے خیال میں ادب کے حق میں کسی

www.taemeernews.com

طرح مفید نہ تھے۔ ان تحریکوں کے سلسلے میں سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ سرور صاحب نے ترقی پسندی اور جدیدیت دونوں کی کم و بیش ''سرکاری (Official) تعریف کبھی قبول نہیں کی۔ وہ ترقی پسندی کے قائل تھے مگر انہیں ترقی پسندی کا وہ تحریکی تصور کبھی پسند نہ آیا جو ایک مخصوص سیاسی فلسفے سے اپنی غذا اخذ کرتا تھا۔ اس لیے ان کے لیے ۱۹۳۲ء یا ۱۹۳۶ء کی ایک خاص تاریخ کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ سرور صاحب ترقی پسند تحریک کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اگر آپ چاہتے ہیں کہ جدید زندگی میں ادب کا وہی درجہ ہو جس کا وہ مستحق ہے تو آپ ادب کے ایک ترقی پسند نظریہ سے انکار نہیں کر سکتے...... اردو میں ترقی پسند رجحانات ہمیشہ پائے گئے ہیں اور حالی اور آزاد کے وقت سے ان رجحانات کو ایک مستقل تحریک کی شکل میں دیکھا جا سکتا ہے مگر اس میں شک نہیں کہ دو جنگوں کے درمیان جو تلخی اور بیزاری ادب میں پیدا ہوئی اور جس نے بڑھ کر ترقی پسند تحریک کا نام اختیار کیا، اس نے ادب اور زندگی کے خاموش سمندر میں خاصا تلاطم پیدا کیا ہے...... شاعری حسن، اسٹائل کی طرح ترقی پسندی کا کوئی بندھا ٹکا فارمولا نہیں ہے یہ ایک رجحان ایک تصور حیات ایک منزل مقصود ہے۔

میرے خیال میں اقبال اور پریم چند کے یہاں ترقی پسندی کا صحیح تصور ملتا ہے۔'' [۱۳]

اسی مجموعے میں لکھتے ہیں:

''یوں تو اردو ادب میں ترقی پسند عناصر غدر کے بعد سے نمایاں ہیں اور غدر سے پہلے کے ادب میں بھی جا بجا ان کی جھلک ملتی ہے ترقی پسندی محض آج کل کے ادیبوں کی جاگیر نہیں ہے۔ مگر حالی کے زمانے سے یہ رجحان ادب میں اتنا اہم ہو گیا کہ اس نے ساری فضا کو متاثر کیا۔ حالی کے بعد پریم چند، اقبال اور جوش نے اس روایت کو آگے بڑھایا اور اس میں بعض مستقل اضافے کیے۔ مگر یہ تحریک باقاعدہ طور پر ۱۹۳۵ء سے شروع ہوئی۔'' [۱۴]

گویا ۱۹۳۵ء میں اس تحریک کے ''باقاعدہ'' ہونے کے علاوہ بہت کچھ اس سے پہلے بھی ہو چکا تھا۔

یہی معاملہ انہوں نے ''جدیدیت'' کے ساتھ بھی کیا۔ جدیدیت پر اپنے چار مضامین میں انہوں نے سماجی، فلسفیانہ اور ادبی جدیدیت کا الگ الگ ذکر کیا ہے۔ وہ معاصر وجودی فلسفے کو اپنے زمانے کی شناخت کے طور پر قبول کرتے ہیں مگر جدیدیت کے ادب کو صرف اس حد تک محدود نہیں کرتے۔ ان کی جدیدیت بھی ترقی پسندی کی طرح ایک مستقل حالت ہے۔ چنانچہ اپنے تصور جدیدیت کی وضاحت کرتے ہوئے سرور صاحب لکھتے ہیں:

''جدیدیت ایک بت ہزار شیوہ ہے اور اس کی کوئی سیدھی سادی تعریف ممکن نہیں۔ کیونکہ اس میں کئی میلانات کام

www.taemeernews.com

کر رہے ہیں ۔ کچھ لوگ جدیدیت کو صرف عقلیت، سائنس کا عطا کیا ہوا علم اور تکنالوجی کی بہشت، سیکولر فکر کی دلآویزی، انسان اور اس کے شعور میں مکمل اعتماد کے مترادف سمجھتے ہیں ۔ دوسرے فطرت، انسان، فرد اور سماج کے بہتر علم، ماضی کے حال میں موجود رہنے اور حال کو متاثر کرنے اور بڑھتے ہوئے علم کے ساتھ بڑھتے ہوئے خطرات کے احساس، بلندیوں میں پستی دیکھنے اور دکھانے کو بھی جدیدیت سمجھتے ہیں یہ ہنری جیمس کی Imagination of Disaster بھی ہے اور Vision of Whole Situation بھی ۔ جدیدیت کی روایت بڑی تہہ دار اور جاندار ہے اور اس کے عرفان کے لیے مغربیت سے اسے الگ کرکے بھی دیکھنے کی ضرورت ہے۔'' [۱۵]

ان دونوں تحریکوں کے متعلق سرور صاحب کی تحریروں کا ہمدردانہ مطالعہ کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ سرور صاحب زندگی کے ایک حرکی تصور کو بہر حال فوقیت دیتے ہیں ۔ اگر ان کی جدیدیت یا ترقی پسندی انہیں بدلتی ہوئی فکری وتہذیبی اقدار سے ہم آہنگ نہیں کرتی تو وہ انہیں اسی طرح نا قابل قبول ہے جس طرح روایتی مذہب یا Myth کا جمود۔ اس کے ساتھ ہی بشر دوستی، جو بدلتے ہوئے زمانے کے ساتھ اپنے مفہوم میں وسعت پیدا کرتی جاتی ہے، ان کی عزیز ترین قدر ہے ۔ کوئی تحریک جو اس وسیع تر بشر دوستی کو محدود کرتی ہے، سرور صاحب اس سے کبھی متفق نہ ہو سکے ۔ ان کا بنیادی مسئلہ کبھی کوئی تحریک رہا ہی نہیں، وہ ہر جگہ انہیں ادبی واخلاقی اقدار کی حمایت کرتے نظر آتے ہیں، جو انسانیت اور بشر دوستی کے اعلیٰ ترین تصورات کی تعمیر وتفہیم میں معاون ہوں ۔ اس لیے سرور صاحب ان دونوں بڑی تحریکوں کے دانشورانہ مطالعہ میں کبھی عصریت پر اس قدر زور نہیں دیتے کہ فن کی روایت یکسر نظر انداز ہو جائے ۔ اس لیے وہ اپنی ادبی زندگی کے ہر دور میں نئے ادب کا غیر مشروط مطالعہ کرنے کے ساتھ ہی اپنے معاصرین کو روایت کی اہمیت کا احساس دلاتے رہتے ہیں ۔ وہ نئے کو پرانے کے ساتھ ملا کر دیکھنا چاہتے ہیں ۔ ترقی پسندی کے دورِ عروج میں جب عصمت چغتائی کو صرف دس سال پہلے کا ادب بھی ان کے مفہوم میں ادب نہیں معلوم ہو رہا تھا ۔ انہوں نے ماضی کے ادب کے ہمدردانہ مطالعہ کا مشورہ دیا ۔ اور جب جدیدیت نے کسی حد تک قدامت یا روایت کی ضد کے Associations اختیار کرنا شروع کیے اس وقت بھی سرور صاحب نے نئے اور پرانے کے تعلق پر نہایت دانشورانہ انداز میں روشنی ڈالی ۔ ادب میں روایت کی ایسی غیر معمولی تعریف کہیں نظر نہیں آتی جیسی سرور صاحب نے کی ہے:

'' روایت دراصل کسی ادارے یا خیال میں نہیں بلکہ اس کی قدر و قیمت کے عقیدے میں مضمر ہے ۔ ایک ادارہ یا تصور اس وقت روایتی ہو جاتا ہے جب یہ دھیان آتا ہے کہ یہ پہلے بھی موجود تھا

www.taemeernews.com

> اور کچھ لوگ اسے آج بھی باقی رکھنا چاہتے ہیں ۔ ایک مروجہ رسم کی طرح روایت محض ایک محاکاتی حقیقت نہیں ہے نہ یہ ایک ایسی کہانی ہے جس کی اہمیت اس کے بیان کے بعد ختم ہو جاتی ہے ۔ یہ ایک ایسا تصور ہے، جس میں قدر کا ایک نظریہ ملتا ہے ، کردار اور عمل میں ایک خاص ڈھنگ ٹھیک سمجھا جاتا ہے ۔ ایک خاص ترتیب یا تنظیم کو پسند کیا جاتا ہے ۔ روایت کو باقی رکھنا اس قدر و قیمت کے نظریہ کو باقی رکھنا ہے...... روایت ترقی کی حدود متعین کرتی ہے، اس کی حیثیت دریا کے ان کناروں کی ہو جاتی ہے ، جن کے اندر موجوں کو بہنا ہے ۔......
> دراصل روایت اسی وقت صحیح روایت بنتی ہے جب وہ ایک واقعہ نہیں رہتی یا اس کی صحت قطعی طور پر جانچی نہیں جا سکتی ۔ جب اسے پورے طور پر عمل میں برتا نہیں جا سکتا ۔ مگر اس پر عقیدہ، اعتماد یا یقین ضرور ہوتا ہے ۔
> روایت کو جب زندہ کیا جاتا ہے تو اسے ایسے بیانات سے منضبط کیا جاتا ہے جو تاریخی اعتبار سے صحیح نہیں ہوتے مگر اس مشتبہ صحت سے روایت کی اہمیت اور نوعیت پر کوئی فرق نہیں پڑتا......[۱۶]
>
> ''روایت ایک وحدت نہیں ہے ۔ اس میں کثرتیں رفتہ رفتہ ایک وحدت کو جنم دیتی ہیں اور انہیں کے وجود سے بغاوت وجود میں آتی ہے جو کسی بھولی ہوئی روایت کی ترمیم اور توسیع بھی ہوتی ہے ۔ اس لیے تنقید میں بقول رینے ویلک صرف تاریخیت یا مستقبلیت (Historicism or Futurism) رہنما نہیں ہو سکتی ۔ تناظرات کی بھی ضرورت ہے اس طرح ہم ماضی کے سرمائے اور حال کی موج در موج سے انصاف کر سکتے ہیں ۔''[۱۷]

ادب کی روایت اور جدت یا نئے پن پر اتنی مرتب گفتگو اردو میں بہت کم لوگوں نے کی ہے ۔ روایت کے متعلق حسن عسکری کا دائرۂ فکر بہت وسیع اور بڑی حد تک فلسفیانہ ہے ۔ وہ ایک ایسی بنیادی، مذہبی روایت کا تصور مرتب کرتے ہیں، جس کی روشنی میں زندگی کے ہر شعبے کا مطالعہ ممکن ہے ۔ یہ روایت کا وہ تصور ہے جو ہماری فکری ارتقاء کے منہاج سے لے کر ادب اور ہماری معاشرتی زندگی کے مقصود تک ہر چیز پر حاوی ہے ۔ سرور صاحب کا بنیادی سروکار صرف ادبی روایت تک محدود ہے ۔ اور اس کی جتنی اچھی اور واضح توضیح مذکورہ اقتباسات میں ملتی ہے ان کے معاصرین میں کسی اور کے یہاں نہیں ہے ۔

روایت کے اس عرفان کے نتیجہ میں سرور صاحب کی عصریت بھی بہت متوازن مگر بہت متحرک اور روشن ہے ۔ اپنے عصر کی آگہی اور اپنی روایت کا یہ عرفان ان کے ذہن کو وہ جلا اور ان کے تنقیدی تصور کو وہ وسعت دیتے ہیں جو انہیں یک رخا اور سطحی ہونے سے محفوظ رکھتی ہے ۔ قدیم و جدید، روایت و جدت، ادب

www.taemeernews.com

اور معاشرہ، نظر اور نظریہ، مقامیت/انفرادیت اور آفاقیت کے درمیان بنیادی ارتباط کی اس بصیرت سے سرور صاحب کے مرتب کردہ تصورِ نقد میں وہ وسعت پیدا ہوئی، جسے نقاد ان کے یہاں قطعیت سے گریز یا قوتِ فیصلہ کی کمی سے تعبیر کرتے ہیں۔

نقادوں کے اس فیصلہ پر گفتگو سے قبل سرورؔ صاحب کی تنقید میں ایک اور اہم تصور 'آفاقی' یا 'آفاقی ذہن' کا ذکر ضروری ہے۔ سرور صاحب ادب سے وابستہ لوگوں کے لیے خواہ وہ تخلیق کار ہوں یا تنقید نگار ''آفاقی ذہن'' کو ضروری سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک بڑے ادب کی بنیادی خصوصیت اس کی آفاقیت ہے۔ اور یہ آفاقیت وسعت مطالعہ کے علاوہ فرد کی اس صلاحیت سے پیدا ہوتی ہے کہ وہ اپنے زمانے کے رائج فیشن یا فارمولے کا اسیر ہونے کے بجائے زمان یا مکان کی قید سے آزاد ہو۔ سرور صاحب لکھتے ہیں:

> ''حالیؔ کے بعد اردو میں کوئی ایسا نقاد نہیں ہے جو ٹی۔ایس۔ ایلیٹ کے الفاظ میں آفاقی ذہن (Universal-Intelligence) رکھتا ہو۔ آفاقی ذہن سے مراد بین الاقوامی نہیں ہے۔ کتنے ہی نقاد اپنے حقیقی منصب کو بھلا کر دنگل میں دادِ شجاعت دینے لگے۔ کتنے ہی فلسفہ بگھارنے کے شوق میں رسوا ہوئے، کتنے ہی آمریت پر اتر آئے، کتنے اسکول، ایک دور، ایک روایت کے ترجمان ہو کر رہ گئے۔ نظریے اچھے اچھے پیش کیے گئے مگر ایسے کم جو تین سو سال پہلے کی شاعری، آج کی شاعری اور تین سو سال بعد کی شاعری تینوں کے مطالعہ میں ہمیں مدد دے سکیں چاہے حرفِ آخر نہ ثابت ہوں، افسوس ہے کہ اردو میں کوئی ارسطو پیدا نہ ہوا......۔''[۱۸]

ارسطو اردو میں کیا دنیا کی کسی زبان میں پیدا نہ ہوا۔ اس کے بہت واضح اسباب ہیں اور اب تخصیص (Specialization) کے اس زمانے میں ارسطو کی توقع بھی نہیں رکھنی چاہیے۔ لیکن پہلے آفاقی ذہن کے متعلق سرورؔ صاحب کا ایک اور بیان ملاحظہ ہو:

> ''میرے نزدیک بڑے شاعر کی پہچان یہ ہے کہ وہ کس حد تک آفاقی ذہن (Universal Mind) یا رکھتا ہے۔ اقبالؔ مشرقیت اور قدامت کے باوجود آفاقی ذہن رکھتے ہیں۔ حالیؔ کو اس آفاقی ذہن کا حصہ اقبالؔ سے زیادہ ملا تھا مگر حالیؔ کے یہاں نہ وہ دانشوری ہے اور نہ وہ معلومات''[۱۹]

اس اقتباس میں آفاقیت کے تین بنیادی عناصر کا ذکر ہے۔ اوّل وہ ''ذہن'' جو فرد کو فطرت کی عطا ہے، دوسرے وہ معلومات یا مطالعہ جو ادیب اپنی محنت اور شوق سے حاصل کرتا ہے اور اس کے نتیجہ میں فکر کی وہ وسعت جسے اصطلاحاً ''دانشوری'' کہتے ہیں۔ جہاں یہ تینوں اجزا اپنی مناسب قوت کے ساتھ آمیز ہوں وہاں ایسے متن کا امکان ہے جو سرورؔ صاحب کے مفہوم میں آفاقی ہو۔ مگر سرور صاحب کو یہ ذہن اردو میں

www.taemeernews.com

صرف اقبال اور حالی کے یہاں نظر آتا ہے۔ دوسری زبانوں کے ادیبوں میں انہوں نے صرف گورکی کے متعلق یہ کہا ہے کہ ''اس کے متون میں آفاقیت موجود ہے۔[۱۱] (تعجب ہے کہ سرور صاحب نے غالب کو اس میں شامل نہیں کیا۔) ظاہر ہے آفاقیت ہر فنکار کے حصے میں آنے والی نعمت نہیں۔ دنیا کی تمام بڑی زبانوں میں کتنے تخلیق کار یا نقاد ایسے ہیں جن کے متون ان کے ذہن کی آفاقیت کی خبر دیتے ہیں؟ انہیں انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے۔ لیکن غور کرنے کی بات یہ ہے کہ ان میں سے کوئی ایک بھی اپنی بنیادی حیثیت میں نقاد نہیں ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ سرور صاحب نے جتنے لوگوں کی دانشوری، وسعت مطالعہ اور آفاقی ذہن کی تعریف کی ہے وہ سب کے سب تخلیق کار ہیں۔ اور یہ صرف ایک تخلیق کار کے لیے ہی ممکن ہے کہ اس کے متون ماقبل کی تمام دانشوری کا عطر جذب کر لیں۔ خود اپنے زمانے کی ذہانت کے نمائندہ ہوں اور ان کی تحریروں میں تین سو سال کے بعد تک آنے والے زمانے کی جھلک موجود ہو۔ یہ آفاقی ذہن کا وہ تصور ہے جو تنقید کے لیے ممکن ہی نہیں۔ تنقید کسی دوسرے شعبۂ علم کی طرح ایک مخصوص Discipline ہے۔ ایک متوازن اور معقول تنقید اپنا ایک تصور ادب رکھتی ہے اور اس تصور کی روشنی میں وہ فن پارے کا مطالعہ کرتی ہے۔ یہ مطالعہ یا تجزیہ بالآخر فن پارے کے متعلق بعض مشاہدات پر منتج ہوتا ہے۔

ایک شعبۂ علم کی حیثیت سے یہ تنقید کی مجبوری یا حد ہے کہ وہ بیک وقت سماجی، فلسفیانہ، لسانی، تہذیبی، نفسیاتی، رومانی، جمالیاتی سب کچھ نہیں ہو سکتی۔ سرور صاحب کو آفاقیت کا تصور پرکشش معلوم ہوتا ہے اور اکثر نابغہ فنکاروں کے یہاں اس آفاقیت کا نور روشن بھی ہوتا ہے، لیکن شاید کوئی نقاد اپنے تصور ادب کی حدود سے واقفیت کے بغیر اچھا تنقید نگار نہیں ہو سکتا۔ اس میں ذہانت بلکہ Genius کی رمق ہو سکتی ہے وہ اپنی غیر معمولی ذہانت سے متن کا ایسا مطالعہ پیش کر سکتا ہے جو اس کے تصورات کی توثیق کرنے کے علاوہ متن کی معنویت پر غور و فکر کے یکسر نئے بلکہ متضاد دروازے کھول دے۔ لیکن وہ اس مفہوم میں کبھی آفاقی نہیں ہو سکتا کہ وہ تصور ادب کے تمام دبستانوں کو ایک متن کے تجزیہ یا مطالعہ میں یکجا کر دے اور وہ نتائج برآمد کر لے جو معاصر ادب کے امتیازات کی نشان دہی کے ساتھ ہی اپنی مخصوص روایت کا جواز بھی ہوں اور مستقبل کے امکانات کے سمت نما بھی۔ اور اب ہمارے زمانے میں گفتگو اس سے بھی آگے بڑھ گئی ہے۔ ''فوق بیانیہ'' سے انکار کے بعد تو اس کا امکان ہی ختم ہو گیا ہے کہ ایک مخصوص زبان کے ادب کو اس زبان اور اس کے بولنے والوں کے تہذیبی تناظر کے علاوہ کسی اور زبان کے اصولوں کی روشنی میں پڑھا جا سکے۔ اس لیے اب وہ تنقید جسے سرور صاحب آفاقی کہتے ہیں یا وہ تنقیدی طریقہ جسے انہوں نے ''انتخابی طریقہ''[۱۲] کہا ہے (اور ہمارے زمانے میں جس کی بونسائی شکل امتزاجی تنقید کہلاتی ہے) ممکن ہی نہیں رہ گیا۔ سرور صاحب کے تصور نقد کے متعلق دیئے گئے اقتباسات میں ''پہچان اور پرکھ'' کا اقتباس (۱.۷) ان کے انتخابی طریقۂ کار کی مثالی

www.taemeernews.com

Synopsis ہے:

۱۔ پہلے فنکار کی شخصیت کا مطالعہ (جس حد تک وہ فن کے مطالعہ میں مدد دے)

۲۔ ماحول کا علم اور اس سماج کا احساس جس میں وہ ادیب سانس لیتا ہے۔

۳۔ فن کا غائر مطالعہ:

(الف) ہیئت

(ب) لفظ کی پہلوداری

(ج) متن کی ساخت (تنظیم اور تناسب)

۴۔ اس مطالعہ سے برآمد ہونے والی بصیرت (خلاصۂ کلام)

ظاہر ہے یہ ایک پوری کتاب یا کسی فنکار کے متعلق تحقیقی مقالہ کی تبویب ہے اور اس طریقۂ کار سے مقالہ لکھنا صرف اس صورت میں ممکن ہے، جب تنقید نگار ایک پوری کتاب لکھنے کا ارادہ رکھتا ہو۔ اگر وہ ایک مضمون لکھ رہا ہو تو ان سب عنوانات پر ایک ساتھ اظہار خیال اس کے لیے ممکن ہی نہیں۔ یہ ہوسکتا ہے کہ ایک مضمون اس کے ماحول کے متعلق دوسرا اس کے فن کے متعلق لکھا جائے۔ لیکن ان سب کو ایک مضمون میں آمیز کرنے کی سعی کے مشکور ہونے کا امکان بہت کم ہے۔

اس طرز تنقید کے ذریعہ ہم کسی متن پر عمومی تبصرہ کر سکتے ہیں یا اپنے تاثرات کا اظہار کر سکتے ہیں لیکن باقاعدہ تنقید کے لیے تو بہر حال ایک تصور ادب کی ضرورت ہے جو تنقید کا مقصود اور اس کا طریقۂ کار دونوں متعین کرے گا۔ ایک تنقید نگار مطالعۂ متن کے لیے، جو نظام مرتب کرتا ہے۔ جسے سرور صاحب تجربہ، معنویت اور تعین قدر کی تین منزلوں کے حوالے سے بیان کرتے ہیں۔ ان میں پہلی ہی منزل پر نقاد کو اپنے مقصود کے حوالے سے تجزیہ کا طریقۂ کار متعین کرنا ہوتا ہے۔ یعنی متن کے ہیئتی یا فنی تجزیہ سے برآمد ہونے والی فن کی معنویت، اس کے لسانی، یا سماجی یا نفسیاتی تجزیہ سے برآمد ہونے والی معنویت سے مختلف ہوگی۔ سرور صاحب خود بھی یہ کہتے ہیں کہ عظمت اور Excellence کی کوئی واحد شکل نہیں ہوتی۔ یہ مختلف شکلوں میں اپنا اظہار کرتی ہے۔ تخلیق کار وہی عظیم ہوگا جو Excellence یا عظمت کے مختلف تصورات کی کسوٹی پر پورا اترے۔ [۲۲] عظمت کی یہ مختلف شکلیں، مختلف تصورات ادب سے پیدا ہوتی ہیں اور اب تک ایسی کوئی تنقید نہیں لکھی گئی جو تمام تصور ہائے ادب کو یکجا کر کے عظمت کے تمام تصورات کو ایک نقطے پر مرتکز کر دے۔ بلاشبہ کثرت مطالعہ کے علاوہ ایک کھلا اور کشادہ ذہن اچھے تنقید نگار کی بنیادی صفت ہے اور وہ سرور صاحب کے مفہوم میں آفاقی ذہن کا مالک بھی ہوسکتا ہے، لیکن اسے بہر حال ایسا تنقیدی نظام تشکیل دینا ہوتا ہے، جس میں تجزیہ اور مطالعہ کے طریقۂ کار، اس مطالعہ سے برآمد ہونے والے نتائج سے براہِ راست مربوط ہو۔ سرور صاحب کا ذہن بلاشبہ آفاقی، ان کا مطالعہ بہت وسیع اور ان کا ذہن کشادہ ہے، لیکن تنقید لکھتے ہوئے اس سب کا استعمال اس Discipline کی حدود میں ہی ممکن ہے۔ سرور صاحب نے بعض جگہ ایسا نہیں کیا اور موضوع یا متن کے تمام ممکنہ پہلو روشن کرنے پر اکتفا کی۔ اس سے ان کی تنقید میں وہ ارتکاز پیدا نہ ہوسکا، جسے ان کے تنقید نگار غیر قطعیت یا فیصلے کی کمی کہتے ہیں۔

www.taemeernews.com

اس کے باوجود اس میں شک نہیں کہ سرورؔ صاحب نے اپنے ماضی کے ادب کی عظمت ہم پر روشن کی، معاصر ادب کے فکری وفنی امتیازات کو خاطر خواہ حد تک نمایاں کیا اور تعجب ہوتا ہے کہ اپنی تحریروں میں ایسے مشاہدات درج کیے ہیں جو اب ان کے بعد مابعد جدید ادب میں ہمارے مرکزی مسائل ہیں۔

مابعد جدیدیت کے متعلق سرورؔ صاحب کی رائے اچھی نہیں تھی۔[۲۳] لیکن خود اپنے زمانے میں بڑھتی ہوئی تکنیکی دریافتوں سے پیدا ہونے والے خطرات کا انہیں اندازہ ہوگیا تھا۔ وہ ہمیں بتاتے ہیں کہ اس نئی صورت حال میں ہمیں کیا کرنا ہے:

> ''جدید دور میں ادب کی اہمیت اور ادب کے راستے سے انسانیت کی نجات پر زور دینے کی ایک اور وجہ ہے اور وہ ہے سائنس اور ٹیکنالوجی کے دور میں زبان کے امکانات سے ناواقفیت اور لفظ کے امکانات اور لفظ کے جادو اور لفظ اور ذہن کے تعلق اور لفظ کی وضاحت اور ذہن کی بڑائی اور ادب میں لفظ کی رمزی اور علامتی اور تخیلی اور تخلیقی استعمال کی وجہ سے اس کی شخصیت پر اثر اور پورے آدمی تک اس کی رسائی کی اہمیت!''[۲۴]

یہ بالکل صحیح ہے کہ موجودہ Market Economy نے ہمیں صارف معاشرہ کا ایک معمولی پرزہ بنا کر رکھ دیا ہے۔ اس معاشرے میں زبان اور اس کے حوالے سے تہذیب کی اہمیت ثانوی ہو گئی ہے۔ معاشرہ تہذیبی وفکری اعتبار سے روبہ زوال ہے، مگر اس کی فکر کسی کو نہیں۔ ایسے میں ادیب کی ذمہ داری ہے کہ وہ عوام میں زبان کی اہمیت اور اس کی تہذیبی افادیت کا تصور عام کرے۔ انہیں بتائے کہ زبان ہمارے فکری ارتقا کی کلید اور ہماری تہذیبی شناخت کا واحد ذریعہ ہے۔ اور ہم زبان کے بغیر ریاست کے لیے ایک بے ضرر شئے میں تبدیل ہو جائیں گے۔ زبان اور اس کے حوالے سے بشر دوست تہذیب کے خلاف، دولت اور ریاست کا یہ منصوبہ ستر۷۰ کی دہائی میں اتنا نمایاں نہیں تھا، جتنا اب ہے۔

اس زمانے میں سرورؔ صاحب نے ادب کے حوالے سے ایک بالکل غیر متوقع بات کہی:

> ''تحریر کی زبان، جو ادب کی بنیاد ہے، بڑی حد تک مصنوعی ہوتی ہے، مصنوعی سے شرمانے کی ضرورت نہیں کیونکہ انسان کی تہذیبی کاوشوں کا سارا سلسلہ سرتاسر مصنوعی ہے۔ لفظ مصنوعی میں شعوری پہلو کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ اس شعور کے ارتقاء میں زندگی کے سارے پیچ وخم آجاتے ہیں......[۲۵]

ان تین جملوں میں سرورؔ صاحب نے تین غیر معمولی باتیں کہی ہیں جو اس بیان کے تقریباً دس سال بعد (یعنی اسّی کی دہائی میں) ادبی مباحث کا مرکزی موضوع بن گئیں۔ پہلی یہ کہ تحریر کی زبان ادب کی بنیاد ہے۔ ادب کی زبانی روایت پر اصرار کرنے والوں کو تو اب تک یقین نہیں آیا کہ یہ بھی کوئی بحث طلب مسئلہ ہے۔ حالانکہ صرف اس ایک بنیادی خیال کے سبب زبان کا تفاعل، ادب کی ماہیت اور

www.taemeernews.com

اس کے مقصود سے متعلق شعر و ادب کی تقریباً تین ہزار سالہ روایت پر اعتماد معرضِ خطر میں آ گیا ہے۔ دوسری بات پہلی سے کم اہم نہیں ہے کہ بشمول زبان، انسان کی ساری تہذیبی کاوشوں کا سلسلہ سرتاسر مصنوعی ہے۔ فطرت اور تہذیب کے تخلیقی تخالف کا یہ سلسلہ فرانس میں روسو کی تحریروں کے زیرِ اثر عام ہوا۔ اس تین سو سال کے عرصے میں طویل بحثوں کے بعد اب صورت حال میں اتنی تبدیلی دکھائی دے رہی ہے کہ خاصے اہم مفکرین یہ کہہ رہے ہیں کہ ذی حیات میں بعض بنیادی صفات کے علاوہ باقی تمام اوصاف اس کی اپنی تہذیب کے پیدا کردہ ہیں۔ اور تیسری بات جو اس دوسرے مشاہدہ کا ضمیمہ ہے یہ کہ یہ سارا تہذیبی ارتقاء افراد کی شعوری کوشش کا نتیجہ ہے۔ یہاں تک کہ سادگی بھی فطری ہونے کے بجائے بے حد شعوری کاوش سے صورت پکڑتی ہے۔ ہمارے زمانے میں ادب کے بنیادی مسائل میں یہ تین مسئلے بھی شامل ہیں اور ان پر بحث ان مراحل میں داخل ہو گئی ہے جہاں ادب اور تہذیب کے تمام روایتی تصورات یکسر مسترد ہو چکے ہیں۔

سرورؔ صاحب کے نزدیک ''بڑا نقاد وہ نہیں ہوتا، جس کی رائے ہمیشہ صحیح مانی جائے۔ بڑا نقاد وہ ہوتا ہے جس کی رائے سے دوسروں کو کسی موضوع پر بہتر اور جامع رائے قائم کرنے کی توفیق ہو۔ اس جامع رائے کا سراغ اس نقاد کی رائے سے ملا ہو......''[۲۶] کسی بھی نقاد کی تمام آراء سے اتفاق تو یوں بھی ممکن نہیں کہ زمانے، ذوق مطالعہ اور مخصوص تاریخی حالات کے سبب، بعد کی نسلیں ادب کے متعلق خود اپنا نقطۂ نظر مرتب کرنے کے لیے مجبور ہیں۔ البتہ ہم سرورؔ صاحب کے تصورِ ادب یا تصورِ نقد یا روایت اور جدیدیت کے باہم تعلق یا مقامیت اور آفاقیت کے درمیان ربط کی نوعیت جیسے بنیادی موضوعات پر ان کی رائے سے جس قدر اختلاف کرتے جاتے ہیں ان موضوعات کے تئیں غور و فکر کی نئی راہیں روشن تر ہوتی جاتی ہیں اور بعض مرتبہ تو ہمیں اپنے زمانے کے اہم تر ادبی مباحث کا سراغ بھی ان کی تحریروں میں نظر آتا ہے۔ اور یہی بحیثیت نقاد پروفیسر آل احمد سرورؔ کا امتیاز ہے۔

حواشی و حوالے

۱۔ سرور صاحب کے تنقیدی تصورات کے لیے مزید اقتباسات:

1.1 ''اچھی تنقید محض کلاسیکی یا رومانی کے پھیر میں نہیں پڑ سکتی وہ اس طرح خانوں میں نہیں بٹ سکتی، کتنے ہی نقاد ادب بھی شاعروں اور ادیبوں کا تجزیہ اس طرح کرتے ہیں کہ وہ ان باتوں میں اپنے پیش رووں سے علاحدہ ہیں یہ ٹھیک ہے مگر نا کافی ہے۔ یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ وہ کس حد تک اس سرمایہ کے امین، اس روایت کے آئینہ دار اور اس مزاج کے مظہر ہیں جو تہذیب و تمدن نے دیا ہے۔ وہ کس حد تک نئے اور کس حد تک پرانے ہیں اور یہی نہیں، ان کا نئے پن میں کس حد تک پرانا پن ہے۔ یعنی

www.taemeernews.com

ان کی قدر و قیمت کا اندازہ محض ان کی جدت و ندرت سے نہیں، ان کی ادبیت سے بھی کرنا چاہیے اور ادبیت سے یہاں مراد اس ادبی معیار سے ہے جو اس عرصہ میں بن سکا ہے۔''

تنقید کیا ہے؛ص ۲۰۵

۱.۲ ''میں تنقید کو ایک اہم سنجیدہ اور مشکل کام سمجھتا ہوں اور اس کا مقصد لطف سخن ہی نہیں بلکہ قدروں کی اشاعت مانتا ہوں۔

دیباچہ؛تنقید کیا ہے؛ص ۱۲

۱.۳ ''تنقید کا کام گلستان میں کانٹوں کی تلاش نہیں۔ اس کا مقصد روایت کا احساس، تجربات کی پرکھ اور قدروں کا تعین ہے۔

''ادب اور نظریہ''؛اردو غزل میر سے اقبال تک؛ص ۳۲

۱.۴ ''یہ (تنقید) تجربات کی پرکھ اور قدروں کے تعین کا نام ہے، تجربات کی پرکھ کے لیے ہمارے پاس معیار ہونے چاہیے اور یہ معیار صرف قواعد یا روایت کے نہیں ہو سکتے۔ تجربات کی وقعت اور واقفیت کا سوال زیر غور ہے پھر قدروں کے سلسلے میں ایسی جامع، کارآمد، زندہ اور معنی خیز قدروں کا سوال اٹھتا ہے جو دیر تک اور دور تک ہمارا ساتھ دے سکیں جو ایک دور یا شخصیت یا ایک رنگ کے مطالعہ ہی میں مفید نہ ہوں بلکہ جن میں ہمہ گیری ہو۔''

ادب اور نظریہ؛ص ۲۸۲

۱.۵ تنقید میرے نزدیک وکالت نہیں پرکھ ہے۔ کبھی کبھی جب کوئی روایت فرسودہ ہو جاتی ہے تو اس کے لیے وکالت کی ضرورت ہوتی ہے اور اس بغاوت کے پیچھے سخن فہمی کا ایک نیا شعور ہی ہوتا ہے۔ مگر سخن فہمی کا معیار قابل اطمینان ہو تو دودھ اور پانی کا فرق رہتا ہے؛

نظر اور نظریے؛اردو میں ادبی تنقید کی صورت حال؛ص ۸۸

۱.۶ ''میرے نزدیک فن کی بڑائی اوّل تو تجربے کی تہہ داری میں ہے۔ یعنی اس تجربے کی کئی تہیں ہوں اور ان میں سے کسی تہہ سے لوگ متاثر ہو سکتے ہیں یا ایک تہہ کے آج دریافت ہونے اور دوسری کے کل یا پرسوں یا برسوں بعد۔ دوسرے یہ بڑائی تجربے کی پیچیدگی میں ہے۔''

مسرت سے بصیرت تک؛غالب کی شاعری کی معنویت؛ص ۱۰۴

۱.۷ ''......تہذیبی تنقید میں ایک اخلاق اور سماجی وفاداری بھی آجاتی ہے۔ اس لیے میرے نزدیک وہ تنقید جو صرف مقررہ اصولوں یا ہیئت کے تجزیے سے سروکار رکھتی ہے ایک بڑے فریضے سے غافل ہو جاتی ہے۔ یہ فریضہ تہذیب کی تنقید کر کے زندگی کے معنی کے رشتوں کی طرف اشارہ کرنے کا ہے اور ان رشتوں کی طرف اشارہ کر کے ہی نقاد دانشوری کے حقیقی منصب تک پہنچ سکتا ہے۔''

مسرت سے بصیرت تک؛نئی اردو شاعری؛ص ۲۶۴

۱.۸ ''اچھی تنقید تجربے اور تجربے میں امتیاز کر کے ذوق سلیم کی ترویج کرتی ہے۔ تخلیق فن کے بہ

نسبت ہزار شیوہ کی ان گنت اداؤں کو نہیں پہچان پاتی ۔ عمدگی اور خوبی کے مختلف معیاروں کو سمجھ نہیں پاتی ۔ ایک کرن ، ایک موج ، ایک رنگ کو سب کچھ سمجھ لیتی ہے ۔ تنقید ان سب کا عرفان رکھتی ہے اور بلندی وسعت گہرائی ، برہنہ گوئی ، رمز وایما ، سہل ممتنع ، ابہام ، لفظ کی تہہ داری ، مانوس جلوؤں اور اجنبی کرنوں سب کو حسن ، صداقت اور خیر کے ان معیاروں سے دیکھتی ہے جو ادب کی مسرت اور بصیرت کے امین نہیں جو بالآخر ایک منظم اور مہذب انسانی شعور تک لے جاتے ہیں ۔''

پہچان اور پرکھ ؛ دیباچہ ؛ ص ۵

۹.۱ ۔ اور جس طرح مطلقیت (Absolution) غلط ہے اسی طرح صرف تاریخیت بھی ناقص ہے ؛ ضرورت تناظریت (Perspectivism) کی ہے ۔ مطلقیت آج کے معیاروں کی روشنی میں ان گنت کرنوں کو نظر انداز کر دیتی ہے جن سے آج کا فن منور ہے ۔ تاریخیت ہر دور کے معیار کو تسلیم کر لیتی ہے اور بالآخر ایک ادبی مزاج کو جنم دیتی ہے ۔ تناظریت بقول Rene-wellak ایک فن پارے کا مطالعہ اس دور کے قدروں کے حوالے سے اور اس کے علاوہ بعد کے تمام دوروں کے حوالے سے کرتی ہے ۔''؎۲

فکر روشن ؛ حالی کے مقدمے شعر و شاعری کی معنویت ؛ ص ۷۸

؎۲ ۱۹۳۶ء کے بعد سے اردو میں سماجی تنقید کا آغاز ہوا ۔ یہ سماجی تنقید ادب اور زندگی کے لیے مطالعہ کی ایک نئی راہ کھولتی ہے ، اس سے اردو ادب کو بڑا فائدہ پہنچا ۔ مگر اس نے اصلاح کے جوش میں بعض اوقات تاریخی حقائق ، روایت کی اہمیت اور فن کے تقاضوں کو نظر انداز بھی کر دیا ۔ اس کے خلاف حال میں ردِ عمل ہوا ۔ مگر یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اصول غلط نہیں تھا ، عمل میں کچھ خامی رہ گئی تھی ......''

نئے اور پرانے چراغ ؛ دیباچہ ؛ ص ۱۴

۲.۱ ۔ میں ادب میں پہلے ادبیت دیکھتا ہوں ، بعد میں کچھ اور گو یہ جانتا ہوں کہ ادب میں جان زندگی کے گہرے اور استوار تعلق سے آتی ہے ......''

نئے اور پرانے چراغ ؛ دیباچہ ص ۷

۲.۲ ۔ تنقید میں بڑی اہمیت اس تجربے کی ہے ، جو شاعر یا ادیب کا ہے ۔ یہ تجربہ کیسا ہے کیسے حاصل ہوا ۔ اس تجربے میں تخیل کی کارفرمائی کس حد تک ہے ۔ خود تخیل کی طلسمی دنیا میں حقائق کے کتنے اجزاء موجود ہیں ۔ انفرادی تجربے میں میراث ، ذاتی حالات اور عصری رجحانات کو کس قدر دخل ہے ......''

تنقید کیا ہے ؛ ترقی پسند تحریک پر ایک نظر ؛ ص ۱۷۵

۲.۳ ۔ تجربات کی راہیں کھلی رکھنا ، تازگی اور ذہنی صحت کے لیے ضروری ہے مگر ان تجربات کی کامیابی یا ناکامیابی ان کی سماجی افادیت پر مبنی سمجھنا چاہیے ۔

ادب اور نظریہ ؛ روایت اور تجربے اردو شاعری میں ؛ ص ۲۴۵

؎۳ ''افادیت کے لیے دراصل ایک ذہنی پیمانے کی ضرورت ہے اور روح انسان کو گہرے تجربات سے آشنا کرنا ، اسے تازگی اور زندگی دینا بھی افادیت رکھتا ہے ۔''

www.taemeernews.com

تنقید کیا ہے؛ ترقی پسند تحریک پر
ایک نظر؛ ص ۱۸۵

۴.۱۔ ''فن ان معنوں میں افادی نہیں ہے، جن معنوں میں ہنر افادی ہے۔ فن حسن کاری کر کے مسرت اور مسرت کے ساتھ بصیرت پیدا کرتا ہے۔''

ادب اور نظریہ؛ ص ۹ ۲۷

۴۔ مسرت سے بصیرت تک؛ پورے غالب؛
ص ۱۴۶۔ ۱۴۷

۵۔ ''جدید فلسفۂ زندگی سادہ اور قطعی نظریوں سے، پیچیدگی اور ژولیدگی (Muddle Headedness) کی طرف جا رہا ہے۔ سادہ اور یک طرفہ ذہن کے لوگ صاف اور واضح خیالات پسند کرتے ہیں، لیکن واقعات کی گہرائی اور پیچیدگی تک نہیں پہنچ پاتے ......''

نظر اور نظریے: جدت پرستی اور جدیدیت
کے مضمرات؛ ص ۱۵۳

۵.۱۔ ''شعریت سادگی میں بھی ہو سکتی ہے اور پیچیدگی میں بھی بلکہ چونکہ زندگی کا قانون یہ ہے کہ سادگی سے پیچیدگی کی طرف ارتقاء ہوتا ہے اس لیے شعریت کو بھی سادگی کے علاوہ زندگی کی پیچیدگی کو جذب کرنا ہوگا۔ اس لیے اصلیت یعنی حقیقت نگاری کو آئیڈیل ماننے کے بجائے اسے ایک اسلوب سمجھنا ہوگا......''

مسرت سے بصیرت تک؛ غالب کی
شاعری کی معنویت؛ ص ۱۰۲

۶۔ پہچان اور پرکھ؛ ادب میں قدروں کا مسئلہ؛ ص ۱۳

۷۔ پہچان اور پرکھ؛ تنقید میں انتخابی نظریہ کی
ضرورت؛ ص ۳۳

۸۔ نئے اور پرانے چراغ؛ نئی اور پرانی شاعری کا
ایک تجزیہ؛ ص ۴۳

۹۔ ادب اور نظریہ؛ روایت اور تجربے؛ ص ۲۲۵

۹.۱۔ ''یک طرفہ ذہن سادہ ذہن ہوتا ہے، آج یہ یا وہ کی نہیں یہ بھی اور وہ بھی کی ضرورت ہے۔''

نظر اور نظریے؛ دیباچہ؛ ص ۶

۹.۲۔ ''یک رخے ذہن اور لکیر کے فقیروں کے لیے اس پیچیدگی کو سمجھنا مشکل ہے جو نئی شاعری کی خصوصیت ہے۔''

مسرت سے بصیرت تک؛ نئی اردو
شاعری؛ ص ۲۷۲

۹.۳۔ ترقی پسند تنقید نے اس سے ایک سیاسی نظریے کی ترویج میں کام لیا، اس میں زندگی سے مراد ایک خاص زندگی اور حقیقت سے ایک خاص طبقاتی کش مکش کی مصوری تھی اور سماج سے مراد ایک خاص سماجی نظریہ۔ یہ نظریے یکسر غلط نہیں ہیں ہاں یہ یک طرفہ ہیں''

نظر اور نظریے؛ تنقید کے مسائل؛ ص ۱۲۳

۹.۴۔ ''ہماری پرانی تنقید میں خواص پسندی تھی تو نو آبادیاتی تنقید اس ہمدردی سے محروم تھی جو ترجمانی یا فن شناسی یا تحسین کے لیے ضروری ہے۔ دونوں یک طرفہ تھیں۔''

پہچان اور پرکھ؛ کچھ اس کتاب کے
بارے میں؛ ص ۵۵

۱۰۔ تنقید کیا ہے؛ موجودہ ادبی مسائل؛ ص ۱۳۶

۱۱۔ مسرت سے بصیرت تک؛ غالب کی عظمت؛ ص ۱۳۳

۱۲۔ ایضاً؛ نئی اردو شاعری؛ ص ۲۶۸

www.taemeernews.com

۱۳؎ تنقید کیا ہے؛ موجودہ ادبی مسائل؛ ص ۱۲۹۔۱۳۱
۱۴؎ تنقید کیا ہے؛ ترقی پسند تحریک پر ایک نظر؛ ص ۱۶۴
۱۵؎ ادب اور نظریہ؛ روایت اور تجربے اردو شاعری میں؛ ص ۲۲۶۔۲۲۸
۱۶؎ کچھ خطبے کچھ مقالے؛ اردو تنقید ایک جائزہ؛ ص ۱۴
۱۷؎ تنقید کیا ہے؛ ص ۱۹۳
۱۸؎ مسرت سے بصیرت تک؛ اقبال اور مغرب؛ ص ۲۰۶
۱۹؎ نظر اور نظریے؛ اردو ادب پر گورکی کا اثر؛ ص ۲۳۲
۲۰؎ نظر اور نظریے؛ اردو میں ادبی تنقید کی صورت حال؛ ص ۱۱۵
۲۱؎ یہاں یہ کہنا بھی ضروری ہے کہ بڑائی کی کئی قسم ہوتی ہے، جس طرح عمدگی کئی قسم کی ہوتی ہے۔ نظریوں میں اسیر نقادان عمدگیوں Excellences یا عظمتوں سے انکار کردیتے ہیں۔

پہچان اور پرکھ؛ تنقید میں انتخابی نظریے کی صورت؛ ص ۳۶
۲۲؎ ''ماڈرنزم یعنی جدید جلد Post Modernism پس جدیدیت کی طرف مائل ہوگئی۔ میں ماڈرنزم کا قائل ہوں مگر پس جدیدیت نے جو انسان دوستی کے خلاف محاذ بنا رکھا ہے اسے اسٹائنر Steiner کے الفاظ میں ''بربریت'' سمجھتا ہوں اور تنقید کو آج جدیدیت سے آگے جا کر نئی انسان دوستی کی طرف جاتا ہے۔''
کچھ خطبے کچھ مقالے؛ اردو تنقید ایک جائزہ؛ ص ۲۴
۲۳؎ نظر اور نظریے؛ ادب میں جدیدیت کا مفہوم؛ ص ۱۶۲
۲۴؎ نظر اور نظریے؛ نثر کا اسٹائل؛ ص ۵۲۔۵۳
۲۵؎ نظر اور نظریے؛ تنقید کے مسائل؛ ص ۱۳۶

☆☆☆

www.taemeernews.com

عابد رضا بیدار*

دانشور سرور

دانشوری کے ڈانڈے اقدار کی چاکری سے ہوتے ہوئے درویشی سے جا ملتے ہیں ۔ دانشور درویش نہیں ہوتا، ہو بھی نہیں سکتا! دونوں دو الگ الگ دنیاؤں کے باسی ہوتے ہیں۔ درویش اپنے میں ڈوب کر ابھرتا ہے، دانشور دنیا میں ڈوب کر ابھرتا ہے۔ درویش کی فکر میں یزدانیت ہوتی ہے، دانشور لازماً اپنی فکر میں صرف یزدانیت سے روشنی لے، یہ ضروری نہیں ہے۔ اس کے یہاں تو اہرمن و یزداں دونوں آنکھ مچولی کرتے ہوتے ہیں ۔ دانشورانہ عمل سے گزرنے کے لیے دور تک اہرمنیت کے ساتھ سوچنا ہوتا ہے لیکن بالآخر اس کے پھندے سے نکلنا، اس کا ساتھ چھوڑنا، تو ہوتا ہی ہے۔

(یہ متوازی پٹریاں زندگی میں بھی ملتی ہیں، ادب میں بھی)

مگر پھر ایک درویشانہ دانشوری بھی تو ہو سکتی ہے۔

درویشی کی خالص، بے میل، صفات میں تر بہ تر۔

تو کیا دنیا کو سمجھنے، برتنے اور اس کا ایک قابل احترام حصہ بن جانے کی شعوری کوشش دانش ور کو حلقۂ دانشوری سے خارج کر دے گی۔ دنیاداری اگر اچھی نیت کے ساتھ ہو، ذاتی مفاد سے زیادہ فلاح عامہ پیش نظر ہو، زندگی کو بہتر بنا کے چھوڑنا ہدف ہو، تو دنیاداری دانش ور کا کچھ نہ بگاڑ سکے گی:

ابوالفضل، امیر خسرو اور شیخ سعدی خاصے دنیادار تھے

مگر اتنے ہی بڑے دانش ور!

ایک دانشوری علم کے راستے آتی ہے، علم خود بہ خود سوچ کی راہ پہ ڈال دیتا ہے۔ اور اگر علم سچا اور کھرا ہوا تو، اور طالب علم یا صاحب علم کا ہاضمہ اچھا ہوا تو علم طالب کی شخصیت کا حصہ بن جاتا ہے: اس کا ساتھی اس کا دوست! مگر طالب کو سوئے ہضم کی شکایت ہو تو یہی علم سب سے پہلے طالب کو ڈستا ہے اس طور سے کہ طالب کو پتا بھی نہیں چلتا: زہر آہستہ آہستہ رگ و پے میں اترتا جاتا ہے اور پھر سنکھیا کی مقدار تھوڑی تھوڑی بڑھا کر زہریلے جسم ڈھالنے کا طبی عمل شروع ہو جاتا ہے۔ پھر یہ جسم/دانشور جس دوسرے جسم/فکر کو چھو لیں وہ ختم!

یہ سچے (Genuine) اور جھوٹے ڈھنگوں کی ریزہ کاری (Pseudo) کا سلسلہ ہر جگہ اور ہر عہد میں مل جاتا ہے۔

---

* سابق ڈائرکٹر، خدابخش لائبریری، پٹنہ۔ محلہ کٹرہ، رامپور، یو۔ پی

www.taemeernews.com

[۲]

چراغ سے چراغ جلتے ہیں (اندھیروں سے روشنی نہیں ملا کرتی)۔ البیر کامیو، برٹرنڈ رسل، برنرڈ شا، ٹی۔ ایس ایلیٹ اور ولفریڈ کینٹویل اسمتھ دور کے چراغ تھے، روشنی ان سے بھی لی، مگر قریب کے بھرپور روشنی دینے والے چراغ قدم قدم پر رہنما بنے، انسپریشن بنے، جن میں سب سے بڑا چراغ سرسید تھے' علی گڑھ' کے جنم داتا، اور پھر سرسید ثانی (ذاکر حسین) تھے۔ نئے علی گڑھ کے جنم داتا۔ اور علی گڑھ کی فضائیں اور ہوائیں تھیں جہاں ہر طرف فکر کی خوشبو تھی اور دانشوری کی رنگا رنگی [تھا رنگ لالہ و گل و نسریں جدا جدا]، مگر جس نے مجسم ہو کے رشید احمد صدیقی کا نام لے لیا تھا، علی گڑھ کا عاشق اور عارف! یہ سب سرور صاحب کی فکر کا حصہ بنتے گئے۔

پھر علی گڑھ سے باہر علی گڑھ کا یا ذاکر صاحب کا حلقہ تھا جو سرور صاحب ہی نہیں اس عہد کے ہر سوچنے والے کے لیے نقطۂ آغاز کا کام دیتا تھا: سید عابد حسین، محمد مجیب اور خواجہ غلام السیدین۔

قومی سطح پر جواہر لال نہرو اور مولانا آزاد سرور صاحب کے عہد کے ہر نوخیز کے لیے (اور بعد میں اگلی نسل کے لیے بھی) سرچشمۂ فیضان تھے۔

لیکن سرور صاحب کی فکر پر سب سے بڑا اثر اقبال کا تھا۔ اقبال کا ساتھ عمر کے کسی حصہ میں نہیں چھوٹا، اور واقعہ یہ ہے کہ اوپر قریب کے جن چراغوں کا ذکر ہوا، سرسید تو خود اقبال کا انسپریشن تھے لیکن ذاکر صاحب، رشید صاحب، سیدین صاحب سبھی 'اقبالی مجرم' تھے۔ یہی سرور صاحب کا حلقہ تھا۔

(یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ سرسید کی تفسیر، اقبال کی الٰہیات اسلامیہ کی تشکیل جدید اور ابوالکلام آزاد کی سورۂ فاتحہ کی تفسیر تینوں کو سرور صاحب درسیات کی بنیاد بنانا چاہتے تھے۔) اپنے اولین مرشد سرسید کی تحسین سے جس سفر کا آغاز ہوا تھا کشمیر میں شیخ عبداللہ کی مشترک دلچسپی سے اقبال انسٹی ٹیوٹ کے قیام پر اس کا کلائمیکس ہوا۔ اور سرور صاحب کا آخری دانشورانہ کام تھا ہمارے عہد کے عظیم دانشور محمد مجیب کے شاہکار ''انڈین مسلمز'' پر ان کا خطبہ!

[۳]

سرسید پر ان کی فکر کا آغاز ۱۹۴۲ء کے اس مضمون سے ہوتا ہے جو انہوں نے اپنے شاگرد ہادی نقشبندی کے پرچے 'بیداری' کے لیے لکھا تھا اور جو ربع صدی بعد ان کے دوسرے شاگرد اصغر عباس نے 'بازیافت' کر کے سرسید ہال ریویو میں شائع کیا۔ اپنی خودنوشت میں سرور صاحب نے اسے یاد رکھا اور ذکر کیا۔ پھر وہ علی گڑھ سے رام پور اور لکھنؤ کی طرف نکل گئے۔ اور ۱۹۵۵ء میں جب علی گڑھ واپس آئے اور ایک بار پھر 'حواس مجتمع ہوئے' تو پھر مرشد اولیں کی یاد آئی اور ۱۹۵۶ء میں زیدی صاحب کی وائس چانسلر شپ کے افتتاحیہ کے طور سے سرسیّد پر ان کی پہلی بھرپور تحریر آئی (نیا خواب، دسمبر ۱۹۶۲ء) باتیں اشاروں ہی میں آسکیں کہ وائس چانسلر کی زبانی طلبا کو خطاب عام میں ضروری نکات پر زیادہ تفصیل میں تو جایا نہیں جاسکتا تھا، لیکن پہلی بار اس میں دانش ور سرور صاحب دانشورانہ اسلوب نگارش کے ساتھ سامنے آئے۔ یہ اسلوب

www.taemeernews.com

تھا کوزے میں دریا بھرنے کا طور۔ کسی اور سلسلہ میں خودسرور صاحب نے اپنے لیے ایک اصطلاح اپنے عام معنوں سے ہٹ کے استعمال کی ہے وہ ہے ''جام جہاں نما''! ہر لفظ، اور پھر ہر سطر میں لفظوں کی نشست اور ترتیب، اور سو جملوں کو دس میں اس طور سے سمیٹنا کہ پڑھنے والا رواں دواں گزرتا جائے اور ایک جہانِ معنی سے جھولی بھرتا جائے! یہ پورا مضمون اس ایجاز اور اعجاز کی پہلی مثال ہے جو بعد میں سرور صاحب نے پوری قدرت، قوت، اور حاکمانہ انداز سے اپنی اکثر تحریروں میں برتا۔ مضمون کے آغاز کی سطریں خصوصاً اس نئے اسلوب کی بہترین نمائندگی کرتی ہیں؛ اسلوب اور فکر دونوں ایک دوسرے میں گتھے ہوئے ہیں اور فکری تحریر ہونے کے باوجود بیان کی شگفتگی کہیں ہاتھ سے نہیں جاتی، یہی نہیں بلکہ نثر میں شعریت یہاں مطالب کو دس گنا زیادہ واضح اور دلنشیں بناتی جاتی ہے کہ جب قلم دل کے ہاتھ میں آجاتا ہے تو مصنف غائب ہوجاتا ہے، صرف دل لکھتا ہوتا ہے۔ آغازِ مضمون کی وہ چند سطریں ملاحظہ ہوں، میرے بین السطور رینگتے اشاروں کے ساتھ کہ صرف دس گیارہ سطروں میں ۳۸ 'جام جہاں نما' کیسی خوبصورتی سے درآئے ہیں:

''سرسید اس ادارے کے بانی [1] ہی نہیں ہندوستان کی ان عظیم شخصیتوں [2] میں سے ہیں جنہوں نے ہماری تاریخ پر ایک [3] غیرفانی نقش چھوڑا ہے۔ سرسیّد نے زندگی کے ہر شعبے [4] پر اثر ڈالا۔ انہوں نے خواب [5] دیکھے اور [6] دکھائے، اور پھر ان خوابوں کو حقیقت [7] بنانے میں لگے رہے۔ انہوں نے مذہب [8]، سیاست [9]، تعلیم [10]، معاشرت [11] ادب [12]، صحافت [13] سب میں بڑے بڑے انقلابی کارنامے [14] انجام دیے۔ وہ بہت بڑے مصلح [15]، مجدد [16]، معلم [17] اور مجاہد [18] تھے۔ انہوں نے اپنی ذہنی [19] اور عملی قیادت [20] سے قوم کا رخ مایوسی [21] سے امید کی طرف، سستی اور بے عملی سے سعی اور جستجو [22] کی طرف، ماضی [23] کے نشے سے حال [24] کی ترشی کی طرف، ذاتی فلاح [25] سے قومی بہبود [26] کی طرف، رسم پرستی [27] اور اندھی تقلید [28] سے حریت فکر [29] اور عقلیت [30] کی طرف، اور قدیم اسالیب فکر [31] سے جدید عالمی [32] معیاروں کی طرف پھیر دیا۔ اپنی پرسوز [33] اور پرخلوص [34] شخصیت کی وجہ سے انہوں نے علم و ادب کے کتنے ہی آفتاب و ماہتاب [35] اپنے گرد جمع کر لیے، اور مخلص، ہوشمند اور باعمل نوجوانوں کی ایک پوری نسل [36] تیار کردی۔ یقین محکم [37] اور عمل پیہم [38] کی وہ زندہ تصویر تھے۔''

[۴]

عمومی سے خصوصی نکتہ کی طرف آتے آتے سرور صاحب کو کئی برس لگ گئے جب انہوں نے سرسید کا سہارا لے کر ہندوستانی مسلمانوں کے تناظر

www.taemeernews.com

میں تفصیل سے سوچنا شروع کیا۔ میرے سامنے ۱۹۶۹ء (جامعہ) کی ایک تحریر ہے ''سر سید کے اسلام کے تصور کی اہمیت کیا ہے'' مضمون شروع ہوتے ہی انہوں نے سوال اٹھا دیا ہے: ''میں اکثر اپنے سے یہ سوال کرتا رہتا ہوں کہ انسانی تہذیب و تمدن کے ارتقا کے ساتھ مذہب اور مذہبی انسان کی اہمیت کیوں کم ہوتی جا رہی ہے''۔ اسلام کے بارے میں اس اظہار کے بعد کہ اس کے تین پہلو ہیں عقاید، عبادت اور معاملات، سرور صاحب نے توجہ دلائی ہے کہ اسلام کی حیات بخش اور حیات آفریں طاقت کو ان مبصرین اور شارحین نے بہت نقصان پہنچایا ہے۔ جن کی نظر معاملات پر اتنی گہری نہ تھی۔ ''معاملات میں معاشرت، معیشت، سیاسی زندگی اور سماجی زندگی کے سبھی عنوان آ جاتے ہیں'' اور ''معاملات کا تعلق صرف ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان سے رشتے تک نہیں ہے بلکہ اس میں غیر مسلموں سے رشتہ بھی آ جاتا ہے۔''

اس تمہید کے بعد سرور صاحب سر سید کی اوریجنل تحریک کی ناکامی پر نظر ڈالتے ہیں۔ اس ذیل میں انہوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ ایک ایسے فرزند علی گڑھ کے قلم سے جو غیر مشروط طور سے نہ سہی علی گڑھ کے عاشقوں میں تو ہے، توجہ سے پڑھنے کے لائق ہے وہ کہتے ہیں:

''سر سید کی عظیم الشان ذہنی بیداری کی مہم کا بنیادی کام مسلمانوں کی ذہنی تربیت تھی جس کے لیے رواجی مذہب پر انہیں ضرب کاری لگانی پڑی۔ لیکن وہ ایم۔ اے۔ او کالج کے قصر بلند کی زینت بن کر رہ گئی ...... کالج ...... مسلمانوں کی ذہنی قیادت اس لیے نہ کر سکا کہ سر سید نے اس کی خاطر پہلے تو 'تہذیب الاخلاق' میں اختلافی مسائل پر مضامین بند کرنے کا وعدہ کیا، اور پھر کالج کی مذہبی تعلیم اس طبقے کے حوالے کر دی جس کی مخالفت وہ زور و شور سے اپنی تحریروں میں کر چکے تھے ...... سر سید کا بنیادی کام پورا نہ ہو سکا۔ یہ بنیادی کام ہندوستانی مسلمانوں کو ازمنۂ وسطیٰ کے ذہن سے نکال کر روشن خیالی کے دور میں لانے کا تھا۔ سر سید نے کالج کا جو ابتدائی خاکہ بنایا تھا اس میں یہ بھی گنجائش تھی کہ حالات حاضرہ سے باخبر علما پیدا کیے جا سکیں۔ مگر اس خاکے کے صرف پہلے حصے پر عمل ہو سکا، دوسرے اور تیسرے حصے پر عمل کی نوبت ہی نہیں آئی وہ خاکہ یہ تھا:

''پہلا مدرسہ انگریزی ہو ......، دوسرا اردو مدرسہ: اس میں تمام علوم و فنون بہ زبان اردو پڑھائے جائیں گے ...... تیسرا عربی فارسی مدرسہ۔ اس میں انگریزی اور اردو مدرسوں کے فارغ التحصیل طلبہ کو جنہوں نے علوم و فنون پڑھ لینے کے بعد عربی یا فارسی لٹریچر و علوم میں کمال حاصل کرنے کا ارادہ کیا ہو گا تو ان کی پڑھائی فارسی

www.taemeernews.com

عربی میں اعلیٰ درجے کی اس مدرسہ میں ہوگی۔"

اس پر سرور صاحب بڑے دکھ سے لکھتے ہیں کہ "ہمیں معلوم ہے کہ نہ اردو مدرسہ قائم ہوا نہ فارسی عربی کا!" سرور صاحب کے خیال میں یہ دونوں کام کرنے کے تھے/ ہیں!

سرسید پر سرور صاحب کی ایک اور معرکہ آرا تحریر ۱۹۷۲ء میں نکلی (رسالہ جامعہ)، عنوان تھا: "سرسیّد کا تہذیبی تصوّر۔ اور موجودہ دور میں اس کی معنویت"۔ یہ تحریر ۱۹۶۹ء فکر کا تتمہ تھی: وہ مذہب پر، یہ تہذیب پر۔ لیکن پچھلی کی مانند یہ تحریر کچھ زیادہ ہی تجزیہ طلب ہے، اور اس لیے وقت طلب؛ اس لیے فی الحال اسے چھوڑتا ہوں۔ سرسیّد پر سرور صاحب کی آخری تحریر کی طرف بھی توجہ مبذول کراناتھی (اکتوبر ۱۹۸۶ء)۔ لیکن زیادہ وقت ایک ہی کے حصے میں کیوں آئے اس لیے یہ بھی پھر کبھی!

سرسید پر اتنی تفصیل یوں ہوئی کہ اس عنوان سے سرور صاحب کے فکر کے ممتاز پہلو سامنے آجائیں۔ سرسید پر لکھتے وقت لگتا تھا جیسے ان پر ایک نشہ کا عالم ہو، ایک کیفیت طاری ہو، مگر پوری ہوشمندی کے ساتھ، اور اسی عالم سرشاری میں وہ سرسید سے زیادہ سرور دانشور کو ایکسپوز کرتے جاتے تھے!

[۵]

یہ فکر جو علی گڑھ تحریک اور ہندوستانی مسلمانوں کے دائرے تک محدود تھی جب ہندوستان گیر ہوئی تو "ہندوستان کدھر" کے عنوان سے سیّدین خطبہ کی شکل میں آئی (۱۹۸۲۔۱۹۸۳ء)۔ اردو دانشور کے قلم سے یہ ایک غیر معمولی تحریر تھی اور سرسید صاحب کی قومی فکر کا نچوڑ۔ گاندھی جی، جواہر لال نہرو، لبرلزم، سیکولرزم، جے پرکاش نرائن، رادھا کرشنن، الیکشن، جمہوریت اور جات پات، فرقہ پرستی، مغربیت، جدیدکاری، تعلیم کا مسئلہ، تربیت کا مسئلہ، غرض پورا ہندوستان اور اس کے مسائل ۴۸ صفحوں میں خوبصورتی سے سمٹ آئے ہیں۔ اس کا اختتامیہ اس طور سے شروع ہوتا ہے:

"ہمیں آزادی تو حاصل ہوگئی مگر وہ عشق جنوں پیشہ کھو گیا جو ویرانوں میں پھول کھلاتا ہے، قانون باغبانی صحرا لکھتا ہے اور سورج کی شعاعوں کو گرفتار کرنے کے ساتھ زندگی کی شب تاریک کو سحر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔"

آزادی ہی کے سلسلے میں ایک بہت دلچسپ ریمارک اس خطبہ میں یہ بھی ہے کہ:

"۱۵ راگست ۱۹۴۷ء کی رات کو جب میں لکھنؤ کی سڑکوں پر آزادی کا جشن دیکھ رہا تھا میرے کانوں میں دو علیحدہ نعرے گونج رہے تھے۔ ایک جواہر لال نہرو کا کہ ہم دو سو سال کی غلامی کے بعد آزاد ہوئے ہیں، دوسرا پنڈت گووند بلبھ پنت کا کہ ہم ایک ہزار سال کی غلامی کے بعد آزاد ہوئے ہیں۔ حکومت جواہر لال کی تھی مگر بات پنت کی مقبول تھی۔"

آزادی ہی کے تعلق سے ایک بات اور: (ہمارے اکثر سوچنے والوں کے مانند) سرور صاحب

www.taemeernews.com

نے بھی ذاکر صاحب، مولانا آزاد اور ہمایوں کبیر کے سامنے گاندھی جی کا ماڈل رکھا کہ آزادی کے بعد گاندھی جی تو حکومت سے علیحدہ رہے، آپ لوگ کیوں ایسا نہ کر سکے۔ ان کا کہنا ہے کہ باہر سے دانشور حکومت کی تائید بھی کر سکتا ہے اور اس پر تنقید بھی، دانشوری کا ایک پہلو تنقید بھی ہے۔ حکومت کا ایک فرد بننے کے بعد تنقید کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ''ان کا اصلی کام ذہنوں کی تعمیر، شخصیتوں کی تشکیل، افکار کی تخم ریزی تھا، جو اعلیٰ عہدوں کی فضا میں ممکن نہیں ہے۔''

شاید سرور صاحب ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ ''دانشور باہر سے حکومت کی مدد کر سکتا ہے لیکن اسے حکومت کی مشین کا پرزہ نہیں ہونا چاہیے''۔ لیکن پھر شاید حکومت مجرموں اور غنڈوں کے ہاتھوں میں ہوگی اور ان کی آوازوں میں اتنا شور ہوگا کہ دانشور کی آواز اس بوجھ تلے دب کے دم توڑ دے گی، اور پھر بھی وہ آواز اٹھے گی تو جیل کی چار دیواری میں بند کر دی جائے گی۔ اگر دیس کی ابتر حالت اور زیادہ ابتر ہوتی جائے، اور دانشور کچھ نہ کر سکے، چونکہ اقتدار سے باہر ہے، تو ایسے میں تاریخ کا فیصلہ تو دانشور کے خلاف ہی جائے گا۔ بے شک وہ دیس کو سنکٹ سے نکالنے کے لیے اپنی جان ضرور دے سکتا ہے لیکن بے حاصل! جس صورت حال سے ہمیں واسطہ ہے اس میں جانوں کی ارزانی بڑھ گئی ہے اور اچھی یا سچی بات کہنے پر جان لینے والوں کی پشت پناہی اسی نسبت سے بڑھتی جا رہی ہے۔

[۲]

سرور صاحب کی آخری قابلِ توجہ دانشورانہ

تحریر مجیب خطبہ ہے (۱۹۸۹ء) جو خود مجیب صاحب کی کتاب 'انڈین مسلمز' پر ایک بھرپور تبصرہ ہے۔ شروع کے تین چار صفحے مجیب صاحب کے بارے میں ہیں پھر قریب ۲۵ صفحے زیرِ نظر کتاب کا خوبصورت خلاصہ۔ بقیہ بیس صفحے میں مجیب صاحب کی فکر کا جائزہ مذکورہ کتاب کی روشنی میں متوقع تھا لیکن چونکہ ۹۹ فیصدی سرور صاحب کو اس سے اتفاق تھا اس لیے اس حصے کا موضوع اس طور پر تشکیل پایا کہ ''آج مسلمانانِ ہند کا مسئلہ کیا ہے'' (دوسرے الفاظ میں ''ہندوستانی مسلمان کدھر''!) یعنی پہلے حصے میں مجیب صاحب کے خیالات ہندوستانی مسلمانوں کے بارے میں آچکے؛ اب دوسرے حصے میں سرور صاحب کے اپنے خیالات! ہندوستانی مسلمان: آج کا مسئلہ!

مسئلہ زیرِ بحث کا مرکزی نکتہ ہندوستانی مسلمانوں کے لیے، ہمیشہ سے، مگر اب کچھ زیادہ ہی، ''ہندوستانی'' اور ''مسلمان'' میں توازن کا نکتہ رہا ہے۔ ہندوستانیت اور اسلامیت دونوں کے ساتھ ہندوستانی مسلمان کی شناخت کا نکتہ ذاکر صاحب اور ان کے حلقے پر پوری طرح واضح تھا مگر اس تصور کو زبان دے دی مولانا آزاد نے۔ ۱۹۴۰ء کا رام گڑھ کانگریس کا مولانا کا خطبہ صدارت اس عنوان پر حرفِ آخر کی حیثیت رکھتا ہے جس میں یہ بھی ہے کہ: ''تاریخ کی پوری گیارہ صدیاں اس واقعے پر گزر چکی ہیں۔ اب اسلام بھی اس سرزمین پر ویسا ہی دعویٰ رکھتا ہے جیسا دعویٰ ہندو مذہب کا ہے''۔ اور

www.taemeernews.com

یہ بھی کہ: ''ہماری اس ہزاروں برس کی مشترک زندگی نے ایک متحدہ قومیت کا سانچہ ڈھال دیا ہے......اور قدرت کی مہر اس پر لگ چکی، ہم پسند کریں یا نہ کریں''۔ سرور صاحب نے مولانا کا یہ خطبہ تفصیل سے مجیب خطبہ میں نقل کیا ہے۔

مندرجہ بالا نکتہ کے علاوہ ایک نکتہ سرور صاحب نے مولانا سے اور بھی سیکھا۔ اور یہ بھی مجیب خطبہ میں آیا ہے:

''مولانا نے انڈیا ونس فریڈم میں کہا تھا، تاریخ نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ پہلی چند دہائیوں کے بعد، زیادہ سے زیادہ پہلی صدی کے بعد، اسلام صرف اسلام کی بنیاد پر تمام مسلم ممالک کو متحدہ کرنے میں کامیاب نہیں ہوا، ......اس سے اسلام پر نہیں ہاں مسلمانوں پر حرف ضرور آتا ہے۔''

مجیب خطبہ سے چند معنی خیز اور فکر انگیز اقتباسات مزید:

''حقیقی اسلام اور تاریخی اسلام میں فرق نہ کرنے کی وجہ سے الجھنیں پیدا ہوتی ہیں۔ اسلام کی چودہ سو سالہ تاریخ میں بادشاہوں اور شہنشاہوں کے کارنامے بھی ہیں اور وہ سب کے سب قابل فخر نہیں کہے جا سکتے۔''

''جدیدیت کی جو رو ہندوستان میں ۱۸ویں صدی کے آخر میں اور ۱۹ویں صدی کے آغاز میں آئی وہ مسلمانوں تک دیر میں پہنچی۔ مولانا محمد علی نے ۱۹۲۳ء میں کوکناڈا کانگریس کے صدارتی خطبہ میں ہندوؤں میں بیداری اور مسلمانوں میں بیداری میں تیس سال کا وقفہ بتایا۔ میرے نزدیک یہ وقفہ پچاس سال کا ہے یعنی رام موہن رائے اور سرسید کا!''

''[ہندوستان میں] مسلمان آبادی کل آبادی میں وہی تناسب رکھتی ہے جو دنیا کی آبادی میں مسلمانان عالم کا ہے......مولانا آزاد کی طرح میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ وہ اقلیت میں نہیں ہیں مگر یہ ضرور کہوں گا کہ اس بڑی اقلیت کی وجہ سے قدرتی طور پر پورے ملک کی ترقی، خوشحالی اور کارکردگی پر اس کے اثرات سے انکار نہیں کیا جا سکتا، اور اسے پامال یا نظر انداز کر کے یا اس کے ساتھ امتیازی سلوک روا رکھ کر ہم پورے ملک کے مفاد کو نظر انداز کریں گے۔''

''ہم نے اسلام جیسے جامع اور ہر شعبۂ حیات کے لیے مشعل راہ مذہب کو صرف عقائد اور عبادات میں محصور کر دیا ہے۔ معاملات کی ہمیں کوئی پرواہ نہیں۔ حالانکہ معاملات کے ذریعہ سے ہی ہم سماجی زندگی میں صالح قدروں کو عام کر سکتے ہیں۔''

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ موضوع سخن سرسید ہو، یا مجیب ہو، نہرو ہو یا ان کا ''ہندوستان کدھر''،

www.taemeernews.com

یا خود سرور صاحب کا اپنا ''ہندوستان کدھر''، ہندوستانی مسلمان ہو یا عالم اسلام، دانشور اپنے خصوصی تھیم کے ساتھ در آتا ہے۔ وہ ہر موقع کو موڑ دے کر اپنی بات اپنا تھیس، اپنا مرکزی خیال پیش کیے بنا نہیں رہ سکتا! رہ ہی نہیں سکتا کہ:

کچھ تو ہو جس کے فیض سے دل کو ہو تاب و تب ہم
کوئی خیال، کوئی خواب، کوئی خدا، کوئی صنم!

کچھ تو ہو! اور جب یہ 'کچھ' میسّر ہو جاتا ہے تو پھر یہ 'اتنا کچھ' ہو جاتا ہے کہ 'پھر' اور 'کچھ' کی سمائی کے لیے جگہ ہی نہیں بچتی۔ بس ایک خیال ہوتا ہے، بس ایک خواب ہوتا ہے! خلیل جبران نے کہا تھا بڑا شاعر صرف ایک شعر کہتا ہے جس کا وزن بھی مکمل ہوتا ہے اور قافیہ بھی بے جھول! موضوعِ سخن کچھ بھی ہو، سچا دانشور شعر تو ایک ہی کہتا ہے جس کا وزن بھی مکمل ہوتا ہے اور قافیہ بھی بے جھول!

[۷]

انقلابوں کی گھڑی میں ہر 'نہیں' 'ہاں' سے بڑی ہے

جاں نثار اختر کا یہ شعر سرور صاحب نے ۱۹۷۴ء میں بمبئی میں اپنے اعزاز میں برپا ایک محفل میں اپنی گفتگو کے دوران پڑھا/سنایا تھا۔ ابھی دوسرے مصرعہ کی بات نہیں کرتا صرف انقلاب کی طرف توجہ مبذول کراتا ہوں۔ ۱۹۴۵ء تا ۱۹۵۵ء کے لکھنؤ، سرور صاحب کے لکھنؤ کو یاد کیجیے جب ان کے گھر پر انجمن ترقی پسند مصنفین کے جلسے ہر اتوار کو منعقد ہوتے تھے جن کا ذکر ان کی خودنوشت میں بڑی محبت سے ہوا ہے۔ اور اس ذیل میں یہ بھی لکھا ہے کہ خوب بحثیں ہوتیں اور لگتا تھا کہ انقلاب بس آنے ہی والا ہے۔ سرور صاحب سے مل کے، باتیں کر کے، پڑھ کے کوئی بھی کہہ سکتا تھا کہ یہ شخص سب کچھ ہو سکتا ہے مگر انقلابی نہیں ہو سکتا۔ پھر ۴۵ء سے ۵۵ء تک انقلابیوں کو گھر میں جمع کرتے رہنا، ۱۹۷۴ء تک (بمبئی کی مذکورہ نشست میں یہ شعر پڑھنا!) اور انقلاب سے ذہنی وابستگی کی کیا تاویل ہو سکتی ہے؟ بات یوں ہے کہ ہر دانشور انقلابی بھی ہوتا ہے۔ لیکن سرور صاحب کے یہاں انقلاب کا کوئی رنگ نہیں تھا، نہ سرخ، نہ ہرا، نہ پیلا نہ نیلا، بس ایک سپید رنگ تھا! نیرنگ بے رنگ! وہ ہر اچھے دانشور کی طرح اپنے اردگرد سے نامطمئن رہے اور ''آیا بہ تو میسازد'' کے جواب میں ان کی دانشوری برابر 'برہم زن' کی صدا بلند کرتی رہی۔ اور آخر تک، یہ ناآسودگی ان سے کبھی سرسید کے بہانے انقلابی باتیں کہلواتی، کبھی ''ہندوستان کدھر'' کا سوال اٹھا کے وہ اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر لیتے۔ (۲۸ صفحے کے اس مختصر خطبہ میں ان کی وہ صفت ایجاز پوری طرح نکھر آئی ہے جو ۱۹۵۶ء میں 'سرسید' پر پہلا اہم مضمون لکھنے سے شروع ہوئی: کوزے میں دریا!)۔

یوں اس شعر کے دوسرے مصرعہ میں یہ بات بھی چھپی ہوئی ہے کہ جب ہر طرف 'ہاں' کہنا فیشن ہو، اور لازمی ہو، اور ذاتی مفاد میں ہو اور روش عام ہو اس وقت 'نہیں' کہنا خود انقلابوں کا ایک سلسلہ چھیڑ دیتا ہے، اور یہاں دانشور اور انقلابی ایک ہو جاتے ہیں۔

[۸]

سرور صاحب عملاً تو انقلابی نہیں ہو سکتے تھے مگر خواب

www.taemeernews.com

دیکھنے کا حق تو ان سے کوئی نہیں چھین سکتا تھا۔ دانشوری کا ایک امتیازی نشان یہ خواب دیکھنا بھی ہے۔ سرسید کے سلسلے میں انہوں نے ۱۹۵۶ء میں لکھا تھا کہ ''انہوں نے خواب دیکھے اور دکھائے، اور پھر ان خوابوں کو حقیقت بنانے میں لگے رہے''۔ ۱۹۸۷ء میں اپنی ۷۵ سالہ سالگرہ پر ایک نظم کہی تو اس میں یہ بھی کہا کہ:

پچھتر سال گزرے آج دنیا میں مجھے آئے
ہزاروں خواب ہیں پامال، لیکن خواب باقی ہیں

۱۹۹۱ء میں جب اپنی خودنوشت سوانح عمری کی تکمیل کی تو اس کا نام رکھا ''خواب باقی ہیں''۔ اس میں جواہرلال کا جب ذکر کرنے لگے تو ۱۹۳۳ء کے دسمبر کی اس شام کو بھی یاد کیا جب جواہرلال نے علی گڑھ میں اپنی تقریر کے دوران کہا تھا ''میرے متعلق کہا گیا کہ میں خوابوں کی دنیا میں رہتا ہوں۔ ہاں میں خواب دیکھتا ہوں اور یہ خواب ہندوستان کی آزادی اور خوشحالی کے خواب ہیں''۔ ہر دانشور خواب دیکھتا ہے اور دکھاتا ہے۔ خواب ٹوٹتے بھی ہیں مگر دانشور (سرور) خوابوں کی شکست سے ''ملول تو ہوتا ہے مایوس کبھی نہیں ہوتا۔''

[۹]

سچا دانشور بڑی رسانیت سے اپنا جائزہ لیتا چلتا ہے۔ ہر لحہ اس کے اندر ایک محشر بپا ہوتا ہے، ہر گھڑی قیامت کی گھڑی ہوتی ہے، حساب کی گھڑی۔ یہ خود احتسابی دانشوری کا ناگزیر حصہ ہوتی ہے۔ وہ دوسرے کو احتساب کا حق تو دیتا ہی ہے بہتر اس کو سمجھتا ہے کہ اپنا حساب خود بے باق کرتا جائے۔ یہ حساب وہ بالواسطہ کرتا ہے: اکثر در حدیثِ دیگراں! سرور صاحب نے اپنی خودنوشت میں کامیو کا ایک قول نقل کیا ہے اور اس طور پر نقل کیا ہے جیسے انہیں اس سے پورا اتفاق ہو (تو اب یہ سرور صاحب کا قول ہوا):

''فن میں سمجھوتا نہیں ہوتا، ہاں زندگی میں ہوتا ہے، اور یہ برا نہیں''

(باقر مہدی کے نام ایک خط میں انہوں نے اس قول کو دوہرایا ہے)

۱۔ فن میں سمجھوتا نہیں ہوتا: یہ صرف سچا دانشور لکھ سکتا ہے۔

۲۔ ''ہاں، زندگی میں ہوتا ہے'': یہ ایک سچائی کا اعتراف ہے، دانشورانہ اعتراف! ہم میں سے ہر شخص زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر کہیں نہ کہیں، کبھی نہ کبھی، کوئی نہ کوئی سمجھوتا ضرور کرتا ہے۔

۳۔ ''اور یہ برا نہیں'': سیدھی سادھی بات تو یہی ہے کہ ہم سب، سو فیصد، زندگی کے کسی نہ کسی مرحلے میں سمجھوتے کرتے ہیں۔ اور جب سب کے سب ''در شہر شما نیز کنند'' میں شامل ہیں تو یہ تو ایسا ہی ہوا جیسے سانس لینا، پانی پینا، جینا! اگر سانس لینے میں کوئی برائی نہیں، اگر جینے پر کوئی حرف گیری نہیں کرتا، تو جینے کے لیے سانس لینے پر حرف گیری کیا معنی! اور جینے کے لیے اگر صد فیصد یہ طریق زندگی ہو اکہ سمجھوتے ناگزیر ہوتے ہیں، تو برا کیسے کہیں اسے!

مگر بات سیدھی سادھی نہیں ہے۔ اوروں کے لیے شاید ہو سکتی ہے مگر نہ البیر کامیو کے لیے

www.taemeernews.com

سیدھی بات ہے نہ سرور صاحب کے لیے! دونوں دانشوروں کے قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ قبیلہ جب یہ جملہ لکھتا ہے تو اپنا حساب بے باق کرتا ہوتا ہے۔ (در حدیث دیگراں) یہ دانشور صوفیوں کے ملامتیہ قبیلہ کے ہوا کرتے ہیں اور اپنے کو ملامت کرنے کا ان کا یہی طور ہوتا ہے! اپنے ہی کو نہیں پورے قبیلۂ دانشوراں کو!! اور جب وہ ایسا جملہ لکھتے ہوتے ہیں تو ان کی روح، زخمی روح (کہ ہر دانشور کی روح زخمی ہوتی ہے!) دانشوری کے سامنے دوزانو ہو کے پورے حوصلے اور اعتماد کے ساتھ/ہوتی ہے:

فن میں سمجھوتا نہیں ہوتا!

زندگی میں بھی نہیں ہوتا!!

اور (جب بھی، جہاں کہیں، ہوتا ہے تو) یہ برا ہے!!!

☆☆☆

تنقید و تخصیص

www.taemeernews.com

محمد حسن*

خودنوشت سرورؔ

آل احمد سرورؔ نے اردو کی تعلیم ہی کو نہیں معلموں کو بھی نیا طرز زندگی دیا۔ سرور صاحب سے پہلے اردو کے استاد کی شبیہ شیروانی اور ٹوپی کے بغیر مکمل نہ ہوتی تھی اور اس کے لیے اردو کے علاوہ فارسی اور عربی کے ادب کے علاوہ اور کچھ جاننا ضروری نہ سمجھا جاتا تھا۔ بہت ہوا تو یورپ کے مخطوطات سے واقفیت اور مخطوطہ شناسی کا علم امتیازی صفات تھے مگر آل احمد سرورؔ نے اس سارے خاکے میں نیا رنگ بھرا اب اردو کے پروفیسر کیا استاد کے لیے بھی صرف مغربی لباس ہی نہیں مشرقی کے ساتھ ساتھ مغربی علوم پر دسترس نہ سہی کم سے کم واقفیت لازم ٹھہری اور اردو پڑھانے والا دوسرے علوم کے ماہرین کی صف میں بیٹھنے کے لائق ہوا۔

وطن بدایون ہے، پیدائش ۱۵ر رمضان ۱۳۲۹ھ مطابق ۹ر ستمبر ۱۹۱۱ء کی ہے۔ والد مولوی کرم احمد ڈاک خانے میں ملازم تھے۔ سرورؔ صاحب کا بچپن اتر پردیش کے مختلف علاقوں میں گزرا۔ تعلیمی حیثیت سے اسکول اور کالج میں نمایاں رہے اور آخر کار سینٹ جانس کالج، آگرہ میں بی ایس سی میں داخلہ لیا۔ اسی کالج میں مجازؔ اور جذبیؔ بھی پڑھتے تھے اور اسی کالج سے ادب کی چاشنی بھی ملی۔ نظمیں بھی کہنے لگے، تقریریں بھی کرنے لگے اور پھر کچھ دنوں بعد مضامین بھی لکھنے لگے اور پھر اچانک سرورؔ صاحب علی گڑھ چلے آئے اور یہاں یونی ورسٹی میں یونین کے نائب صدر منتخب ہو گئے۔ پہلے انگریزی میں ایم۔ اے کیا پھر اردو میں ایم۔ اے کیا اور رشید صاحب کی توجہ سے شعبۂ اردو سے متعلق ہو گئے۔ (اگست ۱۹۳۸ء)

آل احمد سرورؔ نے اپنی آپ بیتی 'خواب باقی ہیں' میں اپنے ساتھ انصاف نہیں کیا خود ان کی اپنی جو منفرد حیثیت اردو ادب میں ہے وہ پوری تو کیا ادھوری شکل میں بھی ابھر کر سامنے نہیں آئی۔ یہ کوئی آج کی بات نہیں بقول شاعر نصف صدی کا قصہ ہے اس وقت اردو کا کوئی پروفیسر یا ریڈر ایسا نہ تھا جو سوٹ پہنتا ہو اور جس کی بیوی بے پردہ ہو اور اس کے ساتھ ساتھ چہل قدمی

*پروفیسر و سابق صدر، شعبۂ اردو، جواہر لال نہرو یونیورسٹی نئی دہلی ـ ڈی ـ ۷، ماڈل ٹاؤن، دہلی ،۹

www.taemeernews.com

کر سکے جس کا ذہن اتنا جدید ہو کہ Times Literary Supplement کے بغیر اس کا ہفتہ مکمل نہ ہوتا ہو جس کے ملنے والوں میں ایک طرف اردو دانش وروں کا ہجوم ہو تو دوسری طرف انگریزی اور ہندی کے ادبی حلقوں کے لوگ بھی شامل ہوں اور یہی نہیں ادبی اور علمی حلقوں کے علاوہ اس دور اور اس علاقے کے سبھی یا تقریباً سبھی قابلِ ذکر لوگ شامل ہوں جس کے بغیر لکھنؤ کافی ہاؤس کی محفلیں سونی سونی لگتی ہوں اور جس کے ارد گرد طلبا ہی کا نہیں اساتذہ اور دانش وروں کا ہجوم پروانہ وار جمع ہوتا ہو۔ مگر یہ تھے لکھنؤ یونیورسٹی والے سرور صاحب۔

یہ تھے سرور صاحب جن کی محبوبیت اور ہر دل عزیزی لکھنؤ میں کم و بیش آج تک ضرب المثل ہے مگر سرور صاحب کی شخصیت تو اس سے پہلے آگرہ کے سینٹ جانس کالج (بلکہ اس سے قبل بدایوں اور یو پی کے مختلف اضلاع میں) اور پھر علی گڑھ یونیورسٹی میں تعمیر و تشکیل کی منزلوں سے گزر چکی تھی۔ رام پور میں وہ رضا کالج کے پرنسپل کا عہدہ بھی سنبھال آئے تھے اور پھر لکھنؤ پہنچے تو بادِ نو بہار کی طرح۔ اور اس شہر کے محبت کرنے والے لوگوں کو روتا بلکتا چھوڑ کر وہ پھر علی گڑھ آ گئے اور اس بار آئے تو اس طرح کہ بقول شاعر ''خیمہ زد و بارگاہ ساخت''۔ یونیورسٹی بھر کے طلباء نے ہڑتال کی اور سرور صاحب کی حمایت میں جلوس نکالا پھر وہ دور آیا جس سے ملک کو آزادی اور اس ملک کے رہنے والوں کو آزمائش اور ابتلا سے دو چار کیا۔ اس وقت مسلم اقلیت کے لیے خصوصاً پناہ گاہیں گنی چنی تھیں اور ان میں ایک مقتدر پناہ گاہ تھی علی گڑھ جہاں سرور صاحب سینٹ جانس کالج آگرے سے انگریزی میں فارغ التحصیل ہونے کے بعد اردو میں ایم اے کیا اور بعد میں یہیں پہلے غالباً انگریزی میں اور پھر شعبۂ اردو میں استاد کی جگہ سنبھالی۔ وہ اچھے استاد سمجھے گئے اور جہاں بھی گئے اپنی اس ذمہ داری کو خوش اسلوبی سے نبھاتے رہے۔ کلاس اکثر کم ہی لیتے تھے مگر جب کلاس لیتے تھے تو ان کی بصیرت کی روشنی طلباء کے دل و دماغ کو منور کر دیتی تھی۔

سرور صاحب علی گڑھ میں طالب علم بھی رہے اور استاد بھی مگر ہوسٹل میں نہ رہے مگر سرور صاحب کی ذات کے اندر ابلنے والا آتش فشاں آسانی سے خاموش ہونے والا نہ تھا وہ علی گڑھ یونیورسٹی یونین کے نائب صدر بھی منتخب ہوئے (کہ اس زمانے میں یہی طلباء کے لیے ترقی کی آخری معراج تھی) اور علی گڑھ میگزین کے مدیر بھی۔ اب گویا پورا علی گڑھ ان کے قبضے میں تھا اور اس میں شک نہیں کہ سرور صاحب نے اس دور کے علیگڑھ سے بڑی خوبی اور نزاکت کے ساتھ نبھایا بھی۔

خوبی اس لیے کہ اس میں ان کی شخصیت کے نشانات جا بجا ملتے ہیں اور نزاکت اس لحاظ سے کہ زمانہ ڈاکٹر ضیاء الدین احمد کی وائس چانسلری کا تھا جن کے نزدیک ان کی اپنی پسند اور ناپسند یعنی مصلحت وقت اور علی گڑھ دو ہی محبوب تھے باقی جو کچھ بھی تھا ان دونوں پر قربان کر دینے کے لیے تھا (ماسوا برطانوی حکومت کے)۔ سرور صاحب نے اس نزاکت کو جہاں تک نبھا سکتے تھے نبھایا آخر کار

www.taemeernews.com

علیگڑھ میگزین کے ایک مضمون پر ان سے جواب طلبی ہوگئی اور اس سے پہلے کہ ضیاء الدین احمد کا وار ان پر پڑتا رشید صاحب کے مشورے پر ذاکر صاحب کی سفارش پر ریاست رامپور کے رضا ڈگری کالج میں کرنل بشیر حسین زیدی وزیر اعظم ریاست رام پور کی ایما پر پرنسپل مقرر کر دیے گئے۔

اس وقت تک سرور صاحب کے اسلوب نے یوں بھی ہے اور یوں بھی کی ادا نہیں سیکھی تھی۔ مزاج میں دلنوازی کے علاوہ ایک خصوصیت کھری بات کہنے کی بھی تھی گو انداز ذرا خوشگوار رہتا تھا کہ جس پر تنقید ہو وہ بھی ایسی کہ ماتھے پر شکن نہ لائے مگر اس کے ساتھ یہ خاراشگافی اور اصول پرستی بھی تھی کہ اسی کالج میں سالانہ امتحان کے موقعے پر خود نواب صاحب رام پور کے ایک منظور نظر اے ڈی سی کو نقل کرتے ہوئے پکڑ لیا، قصّے نے طول پکڑا اور آخر کار بیگم قدسیہ زیدی صاحبہ کے بیچ میں پڑنے سے معاملہ رفع دفع ہوا۔

اس وقت تک گو سرور صاحب علی گڑھ میگزین کے اڈیٹر رہ چکے تھے مگر ادبی دنیا میں صرف اپنی نثری تقریروں کے مجموعے 'تنقیدی اشارے' کے مصنف کی حیثیت سے پہچانے جاتے تھے اس کے چند ماہ بعد رسالوں میں مطبوعہ مضامین کا ایک مجموعہ 'نئے پرانے چراغ' بھی چھپ گیا تھا اور ان میں اکا دکا مضمون ہی چونکا دینے والا تھا البتہ رسالہ نگار لکھنؤ کا خاص نمبر جو نیاز فتحپوری نے دو جلدوں میں مرتب کر کے وقفے وقفے سے شائع کیا تھا اس کی پہلی جلد میں تو اس دور کے اہم شاعروں کے کلام کا خود ان کا منتخب کردہ انتخاب تھا اور دوسری جلد میں نیاز، فراق، مجنوں، کلیم الدین احمد، آل احمد سرور کے ان شعراء کے کلام پر تفصیلی تبصرے اور مضامین تھے۔

جی ہاں قبل تقسیم کا یہی زمانہ تھا جب اتفاقاً سرور صاحب سے نیاز حاصل ہوا۔ جنگِ عظیم کا زمانہ تھا، ریل گاڑیاں کھچا کھچ بھری ہوئی چل رہی تھیں، میں آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ کے ایک نہایت خوش مذاق پروگرام اسسٹنٹ اشرف مرحوم کے ساتھ اپنے وطن مراد آباد میں چھٹیاں گزار کر لکھنؤ یونیورسٹی جا رہا تھا۔ اردو میں ایم۔ اے کر چکا تھا یا ایم۔ اے کا آخری سال تھا کہ مراد آباد کے اسٹیشن پر سفید شیروانی، جناح کیپ اوڑھے ایک صاحب بھیڑ بھاڑ والے اس ریل کے ڈبے میں داخل ہوئے۔ بمشکل دو سیٹوں کے بیچ کی جگہ میں دو یا تین بکس جمائے اور ان کے ساتھ کم عمر بھائی اولاد احمد صدیقی ریل کے ڈبے میں وارد ہوئے۔ ادھر ادھر خالی جگہ ڈھونڈنے کے لیے نظریں ڈال ہی رہے تھے کہ اشرف کی نظر سرور صاحب پر پڑی انہوں نے سرگوشی میں کہا سرور صاحب ہیں۔ میں ان کے نام سے قطعاً ناواقف تھا بہر حال تعارف ہوا اور سرور صاحب اور اولاد صاحب بھی ہم لوگوں کے ساتھ سٹ کر بیٹھ گئے۔ سرور صاحب رام پور کے رضا کالج کا عہدہ سنبھالنے جا رہے تھے۔

سرور صاحب میری دعوت پر پہلی بار لکھنؤ یونیورسٹی آئے، حلقۂ احباب کے جلسے کو خطاب کیا اور ترقی پسند ادب کے بارے میں محاکمے کے طور پر کچھ ایسی باتیں کہیں کہ بقول محمد حسین آزاد کوئی سمجھا

www.taemeernews.com

کوئی کچھ بھی نہیں سمجھا مگر سب کے منہ سے واہ واہ نکل گئی۔ پھر ان کا روپ بہروپ بھی نرالا تھا۔ حیدر آبادی بٹنوں والی صاف ستھری شیروانی، سر پر جناح ٹوپی، منہ میں پان کا بیڑہ۔ ٹھہر ٹھہر کر دل نوازی سے بات کرنے کا انداز۔

پھر جب شعبۂ اردو میں ریڈر شپ کی جگہ نکلی تو اپنے ریڈیائی تقریروں کے مجموعے 'تنقیدی اشارے' کے بل بوتے پر اور مولوی عبدالحق کی پرزور حمایت کی بدولت شعبۂ اردو میں ریڈر منتخب ہوئے۔ یہ حق دراصل احتشام حسین صاحب کا تھا مگر ان کی اعلیٰ ظرفی تھی کہ جب تک سرور صاحب لکھنؤ یونیورسٹی میں رہے احتشام صاحب نے ان کی دوستی نبھائی۔ اور کبھی ان کے خلاف حرف شکایت لب پر نہ لائے۔

سرور صاحب آئے تھے علی گڑھ سے، یہاں لکھنؤ میں فضا مختلف یکسر مختلف تھی۔ یہاں ادبی حلقوں میں ترقی پسند تصورات کی دھوم دھام تھی لہٰذا یہ رنگ دیکھ کر انہوں نے بھی اپنے ہاں ترقی پسند مصنفین کے ہفتہ وار جلسوں کا ڈول ڈالا۔ اسی زمانے میں ''ادب اور سرمایہ داری'' جیسا مضمون بھی لکھا اور ترقی پسند حلقوں میں اعتبار حاصل کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ لکھنؤ کے ترقی پسند ادیبوں سے بھی جو کچھ بنا انہوں نے سرور صاحب کے لیے کیا۔ لیکن اس کی قیمت سرور صاحب کو ادا کرنی پڑی اور اس کی پاداش میں لکھنؤ یونیورسٹی میں صدر شعبۂ اردو کی حیثیت سے ان کا تقرر نہیں ہوا۔

پروفیسر مسعود حسن رضوی کے ریٹائر ہونے کے بعد جب اردو اور فارسی کے شعبہ کے سربراہ کے تقرر کا معاملہ سامنے آیا تو سرور صاحب کی جگہ جواب خاصے پرانے ریڈر تھے فارسی کے ریڈر یوسف حسن موسوی کو صدر شعبہ مقرر کر دیا گیا۔ یہ دراصل اس وقت تک کانگریس حکومت خصوصاً سی۔ بی گپتا جی (سابق وزیر اعلیٰ اتر پردیش) کی انتقامی کارروائی تھی (جس کا اعتراف انہوں نے بہت عرصے بعد مجھ سے ایک ملاقات میں بھی کیا تھا۔)

مگر سرور صاحب اس تقرر سے اتنے بدحظ ہوئے کہ لکھنؤ یونیورسٹی سے استعفیٰ دے کر ذاکر صاحب کی پناہ میں علی گڑھ چلے آئے۔ ذاکر صاحب سے ان کی یوں بھی ملاقات پرانی تھی پھر اس پر رشید احمد صدیقی صاحب سے قربت، نتیجہ یہ ہوا کہ ذاکر صاحب اپنے ایک پرانے ہم جماعت عطا اللہ درانی (مقیم امریکا) کو اس پر آمادہ کر لیا کہ وہ شعبۂ اردو میں ایک اور پروفیسر شپ غالب کے کلام کو انگریزی میں ترجمہ کرنے کے لیے قائم کر دیں۔ سرور صاحب کا تقرر ہو گیا۔

سرور صاحب اس زمانے میں انجمن ترقی اردو (ہند) کے جنرل سیکریٹری اور اس کے رسالے اردو ادب اور ہفتہ وار اخبار ہماری زبان کے مدیر بھی تھے۔ ساہتیہ اکادمی کے اردو مشیر بھی تھے، یونیورسٹی کلچرل کمیٹی کے چیئرمین بھی تھے، کافی عرصہ تک مسلم یونیورسٹی لائبریری کے لائبریرین بھی تھے، یونیورسٹی کے اقامتی ہال سرسید ہال کے پرووسٹ بھی تھے، بعد میں شعبۂ اردو کے صدر اور انجمن اردوئے معلیٰ کے صدر بھی وہی تھے۔ ان میں سے کوئی عہدہ بھی جز وقتی مصروفیت کا نہ تھا مزید براں

www.taemeernews.com

یہ کہ وائس چانسلر کرنل بشیر حسین زیدی کے مشیر خاص بھی تھے۔

دراصل یونیورسٹی کی سیاست اس دور میں ایک خاص نہج پر چل نکلی۔ کرنل بشیر حسن زیدی ہی کے زمانے میں ذاکر صاحب کے چھوٹے بھائی ڈاکٹر یوسف حسین خاں کو حیدرآباد سے بلاکر علی گڑھ یونیورسٹی میں پرو وائس چانسلر بنانے کی مہم میں سرور صاحب نے بڑا اہم فریضہ انجام دیا تھا۔ اس وقت تک وہ علی گڑھ میں صرف وائس چانسلر کو اپنا بنانے کی مہم میں لگے ہوئے تھے مگر یوسف صاحب کے علی گڑھ آنے کے بعد صورت حال یکسر بدل گئی۔ علی گڑھ ذاکر صاحب کے زمانے ہی سے دو حصوں میں بٹا ہوا تھا، ذاکر صاحب بھی اس تقسیم کو مٹانے کے بجائے اسے بڑھانے ہی کی کوششوں میں معاون ثابت ہوئے۔ مزا یہ ہے کہ بظاہر تو ان گروہوں پر سیاسی لیبل لگا دیے گئے تھے مگر درحقیقت ان گروہوں کی اس قسم کی شناخت محض فرضی تھی۔

اس صورت حال میں سرور صاحب کو اپنی حکمت عملی طے کرنی تھی۔ لکھنؤ سے واپسی پر ان کی شہرت ترقی پسند ادیب اور اشتراکیت دوست دانش ور کی تھی اور اسی کی بنا پر لکھنؤ سے کھنچ کھنچ کر ان کے پرانے شاگرد اور ہمدرد علی گڑھ آنے لگے تھے مگر اس کشمکش کے بعد انھیں اپنے موقف کو واضح کرنا تھا۔ لکھنؤ سے علیگڑھ پہنچنے کے بعد انھوں نے اپنا رشتہ رشید احمد صدیقی صاحب سے مضبوط رکھا تھا اور اسی راستے سے ذاکر صاحب سے قریب ہوئے تھے مگر یوسف صاحب کی آمد کے بعد وہ ڈاکٹر نورالحسن کے نیم اشتراکی کیمپ میں شامل ہونے کو ہرگز تیار نہ تھے کہ اس سے ان کی اپنی انفرادیت مجروح ہوتی تھی۔ لہٰذا کرنل بشیر حسین زیدی کے زیر سایہ انھوں نے ایک تیسرے کیمپ کی بنیاد ڈالی جو نہ اشتراکی ہو نہ اسلامی بلکہ اس دور کی کانگریسی حکومت کا وفادار قرار پائے۔ جو لوگ سرور صاحب کے خیالات کے بدلتے ہوئے دھاروں کو جانتے ہیں انھیں اس سرگزشت میں اس قسم کے الفاظ بار بار پڑھنے کے باوجود حیرت ہوگی:

> ''میرے خیالات شروع سے قوم پرستانہ رہے ہیں...... میں اقبال سے بہت متاثر ہوں مگر ان کے ۱۹۳۰ء کے خطبے اور جناح کے نام خطوط میں جس طرح دو قوموں کے نظریے کی حمایت جھلکتی ہے اس سے متفق نہ ہو سکا''
>
> (ص ۱۷۰)

غرض علی گڑھ میں سرور صاحب کو بھی لکھنؤ کی ترقی پسندی کو ترک کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ اور یہ بھی سچ ہے کہ ''ڈھونڈنے والے کو دنیا بھی نئی دیتے ہیں'' چنانچہ اس زمانہ میں ترقی پسندی کے مقابلے میں جدیدیت کا شور شرابا شروع ہوا اور سرور صاحب کو اسلامی اور اشتراکی دونوں خیموں سے یکساں فاصلے پر واقع ایک نیا مستقر مل گیا۔ ۱۹۶۰ء میں انھوں نے جدیدیت پر باقاعدہ سمینار کر ڈالا خود افتتاحی خطبہ پڑھا اور خلیل الرحمٰن اعظمی اور دوسرے ادیبوں کی سرکردگی میں گویا ایک ایسا خیمہ سج گیا جو سرور صاحب کی انفرادیت کا اعلان بھی تھا اور سرور

www.taemeernews.com

لیے صاحب کے بائیں بازو کی سیاست اور ترقی پسندی سے لکھنؤ میں جو وابستگی ہوگئی تھی اس کا ازالہ بھی تھا۔ علی گڑھ آکر یہاں کے ''بائیں بازو'' سے دور رہنے کا مظاہرہ بھی تھا اور کرنل بشیر حسین صاحب زیدی کی سرکردگی میں گویا کانگریس کے خیر خواہوں کے داخلے کی تصدیق بھی۔

دراصل ذاکر صاحب کے زمانے یا یوں کہیے کہ ۱۹۴۷ء کے بعد علی گڑھ کی سیاست شروع شروع میں تو مسلم لیگی یا نیم مسلم لیگی خیمے اور اشتراکی خیمے میں منقسم رہی اور کانگریسی خیال رکھنے والوں یا ''اس دور کے ٹوڈیوں'' کے لیے بھی اس میں گنجائش نہ ہونے کے برابر تھی (خود ذاکر صاحب پر بھی اس کی ذمہ داری عاید ہوتی ہے کہ انہوں نے اسی ''قوم پرست'' لابی کو مضبوط کرنے کی کوشش میں باہر سے لا کر غیر مسلم پروفیسروں کا تقرر کیا جن میں سے اکثر نہ تو علی گڑھ کی روایات کو اپنا سکے اور اسی لیے یہاں کھپ نہ سکے اور نہ ہندوستان میں پھیلی ہوئی علی گڑھ سے متعلق غلط فہمیوں کو دور کر سکے بلکہ اس کے برخلاف علی گڑھ میں ایک قسم کی سرکاری سیاست کا آلہ کار بن گئے)۔ دوسری طرف وہ لوگ تھے جو کبھی شاید اشتراکی رہے ہوں مگر اب گویا کھل کر خود کو کانگریسی کہنے کے بجائے اور کانگریس کی حکومت سے براہِ راست اٹھانے کے بجائے خود کو کمیونسٹ خیمے میں شامل کر لیتے تھے۔ ان میں پروفیسر نور الحسن کی رہبری بھی شامل تھی جو نواب صاحب رام پور کے داماد تھے اور نواب صاحب خود اس وقت علی گڑھ یونیورسٹی کے اعلیٰ ترین عہدہ داروں میں تھے۔

ان دونوں کے بیچ سے سرور صاحب نے اپنے لیے راہ نکالی تا کہ وہ زیدی صاحب کی حمایت میں سرگرم ہو جائیں۔ ادھر شعبۂ تاریخ میں پروفیسر کے تقرر کے لیے دو امیدواروں کا مقابلہ ہونا تھا بہرحال ان دونوں امیدواروں کا مقابلہ ہوا اور سلیکشن کمیٹی میں زبردست اختلاف رائے ہو گئی۔ اکثریت ستیش چندر کے حق میں تھی جنہیں وائس چانسلر کرنل بشیر حسین زیدی کی حمایت حاصل تھی اور اقلیت خلیق احمد نظامی کے حق میں تھی جنہیں پرو وائس چانسلر ڈاکٹر یوسف حسین خاں (جو ذاکر صاحب کے سگے بھائی تھے) کی حمایت حاصل تھی۔ علی گڑھ کی سیاست میں اس انتخاب سے پہلے ہی دو دھڑے قائم تھے اب ان دونوں میں باقاعدہ صف آرائی شروع ہو گئی۔ سرور صاحب تو کرنل بشیر حسین زیدی کے دھڑے کے ساتھ تھے (گو ڈاکٹر یوسف حسین خاں کو حیدرآباد سے علی گڑھ لانے میں ان کا بڑا ہاتھ تھا جس کی داد وہ ذاکر صاحب سے چاہتے تھے کہ ذاکر صاحب کو یوسف صاحب بے حد عزیز تھے) مگر ہونی کو کون روک سکتا ہے۔

اس انتخاب کا اثر علی گڑھ کے لیے تباہ کن ثابت ہوا۔ پورا علی گڑھ دو خیموں میں بٹ کر رہ گیا۔ ایک کے سرپرست وائس چانسلر دوسرے کے سربراہ پرو وائس چانسلر۔ پورا اسٹاف اسی طرز پر تقسیم ہو گیا حد یہ ہے کہ طلبا تک بھی یہ تفریق پہنچی اور طالب علم بھی اپنے اپنے مفاد کے مطابق اپنے سربراہ اور ان کی طرفداریوں میں بٹ گئے۔

یہاں مسئلہ علی گڑھ کی مقامی سیاست کے

www.taemeernews.com

موڑ پھیر کا نہیں ہے خود سرور صاحب کے اپنے کردار اور مزاج کا ہے۔ سرور صاحب بے شک علی گڑھ کے شعبۂ اردو ہی کے لیے نہیں پوری اردو دنیا کے لیے اعلیٰ درجہ رکھتے تھے مگر اتنی دانش وری اتنی ہوش مندی اور اتنی فراست اور ایسے طرز تحریر کے باوجود علی گڑھ کی چھوٹی موٹی وجاہتوں پر قربان ہو گئی بقول شاعر:

جو غیر کے واسطے ہوئیں صرف
افسوس وہ دلربا ادائیں

(بادنیٰ تصرف)

سوانح عمری کے باقی صفحات محض سیر بین کی حیثیت رکھتے ہیں۔ علی گڑھ سے چھٹ کر سرور صاحب کو پر کشائی کی گنجائش کہیں نہیں ملی، کشمیر میں بھی نہیں جہاں ان کے ہم جماعت چشتی صاحب وائس چانسلر تھے۔ یا پھر بقول ان کے ان کے شاگرد ڈاکٹر رئیس احمد اور ان کے دوست کیمسٹری والے عمر فاروق صاحب کے چہیتے شاگرد اور دوست ڈاکٹر وحید الدین ملک سربراہ رہے مگر سرور صاحب کشمیر میں اقبال پرستوں کا ایک حلقہ بنانے کے اور بہت کچھ کر نہیں سکے۔ اسی لیے خود نوشت سوانح عمری کے یہ صفحات کارناموں سے نہیں کشمیر کے حسن کے بیان سے بھرے ہوئے ہیں یا پھر اشخاص و افراد کا محض سرسری تعارف ہے۔

اشخاص و افراد پر یاد آیا کہ یورپ کا سفر ہو یا پاکستان کی یاترا یا پھر امریکا کی وزیٹنگ پروفیسر شپ ان سب میں سرور صاحب جن لوگوں سے قریب نظر آتے ہیں یا جن کا ذکر بڑے لطف اور احترام سے کرتے ہیں ان میں اکثر ایسے ہیں جن سے سرور صاحب سے بہتر قسم کے تبصرے اور تجزیے کی امید کی جا سکتی تھی۔ مثلاً صفحہ ۲۷۵ پر سلیم احمد کو ذہانت کا جو سرٹیفکیٹ دیا گیا ہے وہ سرسری ہے اور عسکری صاحب سے جو ملاقات کا اشتیاق ظاہر کیا گیا ہے وہ کچھ سرور صاحب پر پھبتا نہیں۔ ایسے بھی صفحات ہیں جو سرور صاحب کے انداز نگارش کی ساحری اور دیدہ وری کی مثال ہیں۔

سرور صاحب نے جتنا اور جیسا اپنے آپ کو اپنی سوانح حیات 'خواب باقی ہیں' میں پیش کیا ہے وہ اس سے کہیں بہتر انسان بھی ہیں اور اس سے کہیں بہتر ادیب بھی۔ یہ خود نوشت نہ ان کی شخصیت کا معتبر مرقع ہے نہ ان کے اسلوب کا۔ یہ ضرور ہے کہ انہوں نے بھی اپنے آپ کو معروضی طریقے میں پرکھا اور تولا نہیں ہے۔ یوں بھی اپنے پر محاکمہ دشوار کام ہے تقریباً فوق فطری۔

آج سرور صاحب کی پوری شخصیت پر غور کیا جائے تو چند باتیں تو سامنے آئیں گی:

۱۔ سرور صاحب پہلے اردو نقاد ہیں جنھوں نے اپنی طرز زندگی اور طرز فکر دونوں حیثیتوں سے اردو حلقوں میں ماڈرن روش عام کی، غالباً پہلے اردو معلم جو مغربی لباس سوٹ اور پتلون میں ملبوس حضرت گنج کے قہوہ خانے میں انگریزی صحافیوں اور جدید علوم کے ماہروں کے ساتھ بے تکلفی سے گفتگو کرتے نظر آئے۔

۲۔ سرور صاحب پہلے اردو کے ذمہ دار معلم تھے جو اپنی بیوی کو پردے میں مقید نہ رکھتے تھے۔ حضرت گنج کے نواح میں باقاعدہ کوٹھی میں

www.taemeernews.com

رہتے تھے اور تقریباً ہر روز ہی اپنی بیگم کے ساتھ چہل قدمی کو نکلتے تھے۔ یہ روش علی گڑھ میں تو قایم نہ رہی کہ چہل قدمی کے لیے وقت نکالنا ہی مشکل تھا مگر رام پور اور پھر لکھنؤ میں چہل قدمی بھی جاری تھی اور بیگم کی رفاقت بھی۔

۳۔ سرور صاحب نے اردو حلقے میں انگریزی کے ذریعے آفاقی کلچر کو روشناس کرانے کی کوشش کی۔ یہ آفاقی کلچر محض انگریزی کتابوں کی دکانوں میں انگریزی کتابوں اور رسالوں کی ورق گردانی تک محدود نہ تھا۔ لندن ٹائمز کے شمارے اور ٹائمز لٹریری سپلیمنٹ کی خریداری اور ان کے بالاستیعاب مطالعے پر بھی منحصر نہ تھا بلکہ اس دور میں جتنی اہم ادبی کتابیں یورپ سے درآمد ہوتی تھیں ان میں سے بھی کارآمد مطبوعات پر نظر رکھنا اپنے اوپر عاید کر رکھا تھا۔ ظاہر ہے اس کے لیے علی گڑھ میں ان کے پاس وقت نہ تھا اور یہ مرض متعدی ان کے وسیلے سے ان کے شاگردوں اور واقف کاروں میں بھی بہت عام ہوا۔ مثلاً روسو کی خودنوشت کا ایک اڈیشن چھپ کر آیا، سرور صاحب نے اس کا تذکرہ اپنے حلقے میں کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کا چرچا ہر محفل اور ہر حلقے میں عام ہوگیا اور بحث کا موضوع مدتوں یہی کتاب رہی۔

۴۔ پھر سب سے بڑی بات تھی ان کے یہاں انجمن ترقی پسند مصنفین کی ہفتہ وار نشستوں کا اہتمام۔ یاد رہے کہ یہ دور بی ٹی رندیوے کی انقلابی پالیسی کا دور تھا۔ اس سے کچھ پہلے اور اس کے کچھ عرصے بعد تک باقاعدگی سے سرور صاحب کی رہائش گاہ ہے۔ بیرد روڈ پر انجمن کے جلسے باقاعدگی سے منعقد ہوتے رہے اور حیات اللہ انصاری سے ڈاکٹر علیم تک ان جلسوں میں شریک ہوتے رہے۔ احتشام صاحب تو خیر باقاعدگی سے آتے ہی تھے اور جب کانگریس کے لیڈر چندر بھان گپتا نے غالباً اپنے دور وزارت عظمیٰ میں سرور صاحب کو شعبۂ اردو کا سربراہ مقرر نہ کیا تو بھی سرور صاحب نے یونیورسٹی سے استعفیٰ تو دے دیا مگر انجمن کے جلسوں میں کوئی تعطل پیدا نہ ہونے دیا۔ پھر بھی سرور صاحب تھے کہ جب علی گڑھ پہنچے تو اس طرح سرگرداں ہوئے کہ نہ دن کا ہوش رہا نہ رات کی خبر۔ اور ان معروفیات اور جاہ طلبی نے انھیں دونوں جہاں سے بیگانہ کر دیا۔ مفاد پرستوں اور جاہ طلبوں کی بن آئی اور سرور صاحب انہیں کے حلقے میں گھر کر رہ گئے البتہ پرانی رمق ضرور باقی رہی۔ ہر سال ایک یا دو جلسے ایسے ضرور کرتے تھے جو ان کے پرانے طریق کار کی یاد دلاتے تھے۔ مثلاً جب تک رشید صاحب کی جگہ پر خود نہ ہوئے تھے اس وقت اردو کے مختلف اسالیب پر خطبات کا سلسلہ شروع کیا اور رشید صاحب سے اردو کا بنیادی اسلوب لکھوانے کے محرک بھی ہوئے پھر فراق صاحب کا یادگار لکچر جس کے بعض جملے اور فقرے آج تک کبھی کبھی یاد آتے ہیں۔ فراق صاحب نے کبیر کے ایک دوہے کی روشنی میں ادب اور فن کے تخلیقی عمل پر یادگار تقریر کی تھی "جھینی جھینی چدریا"۔

یہ سب سلسلے ان کے جدیدیت کے مسلک پر

www.taemeernews.com

ایمان لانے سے پہلے کے ہیں۔ ادھر جدیدیت پر سمینار ہوا اور ادھر سرور صاحب کی منصب خلافت چھن گئی اور خود سرور صاحب بھی حلقہ بگوشوں میں آگئے۔ اسی راستے سے ہوکر وہ امریکا اور یورپ کا دورہ کرآئے اور امریکا میں چند ماہ لکچر دیے۔

اب جو ان کے ادبی مزاج اور ان کی تنقیدی یافت پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ دکھ ہوتا ہے کہ اس ذہانت اور اس قدر عرفان و ادراک سے نہ جانے کتنے چراغ روشن ہوتے اور نہ جانے کتنے ویرانوں میں بہار آتی مگر یہ سب مصلحتوں اور مصروفیتوں کی نذر ہوگیا۔ ذہانت ٹکڑے ٹکڑے ہوکر کچھ پُر دوستی کی نذر ہوگئی کچھ وائس چانسلر اور پرو وائس چانسلر کی باہمی کشمکش میں کچل کر رہ گئی، کچھ انجمن ترقی اردو اور ہماری زبان کے اداروں میں ریزہ ریزہ ہوئی کچھ ساہتیہ اکادمی کے انعام بخشیوں اور سرکار کی حاشیہ نشینوں میں صرف ہوئی کچھ ارباب اقتدار کی بازیابی میں۔ آج سرور صاحب خود اپنی دریافت کی مہم پر نکلتے ہیں تو اپنی سوانح حیات میں سوائے دوسرے احباب اور شخصیات کے تذکرے کے یا کچھ روایتی قسم کے واقعات کے اور کچھ اطمینان اور تفاخر کا سامان نہیں پاتے۔ ''خواب باقی ہیں'' کا نام یونہی نہیں رکھا گیا ہے۔ سرور صاحب کے خواب شاید پورے ہو بھی گئے ہوں لیکن ان سے محبت کرنے والوں کے وہ خواب ضرور باقی رہ گئے ہیں جو ان سے وابستہ تھے۔ بقول شاعر:

اب ڈھونڈیے تو اس کا نشاں بھی نہ پایئے
وہ موج جو سفینۂ دل کو ڈبو گئی
(نصیر حیدر)

۱۔ خودنوشت سوانح عمریاں تین قسم کی ہوتی ہیں کچھ اپنے مصنف سے بڑی ہوتی ہیں کچھ اپنے مصنف کے قد و قامت کے مطابق ہوتی ہیں اور کچھ اپنے مصنف کے قد و قامت سے بہت چھوٹی رہ جاتی ہیں ۔ ان پر مصنف کی شخصیت کے دیو قامت سایے تو پڑتے ہیں مگر ان سوانح عمریوں پر پوری طرح اثر انداز نہیں ہوتے۔ شاید ہوتا یہ ہے کہ بڑی اور دلکش شخصیتوں کی زندگی گزارنے کے عمل میں اس طرح محو اور مستغرق ہوتی ہیں کہ اس عمل کے درمیان دیانتداری اور بے محابا انداز میں بیان کرنے کا اکثر ہوش ہی نہیں رہتا اور جب مصروفیات سے کچھ فرصت پاتے ہیں تو بڑھاپا اور اس کے ساتھ بھول چوک کا مرض اور پرانی یادوں کی دل کشی کھونے کا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے اور ماضی ایک زندہ اور تابناک تصویر کے بجائے دور کی آواز ہو کر رہ جاتا ہے۔

یہ سب مرحلے اور سارے مقامات آہ و فغاں سرور صاحب کی آپ بیتی ''خواب باقی ہیں'' میں بیان تو ہوئے ہیں مگر ان کے مخصوص اسلوب کے ساتھ۔

آپ بیتی پڑھتے وقت بنیادی سوال بھی ذہن میں آتا ہے کہ مصنف نے خود کو دوسروں کی نظروں سے (بلکہ یوں کہیے کہ دوسروں کے آئینے میں) دیکھا ہے یا خود اپنے آئینے میں دوسروں کو دیکھا یا دکھایا ہے، یہ بھی ہے کہ یہ دونوں کام بیک وقت کیے ہوئے ہیں اب اس میں کامیابی اپنی اپنی ہنرمندی پر منحصر ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ

www.taemeernews.com

خواب باقی ہیں کہ مصنف نے زندگی کی شام میں اپنا عکس دوسروں ہی کی نظروں میں دکھانے کی کوشش کی ہے جبکہ ان کا وقار اور موقع ومحل کا تقاضا یہ تھا کہ دوسروں کا عکس بھی سرؔور صاحب کی نظروں سے اور ان کے اپنے دور کے میقات ومیزان پر دیکھتے۔

یہ خودنوشت سوانح عمری ایک ''آتش زیر پا'' دور کی سرگزشت ہے۔ یہ کہنا زیادہ موزوں ہوگا کہ یہ دور ایک نہیں کئی پل صراطوں سے گزرا ہے اس کا ایک سرا قبل تقسیم کے اس ہندوستانی کی ثقافتی زندگی سے جڑا ہوا ہے۔

☆☆☆

www.taemeernews.com

نیر مسعود*

آل احمد سرور اور مطالعۂ میر

میر کا ضخیم کلیات میرے علم میں چار پانچ بار سے زیادہ شائع نہیں ہوا اور زیادہ تر بازار سے غائب رہا۔ البتہ ان کے انتخاب آسانی سے دست یاب ہوتے رہے اور میر کی شاعری کے بارے میں ہماری رائے زیادہ تر انہیں انتخابوں پر قائم ہے، یا ان تنقیدی نما فقروں پر جو دلچسپ ہونے کی وجہ سے زبان زد ہو گئے ہیں، مثلاً میر کے اشعار دل اور دلی کے نوحے ہیں، میر کا کلام آہ ہے اور سودا کا کلام واہ، میر کا بلند کلام بہت بلند ہے اور پست کلام بے انتہا پست، میر کے کلام میں بہتر نشتر ہیں (یعنی باقی کلام بھرتی کا ہے)۔

میر کے محدود دست یاب کلام نے ان فقروں کے ساتھ مل کر ہمارے ذہن میں میر کی شاعری کا ایک نقش بنا دیا۔ دوسری طرف تذکروں میں میر کے جو انوکھے واقعات درج ہوئے ہیں انہوں نے ان کی شخصیت کا بھی ایک نقش بنا دیا اور ہم نے میر کی شخصیت اور شاعری کو ملا کر دونوں کا ایک مجموعی نقش بنا لیا جو کچھ اس طرح کا تھا:

میر ایک آدم بیزار، غم پسند، گوشہ نشیں اور بدمزاجی کی حد تک خوددار انسان تھے اور ان کا کلام ان کی اسی شخصیت کا آئینہ دار ہے۔ وہ سہل گو شاعر ہیں اور ان کی شاعری داخلیت اور قنوطیت کی شاعری ہے۔ یہ نقش ہمارے ذہنوں میں اس حد تک راسخ ہو گیا کہ میر کے حالات اور کلام میں اس نقش کے برخلاف ہم کو جو کچھ بھی ملا اسے ہم نے مستثنیات کے خانے میں ڈال دیا اور ہماری میر شناسی کچھ ان خطوط پر قائم ہوئی کہ اگرچہ انہوں نے صلے کی خاطر آصف الدولہ کی مدح سرائی کی ہے لیکن وہ کسی کا احسان قبول نہیں کرتے تھے، اگرچہ انہوں نے نہایت شوخ اشعار بھی کہے ہیں لیکن وہ تھے بہت غم پسند، اگرچہ ان کے کلام میں فاشی کی حد تک عریانی اور امرد پرستی ہے لیکن ان کی متانت میں کلام نہیں، اگرچہ ان کے بہت سے اشعار میں سخت معنوی پیچیدگی اور لفظی اشکال ہے لیکن ان کی شاعری بہت عام فہم ہے، وغیرہ۔

ظاہر ہے ان جامد تصورات کے ساتھ میر پر

---

*پروفیسر، سابق صدر شعبۂ فارسی، ادبستان، دین دیال روڈ، لکھنؤ، ۲۲۶۰۰۳

www.taemeernews.com

زیادہ کچھ لکھنے کی گنجائش نہیں رہتی اس لیے کوئی تعجب کی بات نہیں کہ جب ہم اردو کے چار بڑے شاعروں میر، غالب، انیس اور اقبال پر لکھی جانے والی کتابوں اور تحریروں کے اعداد وشمار اکٹھا کرتے ہیں تو اقبال، غالب اور انیس کے مقابلے میں میر کا حصہ افسوس ناک، بلکہ عبرت ناک حد تک کم نکلتا ہے۔ انہیں تصورات کے نتیجہ میں میر کو ہماری تنقید نے اپنے عمومی بیانات کا صید زبوں بنا کر رکھ دیا اور ایک عرصے تک ہمیں احساس بھی نہیں ہوا کہ میر کا کلام بہت سے پہلوؤں سے اختصاصی مطالعوں کا مطالبہ کرتا ہے۔ گذشتہ چند برسوں میں صورتِ حال کچھ بدلی ہے۔ ڈاکٹر قاضی افضال حسین کی کتاب ''میر کی شعری لسانیات'' اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی ''اسلوبیاتِ میر'' اور پھر شمس الرحمن فاروقی کی ''شعر شور انگیز'' ہمارے اس بڑے شاعر کا قرض چکانے کی مستحسن کوششیں ہیں۔ اس خیال پر بھی نظر ثانی ہوئی کہ میر کا کلام بہت زود فہم ہے اور تشریح یا تجزیے کا محتاج نہیں ہے۔ میر نے خود کہا تھا:

سہل ہے میر کا سمجھنا کیا
ہر سخن اس کا اک مقام سے ہے

اور یہ مقامات مابعد الطبیعیاتی معارف سے لے کر جہان آباد کے پیشہ ور لونڈوں تک پہنچتے ہیں۔ اس تناظر میں ہم آسانی سے یہ کہہ کر بات ختم کر سکتے ہیں کہ میر کی شاعری مجموعۂ اضداد ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ اس پوری شاعری کا متکلم ایک واحد شخص نظر آتا ہے خواہ وہ فرشتوں سے آگے قدم مار رہا ہو یا دارو پیے گلیوں میں پڑا پھرتا ہو۔ اس طرح میر کا سمجھنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔

آل احمد سرور کا مضمون ''مطالعۂ میر کی اہمیت'' ان کے مجموعے ''مسرت سے بصیرت تک'' (۱۹۷۴ء) میں شامل ہے حالیہ برسوں میں میر پر جو کام ہوا ہے اس سے پہلے کا یہ مضمون میر شناسی کے سلسلے میں بہت اہم ہے۔

سرور صاحب کا کہنا ہے کہ میر کی عظمت تو ہر دور میں مسلم رہی لیکن اس عظمت کا صحیح تجزیہ نہیں ہو سکا ہے۔ میر کے متعلق بہت کچھ سوچے سمجھے بغیر طے کر لیا گیا ہے۔'' اسی لیے ہماری کوشش یہ ہے کہ میر کی شاعری کا تفصیلی مطالعہ کیا جائے، ان کے فکر و فن کی اہمیت واضح کی جائے اور اردو شاعری میں ان کے کارنامے کی نوعیت متعین کی جائے۔''

میر کے متعلق بعض معاملات پر ابھی بہت کچھ تحقیق کی ضرورت ہے۔ مثلاً میر اور خان آرزو کے تعلقات، امراء سے توسل کے باوجود ان کا اپنی درویشی اور استغنا پر زور دینا، ان کی اکبر آباد کی زندگی، دہلی میں عنفوانِ شباب کا زمانہ، آصف الدولہ اور دیگر امراء سے مراسم، معاصرین سے تعلقات، ان کے دہلی اور لکھنؤ کے کلام کا تقابل، وغیرہ وہ مسائل ہیں جن کا تفصیل سے جائزہ لینا ضروری ہے۔

بچپن میں باپ اور منہ بولے چچا سے محرومی اور بھائی کی بدسلوکی کے بعد دہلی میں خانِ آرزو نے بھی ان کے ساتھ شفقت کا برتاؤ نہیں کیا اور آخر میر ان کے سائے سے نکل گئے۔ دہلی کی معاشرت نے انہیں جو کچھ دیا اسے سینے سے لگائے ہوئے لکھنؤ پہنچے تو بھی امراء کی مصاحبت کے باوجود خود کو لیے دیے

www.taemeernews.com

رہے اور دہلی کی تہذیب کے مٹنے کا احساس ان کے دل سے نہیں گیا۔ وہ دیوانے تو نہیں تھے لیکن ایک طوفانی عشق کے نتیجے میں ان پر دیوانگی کا دورہ پڑ چکا تھا۔ اور باپ اور چچا سے ملے ہوئے صوفیانہ خیالات بھی ان پر اثر انداز ہوئے تھے۔

میر کی شاعری پر تنقید میں ان کی سادگی، قنوطیت، غایت پست و غایت بلند، ان کی آہ اور سودا کی واہ وغیرہ کو بے سوچے سمجھے دہرایا جاتا ہے۔ عبدالحق اور وحیدالدین سلیم نے کچھ صحیح تنقید کی، لیکن میر کی سادگی وغیرہ کی جو یک رخی تصویر بن گئی تھی اس نے بیسویں صدی کی نسل کو، جو جذبات سے آگے بڑھ کر افکار اور غالب سے مانوس ہو چکی تھی، میر سے بیگانہ کر دیا۔ پھر سماجی تنقید نے بھی میر کو نقصان پہنچایا۔ ان کی عظمت تسلیم کرنے کے باوجود ان کا مطالعہ ضروری نہ سمجھا گیا۔ البتہ اثر اور مجنوں وغیرہ نے میر پر نئے پہلوؤں سے روشنی ڈالی۔ ان کو محض جذبات کا شاعر نہیں مانا اور بتایا کہ شاعری میں جذبہ اور فکر اس طرح گھل مل جاتے ہیں کہ ان میں فرق کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

نئی نسل (ناصر کاظمی وغیرہ) میں جو میر کی پرستش ہے وہ اس وجہ سے ہے کہ اس نسل کے پاس زخموں کی جو کائنات ہے وہ اسے میر کے آزارِ عشق سے قریب کر دیتی ہے۔ مگر یہاں بھی میر کے ایک من مانے بت کی پرستش ہو رہی ہے۔ درحقیقت میر کی جو الگ الگ تصویریں بنائی گئیں ہیں وہ میر کی تمام خصوصیتوں کی آئینہ دار نہیں ہیں۔ ''میر کی شاعری بھی ایک بت ہزار شیوہ کی طرح ہے۔ وہ ہمیں جو بصیرت عطا کرتے ہیں اس کی کمی نہیں ہیں...... میر اس لیے بڑے شاعر نہیں ہیں کہ وہ ماحول کے مصور ہیں، وہ اس لیے بڑے شاعر ہیں کہ ان کے اشعار اس بھرپور احساس سے لبریز ہیں جو زندگی کی گہری بصیرت سے حاصل ہوتا ہے، جو واقعات اور حالات کی نشان دہی نہیں کرتا بلکہ ان کے پیچھے جو ذہنی دنیا ہے اس کا دروازہ ہمارے لیے کھول دیتا ہے۔ میر کے مطالعے میں ہمیں اس نکتے کو ملحوظ رکھنا ہے کہ ان کے ذریعہ ہم اس دور کے ذہن کی گہرائیوں تک پہنچ سکتے ہیں اور اس مختصر جذبات کا اندازہ کر سکتے ہیں جو ہماری تہذیبی بساط پر رونما ہوا تھا۔ میر اس لیے بڑے شاعر ہیں کہ ان کی کرن نہ صرف ماضی کے دھندلکے کو چیر کر ہمیں ایک جیتی جاگتی تصویر دکھا دیتی ہے بلکہ ان کی یہ تصویر ہمارے حال اور مستقبل دونوں میں رہنمائی کر سکتی ہے۔ میر کی رفاقت سے ہم اسی لیے منہ موڑ کر نہیں بیٹھ سکتے۔''

میر کا تصورِ عشق ایک دھندلا سا دیا نہیں بلکہ ایک شعلۂ بے باک ہے جس کا سلسلہ اسرار و معارف سے مل جاتا ہے۔ ''یہی دردمند انسانیت کی وہ آواز ہے جو ہر جبر و قہر کے خلاف ہے اور صداقت، حسن، انصاف اور صحتِ ذہنی کی امین ہے۔ میر کے فن پر اور ان کی فکر کی طرف سے بے نیازی نے ان کے جوہر کو نمایاں نہ ہونے دیا۔ حالانکہ فن کی بہار فکر کی حنابندی کے بغیر وجود میں نہیں آتی۔''

نشتریت، سادگی، قنوطیت، سوز و گداز کے الفاظ میر کے رنگ کی پوری طرح نمائندگی نہیں کرتے۔ ''میر کی نفسیات، اس دور کی تاریخ، اور

www.taemeernews.com

اس تہذیبی بساط کی یہ خصوصیت نظر انداز نہیں کرنی چاہیے کہ یہ اشراف کی پرستار ہوتے ہوئے بھی عوام اور عوام کی زبان سے اپنا رشتہ مضبوط رکھتی تھی۔ میر کی شاعری اس لیے بھی ہماری بڑی دولت ہے کہ ان کے یہاں ہمارے تینوں تہذیبی ادارے بازار، خانقاہ اور دربار اس طرح ملے جلے نظر آتے ہیں کہ اس دور کی تمام سماجی حقیقتیں اس نگار خانے میں جلوہ گر ہو جاتی ہیں۔''

''دراصل میر اور غالب جیسے بڑے شاعروں کے رنگ کو ایک اصطلاح میں بیان کرنا بہت مشکل ہے۔ کبھی کبھی دریا کوزے میں نہیں سماتا...... میر کے سامنے ایک لٹتی ہوئی جنت، ایک الٹتی ہوئی بساط اور ایک جاتے ہوئے کارواں کا ماتم ہے اور اس ماتم کے پیچھے انسانیت کی چند ایسی قدریں ہیں جو آج بھی ہمارے ذہن کا اجالا ہو سکتی ہیں۔''

میر کے یہاں الفاظ معلوماتی اظہار نہیں بلکہ تاثراتی اظہار ہیں۔ ''جس طرح فکر کو محدود معنی میں لینے کی وجہ سے ہم میر کے میلانِ فکری پر پوری توجہ نہیں کر سکے اسی طرح فن کے محدود تصور نے میر کے فن کی عظمت بھی واضح نہ ہونے دی۔'' فکر کے معنی ہم نے کسی نہ کسی فلسفہ طرازی کے سمجھ لیے ہیں اور چونکہ میر کی فکر کا اظہار شاعرانہ انداز میں ہوتا ہے اس لیے ہم ان کے اظہار میں کھو کر ان کی فکر کو فراموش کر دیتے ہیں۔

میر کی زبان کی طرف سرور صاحب نے خاص توجہ کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ میر نے الفاظ کا بہت سوچ سمجھ کر استعمال کیا ہے۔ انہوں نے فارسی الفاظ و تراکیب بھی بے دھڑک استعمال کیے ہیں لیکن وہ ''نغمے کی خاطر ہندی لے کو نہیں چھوڑتے۔''

اردو شاعری پر میر کے احسانات کا احساس تو عام ہے لیکن ان کی صراحت ٹھیک سے نہیں کی گئی ہے۔ ''دوسری جنگِ عظیم، ہندوستان کی آزادی اور تقسیم کے بعد دل کی جراحتوں کے جو چمن کھلائے گئے ان میں میر کا رنگ فطری طور پر آیا۔ اور جب تک غمِ جاناں اور غمِ دوراں کا نشتر سر تیز موجود ہے میر کا ہنر بھی زندہ ہے۔ جدید شاعری میں سرگوشی کی جو کیفیت ہے وہ میر کے سازِ زیرلبی کی ہی بازآفرینی ہے۔''

اس طرح آل احمد سرور نے میر فہمی کے تقریباً تمام شرائط کی طرف اشارہ کر دیا ہے، میر پر تنقید کی غلط کاریوں کی بھی نشان دہی کر دی ہے اور میر کے فکر و فن پر بعد کے لکھنے والوں کے لیے راہ ہموار کی ہے۔

☆☆☆

www.taemeernews.com

ریاض الرحمٰن شروانی*

خواب باقی ہیں
ایک جائزہ

پروفیسر آل احمد سرورؔ (۱۹۱۱-۲۰۰۲) نے اپنی خودنوشت کے حرف آغاز میں کہا ہے:

''خودنوشت سوانح لکھنا بظاہر بہت آسان ہے لیکن دراصل خاصا مشکل۔'' اس ''آسان'' اور ''مشکل'' کے اسباب بیان کرنے کے بعد انہوں نے خودنوشت لکھنے کے لیے اپنے ساتھ ایمان داری برتنے پر زور دیا ہے اور اس کے لیے ''سچائی، ریاض اور کھرے پن'' کی ضرورت بتائی ہے۔ ان کے نزدیک ''اردو میں سب سے اچھی خودنوشت سید رضا علی کی 'اعمال نامہ' ہے اور اس کے بعد انہوں نے رشید احمد صدیقی کی 'آشفتہ بیانی میری'، جوشؔ کی 'یادوں کی برات' اور خواجہ غلام السیدین کی 'مجھے کہنا ہے اپنی زباں میں' کو اہمیت دی ہے۔ پروفیسر اسلوب احمد انصاری کی رائے ہے کہ اردو میں صفِ اوّل کی خودنوشت صرف دو ہیں: مشتاق یوسفی کی 'زرگزشت' اور اختر حسین رائے پوری کی 'گردِ راہ'۔ اس کا مطلب ہے کہ ان دونوں بالغ نظر نقادوں کے خیال میں ''ایمان داری، سچائی، ریاض اور کھرے پن'' کے معیار پر بھی خودنوشت سوانح عمریاں پوری اترتی ہیں۔ یہاں بطور جملہ معترضہ یہ عرض کرنا بے جا نہیں ہوگا کہ ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ سرور صاحب نے اس فہرست میں جوشؔ کی 'یادوں کی برات' کو کیسے شامل کر لیا ہے حالانکہ اس میں لاف زنی اور مبالغہ آفرینی کی بہتات ہے۔ اس کی خوبی صرف اس کا حسن بیان ہے۔ ہم یہ بھی سمجھتے ہیں کہ اس فہرست میں کم سے کم محترمہ ادا جعفری کی 'جو رہی سو بے خبری رہی' کو اور شامل کیا جا سکتا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ خودنوشت لکھنے والا بالعموم اپنے کو ایمان داری سے قارئین کے سامنے بہت کم آشکار کرتا ہے، یا تو وہ کچھ چھپاتا ہے یا ضرورت سے زیادہ اظہار ذات کرتا ہے۔ سرور صاحب نے اپنے بارے میں لکھا ہے کہ ''میں نہ تو اپنا قصیدہ پڑھنے کا قائل ہوں، نہ بے جا انکسار کا۔'' اب دیکھنا یہ ہے کہ 'خواب باقی ہیں' مندرجہ بالا معیار پر کس حد تک پوری اترتی ہے۔

سرور صاحب کا آبائی وطن ہماری ریاست

* پروفیسر و سابق صدر، شعبۂ عربی و اسلامیات کشمیر یونیورسٹی، سری نگر، حبیب منزل، علی گڑھ

www.taemeernews.com

کا مشہور مردم خیز شہر بدایوں تھا۔ ان کے والد مولوی کرم احمد ڈاک خانے میں ملازم تھے اور ان کا تبادلہ ہوتا رہتا تھا۔ سرور صاحب کی ابتدائی تعلیم بدایوں ہی میں ہوئی۔ بدایوں درگاہوں اور خانقاہوں کا شہر ہے، خود سرور صاحب ایک مذہبی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اس لیے شروع عمر میں ان پر روایتی مذہب کا اثر گہرا تھا لیکن بعد میں غالباً مطالعے اور ماحول کی بدولت یہ اثر کم ہوتا گیا۔ تاہم وہ اسلام کی روح سے ہمیشہ ہم آہنگ رہے۔ ان کے مذہبی افکار و رجحانات پر نسبتاً تفصیلی گفتگو آئندہ صفحات میں ہوگی۔ جب سرور صاحب کی عمر کچھ زیادہ ہوئی تو وہ اپنے والدین کے ساتھ مختلف شہروں میں منتقل ہوتے رہے اور اس لیے ان کی تعلیم بھی جگہ جگہ ہوتی رہی۔ سرور صاحب کا تعلیمی کیریر اسکول میں ہمیشہ ہی اچھا رہا لیکن ہائی اسکول کے امتحان میں ریاضی میں کم زور ہونے کے بہ سبب ان کی سیکنڈ ڈویژن آئی۔ بہر حال ۱۹۲۸ء میں، جب کہ ان کی عمر ۱۷ سال تھی، ہائی اسکول کرنے کے بعد وہ سینٹ جانس کالج آگرہ میں داخل ہوگئے۔ وہاں وہ سائنس کے طالب علم تھے۔ انٹرمیڈیٹ اور بی۔ ایس۔ سی انہوں نے وہیں سے کیا۔ وہ اپنے بعض استادوں سے بہت متاثر ہوئے اور انہوں نے اپنی خودنوشت میں ان استادوں کا ذکر بہت عقیدت اور محبت سے کیا ہے۔ انہوں نے کالج میں بھرپور زندگی گزاری، مباحثوں میں حصہ لیتے رہے، شاعری بھی کرتے رہے۔ شاعری کی چسک انہیں بدایوں ہی سے پڑ گئی تھی کیوں کہ بدایوں میں روایتی مذہب کے علاوہ شاعری کا بھی بہت چرچا تھا لیکن آگرہ آکر ان کے اس ذوق کو جلا ہوئی۔ یہاں ان کے ہم عصر مجاز اور جذبی (اس وقت کے ملال) جیسے طلبہ تھے جنہوں نے آگے چل کر شاعری میں غیر معمولی امتیاز حاصل کیا۔ آگرہ میں سرور صاحب کو میکش اکبرآبادی کی صحبتوں سے بھی استفادے کا موقع ملا نیز بعض دوسرے اہم شعراء کو قریب سے دیکھنے اور ان کے کلام سے لطف اندوز ہونے کے مواقع ملتے رہے۔ آگرہ میں سرور صاحب نے اپنا مطالعہ سائنس تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ انگریزی ادب اور فلسفے سے بھی شناسائی حاصل کی۔ علی گڑھ سے ان کی پہلی واقفیت ایم۔ اے۔ او کالج کی سلور جوبلی کے موقع پر ہوئی تھی۔ اس وقت وہ غازی پور میں آٹھویں جماعت کے طالب علم تھے اور وہاں سے علی گڑھ آکر جوبلی میں شریک ہوئے تھے۔ جوبلی کے چند دل چسپ واقعات سرور صاحب نے ''خواب باقی ہیں'' میں بیان کیے ہیں۔ آگرہ کے زمانۂ طالب علمی میں انہیں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے کئی ممتاز اساتذہ اور طلبہ سے ملنے اور ان کی تقاریر سننے کا اتفاق ہوا۔ ان اساتذہ میں ڈاکٹر ہادی حسن اور خواجہ غلام السیدین اور طلبہ میں احمد عباس، انصار ہروانی اور عثمان احمد انصاری کا سرور صاحب نے ذکر کیا ہے۔ اتفاق سے بی۔ ایس۔ سی میں بھی سرور صاحب کو سیکنڈ ڈویژن ہی ملی۔ اس کے بعد انہوں نے سائنس چھوڑنے اور علی گڑھ آکر انگریزی میں ایم۔ اے کرنے کا قصد کرلیا۔ یہاں سے ان کی زندگی کے ایک نئے دور کا آغاز ہوتا

www.taemeernews.com

ہے۔ یہ دور زیادہ بھر پور، زیادہ بار آور اور زیادہ نتیجہ خیز ثابت ہوا۔

سرور صاحب علی گڑھ ۱۹۳۲ء میں آئے۔ یہ مسلم یونیورسٹی کی تاریخ میں، خود سرور صاحب کے بقول، ''جوش، فخر و مباہات اور سرخوشی'' کا دور تھا۔ سر سید اعظم کے پوتے سر سید راس مسعود مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔ وہ ایک نہایت شاندار، باوقار، لبرل مزاج رکھنے والے اور وقت کے تقاضوں سے باخبر انسان تھے۔ مسلم یونیورسٹی میں سائنس کی تعلیم کی طرف کما حقہ توجہ سب سے پہلے انہوں ہی نے مبذول کی۔ ان کے زمانہ وائس چانسلری میں اس یونیورسٹی میں آزادیٔ خیال اور آزادیٔ فکر کی شمعیں فروزاں ہوئیں اور یہاں ہر نقطۂ نظر کے گراں مایہ افراد بطور مہمان تشریف لاتے رہے جن سے یہاں کے نوجوانوں کو، بقول ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم، اپنی زندگی کا پہلا دیا روشن کرنے کے لیے تیل ملتا رہا۔ سرور صاحب کی مسلم یونیورسٹی کی طالب علمی کا مختصر زمانہ سر راس مسعود ہی کے دور وائس چانسلری میں گزرا اور سرور صاحب نے اس فضا اور اس ماحول سے اپنے دل و دماغ کو خوب خوب منور کیا۔ شعبہ انگریزی کے اساتذہ میں وہ سب سے زیادہ خواجہ منظور حسین سے متاثر ہوئے اور سید محمود حسین اور سید مختار حامد علی کے قریب آئے۔ وہ اس زمانہ میں علی گڑھ میگزین (اردو) کے ایڈیٹر بھی رہے جس کی بدولت انہیں خواجہ غلام السیدین اور رشید احمد صدیقی صاحب کے قریب آنے کا موقع ملا۔ علی گڑھ میں سرور صاحب کے ہم عصر طلبہ میں حیات اللہ انصاری اور اختر حسین رائے پوری نمایاں تھے۔ یہاں سرور صاحب کی مضمون نویسی، شاعری اور خطابت سب کو مہمیز ملی۔ ایم۔ اے کے آخری سال انہوں نے اسٹوڈینٹس یونین کی نائب صدارت کا الیکشن لڑا اور کامیاب ہوئے۔ اس زمانے میں، بلکہ کئی سال بعد تک، نائب صدر یونین سب سے بڑا عہدہ تھا کیونکہ اس کا صدر پرو وائس چانسلر ہوتا تھا۔ ایم۔ اے میں انہوں نے فرسٹ ڈویزن حاصل کی۔

۱۹۳۴ء میں ایم۔ اے کرنے کے بعد سرور صاحب شعبۂ انگریزی میں لکچرر ہوگئے۔ وہ مزید حصول علم کے لیے کیمبرج جانا چاہتے تھے لیکن سرمائے کی کمی کی وجہ سے نہیں جا سکے۔ ان کا کہنا ہے کہ اس دوران انہوں نے'' ذاکر صاحب کے مشورے سے اردو میں ایم۔ اے کرنے کا ارادہ کیا''۔ یہاں یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں ہوگی کہ سرور صاحب کی آئندہ زندگی کے بعض اہم فیصلے بھی ذاکر صاحب ہی کے مشورے سے عمل میں آئے۔ مثلاً ۱۹۴۵ء میں وہ ذاکر صاحب کے کہنے پر رام پور جا کر رضا انٹر کالج کے پرنسپل ہوئے اور حصول آزادی اور تقسیم ملک کے بعد موقع ملنے کے باوجود انہوں نے پاکستان نہ جانے بلکہ ہندوستان ہی میں رہنے کا فیصلہ بھی ذاکر صاحب ہی کی رائے کے مطابق کیا۔ اسی طرح ۱۹۵۵ء میں ان کا لکھنؤ سے علی گڑھ واپس آنے کا اقدام بھی ذاکر صاحب کے حکم کی تعمیل تھا۔ بہرحال ۱۹۳۶ء میں اردو میں ایم۔ اے کرنے کے بعد وہ اس شعبہ میں مستقل لکچرر ہوگئے۔ اردو میں ایم۔ اے کرنے اور پھر اردو ہی کا

www.taemeernews.com

ہور ہے کے ان کے فیصلے میں دخل کسی کو بھی رہا ہو لیکن یہ فیصلہ تھا بہت مناسب۔ اس سے خود سرور صاحب کو بھی بیش از بیش ذہنی اور قلبی فوائد حاصل ہوئے اور اردو بھی طرح طرح سے مالا مال ہوئی۔ سرور صاحب کی آئندہ زندگی بہرنوع اردو ہی سے وابستہ رہی۔ یہ داستان طویل بھی ہے اور ولولہ انگیز بھی اور خواب باقی ہیں کے آئندہ صفحات زیادہ تر اسی داستان سے مزین ہیں۔ سرور صاحب کے اس دور زندگی کا ایک اور پہلو، جس پر انہوں نے خاصی تفصیل سے اظہار خیال کیا ہے، مسلم یونیورسٹی میں اندرونی اور بیرونی سیاست کی کارفرمائی اور یہاں کی زندگی کے اتار چڑھاؤ ہیں۔ یہ ذکر اس مضمون کے آئندہ صفحات میں آئے گا۔

جیسا کہ لکھا گیا، ۱۹۴۵ء میں وہ رام پور جاکر رضا انٹر کالج کے پرنسپل ہوگئے۔ اس وقت ریاست رام پور کے وزیر اعلیٰ کرنل بشیر حسین زیدی تھے اور مشیر تعلیم خواجہ غلام السیدین۔ سرور صاحب ان دونوں کے بہت قریب رہے۔ بالخصوص وہ سیدین صاحب سے بہت متاثر ہوئے بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کے افکار و رجحانات کی تشکیل میں ذاکر صاحب کے بعد سب سے زیادہ اثر سیدین صاحب ہی کا رہا۔ بیگم قدسیہ زیدی کی ''دل نواز شخصیت'' نے بھی سرور صاحب کو متاثر کیا۔ انہوں نے مولانا امتیاز علی عرشی کی علمیت اور کتابوں اور کتاب خانے سے دل چسپی کی تعریف کی ہے۔ رام پور کے مختصر دوران قیام سرور صاحب کا پی۔ای۔این کانفرنس میں شرکت کی غرض سے جے پور کا سفر ہوا۔

اس کانفرنس میں ہندوستان کی کئی ممتاز شخصیتیں شریک تھیں۔ مسز سروجنی نائڈو اور پنڈت جواہر لال نہرو سے سرور صاحب کو اردو کے مسئلہ پر تبادلۂ خیال کا موقع ملا۔ مسز نائڈو سے لکھنؤ پہنچ کر ان کی اور زیادہ ملاقاتیں ہوتی رہیں۔

اگست ۱۹۴۶ء میں سرور صاحب اردو کے ریڈر ہوکر لکھنؤ چلے گئے۔ یہاں ان کی زندگی بہت متنوع رہی اور، خود ان کے بقول، ان کا سابقہ علی گڑھ اور رام پور کے مقابلہ میں زیادہ وسیع دنیا سے رہا۔ اس زمانہ میں لکھنؤ یونیورسٹی میں اردو اور فارسی کا شعبہ مشترک تھا۔ اس کی سیاست سرور صاحب کے لیے ضرور پریشان کن رہی بلکہ ایک موقع تو ایسا آیا کہ انہوں نے ملازمت سے استعفیٰ دے دیا لیکن ان کا استعفیٰ منظور نہیں ہوا۔ لکھنؤ میں ان کی زندگی میں انجمن ترقی پسند مصنفین اور کافی ہاؤس کا بہت عمل دخل محسوس ہوتا ہے اور ان دونوں اداروں کے وسیلے سے ان کا رابطہ بہت سے اہل علم و ادب اور دانش وروں سے مستحکم ہوا۔ پڑھنے لکھنے کا مشغلہ بدستور جاری رہا بلکہ اس میں اضافہ ہوا۔ وہ اردو تحریک کے لیے بھی ''کچھ نہ کچھ'' کرتے رہے۔ انجمن ترقی اردو (ہند) کے ادبی جریدے ''اردو ادب'' کی ادارت اسی زمانے میں انہیں تفویض ہوگئی تھی۔ یوپی میں اردو کی بیخ کنی میں شری پرشوتم داس ٹنڈن اور شری سمپورن آنند کے رول کی انہوں نے بجا طور پر مذمت کی ہے لیکن ہم سمجھتے ہیں اس کار ثواب میں یوپی کے وزیر اعلیٰ پنڈت گووند بلبھ پنت کی حصہ داری بھی کم نہیں ہے۔ تعجب ہے کہ سرور صاحب کی نظر ان تک کیوں نہیں پہنچی۔ سرور صاحب نے لکھا ہے کہ ''......میں

www.taemeernews.com

نے رشید صاحب کو خط لکھا تھا جس میں سمپورن آنند کے طرزِ عمل کی شکایت کی تھی۔ رشید صاحب نے اس کا جواب یہ دیا تھا کہ میں سمپورن آنند کی بے حسی کو کیا دیکھوں، مجھے تو گاندھی جی کی دردمندی یاد ہے"۔ رشید صاحب کے اس جملے سے بیک وقت ان کی شرافت طبع، حقیقت پسندی اور بالغ نظری کا اندازہ ہوتا ہے۔ یعنی ہندوستان میں صرف پرشوتم داس اور سمپورن آنند ہی نہیں رہے ہیں، موہن داس گاندھی بھی ہمیشہ رہے ہیں اور آج بھی صورت حال اس سے مختلف نہیں ہے۔

۱۹۵۵ء میں دس برس کے بعد پروفیسر آل احمد سرور کی علی گڑھ واپسی مادر درسگاہ کے کھوئے ہوئے فرزند کی واپسی تھی۔ جب ۱۹۴۵ء میں علی گڑھ سے گئے تھے اس وقت یہاں کی فضا سے زیادہ مطمئن نہیں تھے۔ جب ۱۹۳۲ء میں طالب علم کی حیثیت سے علی گڑھ آئے تھے اس وقت سے ۱۹۴۵ء تک یہاں کے ماحول میں بہت تبدیلی ہوگئی تھی۔ بلاشبہ مسلم یونیورسٹی میں بہت توسیع ہوئی تھی، نئے نئے شعبے کھلے تھے، نئی نئی فیکلٹیاں اور نئے نئے کالج قائم ہوئے تھے یا ان کے قیام کی جدوجہد ہو رہی تھی، طالب علموں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوا تھا، بہت سے لوگوں کو روزگار بھی ملا تھا لیکن لبرلزم کی وہ فضا باقی نہیں رہی تھی جو ۱۹۳۰ء کی دہائی کے نصف اول میں تھی۔ سیاست علم پر غالب آگئی تھی، نظم و نسق کو سخت نقصان پہنچا تھا، اخلاق و کردار پس پشت چلے گئے تھے اور یونیورسٹی کے سربراہ کو اردو اور دوسرے مشرقی علوم وفنون سے زیادہ دلچسپی نہیں رہی تھی۔ یونیورسٹی کی غیر نصابی سرگرمیوں پر بھی اوس پڑ گئی تھی۔ اب جب سرور صاحب ۱۹۵۵ء میں اپنی مادر درسگاہ میں پروفیسر کی حیثیت سے واپس آئے تو یہاں ڈاکٹر ذاکر حسین کی دانش مندی اور دانش وری کے طفیل ایک مرتبہ پھر علم و آگہی کی روشنی پھیلی ہوئی تھی، ایک طرف اس یونیورسٹی میں تحقیق پر پہلی مرتبہ توجہ کی جا رہی تھی اور دوسری طرف تعلیم کا وسیع تر مفہوم، جس میں تہذیبی مشاغل شامل تھے، پیش نظر تھا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین نے ہونہار نوجوان اساتذہ کو بیرون ملک جا کر اعلیٰ تعلیم کے حصول کی زیادہ سے زیادہ سہولتیں مہیا فرمائیں اور علی گڑھ کے باہر سے ایسے اساتذہ کو یہاں لائے جنھوں نے علمی مشاغل کے فروغ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ابتدا میں سرور صاحب کا تقرر سید حسین چیر پر ہوا تھا جو سید حسین صاحب کے ایک معتقد اور ذاکر صاحب کے دوست امریکی شہری عطاء اللہ درانی نے قائم کی تھی۔ سرور صاحب کے ذمے اردو ادب کی تاریخ مرتب کرانے کے علاوہ غالب کے کلام کا انگریزی میں ترجمہ کرنا اور نول کشور کی اردو کے تعلق سے خدمات پر کام کرانا اور اس کا بھی انگریزی میں ترجمہ کرنا شامل تھا۔ ان کا یہ دور متنازعہ فیہ رہا اور ان کی کارکردگی پر مختلف گوشوں سے اعتراضات ہوئے۔ سب سے زیادہ تیکھا تبصرہ تاریخ ادب اردو، جلد اول پر پروفیسر رشید حسن خان نے کیا۔ سرور صاحب کا کہنا ہے کہ انھوں نے دیر سے سہی، بہرحال ۱۹۶۱ء تک دیوان غالب کا انگریزی میں ترجمہ کر کے اور "نول کشور پر انگریزی

www.taemeernews.com

میں ایک اچھا مقالہ" مکمل کر کے درانی صاحب کو بھیج دیا تھا۔ تاہم ایسا محسوس ہوتا ہے کہ درانی صاحب اس کام سے مطمئن نہیں ہوئے اور نتیجتاً سید حسین چیر مسلم یونیورسٹی میں قائم نہیں رہ سکی۔ تاریخ ادب اردو کا کام بھی جلد اول کے بعد آگے نہیں بڑھ سکا اور جلد اول کی اشاعت بھی روک دی گئی۔

۱۹۵۸ء میں پروفیسر رشید احمد صدیقی کے ملازمت سے سبک دوش ہوجانے پر سرور صاحب باقاعدہ پروفیسر اور صدر شعبۂ اردو ہوگئے۔ اس کے بعد انہوں نے مسلم یونیورسٹی کی زندگی کے بہت سے شعبوں میں اپنا حصہ بٹایا اور ذاکر صاحب کے بعد کرنل بشیر حسین زیدی کے یونیورسٹی کی توسیع اور ارتقاء کے منصوبوں کو بروئے کار لانے میں اہم خدمات انجام دیں۔ تدریس، تحقیق، نظم و نسق، تہذیبی مشاغل، ان سب دوائر میں ان کی کارکردگی کے جوہر ظاہر ہوتے رہے۔ تنقید اور شاعری کا مشغلہ نہ صرف جاری بلکہ ترقی پذیر رہا۔ کئی بیرونی اسفار بھی ہوئے جن سے ان کے ذہنی افق کو وسعت حاصل ہوئی۔ بالخصوص شکاگو میں چھ مہینے کا قیام بہت مفید ثابت ہوا۔ کئی ممتاز دانش وروں سے تبادلۂ خیال کا موقع ملا اور اثر آفرینی و اثر پذیری کا سلسلہ جاری رہا۔ انجمن ترقی اردو (ہند) کے سکریٹری کی حیثیت سے اردو کے بقا و ترقی کی کوششیں ان سب مشاغل پر مستزاد تھیں۔ دراصل ۱۹۴۸ء اور ۱۹۶۲ء (ذاکر صاحب اور زیدی صاحب کے دورِ وائس چانسلری) کی درمیانی مدت مسلم یونیورسٹی کی نشاۃ ثانیہ سے عبارت تھی۔ خدمت اردو میں بھی سرور صاحب کو ان دونوں بزرگوں کی رہنمائی بحیثیت صدر انجمن ترقی اردو (ہند) حاصل رہی۔ البتہ اس زمانہ میں اساتذہ کا نظریاتی اختلاف، جس میں بعض بیرونی عناصر بھی شریک ہوگئے تھے، ضرور یونیورسٹی کی مادی ترقی اور ذہنی بالیدگی میں رکاوٹ بنا۔

۲۵ر اپریل ۱۹۶۵ء کا بدبختانہ واقعہ، جس میں وائس چانسلر علی یاور جنگ کو شدید طور پر زدوکوب کیا گیا اور بعض اساتذہ، ممبرانِ یونیورسٹی کورٹ اور دیگر افراد (جن میں سرور صاحب بھی شامل تھے) طلبہ کے غیظ و غضب کا نشانہ بنے، اس ادارے کی تاریخ میں شب تار کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس واقعے نے گھڑی کی سوئیاں پیچھے کی طرف موڑ دیں اور ایک طویل مدت کے لیے مسلم یونیورسٹی کا ارتقاء رک گیا۔ ۱۹۵۱ء کا ایکٹ منسوخ ہوا اور آرڈی ننس جاری ہوا جس نے یونیورسٹی کی خود مختاری کو سخت نقصان پہنچایا۔ جب اس پر احتجاج ہوا تو ایک نیا ایکٹ لایا گیا۔ ۱۹۶۵ء میں جناب لال بہادر شاستری ہندوستان کے وزیر اعظم تھے اور جناب محمد علی کریم چھاگلہ وزیر تعلیم۔ جب ۱۹۷۲ء میں نیا ایکٹ نافذ ہوا اس وقت وزیر اعظم محترمہ اندرا گاندھی تھیں اور وزیر تعلیم پروفیسر نور الحسن۔ پروفیسر آل احمد سرور کی یہ رائے تو درست محسوس ہوتی ہے کہ ۱۹۶۵ء میں ۱۹۵۱ء کا ایکٹ منسوخ کر کے آرڈی ننس نافذ کیا گیا تھا، اب یہ ہونا چاہیے تھا کہ ۱۹۵۱ء ہی کا ایکٹ "بعض ضروری تبدیلیوں کے ساتھ" بحال کر دیا جاتا لیکن جب سرور صاحب، بعض دوسرے بھی خواہانِ یونیورسٹی کی مانند، نئے ایکٹ کی ساری ذمہ داری

www.taemeernews.com

وزیر تعلیم نورالحسن کے سر ڈالتے ہیں تو افسوس ہے کہ ہم ان کی رائے سے متفق نہیں ہو سکتے۔ ہندوستان میں پارلیمانی جمہوریت ہے اور حکومت کابینہ چلاتی ہے۔ اس وقت وزیر اعظم کے عہدے پر ایک ایسی شخصیت متمکن تھی جس کے اشارے کے بغیر پتا جنبش نہیں کر سکتا تھا۔ نورالحسن صاحب نے جو ایکٹ وضع کیا تھا وہ لازماً کابینہ میں پیش ہوا ہوگا اور کابینہ نے وہی کیا ہوگا جو محترمہ اندرا گاندھی کا منشا رہا ہوگا اور ظاہر ہے کہ اس کی منظوری پالیمنٹ ہی نے دی تھی۔ ۱۹۷۲ء میں نیا ایکٹ تو آ گیا لیکن مسلم یونیورسٹی کی فضا مکدر ہی رہی بلکہ کئی اعتبار سے اور زیادہ مکدر ہوگئی۔ یہ سلسلہ ۱۹۸۰ء تک چلتا رہا جب ایک مرتبہ پھر یونیورسٹی میں ہوا کا ایک تازہ جھونکا آیا اور اس کا نظم ونسق ایک ایسے مرد مومن کے ہاتھوں میں آ گیا جو اصول پسندی، جرأت کردار اور دلِ دردمند میں اپنا جواب نہیں رکھتا تھا لیکن چونکہ سرور صاحب ۱۹۷۳ء میں مسلم یونیورسٹی کی ملازمت سے سبکدوش ہوگئے تھے اس لیے اس داستان سرائی کا یہ موقع نہیں۔

مسلم یونیورسٹی کی ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد وہ ۱۹۷۴ء میں وزٹنگ فیلو کی حیثیت سے انسٹی ٹیوٹ آف ایڈوانسڈ اسٹڈیز، شملہ چلے گئے۔ یہاں ان کا قیام ۱۹۷۷ء تک رہا۔ انہوں نے یہ زمانہ زیادہ تر مطالعہ میں گزارا۔ علاوہ ازیں لکچر دیئے اور سیمناروں میں شرکت کی۔ انہیں مختلف علوم و فنون کے اسکالرس سے ملنے جلنے اور تبادلۂ خیال کے وافر مواقع ملتے رہے۔ شعروشاعری اور سیر و تفریح کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ اسی دوران شیخ محمد عبداللہ، وزیر اعلیٰ جموں وکشمیر کے ایما سے کشمیر یونیورسٹی، سری نگر میں اقبال چیر قائم ہوئی اور اس پر سرور صاحب کا تقرر ہوگیا۔ سری نگر میں ان کا قیام ۱۹۸۷ء تک رہا جب ان کی عمر ۷۶ سال ہو چکی تھی۔ ان کی کوشش سے اقبال چیر کی جگہ اقبال انسٹی ٹیوٹ کی تشکیل ہوگئی تھی اور وہ اس کے ڈائرکٹر مقرر ہوگئے تھے۔ اقبال انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام سرور صاحب نے متعدد قابلِ قدر سیمینار منعقد کیے جن میں ملک کے ممتاز دانش وروں نے شرکت کی اور مقالات پڑھے جو بعد میں کتابی صورت میں شائع ہوئے۔ کئی نام ور دانش وروں کو سرور صاحب نے اس انسٹی ٹیوٹ میں وزٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے بلایا جنہوں نے مختلف میقاتوں تک وہاں رہ کر علمی کام کیا۔ انسٹی ٹیوٹ کو ایم۔ فل اور پی۔ ایچ۔ ڈی کرانے کا استحقاق بھی مل گیا تھا چنانچہ چند طالب علموں نے ڈاکٹریٹ حاصل کی۔ سرور صاحب نے اقبال انسٹی ٹیوٹ کی لائبریری پر خصوصی توجہ مبذول کی اور بالخصوص علامہ اقبال سے متعلق کتابوں کا بہت اچھا ذخیرہ جمع کر دیا۔ وہ وہاں ۱۹۸۷ء تک رہے۔ انہوں نے ملازمت ۱۹۳۴ء میں ۲۳ سال کی عمر میں شروع کی اور ۱۹۸۷ء میں ۷۶ برس کی عمر تک برسر روزگار رہے۔ ۵۳ برس کسی دوسرے نے مشکل ہی سے ملازمت کی ہوگی۔ کشمیر یونیورسٹی نے ۱۹۸۹ء میں سرور صاحب کو ان کی اعلیٰ علمی وادبی خدمات کے اعتراف میں ڈی۔ لٹ کی اعزازی ڈگری سے نوازا اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے انہیں پروفیسر ایمریٹس کا اعزاز عطا کرکے ان کی

www.taemeernews.com

خدمات کا اعتراف کیا۔ حکومت ہند سے انہیں پدم بھوشن کا اعزاز حاصل ہوا۔ انہیں جو گراں مایہ علمی و ادبی انعامات اور ایوارڈ ملک اور بیرونِ ملک سے ملے ان کی فہرست خاصی طویل ہے۔ سرور صاحب ملازمت سے سبک دوش ہو کر بھی بیکار نہیں بیٹھے بلکہ انہوں نے اپنی بکھری ہوئی تحریروں کو سمیٹا اور ان کی کئی تصانیف منصۂ مشہود پر آئیں۔ یہاں تک کہ ۱۹۹۶ء میں فالج کے حملے کے بعد بھی وہ مضامین املا کراتے اور کتابیں چھپواتے رہے۔ آخر عمر میں انہیں دو بڑے حادثوں سے گزرنا پڑا۔ ۱۹۹۷ء میں ان کے چھوٹے بیٹے جاوید احمد کی وفات جرمنی میں ہوگئی۔ اس حادثے کا ذکر انہوں نے خواب باقی ہیں کے دوسرے ایڈیشن میں بہت غم واندوہ کے ساتھ کیا ہے۔ ۲۰۰۲ء میں اپنی وفات سے تھوڑے دنوں پہلے، انہیں اپنے داماد ڈاکٹر عبدالجلیل کی وفات کا حادثہ بھی برداشت کرنا پڑا۔ عالم ضعیفی میں یہ حادثے سرور صاحب کے لیے یقیناً بڑا امتحان تھے۔

پروفیسر آل احمد سرور کو پہاڑوں سے ہمیشہ خصوصی شغف رہا اور فطری مناظر ان کے قلب کو فرحت اور تازگی بخشتے رہے۔ انہوں نے اپنی جوانی میں علی گڑھ کے چند احباب کے ساتھ مسوری سے شملے کا پیدل سفر کیا تھا۔ اس سے ان کی مہم جوئی اور بلند حوصلگی کا اندازہ ہوتا ہے۔ پہاڑوں اور مناظر فطرت سے ان کی دل چسپی کی داستان خود ان کے الفاظ میں سننے کے قابل ہے۔ کہتے ہیں:

"پہاڑوں سے مجھے شروع سے عشق رہا ہے۔ میل ویل (Melvile) تو انسان کے لیے سمندر کی کشش کا بڑے مزے سے ذکر کرتا ہے۔ میرے لیے پہاڑوں میں زیادہ کشش ہے۔ مجھے ان کی آغوش میں سکون ملتا ہے، طبیعت کو ایک شادابی حاصل ہوتی ہے، برف پوش چوٹیوں کا نظارہ روح کو پرواز پر مائل کرتا ہے۔ چٹانوں سے ہو کر تیز اور پُر جوش موجوں کا سکڑنا، سمٹنا، پھیلنا اور آگے بڑھنا وجد میں لاتا ہے۔ اگر ندی پُر شور نہیں ہے بلکہ ایک شیریں نغمے کے ساتھ ترل ترل بہہ رہی ہے تو ورڈ سورتھ کا یہ مصرعہ یاد آتا ہے Beauty Born of Mountaining Sound دیودار کے جھنڈ کے جھنڈ کہہ رہے ہیں کہ ہماری طرح تم بھی آسمان سے باتیں کرو۔ دریا کے کنارے دور تک خودرَو پھول رنگ اور خوشبو پھیلاتے ہیں۔ یہ نظارے دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ جسم اور روح دونوں نے غسل کیا ہے۔ ذہن سے سارا زنگ دور ہو جاتا ہے۔ فطرت کا یہ حسن زندگی کا نیا عرفان عطا کرتا ہے۔ فطرت کے آغوش میں دم لے کر پھر آگے بڑھ سکتے ہیں۔"

سرور صاحب کی یہ عبارت ان کی زندگی کے ایک ایسے رُخ کی نقاب کشائی کرتی ہے جو کسی فن کار ہی کی زندگی کا حصہ ہو سکتا ہے۔ انہیں سب سے زیادہ کشمیر کے فطری حسن نے متاثر کیا تھا اور اس

www.taemeernews.com

کی انہوں نے دل کھول کر توصیف کی ہے۔
سرور صاحب کا اشخاص و حالات کا تجزیہ ان کی وسعتِ نظر، گہرائی فکر، سلامت روی اور ژرف نگاہی پر دلالت کرتا ہے۔ وہ علامہ اقبال کے بجا طور پر بہت معترف و مداح ہیں۔ ۱۹۴۷ء میں تقسیم ملک کے بعد بعض سیاسی وجوہ سے ہندوستان میں ان کی شخصیت پس پردہ چلی گئی تھی ان کی بازیابی میں جن نقادوں اور دانش وروں کا خصوصی حصہ ہے ان میں سرور صاحب کا نام بہت نمایاں ہے۔ یہ حسنِ اتفاق ہے کہ انہیں کشمیر یونیورسٹی میں اقبال انسٹی ٹیوٹ کی سربراہی کا موقع ملا اور وہاں رہ کر انہوں نے علامہ اقبال کے ساتھ اپنی عقیدت و محبت کا وافر ثبوت مہیا کیا۔ سرور صاحب کی ایک اور پسندیدہ شخصیت مولانا ابوالکلام آزاد ہیں اور ان پر مولانا آزاد کی فکر کی چھاپ بہت گہری ہے۔ انہوں نے اپنے اکثر مذہبی اور سیاسی افکار کی تشکیل میں مولانا کے قول و عمل سے روشنی اور ہدایت حاصل کی ہے اور وہ مولانا کا ذکر ہمیشہ بہت احترام اور محبت سے کرتے ہیں۔ انہوں نے علی گڑھ کے بعض ممتاز اساتذہ اور دوسرے بزرگوں کے بارے میں جن آراء کا اظہار کیا ہے وہ بھی بالعموم مبنی بر صداقت ہیں۔
سرور صاحب کے مزاج اور شخصیت کا ایک قابلِ ذکر پہلو ان کا عدل و توازن ہے۔ یہ توازن فکر تنقید، سیاست، مذہب ہر باب میں نمایاں ہے۔ انہوں نے اپنی خود نوشت میں جہاں اردو ادب کی ترقی پسند تحریک سے اپنی وابستگی کا ذکر کیا ہے وہاں ان کا یہ جوہر بخوبی واضح ہوتا ہے۔ مثلاً وہ سوشلزم کے قائل ہونے کے باوجود کمیونزم سے اپنے کو کبھی ہم آہنگ نہیں کر سکے۔ وہ ''مذہب کی روحانی طاقت، اس کے اخلاقی مشن اور سیرت رسول ﷺ کے آفاقی پہلوؤں'' کے قائل ہونے کے باوجود مذہبی تنگ نظری سے ہمیشہ دور رہے اور مسلکی اختلافات انہیں کبھی متاثر نہ کر سکے۔ وہ ترقی پسند تحریک کے اس لیے حامی رہے کہ ''ادب میں زندگی کے حقائق'' کو پیش کرنے، ''مریض روحانیت اور توہم پرستی کی مخالفت'' کرنے اور ''آزادی اور ایک منصفانہ سماج کے لیے ذہن کو بیدار'' کرنے کے اس کے مشن سے متفق تھے لیکن اس تحریک پر کمیونسٹ پارٹی کی گرفت مضبوط ہونے کو پسند نہیں کرتے تھے، وہ اس کو نہیں مانتے تھے کہ ''مارکسزم ہی صحیح ترقی پسندی ہے۔'' اس سلسلے میں انہوں نے لکھا ہے کہ ایک کانفرنس میں کچھ والینٹروں نے یہ نعرہ لکھ کر لگا دیا تھا لیکن ڈاکٹر عبدالعلیم نے اسے ہٹوا دیا تھا۔ تاہم انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ ''بات تو درست ہے مگر اس کا اظہار اس طرح مناسب نہیں۔'' سرور صاحب نے عبدالعلیم صاحب کے اس جملے کو ''معنی خیز'' قرار دیا ہے۔ مجھے یاد آتا ہے کہ انجمن ترقی پسند مصنفین علی گڑھ کے ایک جلسے میں کچھ ایسی ہی بات ایک دوسرے ترقی پسند نقاد ممتاز حسین نے کہی تھی، ان کا کہنا تھا کہ جب تک ہمیں اپنا مقصد نہ حاصل ہو جائے اس وقت تک ان اہل قلم کو بھی ساتھ لے کر چلنا ہے جو مارکسسٹ نہیں ہیں۔ ساتھ میں سرور صاحب یہ بھی کہتے ہیں کہ ''میں کمیونزم کا کبھی مخالف نہیں رہا، سرمایہ داری اور رجعت پسندی کا ہمیشہ مخالف رہا...... سیکولر ذہن

www.taemeernews.com

مجھے زیادہ تر کمیونسٹوں میں ہی ملا۔'' وہ ذاکر صاحب کے زیر اثر ذہنی طور پر قوم پرور سیاست سے قریب رہے حالانکہ کبھی کسی سیاسی جماعت سے وابستہ نہیں رہے۔ وہ مولانا آزاد کی مثال کو اپنے لیے نمونہ بنا کر بیک وقت ''اسلامی شناخت اور قومی شناخت'' پر زور دیتے رہے۔ وہ بجا طور پر کہتے ہیں کہ کسی شخص کی اپنے مذہب، زبان، علاقے کے ساتھ وفاداری اور ہندوستان کی مشترک تہذیب میں کوئی ٹکراؤ نہیں ہو سکتا۔ اس طرح کے ٹکراؤ کا تصور دلیلِ کم نظری ہے۔ سرور صاحب کے یہ خیالات و نظریات بلاشبہ ان کی شخصیت کے عدل و توازن اور ان کی فکری اصابت پر دلالت کرتے ہیں۔

سرور صاحب نے تخلیق اور تنقید کے باہمی رشتے پر بہت اچھی گفتگو کی ہے۔ یہ گفتگو اس قابل ہے کہ خود ان کے الفاظ میں دہرائی جائے۔ ان کا کہنا تھا:

''......تنقید تجربے اور تجربے میں فرق کر کے، قدروں کی پہچان کر کے، معنویت کی تلاش اور معیاروں پر نظر کے ذریعے ذوقِ سلیم عام کرنے میں مدد دیتی ہے۔ تخلیق کار میں اگر تنقیدی شعور کم ہو تو اس کی تخلیق ایک منزل پر رک جاتی ہے، وہ یا تو سہل پسندی کا شکار ہو جاتا ہے یا اپنے کو دہرانے لگتا ہے یا شہرت کا شہید ہو جاتا ہے...... اچھی تنقید ذہن کی تنظیم کر کے مہذب اور باشعور قاری پیدا کرتی ہے۔''

انہوں نے خود اپنے بارے میں لکھا ہے:

''میرے خیال میں میری شاعری سے میری تنقید کو اور میری تنقید سے میری شاعری کو مدد ملی ہے۔ تخلیقی شعور کے پروان چڑھنے اور برگ و بار لانے کے لیے تنقیدی شعور کی ضرورت ہے اور تنقید میں آب و تاب تخلیقی صلاحیت سے آتی ہے۔''

ان کے نزدیک اچھی شاعری کا منصب یہ ہے کہ وہ ''ذہن میں چراغاں کر دے ...... مانوس جلووں کو تازگی اور تازگی کو مانوسیت عطا کر دے...... وہ ہمیں زیادہ حساس، زیادہ مہذب بنا دے۔ وہ ہمیں زندگی کے ہر منظر سے آنکھیں چار کرنے کی جرأت عطا کر دے، وہ ہمیں بہتر انسان بنا دے۔'' لیکن سرور صاحب اسے بھی مانتے ہیں کہ ''......متمدن انسان کے زیادہ تر کام اب نثر انجام دیتی ہے۔'' اس لیے اس کی تنقید پر زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

سرور صاحب بنیادی طور پر ایک معلم تھے، اس لیے تعلیمی مسائل سے ان کی دل چسپی قدرتی تھی اور چوں کہ وہ نظر بالغ اور ذہن رسا رکھتے تھے، اس لیے ان مسائل کا ان کا تجزیہ بیشتر مبنی بر صواب ہوتا تھا۔ قدیم اور جدید تعلیم کے مقاصد، افادات اور نتائج پر بہت کچھ کہا اور لکھا گیا ہے۔ سرور صاحب کا کہنا تھا:

'' کلاسیکی دور میں جو برا بھلا نظامِ تعلیم تھا وہ اگرچہ جانو، یاد کرو اور دہراؤ (Learn, Remember

www.taemeernews.com

and Repeat) کے اصول پر تھا مگر اس میں ایک بنیادی مضبوطی ضرور تھی، وہ ایسا یک طرفہ بھی نہ تھا۔ جدید تعلیم، اپنے سارے دعووں کے باوجود، بیدار ذہن پیدا نہیں کر رہی ہے، قدروں کا احساس نہیں دے رہی ہے اور علوم کے سلسلے میں ایک کھلی نظر عطا نہیں کر رہی ہے۔......

بقول ایلیٹ کے وہ معلومات زیادہ عطا کرتی ہے، علم کم اور اگر علم بھی دیتی ہے تو دانش مندی (Wisdom) نہیں دیتی۔"

اردو کے معلّم کی حیثیت سے انہوں نے اپنے ہم پیشہ اساتذہ کو دوسری زبانوں کے ادب سے بہرہ ور ہونے کی ترغیب دی ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے ہڈسن کا یہ قول نقل کیا کہ "وہ انگریزی ادب کو کیا جانتا ہے جو صرف انگریزی ادب کو جانتا ہے۔" اس قول کی صداقت سے انکار ممکن نہیں۔ صرف کسی ایک زبان اور ادب سے واقفیت حاصل کرنے کے بعد مطمئن ہو جانا اور یہ سمجھ لینا کہ اب کچھ اور جاننے کی ضرورت نہیں ہے کوتاہ اندیشی کی دلیل ہے۔

خود نوشت سوانح عمری میں "میں" کی تکرار ناگزیر ہے۔ تاہم خواب باقی ہیں میں بعض مقامات پر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس "میں" کی لَے ضرورت سے زیادہ تیز ہو گئی ہے۔ یہ احساس سب سے بڑھ کر سرور صاحب کے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی ملازمت کے دوسرے دور کے احوال میں ہوتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اس زمانے میں سرور صاحب ذاکر صاحب اور زیدی صاحب کے بہت قریب رہے اور یہ دونوں یونیورسٹی کے مسائل میں ان سے یقیناً مشورہ کرتے ہوں گے، پھر بھی انہوں نے بعض اہم فیصلوں کا کریڈٹ لینے کی کوشش کی ہے۔

سرور صاحب نے یہ کتاب ۱۹۹۹ء میں مکمل کی تھی۔ اس وقت ان کی عمر ۸۸ برس کی تھی۔ اس عمر میں خواب دیکھنے کی صلاحیت بہت کم لوگوں میں باقی رہ جاتی ہوگی۔ آدمی جب خواب دیکھنا چھوڑ دیتا ہے تو اس سے زندگی گزارنے کا ولولہ چھن جاتا ہے۔ سرور صاحب اس حوصلے اور ولولے سے کبھی محروم نہیں ہوئے۔ شاید ان کی طویل العمری کا ایک سبب یہ بھی تھا۔ ان میں حسن سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت بھی آخر تک برقرار رہی۔ اس کے شواہد اس کتاب میں جا بجا ملتے ہیں۔ وہ عمر کی آخر منزل تک پہنچنے پر لکھتے ہیں:

"برسات میں شام کی شفق اب بھی نظر میں رنگ بھر دیتی ہے، ہرے ہرے کھیتوں کی ہریالی اب بھی آنکھوں کو تازگی بخشتی ہے، صبح کو چمن میں چڑیوں کا چہچہانا بہت اچھا لگتا ہے، اچھی صورت پر نظر ٹھہر ہی جاتی ہے، کوئی پرانا دوست مل جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ جوانی لوٹ آئی......کوئی مزے کا فقرہ، کوئی اچھا شعر اب بھی وجد کی کیفیت پیدا کرتا ہے۔"

سرور صاحب نے کتاب کے آخر میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ان کی زندگی میں ان کی اتنی قدر شناسی نہیں ہوئی جتنی قدر شناسی کے وہ مستحق تھے۔

www.taemeernews.com

ان کا یہ احساس شاعری کے تناظر میں زیادہ گہرا ہے۔ ممکن ہے ہر کام کرنے والے کو عمر کی ایک خاص منزل تک پہنچنے کے بعد یہ احساس ہوتا ہو۔ تاہم ہم یہ سمجھتے ہیں کہ سرور صاحب اس معاملے میں اپنے بہت سے ہم مرتبہ ادیبوں، مصنفوں، شاعروں اور دانش وروں سے بہتر ہی رہے، کم تر ہرگز نہیں رہے۔ یہ سلسلہ ان کی موت کے بعد بھی جاری ہے اور یقین ہے کہ طویل مدت تک جاری رہے گا۔ کم کام کر کے زیادہ شہرت حاصل کرنے والوں کا چراغ اتنی مدت تک نہیں جلتا ہے، اتنی مدت تک سرور صاحب جیسے لوگوں ہی کا چراغ جلتا ہے کیوں کہ وہ اس میں اپنا خونِ جگر صرف کرتے ہیں۔

☆☆☆

www.taemeernews.com

ابوالکلام قاسمی*

اقبال تنقید اور آل احمد سرور

علامہ اقبال کی فکر اور شاعری کے بارے میں رطب و یابس تحریروں کا اتنا بڑا ذخیرہ دستیاب ہے کہ اس میں سے نمائندہ اور قابلِ قدر مضامین اور کتابوں کی نشاندہی کی کوشش مشکل معلوم ہوتی ہے۔ تاہم اس بات کا اندازہ بہ آسانی لگایا جا سکتا ہے کہ اقبال کے فکر و فن کو اس کے پورے سیاق و سباق میں سمجھنے کی اہم اور قابلِ توجہ کوششیں کن ماہرین اقبالیات کی تحریروں میں ملتی ہیں۔ آل احمد سرور کا نام بلاشبہ موخر الذکر زمرے میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ آل احمد سرور نے اقبال کی شاعری سے اپنی دلچسپی اور اس پر غور و فکر کا سلسلہ اقبال کی زندگی میں ہی شروع کر دیا تھا، مگر ان کی ابتدائی زمانے کی تحریروں میں تلاش و جستجو بلکہ تجسس کے رجحان سے زیادہ اور کچھ نہیں ملتا۔ اقبال کی منظوم و منثور تحریروں کی تفہیم اور ان تحریروں کی مدد سے پورے اقبال کے نقوش مرتب کرنے کی دیانت دارانہ کاوش۔ ظاہر ہے کہ اقبال جیسے متنوع اور ہمہ جہت مفکر اور شاعر کی تمام جہات تک رسائی حاصل کرنا اور ان کے فکر و فن کی رنگارنگی میں ترتیب و تنظیم کی جستجو میں کامیابی حاصل کر لینا کوئی آسان بات نہ تھی۔ چنانچہ انہوں نے اپنے بعض مضامین میں اپنی ان مشکلات کا ذکر بھی کیا ہے جن سے وہ ابتداء میں نبرد آزما رہے۔ لیکن اگر سرور صاحب کے اس نوع کے مضامین کو زمانی ترتیب اور تسلسل کے ساتھ سامنے رکھا جائے تو وہ گتھیاں کھلتی نظر آتی ہیں جن کو ہم اقبال فہمی کے مختلف مراحل کا نام بھی دے سکتے ہیں۔ انہوں نے اقبال پر اندازاً دو درجن مضامین، متفرق انداز میں لکھے ہیں، اور بیس مضامین کا مجموعہ ''دانش ور اقبال'' کے نام سے شائع کیا ہے۔ ان تحریروں میں ابتدائی برسوں کے مضامین کے علاوہ بیش تر مضامین میں اقبال کے افکار اور فنی اسرار و رموز کو دقتِ نظر سے سمجھنے کا رویہ ملتا ہے۔ کہیں اقبال کی مشرقیت کو موضوع بنایا گیا ہے تو کہیں اقبال اور اشتراکیت کے رشتے کی عقدہ کشائی کی گئی ہے، کسی مضمون میں تصوف کے حوالے سے اقبال کی فکر زیرِ بحث ہے تو کسی مضمون میں اقبال کے خطیبانہ لہجے کی نوعیت کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان مضامین میں

* پروفیسر و سابق صدر شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

www.taemeernews.com

مابعدالطبیعات اور اسلامی فکر کی تشکیل جدید، جیسے عالمانہ موضوعات سے لے کر تصورات کو شاعری بنانے کے مسائل تک، اپنے دائرۂ کار کو وسیع رکھا گیا ہے۔ مگر سرور صاحب کی اقبال فہمی کے ابتدائی مرحلے کے پس منظر کے طور پر ان کے ایک ایسے خط کا ذکر کرنا مناسب ہوگا جو اقبال کی تحریروں سے ان کی بچی دلچسپی کی نمائندگی کرتا ہے۔ ماہ نو (کراچی) کے خاص نمبر (۱۹۴۹ء) میں ''اقبال کا ایک غیر مطبوعہ خط'' کے عنوان سے سرور صاحب کا ایک نوٹ اور علامہ اقبال کے خط کی نقل شائع ہوئی تھی۔ اس میں سرور صاحب نے اپنے ایک ایسے خط کا ذکر کیا ہے جو انہوں نے اپنے ادبی سفر کے آغاز میں اقبال کو لکھا تھا۔ پورے خط کے مضمون کو خود انہوں نے اس طرح اختصار کے ساتھ بیان کیا ہے:

''بارہ سال کا عرصہ ہوا جب میں نے اقبال کو ایک خط لکھا تھا اس خط میں بہت سے سوالات تھے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے اوّل تو اشتراکیت اور فاشزم سے متعلق ان کی رائے دریافت کی تھی۔ دوسرے بعض نظموں میں جو تضاد نظر آتا ہے اس کی طرف اشارہ کیا تھا، تیسرے خاص طور پر ''بال جبریل'' میں مسولینی پر جو نظم ہے اس پر اعتراض کیا تھا اور اس کا مقابلہ ضرب کلیم کی نظموں سے کر کے دونوں کا فرق ظاہر کیا تھا، اس زمانے میں میرا ادبی شعور خاصا خام تھا۔ اقبال کا کلام بہت پڑھا تھا۔ مگر شروع سے آخر تک باقاعدہ مطالعہ نہ کیا تھا۔ ان کے لکچر نہ دیکھے تھے۔ اقبال کا قائل ہونے کے باوجود ان کے یہاں فاشزم کے اثرات جابجا نظر آتے تھے، اس لیے یہ خط لکھا گیا تھا۔''

سرور صاحب نے اپنے خط کا ذکر کرتے ہوئے اپنی ناپختگی کا بھی ذکر کیا ہے اور شروع شروع میں اقبال کی تمام تحریروں کا بالاستیعاب مطالعہ نہ کرنے کا بھی اعتراف کیا ہے۔ یہ بات اندازاً علامہ اقبال کی وفات سے ایک سال قبل یعنی ۱۹۳۷ء کی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک نوجوان اور نا آزمودہ کار متلاشی کا تجسس اور ایک سنجیدہ طالب علم کا دیانت دارانہ استفسار اس بیان سے نمایاں ہے جو بہر حال قابلِ قدر بھی ہے اور علمی تفحص پر دال بھی۔ یوں تو سرور صاحب کے سوالات کے جو جوابات علامہ اقبال کے خط میں ملتے ہیں وہ اپنی جگہ ان کے واضح نقطۂ نظر کو سامنے لاتے ہیں، لیکن اس خط و کتابت سے آل احمد سرور کے اس گہرے سروکار کا اندازہ بخوبی ہوتا ہے جو ان کی اقبال فہمی کے مختلف مراحل کو بھی نمایاں کرتا ہے اور اقبال سے ان کی بچی وابستگی کو بھی۔ علامہ اقبال نے ان کے خط کا قدرے تفصیلی جواب دیا تھا تاہم اس خط کے بعض نکات کو مختصراً یوں بیان کیا جا سکتا ہے۔

علامہ اپنے ۱۲ مارچ ۱۹۳۷ء کے جوابی خط میں لکھتے ہیں کہ:

۱۔ ''میرے نزدیک فاشزم، کمیونزم، یا زمانۂ حال کے اور ازم کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔ میرے عقیدے کی رُو سے صرف اسلام ہی ایک حقیقت ہے جو بنی نوع انسان

www.taemeernews.com

کے لیے ہر نقطہ نظر سے موجب نجات ہوسکتی ہے۔ میرے کلام پر ناقدانہ نظر ڈالنے سے پہلے حقائق اسلامیہ کا مطالعہ ضروری ہے۔ اگر آپ پورے غور اور توجہ سے یہ مطالعہ کریں تو ممکن ہے کہ آپ انہیں نتائج تک پہنچیں جن تک میں پہنچا ہوں۔ اس صورت میں غالباً آپ کے شکوک تمام کے تمام رفع ہو جائیں۔

۲۔ آپ کے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے میرے کلام کا بھی بالاستیعاب مطالعہ نہیں کیا۔ اگر میرا یہ خیال صحیح ہے تو میں آپ کو یہ دوستانہ مشورہ دیتا ہوں کہ آپ اس طرف توجہ کریں۔ کیونکہ ایسا کرنے سے بہت سی باتیں خود بہ خود آپ کی سمجھ میں آجائیں گی۔

۳۔ مسولینی کے متعلق جو کچھ میں نے لکھا ہے اس میں آپ کو تناقد (کذا) نظر آتا ہے۔ آپ درست فرماتے ہیں۔ لیکن اگر اُس بندۂ خدا میں DEVIL اور SAINT دونوں کے خصوصیات جمع ہوں تو اس کا میں کیا کروں ....

۴۔ آپ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے لکچرر ہیں۔ اس واسطے مجھے یقین ہے کہ آپ لٹریچر کے اسالیب بیان سے مجھ سے زیادہ واقف ہیں۔ تیمور کی طرف اشارہ محض اسلوب بیان ہے۔ اسلوب بیان کو شاعر کا حقیقی view تصور کرنا کسی طرح درست نہیں۔

آپ کے دل میں جو باتیں پیدا ہوئیں ہیں۔ ان کا جواب بہت طویل ہے اور میں بحالِ موجودہ طویل خط لکھنے سے قاصر ہوں''۔

نہیں معلوم کہ علامہ اقبال کے مشورے کے مطابق سرور صاحب نے حقائق اسلامیہ سے کتنی واقفیت بہم پہنچائی۔ مگر ان کی بعد کی تحریروں سے ثابت ہوتا ہے کہ انہوں نے اقبال کو حتی الامکان پورے سیاق وسباق میں دیکھنے اور سمجھنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ اس باعث مجنوں گورکھپوری یا ان کی قبیل کے بعض دوسرے ترقی پسند نقادوں کے اس اعتراض کے کھوکھلے پن کو سمجھنے میں وہ کامیاب ہوئے کہ اقبال کے یہاں شاہین کے استعارے پر زور اور جلال کی صفت پر اصرار گویا فسطائی رویے کی نمائندگی کرتا ہے۔ سرور صاحب نے بجا طور پر اس بات کی وضاحت کی کہ جلال کے ساتھ جمال، عقل کے ساتھ عشق اور طاقت کے جبروت کے ساتھ فقر وقناعت، کیوں کر انسان کامل کے ترکیبی عناصر بن جاتے ہیں، کہ ایک مرحلے پر یہ عناصر ایک دوسرے سے متصادم نہیں معلوم ہوتے بلکہ شخصیت کی تکمیل کرتے ہیں۔

علامہ اقبال ان خوش نصیب لوگوں میں سے ہیں جن کے افکار اور شاعری پر غور وخوض کا سلسلہ ان کی زندگی میں ہی شروع ہوگیا تھا۔ ان کے انتقال سے تقریباً پانچ سال قبل ۱۹۳۳ء میں ''نیرنگِ خیال'' کا اقبال نمبر شائع ہوا تھا، جس میں ان کی نثر ونظم کی جہات کا بڑی حد تک احاطہ کیا گیا تھا۔

www.taemeernews.com

لیکن یہ بات بھی اپنی جگہ درست ہے کہ ابتدائی زمانے میں ان کی شاعرانہ حیثیت سے کہیں زیادہ ان کا فلسفۂ زندگی زیرِ بحث رہا۔ آل احمد سرور کی تنقیدی تحریروں میں بھی ابتدائی دہائیوں میں اقبال کے افکار پر زیادہ توجہ ملتی ہے۔ چونکہ سرور صاحب شعروادب کے نقاد ہونے کے ساتھ ہمیشہ دانش ورانہ فکر کے شیدائی رہے ہیں، اس لیے اقبال کی دانش وری نے بھی ان کی توجہ اپنی طرف پہلے مبذول کرائی۔ ان کے مضامین میں دانش ور اقبال، اقبال کی مشرقیت، تشخص کا مسئلہ، اقبال اور جمہوریت اور اقبال کی سیاسی فکر جیسے موضوعات اس طرز فکر کی نمائندگی کرتے ہیں۔ تاہم ایسا نہیں ہے کہ سرور صاحب نے اقبال کی شاعرانہ حیثیت سے صرف نظر کیا ہو۔ لیکن انہوں نے نسبتاً بعد کے مضامین میں اقبال کی غزل گوئی، نظم نگاری اور فنی مسائل وموضوعات پر بھی تفصیل سے اظہارِ خیال کیا ہے۔ اقبال کی فکر کا جائزہ لیتے ہوئے سرور صاحب نے ان کے خطبات اور نثری بیانات کو جگہ جگہ موضوع بنایا ہے۔ ان کی شکایت ہے کہ اقبال کی صحیح تفہیم سے کہیں زیادہ ان کے لیے تحسین اور مبالغہ آمیز توصیف کا رویہ اپنایا گیا ہے۔ اقبال کی دانش وری پر گفتگو کرتے ہوئے وہ بجا طور پر قدر شناسی اور توصیفی طریق کار پر اپنے ردِعمل کا اظہار کرتے ہیں:

> ''اقبال نے شاعری کے علاوہ نثر میں بھی ایک حساس، بیدار مرتب اور منظم ذہن کا لافانی نقش چھوڑا۔ اس کی قدر تو بہت ہوئی مگر اس کا عرفان عام نہ ہو سکا۔ کیونکہ برِصغیر میں وہ ذہن جو ہندوستانی مسلمانوں کی پونجی ہے اور وہ تہذیبی میراث جو اردو ادب کے ذریعہ عام ہوئی ہے، ابھی تک پرستش کی دل دادہ ہے، عرفان کی نہیں، تحسین کی قائل ہے تجزیے کی عادی نہیں، ساحل سے نظارہ کرتی ہے سمندر میں نہیں اترتی، اسے صدف سے مطلب ہے گہر سے نہیں۔''

مگر اس بیان میں حسن بیان کا لطف تو ضرور موجود ہے، پورے مضمون میں خود بھی تجزیہ اور تحلیل سے سروکار نہیں رکھا گیا ہے۔ سرور صاحب اقبال کے افکار کا ذکر تو بار بار کرتے ہیں، لیکن اسرارِ خودی، رموزِ بےخودی، جیسی طویل نظموں اور شاعرانہ فکر سے آگے جانے کی زحمت گوارہ نہیں کرتے۔ سرور صاحب خود بھی اقبال کی مابعد الطبیعاتی فکر اور خطبات کی طرف بڑی مشکل سے متوجہ ہوتے ہیں۔ اقبال نے اپنے خطبات میں نص قطعی، احادیث اور فقہ کے جن نکات پر اپنی رائے دی ہے اور مسلمانوں کی عام فکر اور جبر و اختیار کے مسائل پر جس طرح اظہار خیال کیا ہے اس سے دور دور رہنے کی کوئی معقول وجہ سمجھ میں نہیں آتی، سوائے اس کے کہ اقبال نے اسلام کے ماخذ پر جس عبور کا مظاہرہ کیا ہے اس نوع کی دسترس اور مذہبی واقفیت کے بغیر خطبات پر قلم اٹھانا اپنے آپ کو آزمائش میں ڈالنے کے مترادف معلوم ہوتا ہے۔ سرور صاحب نے اقبال کی متصوفانہ فکر پر البتہ توجہ صرف کی ہے اور یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ''اقبال وحدۃ الوجود کے یکسر مخالف نہ تھے، اس کی عملی

www.taemeernews.com

تعبیر اور فلسفہ وشاعری میں اس کے منفی اثرات کے مخالف تھے''۔ یہاں شاید اس وضاحت کی چنداں ضرورت نہیں کہ ''ایران میں بعد الطبیعات کے ارتقا'' میں اقبال نے بنیادی طور پر اس بات سے سروکار رکھا ہے کہ وحدۃ الوجود میں بھگتی کے جو اثرات شامل ہوئے تھے ان کے باعث وحدۃ الوجودی فکر کے زیرِ اثر تقدیر کا غلط تصور رائج ہوا، اور اسی باعث انسان کو اس حد تک مجبورِ محض سمجھ لیا گیا کہ اس کے ارادہ واختیار کو بے معنی تصور کر لیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ تقدیر پرستی کی لے اس حد تک بڑھی کہ انسان کے اختیار کو ایک الزام اور ایک تہمت کے مترادف قرار دے دیا گیا۔ چونکہ اس تصور نے ایران اور ہندوستان میں مسلمانوں سے قوتِ عمل چھین لی اور انفعال، مجہولیت اور ناکردگی کو نیکی اور مثبت قدر کا بدل سمجھ لیا گیا، اس لیے اقبال مدلل انداز میں اس بات پر توجہ دلاتے ہیں کہ جبر واختیار کا اسلامی مفہوم کیا ہے اور کیونکر اپنی حالت کے بدلنے کی تدابیر کے بغیر صرف ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھنے میں کوئی خیر کا پہلو پوشیدہ نہیں۔ اس ضمن میں آل احمد سرور نے جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا کہ اسرارِ خودی کے دیباچے اور اقبال کے بعض خطوط کو حوالہ بنایا ہے۔ ظاہر ہے کہ اقبال اور تصوف کے موضوع پر اسرارِ خودی کے دیباچے میں محض بنیادی باتیں بیان کر دی گئیں ہیں، اس سلسلے کا اتمام حجت اقبال کے خطبات اور ان کے تحقیقی مقالے میں ملتا ہے، جن کے حوالے سے سرور صاحب کی تحریروں میں کوئی بات نہیں ملتی۔ اقبال نے واضح لفظوں میں لکھا تھا کہ ''عجمی تصوف جزو اسلام نہیں، یہ ایک قسم کی رہبانیت ہے، جس سے اسلام کو قطعاً تعلق نہیں اور جس کے اثر سے اسلامی اقوام میں قوتِ عمل مفقود ہو گئی ہے۔'' لیکن اقبال کے اس خیال سے ان کی تحقیق کا بنیادی تصور سامنے آتا ہے اور وہ بھی تصوف کے محض ایک مکتبِ فکر ''وحدۃ الوجود'' کے حوالے سے۔ جب کہ ''وحدۃ الشہود'' کے سلسلے میں اقبال ہر جگہ رطب اللسان ہیں اور اس تصور میں وہ عجمی اثرات کی شمولیت نہیں پاتے۔

آل احمد سرور نے تصوف کے حوالے سے اقبال کے تصورِ عشق کی بحث بھی چھیڑی ہے۔ وہ کبھی اقبال کے تصورِ عشق کو اردو یا فارسی غزل کے تصورِ عشق سے الگ قرار دیتے ہیں، کبھی بعض صوفی شاعروں کے عشق کو اقبال کے تصورِ عشق کا سرچشمہ بتاتے ہیں اور کبھی اسے محض غیر جنسی عشق کہہ کر اپنی بات مکمل کر لیتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ:

> ''عشق کا تصور جو میرؔ یا دردؔ یا غالبؔ یا اقبالؔ کے یہاں ملتا ہے، جنسی تجربہ نہیں ہے، اس سے بہت مختلف ہے۔ اقبال کے یہاں تو اس کا تصور اتنا بلند ہے کہ وہ پکار اٹھتے ہیں کہ
>
> عقل و دل و نگاہ کا مرشدِ اولیں ہے عشق
> عشق نہ ہو تو عقل و دیں بتکدۂ تصورات
>
> یعنی یہ عشق سے معنی میں عقل کی ضد نہیں بلکہ باطنی نظر ہے۔ حقیقت تک پہنچنے کا ایک وسیلہ اور رہنما۔''

اس بیان میں عشق کے حوالے سے اس قدر

www.taemeernews.com

خلط مبحث ہے کہ اس کی وضاحت خاصی تفصیل کی متقاضی ہے۔ تاہم یہ وضاحت یہاں ناگزیر معلوم ہوتی ہے کہ فارسی اور اردو شاعری میں عشق کا تصور یقینی طور پر حقیقی اور مجازی معنوں کا احاطہ کرتا ہے مگر میر ہوں، میر درد ہوں یا غالب، یہ سارے شعراء اسی تصور عشق کے پروردہ ہیں۔ جبکہ اقبال کا عشق ایک بالکل مختلف سیاق وسباق کا حامل ہے۔ اقبال کا عشق ایک قوت حیات ہے، اپنے مقصد اور مدعا سے غیر معمولی شغف ہے، اس کی تکمیل جمال کے ساتھ جلال سے اور غیر معمولی حرکت وعمل سے ہوتی ہے۔ اقبال کے اس تصور عشق کے رموز اس وقت تک ہمارے ہاتھ آ ہی نہیں سکتے جب تک ہم رسول کریمؐ اور قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کے خون جگر سے نمود پانے والے جذبے اور لگن سے اپنے آپ کو وابستہ کر کے نہیں دیکھتے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ قرطبہ کی مسجد جیسے عظیم فن پارے کو قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کے جذبۂ عشق کا زائیدہ بتانے پر اپنی نظم میں اس قدر زور صرف نہ کرتے اور سلسلۂ روز وشب کی تمام تعمیری اور تخریبی قوتوں کے لیے ع

عشق خود ایک سیل ہے، سیل کو لیتا ہے تھام

کا نام نہ دیتے۔ اس لیے ضرورت اس بات کی تھی کہ صوفیانہ تصور عشق اور مجازی تصور عشق سے الگ اقبال کے عشق کو اس کے مخصوص سیاق وسباق میں دیکھا جاتا اور اس کے شواہد اقبال کے کلام سے تلاش کیے جاتے۔

آل احمد سرور نے اپنے متعدد مضامین میں اقبال کی مشرقیت کے موضوع پر اظہار خیال کیا ہے۔ اقبال کو شاعر اسلام بھی کہا جاتا ہے اور شاعر مشرق بھی۔ دونوں باتیں اپنے اندر جزوی صداقت رکھتی ہیں۔ جہاں تک مشرقیت کا سوال ہے تو اقبال کے حوالے سے سرور صاحب، مطلق مشرقیت کے بجائے نئی مشرقیت کا نام تجویز کرتے ہیں۔ اس کا سبب سوائے اس کے اور کچھ نہیں معلوم ہوتا کہ سرور صاحب کو یہ اندیشہ ہے کہ اقبال کو محض مشرقیت کا دلدادہ قرار دینے سے، کہیں نئی مغربی روشنی سے ان کی محرومی کا تاثر نہ قائم ہو جائے۔ اس لیے ان کے نزدیک نری مشرقیت کوئی مستحسن چیز نہیں، البتہ نئی مشرقیت ان کے لیے مغربی تہذیب و آگہی سے واقفیت کا ثاثر بلکہ اس کا ردِعمل ہے۔ وہ اپنے ایک مضمون میں ''جدید اور مشرقی اقبال'' کے عنوان کے تحت رقم طراز ہیں کہ:

''......دوسری مشرقیت وہ ہے جو ہمیں اقبال کے یہاں ملتی ہے۔ یہ نئی مشرقیت ہے اور مغرب کے اثر سے وجود میں آئی ہے۔ یہ ہندوستانی نشاۃ ثانیہ کا عطیہ ہے۔''

اس سلسلے میں سرور صاحب نے سرسید کو ہندوستانی نشاۃ ثانیہ کا نمائندہ قرار دیا ہے اور اس خیال کا بھی اظہار کیا ہے کہ ''اگر سرسید نہ ہوتے تو اقبال بھی نہ ہوتے'' ہوسکتا ہے کہ سرسید کی تحریک اور نئی بیداری کا ردِعمل بقول سرور صاحب ''اقبال پر یہ ہوا ہو کہ انہوں نے سرسید کی طرح مغربی تہذیب اور مغربی تعلیم کو آئیڈیل بنانے کے بجائے جدید مغربی ثقافت کے کھوکھلے پن کا اندازہ لگانے کے بعد مشرقی اقدار حیات اور مذہبی بنیادوں پر غور وخوض کا سلسلہ نئے سرے سے شروع کرنے کی ضرورت محسوس کی ہو۔

www.taemeernews.com

اقبال نے جو یہ کہا کہ۔

کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق
نے ابلۂ مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند

......اس شعر کے ضمن میں بقول آل احمد سرور، ابلۂ مسجد کی وضاحت ''جامد مذہبی تصورات اور صرف عقائد وعبادات'' سے اور ''تہذیب کا فرزند'' کی تشریح کی تعبیر مغربی افکار واقدار کی تقلید اور اسی میں نجات کو محسوس کرنا'' جیسے رویوں سے کی جاسکتی ہے۔ ان وضاحتوں میں جامد مذہبی تصورات کی بات تو قابل فہم ہے لیکن عقائد وعبادات کی نمائندگی کرنے والوں کو اقبال کا ابلۂ مسجد قرار دینا کسی بھی طرح نہ قابل قبول ہے اور نہ اقبال کی پوری فکر کے حوالے سے قرین قیاس۔ اقبال نے اسلام کے اصولی معاملات کے سلسلے میں کبھی بھی کسی طرح کی مفاہمت کا رویہ اختیار نہیں کیا۔ ریاکاری اور ظواہر کا معاملہ بالکل الگ ہے، اور اقبال اس پر معترض بھی ہوتے ہیں۔ مگر عبادت وعقائد کو علی الاطلاق اقبال کا ہدف ثابت کرنا اقبال کے ساتھ ناانصافی کے مترادف ہے جس کی توقع کم از کم آل احمد سرور جیسے اقبال فہم سے نہیں کی جاسکتی تھی۔ اس تسامح کا حل ہمیں سرور صاحب کے مضمون ''اقبال اور نئی مشرقیت'' میں ملتا ہے جہاں انہوں نے ظواہر پرستی اور بے روح مذہبیت کو اقبال کا اصل ہدف بتایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''یہ بات واضح ہے کہ اقبال مثلاً
اکبر کی طرح مشرقیت کے علم بردار نہیں،
اور مشرق کے جمود، مزاجِ خانقاہی،
تقدیر پرستی اور بے عملی پر وار کرتے ہیں۔''

سرور صاحب نے مشرق کے حوالے سے اقبال کی ترجیحات کا ذکر اپنے مضامین میں جگہ جگہ کیا ہے مگر مشرق کی روحانیت کو مغرب کی مادیت، مشرق کے جمال کو مغرب کے جلال اور مشرق کے جذبے اور عشق کو مغرب کی تعقل پسندی اور بے روح مادی ترقی کے تناظر میں پیش نہ کرکے اقبال کی مشرق پسندی کے بنیادی سروکار کو نظرانداز کردیا ہے۔ سرور صاحب قصۂ جدید وقدیم کو دلیل کم نظری کہتے ہیں، مشرق سے بیزاری اور مغرب سے احتراز کی مخالفت کرتے ہیں اور ہر شب کو سحر کرنے کا مشورہ دیتے ہیں، یا پھر عشق کی بدولت کفر کو مسلمانی اور عشق کے بغیر مرد مسلماں کو کافر وزندیق کی صورت میں دیکھتے ہیں ـــــ یہ باتیں شاعرانہ اس لیے نہیں معلوم ہوتیں کہ یہ سرور صاحب کی اپنی اختراع نہیں بلکہ یہ تمام نکات اقبال کے مختلف اشعار کو نثری شاعری بنا کر پیش کرنے کی مثالیں ہیں۔ سرور صاحب کی تنقید میں جس آرائشی رائے زنی کو متعدد نقادوں نے تنقید کا نشانہ بنایا ہے اس کا ایک بڑا مظہر یہ بھی ہے کہ بسا اوقات اچھے اشعار کی تعین قدر کی بجائے وہ اپنی نثر میں شعری خیالات کو تبدیل کرنا شروع کردیتے ہیں اور اس طریق کار کو ادبی تنقید کا نعم البدل سمجھ کر مطمئن ہوجاتے ہیں۔ ذیل کے بعض فقروں سے اس انداز نقد کو بہتر طریقے سے سمجھا جاسکتا ہے اور ان اشعار کی بازگشت بھی محسوس کی جاسکتی ہے جو تنقید نگار کے رنگین اسلوب بیان کا محرک ہیں۔ اقبال کے بعض اشعار کی نثری صورتیں سرور صاحب کی تحریر میں آکر یہ ہوجاتی ہیں:

www.taemeernews.com

"اقبال ماضی پرست نہیں، ماضی شناس ہیں۔ ان کی نگاہ کوفہ و بغداد کی طرف نہیں وہ تازہ بستیاں آباد کرنا چاہتے ہیں ـــــ وہ دلکشا صدا پر زور دیتے ہیں مگر ان کا فن دل گدازی اور دلکشائی دونوں کو اہمیت دیتا ہے ـــ انہوں نے جہاں ابلہ مسجد پر طنز کی وہاں تہذیب کے فرزند پر بھی ــــ انسان کو طواف شمع سے آزاد اور اپنی فطرت کے تجلی زار میں آباد ہونا چاہیے ــــ"

مختلف شعروں کی مدد سے جملوں کی تراش وخراش کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ تنقید نگار کی تنقیدی منطق مفقود اور مدعا ضبط ہو جاتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ اسے تنقیدی بازآفرینی کا نام دیا جا سکتا ہے۔ یہ انداز تحریریوں تو سرور صاحب کی تنقید میں بہت عام ہے مگر اقبال کے معاملے میں اس لیے بھی زیادہ نمایاں ہو جاتا ہے کہ سرور صاحب کے لیے اقبال کی شاعری کا بڑا حصہ زبان زد معلوم ہوتا ہے، اس لیے اس کی بازگشت کا در آنا قدرے فطری بھی معلوم ہوتا ہے۔ مگر یہ انداز تحریر سرور صاحب کے مختلف اسالیب میں سے محض ایک اسلوب ہے۔ وہ کبھی کبھی نہایت منطقی اسلوب میں بھی نتائج کا استخراج کرنے پر قادر ہیں اور اپنے نتائج کو بسا اوقات اپنی ظاہری ترجیحات کے برخلاف بھی پیش کرنے میں تکلف محسوس نہیں کرتے ۔ وہ اسلام کو اقبال کی نگاہ میں ایک ایسا سوشلزم قرار دینے کے بعد کہ جس پر ابھی پوری طرح غور نہیں کیا گیا، اسلام کی روایت کو مشرق کی صالح اقدار کا نام دینے میں کسی مصلحت سے کام نہیں لیتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ:

"اقبال پر مغربیت کے اثر نے ان کی نئی مشرقیت کو جنم دیا۔ یہ نئی مشرقیت ماضی کے صالح عناصر وروحانی بصیرت کے ساتھ جمہوری خیر کے تقاضوں کو قبول کرتی ہے جس کی مغرب میں ایک شاندار داستان ہے، جو سائنس اور ٹکنالوجی کی برکتوں اور نعمتوں، دونوں کو پہچانتی ہے ــــ"

اقبال، اکثر مشرق کو اسلام کی مشرقی تعبیرات کے پس منظر میں پیش کرتے ہیں۔ اس باعث اسلامی تشخص کے مسئلے پر بھی اظہار خیال کرتے ہوئے رسول کریم کی زندگی کو اس پورے پس منظر میں عینی اور مثالی نمونہ قرار دیتے ہیں اور اپنی نام نہاد مغرب پرستی کو اپنے نتائج کی راہ میں حائل نہیں ہونے دیتے۔ لکھتے ہیں کہ:

"اسلامی تشخص ان (اقبال) کے نزدیک عرب کی شہنشاہیت کو اس فقر غیور سے ایک انحراف سمجھتا ہے جس کی مثال رسول اللہ ﷺ کی شخصیت میں ہے۔ اور جسے اسلام کی روح سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس میں جلال ہے مگر جمال کے ساتھ۔ اس میں قوت مقصود بالذات نہیں مگر، ایک اخلاقی مشن کو پورا کرنے کے لیے ضروری ہے۔"

کلیم الدین احمد نے اردو تنقید پر ایک نظر میں ، آل احمد سرور کی تنقید نگاری ، بلکہ تنقید میں

www.taemeernews.com

"ان کے اسلوب نگارش" پر تفصیل سے لکھا ہے۔ کلیم صاحب کو سرور صاحب کے یہاں گومگو کی کیفیت پر سخت اعتراض ہے اور وہ آل احمد سرور جیسے باشعور ادبی نقاد سے زیادہ منطقی، زیادہ مدلل اور غیر آرائشی زبان کا تقاضہ کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے سرور صاحب کے تنقیدی تصورات اور ان کے اطلاق سے بھی بحث کی ہے جس پر تفصیلی اظہار خیال کرنا اپنے موضوع سے صرف نظر کرنے کے مصداق ہو جائے گا، البتہ اس موقع پر کلیم صاحب کے ایک مشورے کا اعادہ کیا جا سکتا ہے جو انہوں نے "سخن ہائے گفتنی" میں دیا ہے۔ شاید پہلے یہ تحریر رسالہ معاصر پٹنہ میں شائع ہوئی تھی، جس میں سرور صاحب کے ایک تنقیدی ردعمل کا جواب دیا گیا تھا۔ کلیم صاحب کہتے ہیں کہ "میرا مشورہ ہے کہ سرور صاحب عام تنقیدی مضامین لکھنے کے بجائے کبھی کسی ایک غزل یا ایک نظم کو موضوع بنا کر عمیق و بسیط انداز میں بھی اس کا مطالعہ پیش کریں اور اسی مطالعہ کی بنیاد پر تنقیدی رائے قائم کریں۔ خدا جانے اس مشورے کے بعد سرور صاحب کا وسیع تنقیدی مطالعہ عمیق تنقیدی مطالعہ کی طرف متوجہ ہوا یا نہیں۔ لیکن اقبال کے سلسلے میں سرور صاحب نے عمق کے ساتھ بھی بعض فن پاروں کو جائزے کے عمل سے گزارا ہے۔ آل احمد سرور نے ایک مضمون "اقبال کا کارنامہ اردو نظم میں" کے عنوان سے لکھا ہے۔ نظم کا صنفی تصور، مغرب میں نظم کی ہیئت اور تکنیک اور مشرق میں نظم کی روایت، تینوں پہلوؤں سے مصنف کو پوری واقفیت حاصل ہے اور اس کے نزدیک کوئی بھی انداز نظم واحد مثالی انداز نظم نہیں۔ اس پس منظر میں سرور صاحب مغربی نظم کے "عضویاتی کل" والے نظریے کو کلیم الدین احمد کے توسط سے بحث کا موضوع بناتے ہیں۔

> "کلیم الدین احمد نے نظم کے لیے
> ناگزیر ربط اور ناگزیر ترتیب کی شرط لگائی
> ہے، مگر میرے نزدیک یہ نظم کا میکانکی
> تصور ہے۔ شاعری میں مسلسل پرواز بھی
> ہوتی ہے اور جستوں اور پروازوں کا
> ایک سلسلہ بھی ـــــ کلیم الدین احمد نے
> ارتقائے خیال کا بھی ذکر کیا ہے...... پو،
> نے تو ہر طویل نظم کو مختصر نظموں کا مجموعہ
> قرار دیا ہے۔ مغرب میں جس طرح نظم کا
> ارتقاء ہوا ہے اس طرح ہمارے یہاں
> نہیں ہوا" ـــــ

سرور صاحب کا کہنا ہے کہ "اگر ان نظموں کے موضوع اور اقبال کے ادبی ماحول اور ابلاغ کی ضروریات کو ملحوظ رکھا جائے تو کلیم الدین احمد کے اعتراضات بے جا معلوم ہوتے ہیں" وہ مزید کہتے ہیں کہ "کلیم الدین احمد مشرقی اور ہندوستانی روایت کا سرے سے لحاظ نہیں رکھتے"۔ سرور صاحب کی نظر میں "شاعری کا شاعری ہونا پہلے ضروری ہے بعد میں خواہ وہ اچھی شاعری ثابت ہو، خطیبانہ شاعری قرار پائے یا اسے اعلیٰ شاعری کے نام سے یاد کیا جائے" ـــــ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود کلیم الدین احمد کی بات اپنی جگہ برقرار رہتی ہے۔ اگر سرور صاحب کو غزل کی صنف کے تعین کا حق اس لیے حاصل ہے کہ یہ صنف فارسی اور اردو میں ایک روایت کی شکل

www.taemeernews.com

اختیار کر چکی ہے اور کوئی خواہ اس کی زیرہ خیالی پر اعتراض کرے یا افکار پریشاں پر، یہ صنف مخصوص ہیئت سے ہی پہچانی جاتی ہے اور اسی ایجاز و اختصار میں علامتی اظہار کا جواز پوشیدہ ہے اور یہی کفایت لفظی اس صنف سخن کو طول کلامی سے اجتناب کا ہنر سکھاتی ہے۔ تو کلیم الدین احمد کو بھی یہ حق حاصل ہونا چاہیئے کہ وہ مغرب میں ترتیب یافتہ صنف ''نظم'' کے مصرعوں کی ناگزیریت، ترتیب اور ربط وغیرہ کو اس صنف سخن کی تنقید کی اساس بنائیں اور عضویاتی کل، جیسے عناصر کو کسی نظم میں تلاش کرنے کی کوشش کریں۔ لیکن جو بات سرور صاحب کے حق میں جاتی ہے وہ یہ ہے کہ ''نظم'' کی صنف محض مغرب کی صنف نہیں۔ مشرق میں غزل، قطعہ اور رباعی کے علاوہ تمام شعری اصناف، نظم کے بڑے کل کے مصداق کی حیثیت رکھتی ہیں۔ چونکہ قصیدہ، مرثیہ یا مثنوی وغیرہ نے بعض دوسرے فنی اور فکری لوازم کی آمیزش اور تعین سے اپنی حدیں متعین کر لی ہیں، تو کم از کم نظم یا جدید نظم کو اسی طرح مشرقی صنف کہہ سکتے ہیں جس طرح یہ ایک مغربی صنف ہے۔ اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ مغرب میں اس صنف کی کتر بیونت اور اس پر غور و فکر میں کئی صدیاں گزاری گئی ہیں۔ لیکن اردو نظم کے جائزے میں اگر ہم کلیم الدین احمد کی طرح مغربی تصور نظم کو واحد معیار بنانے کی کوشش کریں، تو اس طریق کار سے مشرقی نظم کو پورا انصاف نہیں دلایا جا سکتا۔ اسی طرح اگر سرور صاحب کی طرح مغربی اصولوں سے صرف نظر کر کے محض مشرقی اصولوں کی بنیاد پر اردو نظم کی تنقید کا اسلوب طے کر لیا جائے تو شاید یہ طریق کار غلط تو نہ ہو لیکن دوسرے نقطۂ ہائے نظر کی موجودگی میں نامکمل اور اکہرا تنقیدی طریق کار ضرور کہلائے گا ____ یہی وجہ ہے کہ سب سے پہلے کلیم الدین احمد نے اور قدرے بعد میں اردو کے بعض نمائندہ جدید نقادوں نے اردو نظم کو بھی مغربی تنقیدی پیمانوں کی بنیاد پر پرکھنے کی کوشش کی ہے۔ انگریزی میں ایف۔ آر۔ لیوس اور ان کے بعض معاصرین نے جس طرح نظم کو ایک 'عضویاتی کل' قرار دیا اور اس 'عضویاتی کل' کے اجزاء میں کسی عمارت کے اجزاء جیسا ربط دیکھنے کے بجائے کسی نمو پذیر درخت کی شاخوں اور پتوں جیسا ربط ڈھونڈھنے کی کوشش کی ہے تاکہ یہ اندازہ لگایا جا سکے کہ نظم کے ترکیبی عناصر نے ایا خیال یا موضوع کے اندر سے نمو پذیری حاصل کی ہے یا پھر اس کے اجزاء صرف خارجی طور پر اس سے وابستہ کر دیے گئے ہیں۔ آئی۔ اے۔ رچرڈس، ایف۔ آر۔ لیوس اور ایمپسن وغیرہ کے زیر اثر نئی مغربی تنقید نے چونکہ نظم کے تجزیے اور تشکیلی عناصر کی تلاش و جستجو میں نظم کی تنقید کو ایک نوع کا مخصوص طریقۂ کار بنا دیا، اس لیے تجزیے، تحلیل اور شعری عناصر ترکیبی پر توجہ دیئے بغیر اب کسی بھی صنف کی تنقید، عملی تنقید کے بجائے تصوراتی اور نظریاتی حدود سے آگے جاتی ہوئی نہیں معلوم ہوتی۔ اس سیاق و سباق میں سرور صاحب نے جہاں کہیں اردو نظم نگاری میں اقبال کی ہنر مندیوں کا ذکر کیا ہے وہاں کسی نہ کسی عنوان سے انہوں نے کلیم الدین احمد کے ان اعتراضات کا بھی حوالہ دیا ہے جن میں کلیم صاحب نے اقبال کی نظموں میں ربط و تسلسل کے فقدان، نظم میں بعض

www.taemeernews.com

غیر ضروری اشعار پابند کی شمولیت، خودی، عشق اور فقر کی تکرار اور اقبال کے خطیبانہ اسلوب پر سخت گیر تنقیدی رویہ اختیار کیا ہے۔ ان تمام اعتراضات کو کبھی سرور صاحب بسا اوقات کلیم الدین کا نام لے کر اور اکثر ان اعتراضات کا صرف پس منظر قائم کر کے جواب دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر سرور صاحب نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ''اگر نظموں کے موضوع اور اقبال کے ادبی ماحول اور ابلاغ کی ضروریات کو ملحوظ رکھا جائے تو کلیم صاحب کے اعتراضات بے جا معلوم ہوتے ہیں''۔ آگے اسی سلسلے کو جاری رکھتے ہوئے وہ کلیم صاحب کے اعتراضات کو بھول نہیں پاتے اور کچھ اس طرح جواب کا انداز اختیار کرتے ہیں:

> ''یہاں صرف یہ دیکھنا ضروری ہے کہ یہ شاعری ہے یا نہیں، یہ شاعری خطیبانہ بھی ہو سکتی ہے، اچھی شاعری بھی اور اعلیٰ شاعری بھی۔ بعض لوگ مشرقی اور ھندوستانی روایت کا سرے سے لحاظ نہیں رکھتے۔''

اس بیان کے پردۂ زنگاری میں سوائے کلیم الدین احمد کے اور کون معترض ہو سکتا ہے۔ اس بیان کے تین حصے ہیں۔ پہلا حصہ یہ کہ، کیا شاعری کو محض شاعری کی حیثیت سے تسلیم کر لینے سے تنقید کے سارے مسائل حل ہو جاتے ہیں۔ اس سلسلے کی دوسری شق یہ ہے کہ عام شاعری اور خطیبانہ شاعری کے لوازم کیا ہیں اور ایا خطابت کے لہجے کے باعث شاعری اپنی تہہ داری سے محروم ہو جاتی ہے، اور اس بیان کا تیسرا نکتہ یہ ہے کہ اقبال یا کسی بھی اردو کے شاعر کے مطالعہ میں کیا صرف مشرقی تصورِ شعر سے کام چلایا جا سکتا ہے؟۔ یا پھر یہ کہ مغربی طرز تنقید کو واحد معیار بنا کر اردو کی شاعری کی پرکھ کی کوشش ہمیں کن اور کیسے نتائج تک لے جا سکتی ہے؟ طرز استدلال سے صاف ظاہر ہے کہ سرور صاحب خطابت کو شاعری کے منافی قرار نہیں دیتے۔ انہوں نے اپنی تحریروں میں ایک سے زیادہ مقامات پر اقبال کی نظم 'طلوع اسلام' کے خطیبانہ لہجے کا ذکر کرتے ہوئے یہ وضاحت بھی کی ہے کہ اس نظم کی شعریت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ جہاں تک مغربی معیار نقد پر مشرقی فن پاروں کو پرکھنے کا سوال ہے تو اس سلسلے میں سارا الزام کلیم الدین احمد کے سر ہی کیوں رکھا جائے۔ خود سرور صاحب بھی ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کی شاعری کی تین آوازوں کو جا و بے جا تنقیدی اصول سے کہیں زیادہ تنقیدی محاورے کی حد تک پہنچا دیتے ہیں۔ اقبال پر لکھی ہوئی اہم اردو کتابوں کے مقابلے میں انگریزی زبان کی کسی کتاب کو بار بار اپنے حوالے کے طور پر زیر بحث لاتے ہیں اور آئی۔ اے رچرڈس کے جذباتی اور حوالہ جاتی معنی کی منطق کو حرفِ آخر کی طرح استعمال کرتے ہیں۔ اس جملۂ معترضہ کے بعد یہ عرض کرنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ کلیم الدین احمد اور آل احمد سرور کے تنقیدی نقطۂ نظر کا سب سے نمایاں فرق یہ ہے کہ کلیم الدین احمد مغربی پیمانوں کے اطلاق کے معاملے میں اردو زبان کی لسانی، تہذیبی، ثقافتی حتیٰ کہ تاریخی قدروں کو یکسر فراموش کر دیتے ہیں۔ جب کہ سرور صاحب کو اپنے ادب کی تہذیبی اقدار اور روایتی شناخت کا نہایت گہرا شعور حاصل

www.taemeernews.com

ہے۔ وہ کلیم صاحب کی طرح صدیوں سے پلی بڑھی اور راسخ صنفِ سخن 'غزل' کو یک قلم مسترد کر دینے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ جب کہ کلیم صاحب بہ ہوش حواس تمام ثقافتی اور تاریخی اقدار سے صرفِ نظر کر لینے کا ارتکاب کر گزرتے ہیں۔

آل احمد سرور نے اقبال کے لہجے سے بحث کرتے ہوئے ایک جگہ براہ راست شاعری اور بالواسطہ شاعری کی معنویت سے بحث کی ہے اور لکھا ہے کہ "اگر ہم بالواسطہ شاعری کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں تو اس کے معنی یہ نہیں کہ ہم براہ راست شاعری کو سرے سے نظر انداز کر دیں۔" ____ اگر سرور صاحب نے براہ راست شاعری میں شعری عناصر کی تلاش و جستجو کے موضوع پر قدرے تفصیل سے لکھا ہوتا تو توقع تھی کہ اس ضمن میں بعض عقدے مزید کھلتے۔

تاہم اس نکتہ کو نظر انداز کر کے شاعری کے مختلف اسالیب کی قدر و قیمت کو سمجھا ہی نہیں جا سکتا۔ اردو میں کچھ جدیدیت کے زیرِ اثر اور کچھ مغرب میں علامت پسندی اور ہیئتی تنقید کے نتیجے میں شاعری کے لیے جس طرح تہہ داری، استعارہ سازی اور بالواسطہ طرزِ اظہار کو ادبی ترجیحات کی حیثیت حاصل ہوئی، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بیانیہ اسالیب اور براہ راست اظہار سے متعلق مسائل بڑی حد تک پس منظر میں چلے گئے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ بیانیہ کی منطق، لہجے کی شناخت اور روزمرہ اور محاوروں پر مبنی لسانی ساخت بھی اپنے اندر شاعرانہ اظہار کا ایسا تنوع پیدا کر سکتی ہے جس کو شعریت کا ہی دوسرا نام دیا جا سکتا ہے۔ علم بلاغت میں ایک مفہوم کو ادا کرنے کے نت نئے اسالیب کا اپنایا جانا اہمیت رکھتا ہے، محض تہہ دار اسلوب اہمیت نہیں رکھتا۔ اس لیے شعری اظہار کے ہر رنگ اور ہر انداز میں شعریت کی تلاش تو ضرور کی جا سکتی ہے مگر شرط یہ ہے کہ تنقیدی تجزیہ اس شعریت کو پایۂ ثبوت تک پہنچائے اور اس کے لیے اصول و ضوابط کی تشکیل بھی کرے۔

اقبال کے خطیبانہ لہجے پر بعض بڑے کار آمد نکات بیان کرنے کے بعد "شکوہ اور جوابِ شکوہ" میں موجود خطابت کو وہ اقبال کی قوت بتاتے ہیں۔ ایسے موقعوں پر سرور صاحب کی تنقید جو یوں بھی تحسین سے اپنا دامن نہیں چھڑا پائی، غیر مشروط مداحی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ وہ اقبال کی توصیف میں تنقیدی توازن سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں اور اس طرح کے تاثراتی جملوں کی تخلیق میں بھی کوئی تکلف محسوس نہیں کرتے۔

> "میرا خیال ہے کہ اگر قرآن اردو میں نازل ہوتا تو اس کے لیے اقبال کی نظم یا ابوالکلام کی نثر منتخب ہوتی۔ یہ ذہن میں رہے کہ دونوں کے اسلوب میں برگزیدگی، جو صحیفوں کی زبان کی سنجیدگی، جو بلند آہنگی اور شمشیر کی تیزی ہے وہ خطابت کی دین ہے۔ خطابت اقبال کی کمزوری نہیں طاقت ہے۔"

ادبِ لطیف یا نثرِ لطیف لکھنے کا یہ انداز اقبال کی شاعری اور ابوالکلام آزاد کی نثر سے مصنف کی واقفیت کو تو ضرور ظاہر کرتا ہے مگر قرآن کریم کے اسلوب، لہجے، حتیٰ کہ محکمات اور متشابہات تک کے تنوع سے اس کی بے خبری اور لاتعلقی کو یقیناً بے نقاب کر دیتا ہے۔

www.taemeernews.com

سرور صاحب نے اقبال کی غزلوں پر بھی ایک ایسا مضمون قلم بند کیا ہے جس میں غزل کی زبان کو مرکزی نقطہ بنایا گیا ہے۔ اس مضمون میں یہ غلط نہیں کہا گیا ہے کہ اقبال کی غزل کے ذریعے اردو غزل کی زبان میں توسیع ہوئی ہے۔ لیکن یہ تشنگی بھی محسوس ہوتی ہے کہ اے کاش، مصنف نے اقبال کی لفظیات، مولف اور لسانی طریق کار کا قدرے تفصیلی تجزیہ کیا ہوتا۔ اس مضمون کا نصف سے زیادہ حصہ اردو غزل کی زبان کے عام مسائل پر صرف ہوا ہے اور نصفِ کم تر کو اقبال کی مردف اور غیر مردف غزلوں کے اعداد و شمار اور نظم کی زبان کو غزل میں اور غزل کی زبان کو نظم میں استعمال کرنے جیسی پیش پاافتادہ باتوں کے لیے وقف کر دیا گیا ہے۔ ویسے اس بات میں کوئی شک نہیں کہ زیر بحث مضمون میں سرور صاحب نے اقبال کی تلمیحات اور تراکیب کے ہجوم میں ان کے مدعا اور مافی الضمیر کو ہر جگہ بالادست دکھایا ہے اور اس نکتہ کو ان الفاظ میں سلیقے کے ساتھ نمایاں کیا ہے:

''تلمیحات، تراکیب، استعارات، تشبیہات کی کثرت کے باوجود ہیرے کی طرح ترشے ہوئے خیال اور فن پر پوری قدرت کی وجہ سے ان کی غزلوں کے الفاظ میں زبان پر وہ فتح اور اقلیم معنی پر وہ اقتدار ملتا ہے جو بڑی شاعری کی پہچان ہے۔''

سرور صاحب کا اسلوب بیان بلاشبہ بعض مقامات پر تنقیدی مقدمات اور استدلال کو کمزور کرتا ہے، مگر اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ تنقیدی مکتب فکر کے اعتبار سے تاثراتی اسکول سے علاقہ نہ رکھنے کے باوجود وہ اپنے موضوع کی بازآفرینی کی کوشش کی طرف زیادہ متوجہ رہتے ہیں۔ تخلیق کی بازآفرینی کے ساتھ سرور صاحب کا تہذیبی اور ثقافتی سیاق وسباق ان کی تنقید کو ایک بڑے تناظر کا حامل بنائے رکھتا ہے۔ اقبال کے معاملے میں ان کا تنقیدی امتیاز یہ ہے کہ انہوں نے اقبال کی شاعری پر کوئی باقاعدہ کتاب تو نہیں لکھی، لیکن اپنے معتدبہ مضامین میں کم وبیش اقبال کی فکر اور فن کے تقریباً ہر پہلو پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ اقبال کی ممتاز ترین نظموں کے امتیازات سے لے کر فکر و فلسفہ کی تاریخ میں اقبال کی انفرادیت تک کو سرور صاحب نے بصیرت افروز نقطۂ نظر اور پختہ کار شعور و عرفان کے ساتھ دیکھا ہے اور پورے اقبال کی بازیافت کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے —— اس پس منظر میں آل احمد سرور کا شمار ممتاز ترین اقبال شناسوں میں عرصے تک ہوتا رہے گا۔ ——

☆☆☆

www.taemeernews.com

الطاف احمد اعظمی*

اقبال شناسی اور پروفیسر آل احمد سرور

غالب اور اقبال اردو کے دو ایسے شاعر گذرے ہیں جن کی قدر شناسی اور عظمت سرائی کا عمل ہنوز جاری ہے اور ان کی فکر اور شاعری کے نئے نئے گوشے بے نقاب ہو رہے ہیں۔ غالب کے مقابلے میں اقبال کے یہاں فکر وفن کا تنوع، تابنا کی اور گیرائی اور گہرائی کہیں زیادہ ہے، لیکن اس حسن وخوبی میں خود غالب کی شاعری کے اثرات بھی دیگر اثرات کے ساتھ شامل ہیں۔

اقبال شناسوں میں آل احمد سرور صاحب کی حیثیت میر کارواں کی ہے۔ انہوں نے اپنی زندگی کا آغاز ایک شاعر کی حیثیت سے کیا۔ (سلسبیل اور ذوق جنوں ان کے شعری مجموعے ہیں) اس کے بعد وہ آہستہ روی کے ساتھ تنقید کے ایوان میں داخل ہوئے اور بالآخر اس کی صدر نشینی ان کے حصے میں آئی۔ اردو تنقیدات اردو ادب میں اسناد کا درجہ رکھتی ہیں۔ تنقیدی اشارے، تنقید کیا ہے، نئے اور پرانے چراغ، ادب اور نظریہ، مسرت سے بصیرت تک، ان کے وہ تنقیدی کارنامے ہیں جو اردو جیسی کم عمر زبان کے لیے جس کا تنقیدی سرمایہ کچھ زیادہ نہیں ہے، باعث افتخار ہیں۔

مطالعۂ اقبال میں آل احمد سرور کو اختصاص حاصل تھا۔ تقسیم ملک کے بعد جس کا الزام اوروں کے ساتھ اقبال کے سر بھی تھا، ان کے ساتھ عقیدت وشیفتگی کا برملا اظہار بڑی جرأت وہمت کا کام تھا لیکن اس پُرآشوب دور میں جن لوگوں نے اقبال شناسی کی شمع فروزاں کی ان میں سرور صاحب کو نمایاں مقام حاصل ہے۔ دوسرے اقبال شناسوں میں ڈاکٹر یوسف حسین خاں، مولانا عبدالسلام ندوی اور عالم خوند میری کے اسماء گرامی قابل ذکر ہیں۔ آل احمد سرور کی تین کتابیں، عرفان اقبال، اقبال اور ان کا فلسفہ اور اقبال کا نظریۂ شعر اور شاعری، اقبالیات میں اہم اضافہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔

ہم اس مضمون میں مؤخر الذکر کتاب[1] کے حوالے سے آل احمد سرور کی اقبال شناسی کا ایک اجمالی جائزہ لیں گے۔ کتاب مذکور اقبال کی دانش وفکر کی حامل شاعری کے طویل مطالعہ کا ماحصل ہے۔ اس مطالعہ میں سرور صاحب کے تنقیدی وجدان، ان کے پختہ تنقیدی

* پروفیسر جامعہ ہمدرد، وائس چیئرمین اردو اکاڈمی، دلی۔

www.taemeernews.com

شعور، ان کی ادبی بصیرت اور مشرق و مغرب کے ادبیات کی گہری واقفیت کے جواہر ریزے بکھرے ہوئے ہیں۔

اردو ادب کا کارواں نشیب و فراز کے مختلف مراحل سے گذر کر موجودہ مرحلے تک پہنچا ہے۔ سرسید کی تحریک کے زیر اثر مقصدی شاعری کو فروغ ملا، حالی کی شاعری اس نقطۂ نظر کی ترجمان ہے [۲] آگے چل کر رومانی تحریک نے اس تصورِ شعر و ادب کی مخالفت کی اور مجرد خیال پر جذبہ و جمال کے اظہار کو ترجیح دی۔ ۱۹۳۶ء میں ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوا تو اس نے رومانیت کی جذبات نگاری اور تخیل پرستی کی مخالفت کی اور ایک بار پھر ادب کے سماجی اور افادی پہلو کو اہمیت دی گئی۔ اس تحریک نے شعر و ادب میں اظہار بیان کی نئی جہتیں تلاش کیں، نئے تجربے کیے اور موضوعات و مضامین میں تنوع پیدا کیا لیکن ایک خرابی بھی پیدا ہوئی اور وہ یہ کہ ایک خاص نظریئے کی تبلیغ کی وجہ سے شاعری کا فنی اور جمالیاتی پہلو مجروح ہوا، شعریت پر نظریہ و پیام غالب آگئے۔ آگے چل کر اس بے اعتدالی نے پروپیگنڈے کی شکل اختیار کر لی اور شاعر اور ادیب ایک خاص نظریئے کے نقال اور ڈھنڈورچی بن گئے۔

بہر حال اس نظریاتی جبر اور سکہ بند شاعری کے خلاف ۱۹۶۰ء میں آواز بلند ہوئی اور اردو شعر و ادب کی دنیا میں ایک نئے طرز فکر کا آغاز ہوا جو آگے چل کر جدیدیت کے نام سے موسوم ہوا۔ اس نئے رجحان میں خیال کی فطری آزادی اور فرد کی اہمیت پر زور دیا گیا۔ دوسرے لفظوں میں شاعری کا رخ خارجی کے بجائے داخلی یعنی اظہار ذات پر مرتکز ہو گیا، اور ذات ہی کے حوالے سے مسائل کائنات زیر بحث آئے۔

اقبال کی شاعری زبان و بیان کی جدتوں کے باوجود اول الذکر خیال کی ہم نوا ہے یعنی اس میں ادب کے سماجی اور نظریاتی پہلو پر زور ہے۔ اقبال فن برائے فن یا خالص شاعری کے قائل نہیں تھے۔ ان کے مختلف شعروں میں اس نقطۂ نظر کا مکمل کر اظہار ہوا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

جس سے دل دریا متلاطم نہیں ہوتا
اے قطرۂ نیساں وہ صدف کیا وہ گہر کیا
شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو
جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا
بے معجزہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں
جو ضربِ کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا
(ضرب کلیم)

ہے شعرِ عجم گرچہ طربناک و دل آویز
اس شعر سے ہوتی نہیں شمشیرِ خودی تیز
افسردہ اگر اس کی نوا سے ہو گلستاں
بہتر ہے کہ خاموش رہے مرغِ سحر خیز
اقبال یہ ہے خارہ شگافی کا زمانہ
از ہر چہ بآئینہ نماید بہ پرہیز
(ضرب کلیم)

اقبال شاعری میں صرف حدیث دلبری کے قائل نہ تھے، اس طرح کی شاعری کو وہ بت گری اور بت پرستی خیال کرتے تھے [۳] ان کے نزدیک دلبری اور قاہری اور جلال و جمال کے

www.taemeernews.com

امتزاج سے اعلیٰ شاعری جنم لیتی ہے۔ حدیث دلبری کے قائلین سے فرماتے ہیں:

او حدیث دلبری خواہد ز من
رنگ و آب شاعری خواہد ز من
کم نظر بیتابیٔ جانم نہ دید
آشکارم دید و پنہانم نہ دید
از ہنر سرمایہ دارم کردہ اند
در دیار ہند خوارم کردہ اند
لالہ و گل از نوایم بے نصیب
طائرم در گلستانِ خود غریب
(نوائے مشرق)

ترا از خویشتن بیگانہ سازد
من آں آبِ طربناکی ندارم
بہ بازارم مجو دیگر متاعی
چو گل جز سینۂ چاکی نہ دارم
(نوائے مشرق)

نہ ہو جلال تو حسن و جمال بے تاثیر
ترا نفس ہے اگر نغمہ ہو نہ آتش ناک
مجھے سزا کے لیے بھی نہیں قبول وہ آگ
کہ جس کا شعلہ نہ ہو تند و سرکش و بیباک
(ضرب کلیم)

معلوم ہوا کہ اقبال کی شاعری پیامیہ شاعری ہے، وہ ایک مقصد اور نصب العین رکھتی ہے۔ وہ شاعری کو قوم میں حیات و قوت پیدا کرنے اور اس کو خواب گراں سے بیدار کرنے کا وسیلہ سمجھتے تھے۔ اس لیے ان کی نگاہ میں وہی شاعری اعلیٰ شاعری تھی جس میں دل گدازی ہو، اضطراب و التہاب ہو اور سوز و مستی کی کیفیت ہو:

حضورِ ملتِ بیضا تپیدم
نوائے دل گدازی آفریدم
ادب گوید سخن را مختصر گوئی
تپیدم، آفریدم، آرمیدم

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ
کہ میں ہوں محرمِ رازِ درونِ میخانہ
(بالِ جبریل)

عزیز تر ہے متاعِ امیر و سلطاں سے
وہ شعر جس میں ہو بجلی کا سوز و برّاقی
(بالِ جبریل)

کہہ گئے ہیں شاعری جزویست از پیغمبری
ہاں سنا دے محفلِ ملت کو پیغامِ سروش
آنکھ کو بیدار کر دے وعدۂ دیدار سے
زندہ کر دے دل کو سوزِ جوہرِ گفتار سے
(بانگِ درا)

فطرتِ شاعر سراپا جستجو ست
خالق و پروردگارِ آرزو ست
شاعر اندر سینۂ ملت چو دل
ملتی بے شاعری انبارِ گل
سوز و مستی نقش بندِ عالمی ست
شاعری بے سوز و مستی ماتمی ست
شعر را مقصود گر آدم گری ست
شاعری ہم وارثِ پیغمبری ست
(جاوید نامہ)

www.taemeernews.com

آدم گری کو شاعری کا مقصود قرار دینے کے باوجود اقبال فن کے تقاضوں سے بے خبر نہ تھے۔ وہ اس رمز سے بخوبی آگاہ تھے کہ پیام و مقصد بے تاثیر اور انجام کار لا حاصل ہے اگر وہ فن کے تقاضوں سے ہم آہنگ نہ ہو۔ بڑی شاعری خواہ وہ حدیث دلبری ہو یا نوائے سرافیل، فن کے آداب و اطوار سے چشم پوشی نہیں کر سکتی ہے۔ اقبال اس نکتہ سے بھی بخوبی واقف تھے کہ اعجاز فن خون جگر کے بغیر ہاتھ نہیں آتا، جیسا کہ اشعار ذیل سے بالکل واضح ہے:

رنگ ہو یا خشت و سنگ، چنگ ہو یا حرف و صوت
معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود
قطرۂ خونِ جگر سل کو بناتا ہے دل
خونِ جگر سے صدا، سوز و سرور و سرود
(بال جبریل)

خونِ دل و جگر سے ہے میری نوا کی پرورش
ہے رگِ ساز میں رواں صاحب ساز کا لہو
(بال جبریل)

جس روز دل کی رمز مغنی سمجھ گیا
سمجھو تمام مرحلہ ہائے ہنر ہیں طے
(ضرب کلیم)

ہر چند کہ ایجادِ معانی ہے خدا داد
کوشش سے کہاں مردِ ہنر مند ہے آزاد
خونِ رگِ معمار کی گرمی سے ہے روشن
مے خانۂ حافظ ہو کہ بت خانۂ بہزاد
بے محنتِ پیہم کوئی جوہر نہیں کھلتا
روشن شررِ تیشہ سے ہے خانۂ فرہاد
(ضرب کلیم)

پروفیسر آل احمد سرورؔ نے اقبال کے متذکرہ بالا نظریۂ شعر اور شاعری کا جائزہ نہایت دقتِ نظر اور باریک بینی سے لیا ہے اور اپنے مخصوص اسلوب میں اس کے فکری و فنی محاسن واضح کیے ہیں۔ اقبال کے نظریۂ شعر کی وضاحت میں لکھتے ہیں:

''اقبال کا نظریۂ شعر غزلیہ شاعری کا نہیں ہے۔ یہ نغمۂ جبریل یا بانگ سرافیل والا نظریہ ہے۔ اس نظریہ کے مطابق شاعری کا ایک مقصد اور پیام ہے۔ اس کا مقصد سلانا یا رلانا نہیں، بیدار کرنا ہے۔ اس کے پیچھے حیات و کائنات کا ایک فلسفہ اور ایک مذہبی فکر ہے۔''[۳۵]

جن اصحاب علم کے نزدیک پیامیہ شاعری ایک معمولی درجہ کی شاعری ہے یا پروفیسر کلیم الدین کے الفاظ میں فوجی باجے کے مشابہ ہے یعنی وقتی اور ہنگامی نوعیت کی چیز، ان کے اس خیال کی تردید کرتے ہوئے آل احمد سرور لکھتے ہیں:

''مقصد سے اختلاف ہو سکتا ہے مگر اگر مقصد شعر بن گیا ہو تو وہ منطق سے بڑھ کر کام آتا ہے۔ وہ قائل کرنے کے بجائے ساتھ لے لیتا ہے۔ جس طرح دانتے سے لطف اندوز ہونے کے لیے اس کی مذہبی فکر سے اتفاق ضروری نہیں ہے، جس طرح ملٹن کی آسمانی جنگ اور خدا اور شیطان کے معرکہ کی سیر میں ملٹن کے عقائد سے اتفاق ضروری نہیں، جس طرح ڈبلو۔ بی۔ یےٹس اور ٹی۔ ایس ایلیٹ

www.taemeernews.com

کے شاعرانہ کارناموں سے لطف اندوز ہونے کے لیے اور اس سے مسرت وبصیرت حاصل کرنے کے لیے ٹس کی اساطیری فضا اور ایلیٹ کی مذہبی فکر سے اتفاق ضروری نہیں، اسی طرح اقبال کے نظریۂ شعر کی عظمت کے سلسلے میں ان کے عقائد اور فکری بنیاد سے اتفاق یا اختلاف فیصلہ کن نہیں ہے۔ شعر کی دنیا بڑی وسیع، بڑی ہمہ جہت، بڑی پہلودار ہے۔ اس کی قلمرو پوری انسانی زندگی، اس کے تجربات، جذبات، احساسات اور واردات ہیں۔ شاعری میں بڑائی اسی وقت آتی ہے جب اس میں فکری گہرائی ہو جو جذبہ کی توانائی سے مل کر فکر و نظر کا چراغاں کر سکے۔'' [۴]

آگے مزید لکھتے ہیں:

''ہومر کی رزمیہ ہو یا فردوسی کا شاہنامہ، یونانی ڈرامہ ہو یا فارسی شاعری، افراد کی قسمت کا بیان ہو یا قوموں کے عروج و زوال کی داستان، قدروں کی کش مکش ہو یا جذبات کے زیر و بم کی مصوری، ان کے پیچھے کچھ نہ کچھ فکری میلان، انداز نظر، سفر میں منزل کا احساس، آغاز و انجام کا رشتہ ضرور ہوگا، غالب تک ہماری کلاسیکی شاعری میں مختلف جلوؤں کے ہجوم میں یا بے ثباتی دنیا کا تصور ابھرتا ہے یا اس بے ثبات زندگی کو کچھ اعلیٰ قدروں کے ذریعہ جاودانی بنانے کا تصور۔ ایک نہ ایک اخلاقی تصور ان شعروں میں بھی دکھائی دیتا ہے، پھر ایک سماجی شعور بھی۔ مگر اس اخلاقی اور سماجی شعور کی مجرد اہمیت شعر میں نہیں ہے جب تک کہ یہ جمالیاتی قالب میں نہ آئے۔'' [۵]

اقبال کی شاعری کسی مقام و منزل پر بھی ایک مخصوص مذہبی فکر اور پیام سے خالی نہیں ہے لیکن اس کے باوجود ان کی شعری عظمت تسلیم کی گئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ فکر رسا کے ساتھ گداز قلب کا جوہر بھی رکھتے ہیں۔ اعلیٰ شاعری کا وجود ان ہی دو عناصر کا ہمیشہ مرہون منت رہا ہے۔ آل احمد سرور نے بالکل بجا لکھا ہے کہ:

''ان کے یہاں فکر روشن کے ساتھ گداز دل اور شاعرانہ نظر بھی ہے۔ اس لیے پیمبرانہ شاعری یہاں شاعری کی بلندیوں کو چھو لیتی ہے۔ اقبال کو شکوہ تھا کہ ان کا حلقہ ان سے حدیث دلبری مانگتا ہے جبکہ وہ اسے شکوہِ خسروی دینا چاہتے تھے لیکن اس شکوہِ خسروی کی اتنی اہمیت نہ ہوتی اگر یہ حدیث دلبری بن کر نہ آتا۔ خالص شاعری یا فن کی شاعری سے بیزار ہونے کے باوجود وہ ساری عمر شاعری کرتے رہے۔'' [۶]

اقبال کی شاعری میں مضامین اور موضوعات کی جو کثرت اور تنوع ہے وہ اردو کے کسی اور دوسرے شاعر کے یہاں بمشکل ملے گا۔ ان مضامین میں جو بنیادی فکر کارفرما ہے وہ ان کا فلسفہ خودی ہے

www.taemeernews.com

جو وحدۃ الوجود کی ایک مبتذل صورت ہے۔ [۱] عقیدہ و فکر سے قطع نظر کر کے دیکھیں تو ماننا ہوگا کہ وحدۃ الوجود نے فارسی شاعری کی طرح اردو کی کلاسیکی شاعری کے ایک بڑے حصے کی تخلیق کی ہے۔ فارسی اور اردو شاعری دونوں میں جو خوش خیالی اور سرود و نغمگی ہے وہ اسی خیال کی آفریدہ و پروردہ ہے۔ مولانا روم کی مثنوی ہو یا حافظ کی غزلیں ہوں یا مرزا بیدل اور غالب کی متصوفانہ نکتہ سنجیاں، سب تصورِ وجودی کی دین ہیں۔ غالب کے یہ اشعار دیکھیں:

نہ تھا کچھ، تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

دل ہر قطرہ، ہے سازِ انا البحر
ہم اس کے ہیں، ہمارا پوچھنا کیا

ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسدؔ
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

اے ز وہم غیر غوغا در جہاں انداختہ
گفتہ خود حرفے و خود را در گماں انداختہ
دیدہ بیرون و درون از خویشتن پروا نگہی
پردۂ رسم پرستش درمیاں انداختہ

اقبالؔ کے فارسی اور اردو دونوں کلام میں وجودی خیال کی جلوہ گری ملتی ہے۔ بانگِ درا کی نظموں میں عقل و دل، آرزو، جگنو، سرگذشتِ آدم اور چاند کے علاوہ بعض غزلوں میں بھی یہ خیال پوری آب و تاب کے ساتھ نمایاں ہے۔ غزل کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

چھپایا حسن کو اپنے کلیم اللہ سے جس نے
وہی ناز آفریں ہے جلوہ پیرا نازنینوں میں

چمک تیری عیاں بجلی میں، آتش میں، شرارے میں
جھلک تیری ہویدا چاند میں، سورج میں، تارے میں

جو ہے بیدار انساں میں وہ گہری نیند سوتا ہے
شجر میں، پھول میں، حیواں میں، پتھر میں، ستارے میں

(بانگِ درا)

اقبالؔ کے فارسی کلام میں وجودی خیال کی جھلک پوری شدت کے ساتھ ظاہر ہوتی ہے۔ پیامِ مشرق، زبورِ عجم (گلشنِ راز جدید) جاوید نامہ، ارمغانِ حجاز (فارسی) میں اس خیال کی جلوہ آرائیاں اپنے شباب پر ہیں۔ پیامِ مشرق کے یہ اشعار دیکھیں:

کرا جوئی، چرا در پیچ و تابی
کہ او پیدا است تو زیرِ نقابی
تلاشِ او کنی جز خود نہ بینی
تلاشِ خود کنی جز او نیابی

جاوید نامہ میں ہے:

گفت تن؟ گفتم کہ زاد از گردِ رہ
گفت جاں؟ گفتم کہ رمزِ لا الٰہ
گفت آدم؟ گفتم از اسرارِ اوست
گفت عالم؟ گفتم او خود روبروست

ارمغانِ حجاز میں ہے:

خودی را از وجودِ حق وجودی
خودی را از نمودِ حق نمودی
نمی دانم کہ ایں تابندہ گوہر
کجا بودی، اگر دریا نہ بودی

www.taemeernews.com

آل احمد سرور نے اپنی کتاب ''اقبال اور ان کا فلسفہ'' میں اقبال کے فلسفۂ خودی سے بحث کی ہے لیکن یہ فلسفہ آگے چل کر جس طرح وحدۃ الوجود کے روپ میں ظاہر ہوا اس سے انہوں نے تعرض نہیں کیا ہے یا انہوں نے اس زاویہ سے ان کے فلسفۂ خودی کا جائزہ نہیں لیا ہے۔

سرور صاحب نے اقبال کی جن نظموں پر اپنی خصوصی توجہ مبذول کی ہے ان میں مسجد قرطبہ نمایاں حیثیت رکھتی ہے۔ اقبال نے بلا شبہ اس نظم میں اعلیٰ شاعری کی بلندی کو جا لیا ہے اور تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ موضوع خواہ کچھ بھی ہو اگر اس کو زبان و بیان کا جادو چھو لے تو وہ شعر بن جاتا ہے اور شاعری کی دنیا میں آفاقیت اور ابدیت کا حامل قرار پاتا ہے۔ مسجد قرطبہ فن تعمیر کا ایک معجزہ اس لیے بنی کہ اس میں خونِ رگِ معمار کی گرمی یعنی جذبۂ اخلاص اور سوز باطن شامل تھا، دوسرے لفظوں میں جذبۂ عشق نے سنگ و خشت کا لباس زیب تن کر لیا۔ حقیقت یہ ہے کہ فکر و فن کا کمال اسی وقت ظہور میں آتا ہے جب خونِ جگر کی لالہ کاری کا عمل اس میں شریک ہو۔ آل احمد سرور نے مسجد قرطبہ کے جائزہ میں اقبال کے فکر و فن کی سحر کاری اور معجز بیانی کا جس خوبصورتی کے ساتھ احاطہ کیا ہے وہ ان کا طرۂ امتیاز ہے، لکھتے ہیں:

''مسجد قرطبہ اقبال کی نظم گوئی کا تاج محل ہے۔ یہاں وقت، عشق، فن، مردِ مومن، عربی شہسوار، تاریخ اور کسی زمانے کے خواب میں فکری شاعری محسوس اور پر جوش اور وجد آفریں خیال کے سہارے ذہن میں ماضی، حال اور مستقبل کی ایسی دنیائیں تعمیر کر دیتی ہے کہ جن کے سہارے ہم ترفع، تطہیر، جلال و جمال، معنویت اور رمزیت کی نئی حدوں کو چھو لیتے ہیں ...... نظم ایک عظیم سوچ سے شروع ہوتی ہے اور جوش کی مختلف منزلوں سے گذرتی ہوئی پھر ایک عظیم سوچ پر ختم ہوتی ہے۔ اس نظم کی اہمیت اور معنویت صرف اس کے موضوع میں نہیں ہے، موضوع کو شعر بنانے میں ہے ...... اقبال اس نظم میں ثابت کر دیتے ہیں کہ عظیم فکر عظیم فن بن سکتی ہے بشرطیکہ فکر ایک طرف فرشتہ صید و پیمبر شکار و یزداں گیر ہو اور دوسری طرف فن کا وہ شیشہ جو ہر سفید کرن سے رنگوں کو قوسِ قزح بنا سکے۔ لفظ میں بادۂ رحیق کی مستی اور تیغ اصیل کی کاٹ بھر سکے اور پڑھنے والے کو رنگ و نور کی ان دنیاؤں میں لے جا سکے جن سے ذہن میں روشنی اور روح میں شادابی آتی ہے۔ یہ اشعار دیکھیے، ان کی حسن کاری تخیل کی کیسی پہنائیاں لیے ہوئے ہے۔''[۸۰]

تجھ کو پرکھتا ہے یہ، مجھ کو پرکھتا ہے یہ
سلسلۂ روز و شب صیرفیِ کائنات
تند و سبک سیر ہے گرچہ زمانے کی رو
عشق خود ایک سیل ہے، سیل کو لیتا ہے تھام

www.taemeernews.com

قطرۂ خونِ جگر سل کو بنا تا ہے دل
خونِ جگر سے صدا، سوز وسرور وسرود
تیرا جلال و جمال مردِ خدا کی دلیل
وہ بھی جلیل وجمیل، تو بھی جلیل وجمیل
کون سی وادی میں ہے، کون سی منزل میں ہے
عشقِ بلا خیز کا قافلۂ سخت جاں
نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

اقبالؔ کی ایک دوسری اہم نظم "ساقی نامہ" ہے جس میں سادہ بلاغت اپنے منتہائے کمال پر ہے۔ اس نظم میں بھی فکر کی گونا گونی کے ساتھ جوش اور جذبے کی وہی رو ملتی ہے جس نے مسجد قرطبہ جیسی لافانی نظم تخلیق کی۔ آلِ احمد سرورؔ لکھتے ہیں:

"اس نظم میں جو سحر البیان کی بحر میں ہے اور بزم موضوعات کے لیے زیادہ موضوع ہے، اقبالؔ نے اپنا فلسفۂ خودی، تصورِ ارتقاء اور نشانِ منزل سبھی سمو دیا ہے۔ نظریہ شعر بن سکتا ہے بشرطیکہ شاعر بڑا ہو اور افکار کی ثروت ہو۔ اس کا سب سے اچھا ثبوت یہ نظم ہے۔ پھر یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اقبال نے یہاں استعارات اور تشبیہات اور رمز وکنایہ کو بقدرِ ضرورت استعمال کیا ہے اور بجلی کی طرح روشن خیال کو ہیرے کی طرح ترشے ہوئے اور لو دیتے ہوئے الفاظ میں بیان کیا ہے۔ ان اشعار میں شعریت کی تب وتاب دیکھیے:"[۹]

گیا دورِ سرمایہ داری گیا
تماشا دکھا کر مداری گیا
تمدن، تصوف، شریعت، کلام
بتانِ عرب کے پجاری تمام
یہ عالم، یہ بت خانۂ شش جہات
اسی نے تراشا ہے یہ سومنات
الجھ کر سلجھنے میں لذت اسے
تڑپنے پھڑکنے میں راحت اسے
اتر کر جہانِ مکافات میں
رہی زندگی موت کی گھات میں
گل اس شاخ سے ٹوٹتے بھی رہے
اسی شاخ سے پھوٹتے بھی رہے

اقبالؔ کی تیسری اہم نظم "جبریل وابلیس" ہے جس میں شاعری کی تیسری آواز مکمل طور پر ملتی ہے۔ ان دو علامتوں کی مدد سے اقبالؔ نے دراصل دو مختلف کردار پیش کیے ہیں جن میں سے ایک میں خود فتادگی اور نفی خودی اور دوسرے میں معاملہ اس کے برعکس ہے۔ اس نظم کی معنوی خوبیاں بیان کرتے ہوئے آلِ احمد سرورؔ لکھتے ہیں:

"یہ نظم گوئٹے کی شاعری کے درجہ تک پہنچ گئی ہے۔ ابلیس سے اقبالؔ کی یہ گہری دلچسپی اور ابلیس کی یہ ترجمانی صرف اقبالؔ کی منفی شاعرانہ صلاحیت کی آئینہ دار نہیں ہے۔ ابلیس اثباتِ خودی، زیرکی، پیہم تخلیق اور باغیانہ جذبے کی وجہ سے اقبالؔ کی روح کے تاروں کو چھیڑتا ہے۔

www.taemeernews.com

اقبال وصل کے مقابلے میں فراق کے قائل ہیں اور یہ معمولی بات نہیں کہ ابلیس ان کے نزدیک خواجہ وا ہلِ فراق ہے۔ اقبال بعض اوقات نظم میں تنظیم کا زیادہ لحاظ نہیں رکھتے مگر اس نظم میں ایسی چستی اور کفایت اور نفیس ہنرمندی ہے کہ روح وجد کرنے لگتی ہے...... اس نظم میں اقبال کے جذب و فکر کے گونا گوں پہلو سمٹ آئے ہیں اور بالآخر وہ آشوب نغمہ جسے انہوں نے سنبھال کر لامکاں کے لیے رکھا تھا، پختگی کو پہنچ کر ان کی پوری شعری اور فکری قوت کے ساتھ "جبریل و ابلیس" میں ابل پڑا۔"[۱۰]

ان تین نظموں کے علاوہ بانگِ درا اور بالِ جبریل میں جو بقول آل احمد سرور اقبال کی اردو شاعری کی معراج ہے[۱۱]، متعدد نظمیں ایسی ہیں جن میں اقبال کا فکروفن اپنی منفرد جوت جگاتا ہوا ملتا ہے۔ ان نظموں میں عقل و دل، شاعر، دل، تصویرِ درد، سرگذشتِ آدم، جگنو، نیا شوالہ، ابر، کنارِ وادی، خضرِ راہ اور بالِ جبریل کی نظموں میں ذوق وشوق، لینن، لالۂ صحرا، زمانہ، روحِ ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے، قابلِ ذکر ہیں۔ سرور صاحب نے بالِ جبریل کی مذکورہ نظموں پر سیر حاصل اور فکر انگیز بحث کی ہے لیکن یہاں گنجائش نہیں کہ ان پر گفتگو کی جائے۔

آل احمد سرور نے ایک دیانت دار ناقد کی حیثیت سے اقبال کی شاعری کی خوبیوں کے ساتھ ان کی بعض خامیوں کو بھی بیان کیا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ اقبال کے یہاں زندگی کے ایک ہی پہلو یعنی رجائیت پر جو مبالغہ کی حد تک اصرار ملتا ہے وہ کلی طور پر حقیقت پر مبنی نہیں ہے۔ زندگی میں حزن وقنوطیت بھی ایک زندہ حقیقت ہے اور اس سے صرفِ نظر نہیں کیا جاسکتا ہے۔ سرور صاحب لکھتے ہیں:

"اقبال کے ہاں رجائیت پر اصرار اور قنوطیت سے جو گریز ہے، وہ مجھے آسودہ نہ کر سکا۔ یہاں میرے نزدیک اقبال اپنے نظریئے کے شہید ہو گئے ہیں۔ یہ کہنا کہ رجائیت خیرِ محض ہے اور قنوطیت شرِ محض، میرے نزدیک سہل پسندی ہے...... اس سے قطع نظر کہ بقول شیلے ہمارے سب سے شیریں نغمے وہ ہیں جو سب سے زیادہ حزنیہ خیالات رکھتے ہیں۔ وہ غم جو مرد بنائے، اس رجائیت کے مقابلے میں بہت بلند ہے جو ہر بونے کو سورما ہونے کا یقین دلا دے اور زندگی کے پیچ وخم، عجائبات، تضادات، حادثات کو صرف ایک نعرے میں ہموار کرنے کا دعویٰ کرے۔ پھر ادب کا ایک نکتہ یہ بھی ہے کہ مسرت ہو یا غم، رجائیت ہو یا قنوطیت، بذاتِ خود یہ چیزیں بڑی نہیں ہیں، بڑی چیز زندگی کو استقامت کے ساتھ دیکھنا اور پوری زندگی کو دیکھنا ہے۔"[۱۲]

اسی طرح آل احمد سرور نے یہ شکوہ بھی

www.taemeernews.com

کیا ہے کہ آخری دور میں اقبال کی شاعری پر ان کا نظریہ غالب آ گیا اور فلسفہ اور پیام ان کے اعصاب پر سوار ہو گئے گو کہ اس دور کا پیام بھی شعریت سے خالی نہیں۔[۱۳]

ہم نے گذشتہ صفحات میں پروفیسر آل احمد سرور کی اقبال شناسی کا جو اجمالی جائزہ لیا ہے اس سے بالکل واضح ہو گیا کہ اقبال شناسوں میں ان کا مقام و مرتبہ، متعدد اعتبارات سے بہت بلند ہے۔ ان کی تنقید بصیرت افروز بھی ہے اور فکر انگیز بھی۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ اقبال سے غیر معمولی عقیدت و شیفتگی کے باوجود وہ کہیں بھی تعصب و تنگ نظری کا شکار نہیں ہوئے۔ نہ ہی اقبال کا فکر و فن ان کی تنقید کی راہ میں حائل ہوا اور نہ ہی ان کا مخصوص نظریۂ شعر۔ انہوں نے ہر چیز کو فکر و فن کے مسلمہ ادبی اصولوں کی روشنی میں دیکھا ہے اور ہر طرح کے خارجی پردوں کو ہٹا کر شاہدِ معنی کے مختلف جلوؤں کو جس طور پر بے نقاب کیا ہے وہ چیز ان کے ہم عصر ناقدوں کے یہاں نہیں ملتی۔ اس کی وجہ بھی ظاہر ہے۔ سرور صاحب کو جس طرح اردو کے کلاسیکی سرمائے اور فارسی ادبیات پر مکمل دسترس حاصل تھی اسی طرح مغربی ادب سے بھی وہ بخوبی واقف تھے۔ ان سب کے ساتھ ان کا بے مثل اسلوب بیان ہے جس نے ان کی تنقید میں لالہ و گل کی رعنائی، شبنم کی تازگی و درخشندگی اور نسیم صبح کے خرامِ دل نوازی کی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ لیکن بعض مقامات پر یہ اسلوب تنقید اپنی معروف روش سے ہٹ کر شاعری اور انشاء پردازی کی حد میں داخل ہو گیا ہے جو تنقیدی اعتبار سے بہرحال ایک عیب ہے۔ ایک نمونہ بطور مثال ملاحظہ فرمائیں:

> ''صرف سماجی یا اخلاقی شعر کا ہونا شعریت کی ضمانت نہیں ہے۔ شعریت، تخیل کی وہ پرواز چاہتی ہے جو مانوس جلوؤں میں نئے پہلو دکھائے، جو ماضی کو حال کی طرح زندہ اور چلتا پھرتا دکھا سکے، جو نئی کرنوں میں پرانے سورج دریافت کر سکے۔ جو ایک گزرتے لمحے کو جاودانی بنا سکے۔ جو واقعے کو بشارت، فرد کو علامت اور شخصیت کو ادارے میں تبدیل کر سکے، جو ذرے میں سورج دیکھ سکے اور جو مہر و ماہ کو دھرتی پر اگا سکے...... لفظ دنیا بن جائے، ترکیب نگار خانہ ہو جائے اور پڑھنے والا برضا و رغبت اپنے آپ کو اس سحر، اس اعجاز، اس بت طناز اور اس کرشمہ ساز کے حوالے کر کے یہ محسوس کرے کہ ہم اس سے محروم رہتے تو ہم میں کوئی کمی رہ جاتی، ہم آدمی رہتے، انسان نہ ہو پاتے، یا پھر انسانیت کی مالا جپتے رہتے، آدمی کے سوز و گداز کے محرم نہ ہو سکتے۔''[۱۴]

لیکن ہم کو یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ آل احمد سرور تنقید نگار کے ساتھ شاعر بھی تھے اس لیے ان کی تنقید میں شاعرانہ لب و لہجہ کی آمیزش میں حیرانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ ان کی تنقیدات میں اس نوع کا عنصر بہت تھوڑا ہے اور سنجیدہ تنقید نگاری کا حصہ زیادہ ہے۔ ان کے اسلوب تنقید کی پیروی ان کے عہد میں بھی

www.taemeernews.com

مشکل تھی اور اس کے بعد بھی۔ بلا شبہ وہ جامع کمالات تھے اور ایک اقبال شناس کی حیثیت سے ان کے نام اور کام دونوں کو ادبی تنقید کی دنیا میں چراغ رہ گزر کی حیثیت حاصل رہے گی۔

ماخذ و حواشی

۱۔ اقبال کا نظریۂ شعر اور شاعری، شائع کردہ شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، ۱۹۷۸ء۔ دراصل یہ ایک خطبہ ہے جو پروفیسر آل احمد سرور نے نظام اور خطبات، دہلی یونیورسٹی (۱۹۷۷۔۷۸ء) کے تحت دیا تھا۔

۲۔ حالی نے مسدس میں اردو کے قدیم شعری سرمائے کو شعر و قصائد کا ناپاک دفتر قرار دیا ہے کیونکہ اس میں حقیقت نگاری کی جگہ تصنع اور آورد ہے۔ ساری توجہ صنائی پر مرکوز ہے۔ انہوں نے شاعری کا نصب العین سچائی کی بازیافت قرار دیا ہے۔ مسدس ہی میں فرماتے ہیں:

اے شعر دل فریب نہ ہو تو تو غم نہیں
پر تجھ پہ حیف ہے جو نہ ہو دل گداز تو
صنعت پہ ہو فریفتہ عالم اگر تمام
ہاں سادگی سے آئیو اپنی نہ باز تو
وہ دن گئے کہ جھوٹ تھا ایمانِ شاعری
قبلہ ہو اس طرف تو نہ کچھ نماز تو

۳۔ اقبال کا نظریۂ شاعری ص ۳۹

۴۔ ایضاً ص ۴۰

۵۔ ایضاً ص ۴۱

۶۔ ایضاً ص ۹۵

۷۔ دیکھیں، اقبال اور وحدۃ الوجود، الطاف احمد اعظمی، سرسید فاؤنڈیشن، دہلی ۲۰۰۱ء۔

۸۔ اقبال کا نظریۂ شعر اور شاعری ص ۶۹

۹۔ ایضاً ص ۷۲

۱۰۔ ایضاً ص ۷۵

۱۱۔ ایضاً ص ۶۶

۱۲۔ ایضاً ص ۴۴، ۴۵

۱۳۔ ایضاً ص ۹۵

۱۴۔ ایضاً ص ۴۱، ۴۲

☆☆☆

www.taemeernews.com

علی احمد فاطمی*

آل احمد سرور کی اقبال شناسی ۔ ایک عمومی جائزہ

اقبال کے حوالے سے آل احمد سرور کے بارے میں جگن ناتھ آزاد نے کہا تھا:

''ہندوستان میں آزادی سے پہلے اقبال پر متوازن مضامین لکھنے والوں میں آل احمد سرور کا نام خاصی اہمیت رکھتا ہے ۔اب مجھے یاد تو نہیں کہ آزادی کے بعد ایک دو سال کے اندر سرور صاحب نے کون کون سے مضامین لکھے لیکن ان کے مضامین کو اہلِ نظر نے ہمیشہ قدرِ اوّل کے مضامین سمجھا اور آج بھی علامہ اقبال کے بارے میں ان کی تحریریں منارۂ نور کی حیثیت رکھتی ہیں ۔''

(آزادی کے بعد اقبال شناسی)

سرور صاحب نے یقیناً اقبال کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے ،آزادی سے قبل اور آزادی کے بعد کچھ زیادہ ہی' ان مضامین میں اس قدر تنوع اور رنگا رنگی ہے کہ کسی ایک مقالہ میں ان کی تمام جہتوں کو سمیٹ پانا مشکل کام ہے تاہم میں اپنی بات سرور صاحب کے نظام خطبہ' اقبال کے نظریہ شعر و شاعری' سے شروع کرنا چاہتا ہوں جو پروفیسر قمر رئیس صدر شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی کے زیرِ اہتمام منعقد ہوا اور شائع بھی ہوا (۱۹۷۸ء) ۔تقریباً سو صفحات پر مشتمل یہ خطبہ دو حصوں میں تقسیم ہے ۔ پہلے میں اقبال کے شعری نظریہ اور دوسرے میں اقبال کی شاعری ان کے نظریۂ شعر کی روشنی پر گفتگو کی گئی ہے ۔میری ناقص نظر میں ، اقبال سے متعلق سرور صاحب کے دوسرے مضامین کے مقابلہ یہ عالمانہ و ناقدانہ خطبہ ان کی اساسی فکر اور تفہیم اقبال کی بھرپور نمائندگی کرتا ہے ۔سرور صاحب نے غالباً پہلی بار اقبال کے تخلیقی و فکری سوتے تلاش کیے ہیں ۔ سرور صاحب صرف ایک ناقد ہی نہیں ، عالم بھی تھے اور انگریزی کے اسکالر بھی ،انہیں اس بات کا اندازہ تھا کہ انیسویں صدی کے نشاۃ الثانیہ میں سرسید، حالی، آزاد وغیرہ جس انگریزی ادب سے متاثر ہو رہے ہیں وہ تازہ ترین انگریزی میلانات نہیں بلکہ اٹھارویں صدی کا نوکلاسیکی ادب ہے لیکن ان لوگوں کے بعد وہ شعراء جو براہِ راست

* ریڈر، شعبۂ اردو، یونیورسٹی ، الہ آباد ۔

www.taemeernews.com

انگریزی اساتذہ اور زبان و ادب کا مطالعہ کر کے آئے تھے جس میں اقبالؔ پیش پیش تھے ان کا تاثر یقیناً گہرا اور روشن وسیع تھا۔ تبھی تو وہ لکھتے ہیں:

"اقبالؔ کے یہاں جو ابھرتا ہوا
ذہن ہم دیکھتے ہیں اس پر مذہبی اور صوفیانہ
میلان کے ساتھ سر سیدؔ کی عقلیت، حالیؔ
کے سماجی شعور، غالبؔ کی شوخیٔ فکر اور
مغرب کے رومان شعراء سب کا اثر ہے۔"

سرور صاحب صرف رائے نہیں دیتے بلکہ ثبوت بھی پیش کرتے ہیں۔ ۱۹۱۰ء میں بکھرے ہوئے خیالات کو پیش کرتے ہوئے وہ اقبال کے اس تصوّر رومان کو بھی پیش کرتے ہیں کہ جس کے بغیر اقبالؔ کے فلسفہ، مذہب اور سائنس کو بھی نہیں بھی سمجھا جا سکتا کیونکہ خود بقول اقبال:

"سائنس، فلسفہ، مذہب کے حدود ہیں
صرف فن ہی لامحدود ہے۔ فلسفہ بوڑھا بنا
دیتا ہے، شاعری دوبارہ شباب واپس
لاتی ہے۔ عورت مجھے خدائی سرزمین پر
سب سے زیادہ دلآویز شے لگتی ہے۔ شاعری
میں منطقی سچائی کی تلاش بالکل بیکار ہے۔
تخیل کا نصب العین حسن ہے نہ کہ سچائی۔"

اب اس حسن اور سچائی کو لے کر چاہے تو کوئی بحث کرے اور اکثر کی بھی جاتی ہے کہ شاعری کا تعلق صداقت، مقصدیت سے نہیں صرف حسن و جمال سے ہے اور اس سے زیادہ اظہار و احساس جمال سے ہے لیکن ایسے مباحث میں اکثر یہ بات نظر انداز ہو جاتی ہے کہ اگر صداقت کا تصور مبہم ہے تو اس سے زیادہ ابہام حسن کے تصوّر میں ہے۔ اس کا جواب بھی اقبالؔ کی شاعری ہے جو کسی لحہ صداقت اور مقصدیت سے الگ نہیں ہے۔ دراصل یہ دونوں تصورات مزید تفتیش طلب اور غور طلب ہیں جن پر ترقی پسند مفکرین نے اقبالؔ کے حوالے سے سنجیدگی سے غور کیا ہے جس میں خود سرورؔ صاحب بھی شامل ہیں۔ ذرا دیکھیے وہ اقبال کے فلسفہ کو رومان سے کس طرح معروضی انداز سے جوڑتے ہیں۔

"ان کے پہلے دور کی شاعری میں
موتیوں کی طرح بکھری ہوئی نظموں سے
جو مالا بنتی ہے وہ رومانیت کے دھاگے کی
ہے۔ اس رومانیت کو فلسفے نے محض ایک
شیریں دیوانگی ہونے سے بچا لیا اسے وہ
اعلا سنجیدگی سکھائی جو شروع سے نثر میں
مرتب و منظم اظہار خیال اور استدلال پر
قادر ہے اور جو فکر میں ایک گہرائی اور
سمت پیدا کرتی ہے۔ مذہبی اساس نے
ایک یقین کی دولت دی تھی۔ تصوّف نے
انسان دوستی، خدمت خلق اور حب جاہ و مال
سے بے نیازی یا ایک درویش منشی عطا کی
تھی۔ مغربی ادب کے مطالعے نے رومانی
نظر دی اور یہ رومانیت فطرت کے حسن
کے ساتھ انسان کی زبوں حالی کا بھی
احساس رکھتی ہے اور وطن کے ماضی و حال کا
بھی...... اقبال نے ورڈسورتھ کے اثر کا
اعتراف کیا ہے مگر شیلے کا بھی اثر واضح ہے۔"

سرورؔ صاحب سے قبل اکثر ناقدین نے

www.taemeernews.com

اقبال کے اس پہلو کو طرح طرح سے دیکھا۔ خلیفہ عبدالحکیم نے لکھا۔ ''اقبال کے شباب میں رندی اور عشق مجازی کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں لیکن اس نے کبھی ہوسِ محبت کو اپنے نفس پر مسلط نہیں ہونے دیا۔'' ڈاکٹر تاثیر نے لکھا ''اقبال کی رندی کوئی راز نہیں لیکن یہ رندی بیشتر لفظی اور خیالی رندی تھی جوانی کا زور تھا بس۔'' ایک واقعہ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ ۱۹۱۲ء میں جب وہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس میں شرکت کرنے لکھنؤ گئے تو ایک طوائف کا مجرا سننے چوک بھی گئے۔ یہ سرور صاحب ہی تھے جنہوں نے اقبال کی حسن پرستی کو رومان پروری اور رومان پروری کو معنی خیزی اور فکر انگیزی کے ایسے لباس پہنائے جو اس سے قبل ممکن ہی نہ تھے وہ انگریزی کے اسکالر تھے اس لیے اقبال کے ابتدائی ایام، عوامل ومحرکات کو جس طرح انہوں نے سمجھا اس سے قبل مشکل تھا۔ سرور صاحب اقبال کے ان ابتدائی ایام وآثار کو ان کے افکار کا سرچشمہ مانتے ہیں اور مغربی ادب میں رومانیت اور امیجینیشن کی جو تعریف کی گئی ہے اردو میں اس کا نقطۂ آغاز اور پرِ پرواز بھی۔ سرور صاحب نے بظاہر اقبال کی کمزوریوں کو ایک فطری شاعر کے تلاش حسن اور پرواز فکر کے حوالے سے دیکھا اسی لیے وہ بار بار کہتے ہیں کہ ان کے یہاں تشنگی ومحرومی نہیں بلکہ شادابی ہے لیکن ایک مخصوص خلش کے ساتھ اس لیے کہ وہ عام انسان نہ تھے بلکہ شاعر تھے اور ایک ایسا شاعر جس کے باطن کا رومان رفتہ رفتہ فکر وفلسفہ کا روپ لے رہا تھا۔ حالانکہ رومان خود اپنے آپ میں ایک، فلسفۂ حیات اور بعضوں کے نزدیک مقصدِ حیات بھی لیکن ادب کے ساتھ فلسفہ کا مطالعہ اس پر اقبال کی سنجیدگی، دردمندی اسے ایک دوسری ڈگر پر لے جانے کے لیے بیقرار تھی اور اس عمل نے اس وقت زور پکڑا جب وہ مغرب گئے۔ مغربی فلسفہ، تہذیب ومعاشرت، فنی حقیقت کا بغور مطالعہ کیا۔ پھر انہوں نے یہ بھی لکھ دیا کہ ''مغرب کی آب وہوا نے مجھے مسلمان کر دیا۔'' اقبال کے مسلمان ہونے پر بھی بحثیں ہوتی رہی ہیں اور ہوتی رہیں گی۔ مجنوں گورکھپوری، احتشام حسین، علی سردار جعفری غرض کہ ترقی پسندوں کے درمیان یہ بحث کل بھی تھی اور آج بھی اس کے سلسلے جاری ہیں لیکن سرور صاحب نے اقبال کو پہلے نطشے اور برگساں سے متاثر ہونے کی وجہ ان کی رومانی وجذباتی فکر قرار دی ہے کہ جس کے تحت وہ مسلمان ہوئے اور بہت بعد میں مارکس کے قریب آئے۔ آگے چل کر جب اقبال یورپ کے علم وحکمت سے مزید واقفیت حاصل کرتے ہیں اور گوئٹے کے ذریعہ انسانی حرمت و عظمت سے واقف ہوتے ہیں تو اس راہ پر بھی چلنے کے لیے بقول سرور جو زادِ راہ کی ضرورت پڑی وہ رومانیت ہی تھی جس کے ڈانڈے مذہب اسلام سے جا ٹکراتے ہیں بس اسی موڑ پر اقبال کی فکر، اس کی حقیقت نگاری، ماضی میں مراجعت ونیز مادیت وغیرہ کو لے کر بڑے سوال کھڑے ہو جاتے ہیں جو معاصرین ونا قدین اقبال کے مابین مسلسل متصادم رہتے ہیں۔ اقبال کی عظمت طرح طرح سے سوالیہ نشان بن کر الجھن اور اس کے بعد وژن کا حصہ بن جاتی ہے ایسے میں تنقید کا متوازن رہنا مشکل کام تھا لیکن سرور صاحب

www.taemeernews.com

نے اسے غیر جانب دارانہ، حقیقت پسندانہ زاویہ سے دیکھنے کی کوشش کی اور دوسروں کے مقابلے میں بہتر و متوازن راہ نکالی اس کی وجہ بقول قمر رئیس:

"وہ (آل احمد سرور) مشرق اور مغرب دونوں کے ادبی اور تہذیبی سرمایہ پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ دونوں کی زندہ اور مشترک فنی اقدار کو میزان بنا کر انہوں نے حسب ضرورت ادبی تنقید کے اصول وضع کیے۔ اپنی تصنیفی زندگی کے آغاز سے ہی وہ اقبال کے گرویدہ رہے ہیں لیکن یہ تعلق خاطر کسی بھی دور میں پرستش نہ بن سکا۔ اقبال سے گرویدگی کا یہ طور ان کی اقبال شناسی پر اثر انداز نہیں ہوا۔ اقبال کا مطالعہ انہوں نے اسی معروضی، فطری اور علمی ضبط و نظم سے کیا ہے جس طرح شعر و ادب کے دوسرے اظہارات اور موضوعات کو انہوں نے نقد و نظر کی کسوٹی پر پرکھا ہے۔"

(تعارفی تقریر نظام خطبہ)

یہی وجہ ہے کہ وہ اقبال کے ان ابتدائی حالات اور بالخصوص یورپ کے سفر کو واضح طور پر اس طرح لیتے ہیں کہ اقبال مسلمان ضرور ہوئے لیکن یورپ کے ہی اثر نے اول تو جارحانہ قوم پرستی کے خطروں سے آگاہ کیا، مادی ترقی اور خوشحالی ہی کو سب کچھ سمجھنے سے روکا، قوموں کے عروج و زوال پر غور کرنا سکھایا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ غالب سے بے حد متاثر ہونے کے باوجود زندگی کے صرف تماشائی نہ بن سکے بلکہ حالی کی طرح مقصدی اور پیامی شاعری کو اپنا مشن بنانے کی طرف مائل ہوئے۔ غالباً پہلی بار اقبال کے شعری مشن کو حالی سے ملانے والے سرور صاحب ہی تھے ورنہ غالب کی عظمت اور اقبال کی حرکت و حرارت کے درمیان حالی کا ذکر کون کرتا۔ یہ پہلی بار ترقی پسندوں کی دریافت ہوئی۔ سردار جعفری، احتشام حسین، ممتاز حسین وغیرہ نے بھی اقبال کے سیاسی اور سماجی محرکات میں ایسے ہی اشارے اور حوالے پیش کیے ہیں۔ ہر چند کہ اقبال کی فکر بہت جلد حالی کو پیچھے چھوڑ دیتی ہے اور پیچھے جا کر وہ رومی و حافظ کو اپنا لیتے ہیں۔ غور سے دیکھا جائے تو یہ ان کا رومانی ذہن ہی تھا جو دنیا کے عظیم اور با مقصد شاعروں کے درمیان ڈولتا پھرتا ہے۔ "حیات و کائنات" کی حقیقت تلاش کرتا رہتا ہے اور شاید اسی وجہ سے کہیں کہیں تصادمات اور تضادات کی سی کیفیت نظر آنے لگتی ہے جس کی نشاندہی اور انگشت نمائی بھی ہوتی رہی لیکن بڑا ذہن، بڑی پرواز، اکثر ٹکراہٹوں کا شکار ہوتی ہے۔ یہ صورتیں اس لیے بھی گڈمڈ ہو جاتی ہیں کہ اکثر نقاد اقبال کی شاعری کے حوالے سے کم ان کے ارشادات و بیانات کو سامنے رکھ کر اقبال کی فکر اور شاعری پر گفتگو کر جاتے ہیں، بظاہر اس میں کوئی حرج تو نہیں ہے لیکن اکثر یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ شاعر کی شاعری اور نثر نگاری میں بُعد اور تضاد ہوتا ہے۔ شاعری لاشعوری طور پر دل سے نکلی ہوئی آواز ہوتی ہے جبکہ نثر ارادی اور شعوری طور پر ظاہر ہوتی ہے۔ فن کار کو اس کے فن کے حوالے سے ہی جانچا پرکھا

www.taemeernews.com

جانا چاہیے۔ سرور صاحب کی اقبال شناسی کے تعلق سے یہ بات بھی مستحسن ہے کہ انہوں نے اقبال کو کلام اقبال میں تلاش کیا ہے، ہر چند کہ شاعری کا فن اکثر فکر کی مکمل پیش کش نہیں ہوتا۔ بقول جوش: ع

پوچھ شاعر سے کہ وہ کیا کہہ گیا کیا رہ گیا

تاہم وہ اقبال کے تعلق سے صاف کہتے ہیں:

''مجھے اقبال کے ان ارشادات پر اعتقاد ہے جو شعر میں ہیں۔ میرے نزدیک ان کے نثری بیانات کو اقبال کے وہ قطعی مثبت اور کچھ منجمد بیانات سمجھنا چاہیے جو فلسفی اقبال، پیامبر اقبال، معلم اقبال، دانش ور اقبال کی نمائندگی کرتے ہیں جو اپنی شاعری کو وظیفۂ حیات ایک مشق سمجھتے ہیں۔ لیکن فن بڑا کافر اور اس کا ایمان بھی بغیر کچھ کفر کی آمیزش کے مکمل نہیں ہوتا۔ شاعر کے بیانات میں یہ فکر ایک جذباتی کیفیت کی وجہ سے کچھ اور بڑی اور پھیلی ہوئی ہے اور میرے نزدیک زیادہ سچی معلوم ہوتی ہے...... اس سچ کو معلوم کرنے کے لیے صرف لفظ کے لغوی معنی کا علم کافی نہیں۔ اس کے جذباتی، رمزی، ایمائی اور علامتی پہلو کا عرفان بھی ضروری ہے کیونکہ بقول جگر سخن میں ایک بات ماورائے سخن بھی ہوتی ہے اور سخن وری ''سخن اور ماورائے سخن دونوں سے مل کر مکمل ہوتی ہے۔''

اگر چہ ایک طرف سرور صاحب اقبال کے فکر و خیال کو ترجیح دیتے ہیں لیکن اس بات پر زیادہ زور دیتے ہیں کہ اقبال شاعری کی ساحری کو تسلیم کرتے تھے۔ ان کے بارے میں یہ نتیجہ نکالنا غلط ہوگا کہ وہ الفاظ یا ان کی ترتیب اور حسن بیان کے قائل نہ تھے۔ دراصل وہ شعر محض اور صرف صناعی کو کمال شاعری نہیں سمجھتے۔ اس سلسلے میں وہ خود اقبال کے ایک مضمون کا حوالہ دیتے ہیں جس میں اقبال کہتے ہیں:

''استعارے کا میدان وسیع ہے۔ شاعر اہل زبان کے محاورات کا پابند ہوتا ہے اور یہ پابندی ضروری ہے لیکن اہل زبان کے تخیلات کی پابندی ضروری نہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ اگر متقدمین نے گلشن طور لکھا ہے تو ہم بھی گلشن طور ہی لکھیں۔''

اس کے علاوہ انہوں نے اچھی اور معیاری شاعری کی بابت لکھا ہے:

''وہ شاعری جو آرٹ کے حقیقی معیار پر پوری اترتی ہے پیغمبری کا جز ہے، وہ شاعری جو اس معیار پر پوری اترے یا نہ اترے لیکن فنی معیار پر پوری اترتی ہے، کامیاب شاعری ہے۔''

سرور صاحب نے تقریباً اپنے ہر مضمون میں اقبال کے نظریۂ شعر پر آزادانہ اور ناقدانہ بحث کی ہے۔ زبان و بیان کے ضمن میں اگر چہ وہ مقصدیت، ذوق حیات، امید و نشاط پر زیادہ توجہ دیتے ہیں لیکن سرور صاحب کا خیال ہے کہ یہ بھی ان کی رومانیت کا ہی حصہ ہے۔ وہ بار بار کہتے ہیں کہ اقبال کے یہاں

www.taemeernews.com

رومانیت ایک بہت ہزار شیوہ بن گئی ہے۔ آگے وہ لکھتے ہیں:

''یہ نظریہ زندگی کو آئینہ دکھانے والے شاعر کا نہیں ہے زندگی کو ایک خاص زاویہ سے دیکھنے والے شاعر کا ہے۔ یہ ایک ایسے شاعر کا نظریہ ہے جو صرف زندگی کی کثرت کے مظاہر اور اس کے نت نئے جلوؤں کی عکاسی پر قانع نہیں ہے بلکہ اس کی کثرت میں وحدت دیکھتا اور دکھاتا ہے۔ یہاں شاعری جذبات کی مصوری نہیں، جذبے اور فکر کی آمیزش یا فکر کے جذبہ بننے سے وجود میں آتی ہے۔''

آخری جملہ بے حد معنی خیز ہے: جذبات کب فکر اور فکر کب جذبات بنتے ہیں بہ الفاظ دیگر جذباتی فکر یا فکری جذبات کے تحلیل و تجسم کا عمل کیا ہے۔ کیا یہ محض کسی مفکر یا دانش ور کے ذریعہ ممکن ہے شاید نہیں یا شاید اس لیے کہ یہ خونِ جگر کی اس ہلچل کا نام ہے جس سے فن کے معجزہ کی نمود ہوتی ہے تبھی تو شاعر بار بار کہتا ہے:

رنگ ہو یا خشت و سنگ چنگ ہو یا حرف و صوت
معجزۂ فن کی ہے خون جگر سے نمود
قطرۂ خون جگر سل کو بناتا ہے دل
خون جگر سے صدا سوز و سرور و سرود

شعر کی دنیا بڑی وسیع، ہمہ جہت اور پہلودار ہوتی ہے۔ اس کی تہہ دار معنویت اور اس کا اشاراتی ترسیل نظام بذات خود ایک سسپنس اور رومان پرور ہوا کرتا ہے۔ بڑی شاعری جب رومانیت کے حوالے سے فکر و نظر کے چراغ روشن کرتی ہے تو معنی کی ایک دنیا آباد ہوتی ہے۔ خارج اور باطن دونوں سطح پر جمالیات کی بھی ایک دنیا آباد کرتی ہے کیونکہ فکر و نظر، حرکت و حرارت، حقیقت اور صداقت کی بھی اپنی جمالیات ہوتی ہے جو رومان کے حوالے سے عقل و خرد کے دروازے کھولتی ہے۔ تاریخ کے در پر دستک دیتی ہے اور خود تاریخ بن جاتی ہے۔ سرور صاحب کے اس خیال سے اتفاق کرنے کو جی چاہتا ہے کہ اخلاقی اور سماجی شعور کی مجرد اہمیت شعر میں نہیں ہے جب تک وہ لہو کی پکار نہ بنے......

شعریت تخیل کی وہ پرواز چاہتی ہے جو مانوس جلوؤں میں نئے پہلو دکھائے، جو نئی کرنوں میں پرانے سورج کو دریافت کر سکے، جو ایک گزرتے لمحے کو جاودانی بنا سکے، جو واقعے کو بشارت، فرد کو علامت، اور شخصیت کو ادارے میں تبدیل کر سکے، جو ذرّے میں سورج دیکھ سکے، جو مہر و ماہ کو دھرتی پر اگا سکے۔''

سرور صاحب کا یہ وہی انداز تحریر ہے جس کے لیے وہ شہرت رکھتے ہیں، جس پر یہ الزام عاید ہوتا ہے کہ وہ تنقید کے کھرے پن اور فیصلہ کن لب و لہجہ سے پرہیز کرتا ہے۔ سرور صاحب خود ایک اچھے شاعر ہیں، شعر کی رومانی و وجدانی کیفیت پر اچھی نظر رکھتے ہیں اس لیے اکثر ان کی تنقیدی تحریریں تاثراتی کیفیت کا شکار ہو جاتی ہیں لیکن اگر سرور صاحب کے باطن میں جھانکنے کی کوشش کی جائے تو اندازہ ہوگا کہ انھوں نے کسی بھی شاعر کو تنقید کے

www.taemeernews.com

بندھے ٹکے اصولوں سے کم بلکہ شاعر کے رومانی و وجدانی و نیز سماجی و اخلاقی حوالوں سے شعری نظر اور نظریہ کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ اقبال اور اکبر کے سلسلے میں یہ بات بطور خاص کہی جا سکتی ہے۔ سرور صاحب اس سے اتفاق نہیں کرتے کہ ہر بڑی شاعری آگے بڑھ کر صوفیانہ یا مذہبی ہو جاتی ہے حالانکہ ان حوالوں سے اقبال کو سمجھنا زیادہ آسان تھا۔ ان کا یقین ہے کہ وہ اور آگے بڑھ کر اور کچھ ہو یا نہ ہو اخلاقی ضرور ہو جاتی ہے۔ اس اخلاق کے رشتے بظاہر حالی سے جا کر ضرور ملتے ہیں جب حالی یہ کہتے ہیں کہ شعر اخلاق کا نائب مناب اور قائم مقام ہے لیکن سرور صاحب کا کہنا ہے کہ اقبال کا اخلاق عالمی اور کائناتی ہے اور مشرق و مغرب کے اعلیٰ ترین افکار و اقدار سے مستعار اور مزین جو آگے بڑھ کر جذبہ اور فلسفہ کا روپ لے لیتا ہے۔ ڈی۔ ایچ لارنس نے اچھی بات کہی ہے:

> ''آرٹ کی اصل غایت اخلاقی ہے
> مگر جذبے سے مملو مضمر اخلاق، پندو وعظ
> نہیں، ایسا اخلاق جو ذہن کے بجائے
> خون کی کایا پلٹ دیتا ہے۔ پہلے وہ خون
> میں تبدیلی پیدا کرتا ہے ذہن پھر آپ ہی
> آپ پیچھے کھنچا چلا آتا ہے۔''

سرور صاحب باوجود اس کے کہ بڑے شاعر کے بڑے شعری نظریہ میں حیات و کائنات کی راہیں تلاش کرتے ہیں اور اس کے تصور حیات میں ڈوبنا چاہتے ہیں لیکن ان تمام عوامل میں وہ جس بات کو سب سے زیادہ ضروری سمجھتے ہیں وہ ہے اس کا رومانی تجربہ، اسی لیے وہ کہتے ہیں:

> '' ہر شعری نظریہ کا مطالعہ کرنے
> کے لیے آدمی کو اس شاعر کے رومانی
> تجربے میں شریک ہونا پڑتا ہے اس کے
> ساتھ پرواز کرنا پڑتا ہے اس کے کرب کو
> بھوگنا اور اس کے زہر کو پینا ہوتا ہے اور
> اس کی مستی اور ہشیاری دونوں میں شریک
> ہونا ہوتا ہے۔''

اقبال سے متعلق بھی وہ یہی بنیادی رویہ اپناتے ہوئے کہتے ہیں:

> ''اقبال کے ساتھ شعر میں بلند پروازی
> کا Thrill، دھرتی اور آفاق کا نیا
> تناظر، ماضی، حال اور مستقبل کا ایک نیا
> صحیفہ ہاتھ آتا ہے اور انسان کی عظمت پر
> ایک نیا اعتماد پیدا ہوتا ہے، یہی اس کی
> معنویت کی دلیل ہے۔''

کوئی اس سے اتفاق کرے یا نہ کرے اس ضمن میں وہ رجائیت اور قنوطیت دونوں کو اہمیت دیتے ہیں اور شیلے کے اس خیال سے اتفاق کرتے ہیں کہ ہمارے سب سے شیریں نغمے وہ ہیں جو سب سے زیادہ حزنیہ خیالات رکھتے ہیں۔ اس پس منظر میں فانی پر لکھا ہوا ان کا مضمون عمدہ کوشش ہے لیکن اقبال کے تعلق سے انھوں نے امید و نشاط، خیر و شر اور تاریخ و تہذیب کے حوالے زیادہ دیے ہیں کہ اقبال نے اپنی شاعری میں انسانی عظمت، حسن اور صداقت کی تلاش کرنے کی کوشش اور اسے سرور صاحب نے رومان کی ایک نئی آواز کہا لیکن ساتھ میں یہ بھی کہا کہ یہ بھی

www.taemeernews.com

کوئی کامل اور جامع نظریہ نہیں اس لیے کہ ......
''ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں۔'' یہ بھی رومانی فکر اور پرواز تخیل کا ہی ایک حصہ ہے اس لیے کہ فکر و خیال، تخیل کی پرواز کسی ایک جگہ ٹھہرنے نہیں دیتا۔ خود اقبال اس کے قائل تھے، اور آل احمد سرور صاحب بھی۔ سرور صاحب کا یہ خیال ضرور تھا کہ نظریہ جامد شے ہے اور شاعری سیال لیکن ساتھ ساتھ وہ غالب کے حوالے سے یہ بھی کہتے ہیں، غیب سے بھی مضامین خیال میں آتے ہیں مگر یہ پردۂ غیب اس قدر آسانی نہیں جتنا کہ تصور کیا جاتا ہے۔ اقبال کے ذیل کے اشعار سے یہی مطلب نکلتا ہے:

سکوت شام سے تا نغمۂ سحر گاہی
ہزار مرحلہ ہائے فغان نیم شبی
کشاکش زم و گرما، تپ و تراش و خراش
زخاک تیرہ دروں تا بہ شیشۂ حلبی

سرور صاحب کی نگاہ تنقید میں اقبال ایک جذباتی آدمی تھے۔ قرآن کی آیات اور موسیقی کے کمالات دونوں سے ان کی آنکھوں میں آنسو آجاتے تھے۔ ذہانت، ذوق جمال، جذباتیت، انگریزی کے رومانی شعراء کے مطالعے نے مل جل کر ان کے یہاں ایک رومانی لے پیدا کردی۔ یہ سچ ہے کہ مذہب، تاریخ، فلسفہ وغیرہ نے ان کے مزاج میں ایک حکیمانہ میلان پیدا کردیا تھا۔ اس رومان اور میلان نے مل جل کر درمیان سے وہ راستہ نکالا جو سرور صاحب کے خیال میں رومانیت کا ہی تھا اس لیے کہ رومانیت میں تصوریت اور ماورائیت کے باوجود ایک غالب عنصر بغاوت کا ہوتا ہے خواہ وہ فنی قید و بند سے بغاوت ہو یا معاشرہ کے اصول و ضابطہ سے بغاوت ہو یا زندگی کو عمل اور مسرت کے حوالوں سے دیکھنے کی آواز اور اضطراب ہو۔ روسو نے بہت پہلے کہا تھا:

''انسان آزاد پیدا ہوا ہے مگر جہاں
دیکھو پا بہ زنجیر ہے۔''

معروف نقاد پروفیسر محمد حسن نے روسو کی اس آواز کو رومانیت کا مطلع کہا ہے۔ اس فلسفہ کے تحت روسو کے بعد کے مفکرین یہ سوچنے پر مجبور ہوگئے کہ انسان اصولوں اور کائنات کے ضابطوں کے لیے نہیں ہے بلکہ کائنات خود انسان کے لیے ہے۔۔۔ وہ شہنشاہ ہے جو اصولوں کو روندتا، ضابطوں کو ٹھکراتا اور فارمولوں کو اچھالتا نئی ترتیب اور نئے شعور کے ساتھ بڑھ رہا ہے۔ روسو کا یہ خیال عمرانیات تک محدود رہا لیکن نطشے، برگساں، فرائڈ وغیرہ نے بار بار اسی بات پر زور دیا کہ جذبات اتنے غیر عقلی نہیں ہوتے جتنی کہ ہماری سائنس سمجھتی ہے۔ جذبات اور وجدان وہ آگ پیدا کرتے ہیں جو کائنات کو نئے اجالوں سے روشناس کرتی ہے۔ ان صورتوں کو ذہن میں رکھیے اور اقبال کی شخصیت اور شاعری کا جائزہ لیجیے۔

خود محمد حسن نے اپنی کتاب 'اردو ادب میں رومانوی تحریک' میں نئی رومانویت کے ابتدائی معماروں میں اقبال کا نام سرفہرست لیا ہے اور صاف طور پر کہا:

''اقبال کی شاعری میں رومانوی اثرات بہت نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ ان کے ہاں جذبات اور وجدان کی

www.taemeernews.com

افراط اور غلبہ اس قدر زیادہ ہے کہ اگر ان کو رومانوی شاعر کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ اقبالؔ نے عقل اور عشق کے لفظوں سے نیا جہان بسایا، اس جہان کی تعمیر میں جذبہ اور وجدان کی بنیادی حیثیت ہے گو اس کی تکمیل کے لیے اطاعت اور جماعتی احساس کی ضرورت ہے یہاں یہ بات قابل توجہ ہے کہ اقبالؔ روسو کی طرح خودی کے بے پناہ جذبے کی شدت پر عقل کے ذریعہ نہیں عشق یعنی شدید تر جذبے کی مدد سے قابو حاصل کرنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ اقبالؔ نے جگہ جگہ جذبے اور وجدان کی بنیادی اہمیت پر زور دیا اور اس کے مقابلے آنے والے سنگ گراں ٹھکرائے ہیں۔''

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لب بام ابھی
اچھا ہے دل کے پاس رہے پاسبان عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

یہاں ہمیں وہی آرزو مندی ملتی ہے جسے رومانیت کا بنیادی عنصر قرار دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ شوکتِ باستان کا جو تصور بار بار اقبالؔ کے کلام میں جھلکتا ہے وہ رومانویت کی تقدس کو اور بھی واضح کرتا ہے۔

پروفیسر محمد حسن کے رومانویت سے متعلق یہ خیالات بعد میں آئے لیکن آل احمد سرورؔ ابتدا سے ہی اقبالؔ کو اسی رنگ میں دیکھتے آئے ہیں۔ اقبالؔ کی موت کے فوراً بعد غالباً ان کا پہلا مضمون 'اقبالؔ اور ان کا فلسفہ' ۱۹۳۹ء میں شائع ہوا جو ان کے تنقیدی مضامین کے پہلے مجموعہ 'تنقیدی اشارے' میں شامل ہے اس میں بھی وہ لکھتے ہیں:

''یہ کہنا کہ اقبالؔ محض ایک فلسفی تھے اقبالؔ کی بہت بڑی توہین ہے، فلسفی حقیقت کی خشک اور بے جان تفسیریں کرتا ہے، وہ کائنات کا ادراک صرف اپنے ذہن سے کرنا چاہتا ہے۔ وہ مادہ اور روح کی بحث میں الجھا رہتا ہے۔ زندگی کے تمام سرچشموں میں سے صرف عقل سے دلچسپی رکھتا ہے...... اس لیے اقبالؔ کو ہم اس معنی میں فلسفی نہیں کہہ سکتے۔ ان کا فلسفہ وہ ہے جو خونِ جگر سے لکھا جائے۔ وہ مستی احوال یا مستی گفتار کے قائل نہیں۔ مستی کردار پر جان دیتے ہیں۔ ان کا اپنا فلسفۂ حیات ہے۔ یہ فلسفۂ حیات نہ تو فقیر کی جھولی کی طرح ہے جس میں اِدھر اُدھر سے مانگ کر بھیک کے ٹکڑے جمع ہو گئے ہوں۔ نہ یہ خودرو ہے بلکہ اس میں ہمارے تمام سرمایۂ ذہنی کی ترقی یافتہ شکل ملتی ہے۔''

اس مضمون میں سرورؔ صاحب اقبالؔ کے سب سے بڑے فلسفۂ خودی کو بھی رومانویت کا حصہ قرار دیتے ہیں اور صاف کہتے ہیں کہ خودی

www.taemeernews.com

عشق و محبت اور فقر و استغنا سے مستحکم ہوتا ہے تو کائنات کی ساری قوتیں انسان کے قبضے میں آجاتی ہیں کیونکہ عشق میں جذبۂ تسخیر، جذبۂ تخلیق اور جذبۂ ارتقا تینوں پائے جاتے ہیں اور یہیں سے اقبال کا فلسفۂ عمل بھی شروع ہوتا ہے۔ اقبال شاہین کو بھی صرف خونریزی کے حوالے سے نہیں بلند پروازی کے لیے سمبل بناتے ہیں اور اسی سے حریت اور انسانیت کے رشتے بھی ملتے ہیں اسی لیے وہ اشتراکیت کی ہم نوائی کرتے ہوئے محنت اور مساوات کا علم بھی بلند کرتے ہیں۔ سرور صاحب کے اس مضمون کے تین چار سال بعد ہی ان کے ہم عصر دانش ور اور صف اول کے ترقی پسند ادیب و ناقد احتشام حسین نے بھی اقبال بحیثیت شاعر اور فلسفی کے عنوان سے مضمون لکھا (۱۹۴۴ء) جس کی ابتدا یوں کرتے ہیں:

> ''اگر شاعری روح کی بلند پروازی
> کے لمحات میں گایا ہوا گیت ہے تو اقبال
> حسین اور نایاب پُر اثر اور پُر جوش گیتوں
> کے شاعر تھے۔''

خیال رہے کہ اس جملہ کی ابتدا 'اگر' سے ہوتی ہے...... اس لیے کہ احتشام حسین جس طرح کا ترقی پسند ذہن رکھتے تھے اور وجدان کے مقابلے عقل کو ترجیح دیتے تھے، روح سے زیادہ دماغ پر یقین رکھتے تھے غالباً اسی لیے گفتگو تیقن کے بجائے تشکیک سے شروع ہوتی ہے یہ الگ بات ہے کہ جلد ہی وہ اس تشکیک کو اس عہد کی مبہم اور غیر واضح صورتوں میں تبدیل کر دیتے ہیں اس لیے کہ احتشام حسین کا کوئی بھی مطالعہ تاریخ و تہذیب کے بغیر مکمل نہیں ہوتا ہے۔ یہی وہ راہ علم و عمل ہے اور خط امتیاز بھی جو سرور اور احتشام کو الگ الگ کرتی ہیں کہ سرور کا عملی ذہن اپنی رومانی اور وجدانی کیفیتوں کی وجہ سے بدلتا رہتا ہے اور ہر طرح کی تبدیلی کو قبول کرتا چلتا ہے خواہ وہ جدیدیت ہی کیوں نہ ہو لیکن احتشام حسین کی پہچان ہی ان کا منفرد مستحکم نظریۂ ادب اور نظریۂ حیات ہے جو سرور صاحب سے کئی مماثلتوں کے باوجود الگ ہے۔ وہ پورے عہد کو مادی، اخلاقی مسائل سے آنکتے ہیں اقبال کی حقیقت پسندی پر زور دیتے ہیں۔ وہ حقیقت کے حوالے سے رومانیت تک پہنچتے ہیں جبکہ سرور صاحب رومانیت کے حوالے سے حقیقت کا عرفان حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ غالباً منزل دونوں کی ایک ہے لیکن راستے الگ الگ ہیں۔ یہ سچ ہے کہ سرور صاحب نے احتشام حسین کے مقابلے اقبال پر زیادہ کام کیا لیکن براہ راست مارکسزم سے وابستہ نہ ہونے کی وجہ سے انھوں نے اقبال کی شاعری کو بحیثیت مجموعی ان کی رمزیت، رومانیت کے حوالے سے جانچا پرکھا جس کی وجہ سے ان کے تنقیدی سفر اور نظر میں تاریخی ادوار، اس کے سیاسی و سماجی جھیلے، غالب، حالی، اکبر وغیرہ کی پیدا کردہ روایات اور اس کے تسلسل کی تلاش کم کم ہی ہے۔ نتیجتاً قومی و عالمی تناظر میں اقبال کو جانچنے کی کوشش بھی کم کم ہے جبکہ اقبال کی شاعری ان حوالوں کے بغیر سمجھی ہی نہیں جاسکتی، اس کے برعکس احتشام حسین کا مارکسی ذہن زندگی کے فلسفۂ تحیّر پر مبنی ہے اور یہ حیرت ہی کائنات کے علم کا وسیلہ بنتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اقبال کے یہاں قدم قدم پر بکھری حیرت اور

www.taemeernews.com

تجسس تلاش کرتے جسے سرورؔ رومان اور وجدان کا نام دیتے ہیں۔ احتشام حسینؔ لکھتے ہیں:

"وہ سورج، چاند، ستاروں اور دوسرے مظاہر فطرت سے زندگی کا مقصد پوچھ لیتے ہیں۔ ان خیالات پر زور دینے کی ضرورت اس لیے بہت زیادہ ہے کہ اسی حیرت، تشنگی اور راز جوئی نے دن رات ان پر مسلط ہو کر زندگی کے بھیدوں کو سمجھنے پر مجبور کیا ہے۔"

اور آگے وہ لکھتے ہیں:

"اپنی شاعری میں انہوں نے خود کو ایک حقیقت پسند ظاہر کیا ہے لیکن اگر فلسفیانہ حیثیت سے دیکھا جائے تو وہ خیال کو پہلی جگہ دیتے ہیں اور یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ ضمیر اور روح کا انقلاب مادی زندگی میں انقلاب لاتا ہے۔۔۔ یہ وہ بنیادی خیال ہے جو انہیں حقیقت پسندوں کی صف سے نکال کر تصور پسندوں کے حلقے میں ڈالتا ہے گو ان کی حیثیت داخلی ہونے کے بجائے زیادہ تر خارجی ہوتی ہے۔ یہ حقیقتوں کا تجزیہ کرتے ہوئے اقبالؔ بار بار خیال کی دنیا میں پہنچ گئے ہیں اور ان کا شعور داخلیت کی گرفت میں آ گیا ہے۔ انہوں نے حقائق کے ادراک سماج کے واقعی عناصر کی تحلیل سے نہیں بلکہ قوت متخیلہ کی مدد سے کیا ہے۔ نتیجہ نظریہ اور عمل کے افتراق کی شکل میں ظاہر ہوا اور گفتار کا غازی" "کردار کا غازی" نہ بن سکا۔"

ان جملوں میں آپ کو سرورؔ صاحب کے خیالات کی گونج سنائی دے گی لیکن بین السطور میں احتشام حسینؔ، سرورؔ کے خیالات سے اختلاف بھی کرتے ہیں۔ آپ اس سے اتفاق کریں یا نہ کریں لیکن اقبالؔ کے تعلق سے احتشامؔ حسین کی فکر جرأت و بے باکی کا اظہار کر رہی ہے۔ یہ تو خیر احتشام حسین تھے جو خالصتاً نقاد تھے وہ بھی ترقی پسند مارکسی نقاد جنہیں خشک اور مادہ پرست وغیرہ کہہ کر طرح طرح کے القاب سے نوازا جاتا رہا ہے۔ اب میں دو باتیں علی سردارؔ جعفری کے تعلق سے بھی عرض کرنا چاہتا ہوں جو بنیادی طور پر شاعر تھے جن کے یہاں احتجاج و انقلاب کے عناصر تو ہیں ہی اس رومانیت کے عناصر بھی ہیں جس پر سرورؔ صاحب سر دھنتے ہیں۔ سرورؔ صاحب جعفریؔ کے قائل ہیں ان کی شخصیت اور شاعری اور ان کی اقبالؔ شناسی کے بھی تبھی تو وہ شاعرانہ انداز میں کہتے ہیں:

سرورؔ اس واسطے سردار سے ہم کو محبت ہے
کہ ہم دونوں ہیں گو مجرم مگر مجرم ہیں اقبالی

سردارؔ جعفری کا اقبال سے متعلق سرمایۂ نقد دو حصوں میں تقسیم ہے۔ پہلا ان کی کتاب ترقی پسند ادب ہے اور دوسرا اقبال شناسی، کتاب کے مضامین کا مربوط اور منظم حصہ دوسرا ہی ہے لیکن پہلے حصے میں آڑے ترچھے سوال زیادہ ہیں مثلاً وہ خودی پر ہی سوالیہ نشان لگا دیتے ہیں:

"خودی کی بنیاد ہی عینیت کے فلسفے

www.taemeernews.com

اور ہیگل کی جدلیت (Dialectics) پر ہے جس کو اقبال نے اسلامی فلسفے اور روایات سے تقویت پہنچائی۔ اس کی ابتدا اس سوال سے ہوتی ہے کہ وہ روشن نقطہ جسے شعور کہتے ہیں کیا ہے؟ ظاہر ہے اقبال نے اس سوال کا جواب علمی طریقے سے نہیں دیا کہ شعور مادے کی ایک ترقی یافتہ شکل یعنی انسانی ذہن کی ایک خاصیت ہے اور یہ جو ہر انسان نے صدیوں کی محنت اور کشکش کے ذریعہ حاصل کیا ہے اور اس کا تاریخی ارتقا ہوا ہے اور یہ زمان و مکان کے قیود سے آزاد نہیں ہے اور اس کا تجسّس، فکر اور مجرد فلسفے کے بجائے مظاہر کے سلسلۂ عمل اور طبیعی علوم کے ذریعہ سے کرنا چاہیے۔ یہ مسئلہ صرف سائنس ہی حل کر سکتی ہے اور اس کا جواب صرف طبیعی علوم دے سکتے ہیں کہ شعور کیا ہے اور کیسے پیدا ہوتا ہے؟ اس منزل پر پہنچ کر فلسفہ سائنس بن جاتا ہے اور اس کا اپنا علیحدہ وجود ختم ہو جاتا ہے اس لیے اقبال نے شعور کو ایک خیالی اور روحانی وجود دے دیا۔ خودی اپنی ضد خود پیدا کرتی ہے اور ان دونوں کے ٹکراؤ کے ذریعہ سے ارتقا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ باوجود اپنی عینی بنیادوں اور مابعد الطبیعاتی خصوصیات کے اقبال کا فلسفۂ خودی مجرد فکر اور مکتبی فلسفے کی شکل کبھی اختیار نہ کر سکا۔"

(ترقی پسند ادب)

حالانکہ اس کے بعد سردار، اقبال کے فلسفے کو بحیثیت شاعر اس قسم کی تلاش کو صحیح قرار نہیں دیتے، ان کا کہنا ہے کہ ایک شاعر کی حیثیت سے انہیں جو کرنا تھا وہ کر گئے یعنی خودی کی روح کو کائنات کے ذرّے ذرّے میں پھونک دیا چنانچہ چاند، سورج، ستارے، دریا، پہاڑ، پھول، ہوائیں، سمندر، بیابان، چڑیاں، جانور، انسان سب اس جذبہ سے سرشار ہیں۔ رائی زورِ خودی سے پربت بن رہی ہے۔ بلبل ذوقِ نوا سے منقار حاصل کر رہی ہے۔ انسان کائنات پر حکمرانی کر رہا ہے۔ یہاں وہ سردار کے قریب آ جاتے ہیں اگرچہ اس قربت میں سردار کے اندر کا شاعر زیادہ قریب ہوتا ہے لیکن جیسے ہی سردار کا مفکر جاگتا ہے تو اقبال کے تضادات کو جلد ہی اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔

> "یہ اقبال کا مستقل تضاد ہے کہ وہ اپنی شاعری میں جس حسین و جمیل دنیا کی تشکیل کرنا چاہتے ہیں ان کا فلسفہ اس دنیا کے تباہ کرنے والے افراد کی پیدائش میں مدد کرتا ہے اس لیے اقبال کی شاعرانہ شخصیت کو ان کی فلسفیانہ شخصیت سے الگ کر کے یہ کہنا پڑتا ہے کہ وہ شاعر بڑے ہیں فلسفی چھوٹے۔"

یہ تضاد سردر صاحب کو کم کم ہی نظر آتا ہے۔ اس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ سرور زندگی اور اس کی حرکت کو مادّی حوالوں سے کم دیکھتے ہیں اسی لیے ان کو رومانیت اور مادّیت کے تصادمات نظر نہیں آتے

www.taemeernews.com

اور ان تضادمات سے ایک نیا تاریخی ارتقا نظر آتا ہے۔ حالانکہ وہ نظریہ کے ضرور قائل ہیں لیکن اس کے بھی قائل ہیں کہ نظریہ کو پہلے ادب بننا چاہیئے۔

سردار، اقبال کے اس رویہ سے بھی نالاں ہیں کہ انہوں نے سیاسی اور معاشی سوال کو اخلاقی مسئلہ میں تبدیل کر دیا۔ وہ سامراج اور سرمایہ داری کا سبب مادّیت کو مانتے ہیں جس کا علاج روحانیت میں تلاش کرتے ہیں۔ سردار یہ اعتراف تو کرتے ہیں کہ اقبال شاعر اور فنکار کی حیثیت سے سامراج اور سرمایہ داری سے نفرت تو کرتے ہیں لیکن ان کے سامنے کوئی تعمیری راستہ نہیں تھا اس لیے وہ ماضی کی طرف پلٹ رہے تھے:

از زمانِ خود پشیماں می شوم
در قرونِ رفتہ پنہاں می شوم

یہ در اصل ایک طرح کی روپوشی تھی۔

لیکن ۱۹۱۷ء میں روس کے انقلاب کے بعد ان کی آنکھیں کھلتی ہیں اور وہ اشتراکیت کے قریب آتے ہیں جس کی طرف سرور صاحب کی نگاہ کم جاتی ہے حالانکہ یہاں سے اقبال کی شاعری کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے بقول سردار:

"پہلی بار اقبال کی شاعری میں انقلاب کا لفظ سیاسی اور سماجی تبدیلی کے معنوں میں آیا اور مزدور اور سرمایہ دار کے تضاد کا اظہار ہوا۔"

لیکن یہ بھی ہوا کہ وہ اس انقلاب میں قدیم روحانیت بھی شامل کر دیتے ہیں جس کا اظہار ان کی نظم 'لینن خدا کے حضور' میں ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ انقلاب کی دعوت بھی دیتے ہیں اور اس سے گھبراتے بھی ہیں۔ وہ مارکس اور لینن کی تعلیمات کی سچائی جان لیتے ہیں لیکن یہ بھی احساس رہتا ہے کہ اس میں روحانیت کی کمی ہے۔

اچھی بات یہ ہے کہ سردار جعفری ہوں یا احتشام حسین اقبال کی ان تضادات کو محبت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور ان کو اس عہد کے تضادات کا حصہ بتاتے ہوئے اقبال کی فنکارانہ سادگی اور معصومانہ شعری کردار پر روشنی ڈالتے ہیں اور اعتراف کرتے ہیں کہ ان تضادات کے باوجود اقبال کی شاعری نہ صرف بڑی بلکہ عظیم ہے اور اس کی عظمت انہیں تضادات میں ہی پوشیدہ ہے۔ سردار کا یہ جملہ دیکھیے:

"ہم اقبال سے محبت کرتے ہیں کیونکہ انہوں نے اپنی شاعری سے آزادی کے شعور کو پیدا کیا ہے۔ ہمارا ورثہ ہے اقبال کا نظریۂ ادب، اقبال کی سامراج دشمنی اور انسان دوستی۔ اقبال نے ہمیں جو انسان کا عظیم الشان تصور دیا ہے وہ پہلے اردو ادب میں اور کہیں نہیں ملتا...... اقبال نے ان تصورات سے اردو شاعری کو نئی سطح پر پہنچا دیا اور آج یہ سب تصورات ترقی پسند شاعری کی رگوں میں خون کی طرح دوڑ رہے ہیں۔ ہم اس سرمائے کی قدر کرتے ہیں اور اس کے لیے اقبال کا بے انتہا احترام کرتے ہیں۔ اقبال کے بغیر ہم اپنی موجودہ شاعری کا تصور ہی نہیں کر سکتے۔"

www.taemeernews.com

ضرورت تو اس بات کی ہے کہ سرورؔ صاحب کی اقبالؔ شناسی کی انفرادیت، خصوصیت کو سمجھنے کے لیے مجنوںؔ گورکھپوری، ممتاز حسین وغیرہ کے خیالات بھی پیش کیے جائیں لیکن مضمون کی طوالت کے خوف سے صرف نظر کیا جاتا ہے۔

اقبالؔ سے متعلق ۱۹۹۴ء میں چھپی آل احمد سرور کے مضامین کا مجموعہ 'دانشور اقبالؔ' ان کی اہم کتاب ہے جس میں بیس مضامین ہیں جن میں ابتدائی دس کا تعلق فکرِ اقبال سے ہے اور بقیہ دوسرے دس مضامین کا تعلق شعرِ اقبال سے ۔ یہ سارے مضامین ۱۹۷۷ء اور ۱۹۹۰ء کے درمیان لکھے گئے ۔ یہ مدت ان کی اقبال انسٹی ٹیوٹ سے وابستگی کی بھی تھی اور ۷۸۔۱۹۷۷ء میں اقبال صدی تقریبات زور وشور سے منائی گئیں اس زمانے میں اقبالؔ پر بہت کچھ لکھا گیا۔ سرور صاحب نے بھی لکھا اور خوب لکھا۔ یہ ایک طرح سے ان کی اقبالؔ شناسی کا دوسرا دور تھا جو قدرے معتدل اور متوازن، جس کا جائزہ ایک الگ تفصیلی مضمون کا تقاضا رکھتا ہے۔ کم وبیش یہی صورت سردارؔ جعفری کی اقبال شناسی کی ہے۔ احتشامؔ حسین تو رخصت ہو چکے تھے لیکن دوسرے اہم ترقی پسند نقاد ممتاز حسین، محمد حسن، سید محمد عقیل، قمر رئیس وغیرہ نے اقبال کو بالکل ایک نئے دور، نئی صورتوں میں سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی جس سے اقبال کا دائرۂ مطالعہ بہر حال وسیع تر ہوا۔ یہاں ان سب کی تفصیل ممکن نہیں تاہم اس کی ضرورت ہے کہ اقبال ترقی پسندوں کے ذریعہ پہلے اور بعد کے دور میں ردّ وقبول کے کن کن مراحل سے دوچار ہوئے۔

سرورؔ صاحب کے تعلق سے یہاں یہ بات غور کرنے کی ہے کہ وجدان اور رومان کے حوالوں سے جانچنے والے آل احمد سرورؔ اپنی اس اہم کتاب کا عنوان دانشور اقبال رکھتے ہیں۔ پورے دس مضامین یعنی آدھے سے زیادہ کتاب اقبال کی دانش وفکر پر رقم کرتے ہیں حالانکہ اپنے دیباچے میں وہ یہ شکایت کرتے ہیں:

> ''کسی بڑے شاعر کے مطالعے میں
> پہلی چیز یہ دیکھنی ہوتی ہے کہ وہ کیا کہتا ہے
> اور کس طرح کہتا ہے۔اس جملے کے پہلے جز
> پر کچھ زیادہ ہی توجہ ہوئی ہے مگر دوسرے پر
> نسبتاً کم دھیان دیا گیا ہے۔اردو تنقید ایک
> غالب رجحان یعنی ترقی پسندی نے اقبالؔ
> کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔''

دلچسپ بات ہے کہ سرورؔ صاحب شاعر کیا کہتا ہے یعنی اس کے فکر وخیال کو اوّلیت بھی دیتے ہیں پھر یہ بھی کہتے ہیں کہ ترقی پسند ادیبوں میں سے بیشتر کے یہاں اقبال شناسی میں ان کے نظریہ کی بہتات تھی۔ اس ضمن میں وہ مجنوںؔ اور فراقؔ کا نام بطور خاص لیتے ہیں۔ سب جانتے ہیں کہ فراقؔ نے اقبالؔ پر کوئی خاص نہیں لکھا۔ مجنوںؔ کی کتاب ایک اچھی کتاب سمجھی جاتی ہے۔ سرورؔ صاحب کا اختلاف سردار جعفری، احتشامؔ حسین، ممتازؔ حسین سے ہو سکتا تھا لیکن انھوں نے ان سب کے نام نہیں لیے اور کل ملا کر یہ نتیجہ نکالا:

> ''اقبال شناسی کی اس کوشش میں یہ
> بات نمایاں نظر آتی ہے کہ شروع سے
> یک رخی رہی۔ یعنی ان کی فکر، ان کے

www.taemeernews.com

فلسفے، ان کی سیاست پر زیادہ توجہ ہوئی اور ان کی شاعری پر کم۔''

یہ شکایت صحیح تو ہو سکتی ہے لیکن سرور کی اقبال شناسی کے دوسرے دور کے تعلق سے یہ الزام خود سرور صاحب پر بھی لگایا جا سکتا ہے کہ ان کے زیادہ تر مضامین اقبال کے فکر وشعور سے زیادہ تعلق رکھتے ہیں۔ البتہ پہلے دور کے مضامین جبکہ سرور صاحب خود جوان تھے، شاعر تھے ان کی اقبال شناسی کا دور بھی رومان پرور اور وجدان آمیز تھا۔ لیکن جیوں جیوں سرور صاحب کا علم وشعور پختہ ہوتا گیا وہ خود اقبال کے فکر و فلسفہ میں ڈھلتے چلے گئے۔ ملاحظہ کیجیے ان کے بعد کے دور کے مضامین جن میں دانشور اقبال، عصر حاضر میں قدروں کا بحران اور اقبال، اقبال اور تصوف، اقبال اور جمہوریت، اقبال کی سیاسی فکر، اقبال کی معنویت وغیرہ یہ سب وہ مضامین ہیں جن میں سرور اقبال کی فکر کی باتیں زیادہ کرتے ہیں۔ جہاں انھوں نے اقبال کی شاعری پر مضامین لکھے ہیں مثلاً اقبال کا کارنامہ اردو نظم میں، غزل کی زبان اور اقبال کی غزل، اقبال کا فن ایک عمومی جائزہ وغیرہ یقیناً یہاں ان کی شاعری پر باتیں زیادہ ہیں۔ ایک جگہ وہ بڑے تیقن سے کہتے ہیں:

> ''اقبال کے نقطۂ نظر کی آفاقیت یا محدودیت کا سوال نہیں ہے اس کی شاعرانہ حیثیت کا سوال ہے۔ کوئی مسلک چاہے کتنا ہی عظیم کیوں نہ ہو اگر شاعرانہ اظہار نہیں رکھتا تو اس مسلک کی وجہ سے شاعری عظیم نہیں ہو سکتی۔''

اس مضمون میں آگے چل کر وہ یہ بھی کہتے ہیں:

> ''اقبال کی بیشتر نظمیں کسی فوری واقعے یا کسی خارجی امر سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہیں مگر نظم اس فوری تاثر سے بلند ہو کر ایک ایسی نظر یا نظریہ کی حامل ہو گئی ہے جس میں ایک دیرپا آفاقیت اور ابدی کیفیت آ گئی ہے۔''

کیا ان بیانات میں ہلکا سا تضاد نہیں ہے۔ لیکن یہ بھی ہے کہ اس قسم کے تضادات اقبال جیسے فکری ونظری شاعر کے حوالے سے اٹھ جانا ایک فطری امر ہے۔ یہ مضمون کلیم الدین احمد کی کتاب کے جواب میں لکھا گیا۔ اقبال شناسی کے ضمن میں وہ کلیم الدین احمد نہیں بننا چاہتے۔ احتشام حسین بننا بھی انہیں گوارا نہیں چنانچہ بننے اور نہ بننے کے اس پُر پیچ عمل میں اپنے نقد ونظر کے توازن میں کہیں کہیں عدم توازن کا شکار بھی ہو گئے ہیں اور ان باتوں کا اظہار کر گئے ہیں جو ان کے دل سے نکلتے ہیں لیکن دماغ اجازت نہیں دیتا، پھر اس پر ان کی اپنی تنقید کی مخصوص زبان جو اکثر معنی کو کہیں سے کہیں پہنچا دیتی ہے اور کبھی کبھی تو صرف خوبصورت جملوں کا رقص و سرور ہی نظر آتا ہے۔ ذرا یہ جملے دیکھیے:

> ''اقبال بنیادی طور پر اپنے فن میں کلاسیکی نظم وضبط کے قائل ہیں مگر ان کے یہاں رومانی لَے اور جدید اثرات کے نقوش اتنے واضح ہیں کہ وہ قدیم ہوتے ہوئے جدید اور جدید ہوتے ہوئے قدیم کہے جا سکتے ہیں۔''

www.taemeernews.com

یا ایک یہ جملہ بھی دیکھیے:

''اقبال کا فن اعلیٰ سنجیدگی کا فن ہے
اور اس اعلیٰ سنجیدگی میں جلال و جمال،
جلال کے جمال اور جمال کے جلال کا
خوبصورت امتزاج ہے۔''

اپنے مضمون اقبال کا فن میں ایک طرف وہ یہ کہتے ہیں:

''ہماری نظم جدید حالی اور آزاد،
اسماعیل اور اکبر کے سہارے پروان چڑھی
مگر اسے بلوغت اقبال نے ہی عطا کی۔''

مضمون کے اسی صفحہ پر وہ یہ بھی کہتے ہیں:

''اقبال کی وجہ سے اردو نظم جوان
ہوئی اور اس میں جوانی کی لغزشیں بھی ہیں۔''

یہاں وہ ان کی غزل گوئی کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ ایک طرف وہ اقبال کے فلسفہ کو، ان کی شاعری کے مقابلے کم تر قرار دیتے ہیں تو دوسری طرف ان کی شاعری کو منظوم فلسفہ بھی کہتے ہیں اور اعتراف کرتے ہیں کہ ان کے یہاں خطیبانہ شاعری، مفکرانہ شاعری و نیز غنائی شاعری کے اعلیٰ نمونے ملتے ہیں اور پھر یہ بلیغ جملہ بھی نکلتا ہے کہ:

''عمدگی (Excellence) ایک
قسم کی نہیں ہوتی۔ فریاد کی ایک لَے
نہیں ہے۔''

اس کے فوراً بعد یہ عجیب و غریب جملہ بھی نکلتا ہے:

''ہمارے یہاں ابھی نظر نہیں ہے
ہاں نظریہ سازی ہے جس کی وجہ سے ہم
فن کے جلوۂ صد رنگ کو دیکھ نہیں پاتے۔
ہر فن ایک یقین اور اس کے استناد کی ایک
وژن میں جلوہ گری ہے۔''

سرور کے مخصوص تنقیدی اسلوب و نیز نظریۂ نقد سے متعلق یہ شکایت عام ہے کہ اس میں شگفتگی و دلکشی تو ضرور پائی جاتی ہے لیکن فیصلہ کن گہرائی اور تنقید و تاریخ کی وہ بصیرت جو ان کے نقطۂ نظر کو وحدت اور تاریخیت عطا کرے اکثر معدوم رہتی ہے یا ہوتی ہے تو زبان کی دلکشی میں گم ہو جاتی ہے۔ اقبال شناسی سے متعلق بھی یہ بات کہی جاتی ہے۔ کچھ یہ بھی کہ وہ اکثر انگریزی ادب کے رجحانات اور مغربی مفکرین کے افکار و خیالات سے اپنے آپ کو ہم آہنگ کرنے اور پھر مشرق کی طرف واپس، رومانیت و وجدانیت کو ہمہ وقت گلے لگائے رہنے، کلیم الدین احمد، احتشام حسین نہ بننے، مجنوں اور ڈاکٹر سچد انند سنہا کا جواب دینے اور بظاہر قدیم و جدید، مشرق و مغرب میں توازن قائم کرنے میں اپنی انفرادیت، تنقیدی بصیرت اور فکری وحدت کو متاثر کر بیٹھتے۔ اقبالیات کے تعلق سے بھی ان کا یہ عمل جا بجا بکھرا ہوا ہے ورنہ ایسا نہیں ہے کہ وہ تاریخ، تہذیب، فلسفہ، مذہب وغیرہ پر نظر نہیں رکھتے۔ اقبال کے تعلق سے بھی ان کی نظر گہری، معلومات وسیع اور وہ خلوص، ہمدردی سب کچھ ہے جو ایک اعلیٰ پائے کے نقاد میں ہونا چاہیے۔ جہاں جہاں وہ اپنی اور یجنل صورت اور مکمل تنقیدی شخصیت میں آگئے ہیں اکثر غیر معمولی تحریریں چھوڑ گئے ہیں۔ اقبال سے متعلق دو تحریریں بطور خاص پیش کرنا چاہتا ہوں:

''اقبال کے یہاں ایک بلند تخیل،
ایک فکری میلان شروع سے ہے۔ مشرقی

www.taemeernews.com

اور مغربی فلسفے کے مطالعے نے اس میں گہرائی پیدا کی۔ مغرب کے رومانی شعرا کے مقابلے میں تخیل کی پرواز سکھائی، مگر تخیل کے لیے بال و پر فارسی شاعری نے دیے۔ اردو شاعری کا لسانی اسلوب غالب سے پہلے محدودیت کا شکار تھا۔ غالب کے اثر سے اقبال نے اس راز کو سمجھا اور فلسفیانہ استفسارات کے لیے سیاہ اور پُر پیچ بلاغت کے گُر فارسی شاعری سے سیکھے۔ اقبال کے اردو کلام میں فارسی اساتذہ کے جن اشعار کی تضمین کی گئی ہے ان کے حوالے سے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اقبال کے اسلوب کی تشکیل میں ان شعراء کے ساتھ پرواز کے بھی کچھ معنی ہیں۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ اقبال نے رومی کی تمثیلی حکایات کی روایت کو حالی اور شبلی کے واسطے سے زندہ کیا۔ یعنی مسئلہ صرف حدیث دلبری کا نہیں صحیفۂ کائنات کا ہے۔ اسی صحیفۂ کائنات کے لیے اقبال کو وہ اسلوب اختیار کرنا پڑا جو میرے نزدیک Ground Style سے تعبیر کی جاسکتی ہے اور جس میں خطابت، غنائیت فکری، صلابت تینوں سما گئے ہیں۔"

(اقبال کا فن)

ایک اور مثال دیکھیے:

"میرے نزدیک اقبال کی معنویت سب سے پہلے اس وجہ سے ہے کہ انھوں نے اپنے فلسفے اور فن کے ذریعہ ہمارے نوآبادیاتی دور کی مغرب پرستی، مذہب سے بیگانگی اور مغرب سے مرعوبیت کے خلاف جہاد کیا۔ اگرچہ انہیں کسی طرح قدامت پرست نہیں کہا جاسکتا۔ ان کی نگاہ کوفہ و بغداد کی طرف نہیں تھی، وہ تازہ بستیاں آباد کرنا چاہتے تھے لیکن وہ جدیدکاری کا معنی مغربیت نہیں سمجھتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ کسی دوسرے علاقے کے ادارے بجنسہ ہمارے یہاں نہیں نافذ کیے جاسکتے۔ ان کے فروغ کے لیے ہماری دھرتی، ہمارے ماحول، ہماری فضا، ہمارے سماج، ہمارے مزاج کا لحاظ بہت ضروری ہے۔ اس لیے وہ اپنی فطرت کے تجلی زار میں آباد ہونے کو ضروری سمجھتے تھے۔ ان کی شاعری کا مطالعہ تو بہت ہوا ہے اور اس میں سطح بینوں نے ہر شعر کو ایک بیان سمجھ لیا ہے اور شعر میں لفظ کے جدلیاتی استعمال، اس کے سخن میں ماورائے سخن، اس کے سطور میں بین السطور اور اس کے بادہ و ساغر میں مشاہدۂ حق کو نظر انداز کر دیا ہے یا صرف اپنے مطلب کے اشعار پر نظر رکھی ہے مگر پوری شعری بساط اور اس کے جلووں کی کثرت میں وحدت پر غور نہیں کیا۔ پھر ان کے فلسفے خصوصاً تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ

www.taemeernews.com

کے گراں قدر خیالات سے سرسری گذر گئے ہیں۔''

حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ بقول اکرام، اقبال کو اقبال مغرب نے بنایا۔ وہ ایک نئی مشرقیت کے علمبردار ہیں۔ وہ مغرب کی ذہنی غلامی سے آزاد ہیں مگر مشرق میں بھی اسیر نہیں ورنہ وہ یہ نہ کہتے:

مشرق سے ہو بیزار نہ مغرب سے حذر کر
فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر

یا

زمانہ ایک، حیات ایک، کائنات بھی ایک
دلیل کم نظری قصۂ جدید و قدیم
(اقبال کی معنویت)

قدرت نے سرور صاحب کو لمبی عمر عطا کی۔ پڑھنے لکھنے کے مواقع اور آسانیاں فراہم کیں۔ سرور صاحب نے اس کا فائدہ بھی اٹھایا اور نثر و نظم و نقد سے متعلق خوب کام کیا۔ اقبال سے متعلق ان کی تحریریں یادگار ہیں اور مشعلِ راہ بھی، ان کے انتقال کے بعد ان کو خراج پیش کرتے ہوئے شب خون کے تازہ شمارہ میں جدید نقاد شمس الرحمن فاروقی لکھتے ہیں:

''۱۹۴۷ء کے فوراً بعد کے شب و روز وہ تھے جب ہندوستانی کے لیے عموماً اور مسلمان کے لیے خصوصاً پاکستان کا نام لینا کفر اور اقبال کا نام لینا گناہ کبیرہ تھا۔ ترقی پسند لوگ تو سستے میں چھوٹ گئے تھے کہ آزادی کے پہلے کمیونسٹ پارٹی نے قیام پاکستان کی حمایت کی لیکن بعد میں وہ اقبال کی مخالف ہو گئی تھی۔ آل احمد سرور کا معاملہ یہ تھا کہ وہ پاکستان کے حامی نہ تھے لیکن اقبال کے پرستار تھے اور انہوں نے اقبال سے اپنی عقیدت اور محبت کا لگاؤ علمی اور تنقیدی سطح پر متعدد مضامین میں کیا اور ایسے زمانے میں کیا جب لوگ اقبال کا نام لیتے ڈرتے تھے۔''

سرور صاحب کے ابتدائی اہم مضامین زیادہ تر تقسیم سے قبل کے ہیں، دوسرے دور میں انہوں نے ۱۹۷۰ء کے بعد مضامین لکھے جب وہ اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر سے وابستہ ہوئے اور اقبال صدی تقریبات منائی گئیں۔ یہ بات بھی درست نہیں ہے کہ ۱۹۴۷ء کے بعد اقبال پر لکھنا کم ہو گیا یا خوف محسوس کیا گیا۔ مجنوں، احتشام، سردار وغیرہ کے مضامین تقسیم کے فوراً بعد کے ہیں۔ اس کے علاوہ جگن ناتھ آزاد نے اپنے مضمون آزادی کے بعد اقبال شناسی میں عطیہ فیضی، اقبال سنگھ، عبدالسلام ندوی، ظہیر الدین جامعی وغیرہ کے نام لیے ہیں۔ ان کا یہ اقتباس ملاحظہ کیجئے:

''۱۹۴۷ء کے بعد ہندوستان میں اقبالیات کی داستان ایک سناٹے اور ہنگامے کی ملی جلی داستان ہے۔ اس وقت مثبت و منفی دونوں طرح کے دھارے بہہ رہے تھے ...... سناٹے کا جو میں نے ذکر کیا ہے اس سے کہیں یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ آزادی کے دو چار سال بعد تک

www.taemeernews.com

ہمارے ملک کے اہلِ قلم نے اقبال پر کچھ لکھا ہی نہیں، جہاں تک میرا حافظہ کام کرتا ہے میں کہہ سکتا ہوں کہ مجلہ عثمانیہ حیدرآباد دکن، نگار لکھنؤ، معارف اعظم گڑھ، شاعر آگرہ، اردو دہلی، سب رس حیدرآباد، آجکل دہلی، برہان دہلی، فروغ اردو لکھنؤ، شاہراہ دہلی، علی گڑھ میگزین علی گڑھ، دارالعلوم دیوبند کا میگزین، کاروان ادب بمبئی اور زمانہ کانپور وغیرہ کے صفحات اس دور میں بھی اقبال اور اقبالیات کی روشنی سے جگمگاتے رہے۔ ان جرائد میں لکھنے والے مستند اہلِ قلم تھے۔ اردو میں ۱۹۴۷ء کے آخر میں عزیز احمد کا مضمون اقبال اور ارتقائے تخلیق شائع ہوا تھا۔ دوسرے جرائد میں لکھنے والے تھے غلام ربانی عزیز، فرمان فتح پوری، آل احمد سرور، اختر علی تلہری، عبدالسلام ندوی، راجندر ناتھ شیدا، نیاز فتح پوری، نور الحسن ہاشمی، شوکت سبزواری، احتشام حسین، سردار جعفری، فراق گورکھپوری، باقر مہدی اور متعدد دوسرے حضرات۔ پروفیسر عشرت حسین انور نے تو اقبال کے متعلق مضامین کی ایک فوج اتاردی۔ ان کے زیادہ تر مضامین معارف اعظم گڑھ میں چھپتے تھے اور ان کے عنوانات تھے...... اقبال اور برگساں، اقبال اور جیمز وارڈ، اقبال اور نطشے، اقبال اور ولیم جیمز وغیرہ وغیرہ۔"

لیکن یہ سب جانتے ہوئے بھی فاروقی صاحب کا فرمان اس بات کا متقاضی ہے کہ تقسیم کی کئی دہائیوں کے گذر جانے، سناٹے اور خوف کے ختم ہوجانے کے بعد خود انہوں نے اقبال پر قلم کیوں نہیں اٹھایا۔ شاید اس لیے کہ مقصدیت، افادیت، تاریخیت، خطابت، پیامیت وغیرہ سب ان کی شریعت کے باہر کی چیزیں ہیں لیکن وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ دنیا کے ہر ادب کی بڑی شاعری کے یہی عناصر ہوا کرتے ہیں۔

سرور صاحب نے تمام اردو شعر وادب کو عموماً اور اقبالیات کو بالخصوص اپنی تنقیدی بصیرت، سچی آگہی، تاریخی اور سماجی شعور کے حوالے سے سمجھا، سمجھایا اور مالا مال کیا۔ بلا شک وشبہ اردو کے اقبال شناسوں میں آل احمد سرور کا نام ہمیشہ زندہ و پائندہ رہے گا۔

☆☆☆

www.taemeernews.com

صغرا فراہیم*

اردو فکشن ــــ آل احمد سرور کی نظر میں

پروفیسر آل **احمد سرور** اُردو ادب و تنقید کا ایک ناگزیر اور ناقابلِ فراموش نام ہے۔ انہوں نے اردو ادب کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی، اور کہا جا سکتا ہے کہ مقبول اصناف کے علاوہ ذیلی اصناف بھی اُن کی توجہ کا مرکز بنیں۔ غزل، نظم، تنقید، مرثیہ، اقبال، غالب...... کوئی بھی ایسا اہم موضوع نہیں ہے جسے آل احمد سرور نے چھوا نہ ہو۔ انہوں نے ایک ایسے دور میں، جب تنقید مختلف نظریات کی آویزش سے متشکل ہو رہی تھی، متن پر مرتکز مطالعے (Close Textual Reading) کو اساسی حوالہ بنا کر فن پارے کے خود مکتفی ہونے کی جانب اشارے کیے۔ اُن کی تنقید دائیں بائیں نہیں بلکہ فن پارے پر مرتکز رہتی ہے۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ معاصر عمرانی مسائل اور ادبی رویّوں سے غافل رہے ہیں۔ ان کی تحریریں اس بات کا ثبوت ہیں کہ غفلت ایک لمحے کے لیے بھی اُن کی تحریر پر حاوی نہ ہو سکی۔

پروفیسر آل احمد سرور نے نثر و نظم دونوں اصناف پر اپنی توجہ مرکوز کی اور نثر میں 'فکشن'، ان کی دلچسپی کا خاص سبب رہا ہے۔ خود یہ لفظ فکشن موضوع بحث رہا ہے۔ بعض حضرات اِس انگریزی اصطلاح کو قبول کرنے کے لیے اب تک تیار نہیں ہیں مگر سرور صاحب کا رویّہ اِس ضمن میں اِجتہادی تھا۔ وہ لفظ ''فکشن'' کے اردو میں بے تکلف استعمال کی وکالت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''فکشن کا لفظ ناول اور افسانہ دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اُردو میں فکشن کے لیے افسانوی ادب کی اصطلاح بھی برتی گئی ہے۔ مگر چونکہ افسانہ ہمارے یہاں مختصر افسانے کے لیے مخصوص ہو گیا ہے اِس لیے افسانوی ادب کہا جائے تو پڑھنے والے کا دھیان مختصر افسانے کے سرمائے کی طرف جائے گا ......اِس لیے میرے نزدیک ناول اور افسانہ دونوں کے سرمائے کے لیے فکشن اور فکشن کا ادب استعمال کرنے میں کوئی

---

* ریڈر، شعبہ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

www.taemeernews.com

حرج نہیں۔ انگریزی کی ایسی اصطلاحیں
جن کے مترادف الفاظ ہمارے یہاں نہ
ہوں اور جو ہمارے صوتی نظام کے
مطابق ہوں، اُنہیں بجنسہٖ لے لینے میں
پس وپیش نہیں کرنا چاہیے۔''
فکشن کیا، کیوں اور کیسے
(اردو فکشن، ص ۲)

مذکورۂ بالا اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اردو دنیا نے سرور صاحب کا مشورہ تسلیم کرلیا ہے مگر اس سلسلے میں ایک اور قابلِ غور پہلو یہ ہے کہ آل احمد سرور ہی نہیں اردو کے زیادہ تر نقاد حضرات بالعموم افسانہ اور ناول کے لیے تو فکشن کا لفظ استعمال کرلیتے ہیں مگر داستان کو اِس میں شامل نہیں کرتے۔ جس طرح افسانہ اور ناول دو الگ اصناف ہیں اُسی طرح داستان بھی ایک مستقل صنف ہے۔ اِن تینوں میں سے کوئی کسی کی محتاج نہیں اور اگر افسانہ اور ناول میں کچھ مماثلتیں تلاش کی جاسکتی ہیں تو پھر داستان، ناول اور افسانہ تینوں میں مماثلت کا سراغ لگانا دشوار نہیں ہے۔ ضرورت ہے کہ اِس مسئلے پر نئے سرے سے غور کیا جائے۔

فکشن کے اساسی حوالے، افسانے کے بارے میں پروفیسر آل احمد سرور کا ایک بنیادی سوال ہے کہ:

''ہمارے یہاں افسانے کی اتنی ترقی
کیوں ہوئی اور ناول کی کیوں نہیں ہوئی۔''
(اردو فکشن ص ۳)

اس ایک سوال میں سرور صاحب کا علم اور وسعتِ نظری پوشیدہ ہے۔ سوال سے ظاہر ہوتا ہے کہ سوال کنندہ کے سامنے اردو افسانے کی پوری تاریخ ہے اور وہ افسانہ اور ناول کے نشیب و فراز سے بخوبی واقف ہے۔ اسے معلوم ہے کہ معیاری افسانہ کیسے کہتے ہیں اور عالمی سطح پر معیاری افسانے کی کیا تاریخ ہے۔ یہی نہیں دیگر زبان کے افسانوں اور اردو افسانوں کا ایک تقابلی منظرنامہ بھی سرور صاحب کے سامنے ہے، تب ہی تو سرور صاحب یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ افسانے کی ترقی ہوئی اور ناول کی نہیں ہوئی۔ افسانہ کی روزافزوں ترقی کے بارے میں سرور صاحب یہ مقدمہ قائم کرتے ہیں:

''غزل کے اثر سے چونکہ مجموعی طور پر
ہمارا فنی شعور چھوٹے پیمانے پر تصویریں
بنانے یا Miniature
Painting سے زیادہ مانوس ہے، اِس
لیے مختصر افسانے میں اُس نے زیادہ
آسودگی پائی۔''

(اردو فکشن، ص ۳)

یقیناً سرور صاحب کی یہ رائے صائب ہے۔ اردو میں افسانہ کے فروغ کی چند اور وجوہ اُن کے خیال میں حسبِ ذیل ہیں:

۱۔ ہمارے یہاں متوسط طبقہ دیر میں ابھرا۔
۲۔ وہ حقیقت پسندی جو کسی سیاسی یا مذہبی شکنجے کی پابند نہیں، ہمارے یہاں عام نہیں ہوسکی۔
۳۔ ہماری تنقید میں نظر سے زیادہ نظریے پر زور رہا اور بجائے بار بار دیکھنے کے ایک نظر دیکھنے کو کافی سمجھا گیا۔

(اردو فکشن ص ۴)

مذکورہ بالا تین اہم نکات بحث کا در وا کرتے ہیں اور

www.taemeernews.com

بہت تفصیلی گفتگو کے طالب ہیں جس کا یہاں موقع نہیں پھر بھی اجمالاً عرض ہے کہ جب سرور صاحب اردو افسانے کے فروغ کا ایک سبب متوسط طبقہ کا دیر میں ابھر کر سامنے آنا قرار دیتے ہیں تو گویا بہ الفاظ دیگر یہ کہہ رہے ہیں کہ بیسویں صدی کے اوائل اور وسط تک چونکہ ہمارے یہاں متوسط طبقہ نہیں تھا اِس لیے اردو افسانے کا فروغ نہیں ہوا۔ اِس متوسط طبقے کا تعارف بھی سرور صاحب کے الفاظ میں ملاحظہ فرمایئے:

> ''متوسط طبقہ......جس میں خواندہ لوگوں کی خاصی تعداد ہو، جسے اپنی اہمیت کا اِحساس ہو، جو اپنے سے نیچے طبقے کے بظاہر بھدے اور بھونڈے طریقۂ زندگی سے اور اپنے سے اوپر کے طبقے کے بظاہر ناکارہ پن سے اپنے کو ممتاز سمجھتا ہو۔''
>
> (فکشن ص ۴)

گویا سروؔر صاحب کے الفاظ میں اردو معاشرے میں وہ طبقہ تھا ہی نہیں جس کی امید و بیم کی معروضی عکاسی کی ضرورت ہو، جس کے طرز زندگی کا تجزیہ کیا جاسکے، جس کے اخلاق پر ضرب لگائی جاسکے اور جس طبقہ کے پس منظر میں اس طرز زندگی کے متبادل طریقے تلاش کیے جاسکیں۔ اگر اس طرح سوچا جائے تو احساس ہوتا ہے کہ:

۱۔ اردو افسانہ نے گویا انسانی طبقات کی امید و بیم کی معروضی عکاسی کی ہی نہیں۔

۲۔ انسانوں کے مختلف طبقاتی طرزِ حیات کا تخلیقی طور پر اردو افسانہ نگاروں نے کوئی تجزیہ نہیں کیا۔

۳۔ اردو افسانہ نگاروں نے اعلیٰ طبقے کی اخلاقیات کو چھونے کی ہمت نہیں کی اور ادنیٰ طبقے کی اخلاقیات کو اپنے اظہار کے لائق نہیں سمجھا۔

اردو افسانہ نگاروں کے یہاں بنی نوع انسان کی بہبود کے لیے کوئی متبادل احساس موجود نہیں......اور صرف اردو افسانہ نگار ہی کیا جب متوسط طبقہ کے منظرِ عام پر تاخیر سے آنے کو ہی افسانے کے فروغ کا سبب قرار دیا جائے گا تب گویا ہر معاشرے کا افسانہ امید و بیم کی معروضی عکاسی سے خالی نظر آنا چاہیے۔ ہر زبان کے افسانے میں گویا طبقاتی طرزِ حیات کے تئیں تجزیاتی انداز عنقا یا شاذ و نادر ہونا چاہیئے۔ ہر زبان کے افسانے میں اعلیٰ طبقے کی اخلاقیات کو بے مہار چھوڑا گیا ہو، کہیں کا افسانہ ہو، تبدیلی کا کوئی متبادل احساس موجود نہ ہونا معاشرہ کے مختلف طبقات سے اصناف کے براہ راست معاشرتی تعلق پر اصرار عمرانی تنقید کا بنیادی سروکار ہے مگر یہ خیال غور طلب اور بحث طلب ہے۔

آل احمد سروؔر نے جب اپنا ادبی سفر شروع کیا تو وہ ترقی پسند ادب کے فروغ کا زمانہ تھا۔ مگر ترقی پسند فکر اور اسلوب دونوں کے معترف اور مدّاح ہونے کے باوجود وہ اِدّعائیت (Dogmatism) سے دور رہے۔ ایک بیدار مغز ناقد ہونے کے ناطے ان کی نگاہ عالمی سطح پر رونما ہونے والی علمی اور ادبی تبدیلیوں کی طرف بھی رہی اور اس کا ثبوت اور نتیجہ یہ ہے کہ بہت سے اِدّعائیت پسند حضرات کی طرح انہوں نے ترقی پسند اسلوب کے زوال کے بعد اردو میں

www.taemeernews.com

سامنے آنے والی علامت پسندی کو رد نہیں کیا۔ وہ علی الاعلان اس بات کا اعتراف کرتے ہیں:

''علامت کسی غیر مرئی شے کا مرئی نشان ہے۔ علامت سازی انسان کی فطرت ہے۔ یہ اس دور کا ہی عجوبہ نہیں ہے۔ وہائٹ ہیڈ علامت پرستی یا اشاریت کو Perception کا ایک طریقہ سمجھتا ہے۔ کیسرر (Cassirer) کہتا ہے کہ 'آدمی ایک علامتی جانور ہے جس کی زبانیں، اساطیر، مذاہب، سائنس اور آرٹ سب علامتی فارم ہیں جن کے ذریعے سے وہ اپنی اصلیت کو Project کرتا ہے اور اسے سمجھتا ہے۔' کیسرر'' تو یہاں تک کہتا ہے کہ ان شکلوں کے علاوہ جو اصلیت ہے وہ مذ فاضل ہے۔'' ایک بنیادی مفہوم میں علامت پسندی ہر دور کی خصوصیت رہی ہے۔ ہاں اس دور میں علامت کا استعمال شعور سے اور بالا رادہ ہو گیا ہے۔ اس لیے علامتی (ناول اور افسانے کو یہ کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ یہ ترشے ترشائے، واضح، متناسب، صاف ستھرے، روزِ روشن کی طرح عیاں فن کو دھندلا، طلسمی، خواب آلود اور ہر شے کو کچھ اور بنا دیتا ہے۔''

(اردو فکشن، ص ۱۱)

آل احمد سرورؔ کے مضامین کا مجموعہ ''تنقیدی اشارے'' کے نام سے ۱۹۴۲ء میں شائع ہوا۔ سات برس بعد اس کا دوسرا ایڈیشن منظرِ عام پر آیا تو انہوں نے نوٹ لکھا کہ:

''اس عرصے میں میرا ادبی نقطۂ نظر بہت کچھ بدلا ہے۔ اس کتاب میں جو رائیں ظاہر کی گئی ہیں ان سے تمام تر مجھے اتفاق نہیں رہا لیکن بہت بڑی حد تک اب بھی انہیں صحیح سمجھتا ہوں۔''

(ص ۸)

مذکورہ کتاب کا تیسرا ایڈیشن ۱۹۵۵ء میں اور چوتھا ۱۹۶۴ء میں شائع ہوا جس کے ابتدائی صفحہ پر وہ لکھتے ہیں کہ:

''کتاب میں کوئی ترمیم مناسب نہیں سمجھی گئی۔ تنقیدی اشارے کی مقبولیت اس بات کی دلیل ہوتی ہے کہ عقل مند کو اشارہ کافی ہوتا ہے۔''

یعنی اس میں اٹھائی گئی بحث سے وہ مطمئن ہو گئے۔ اور شاید اسی اطمینان نے انہیں اس جانب سوچنے کی مہلت نہیں دی جو اختلافی مسائل تھے اور آج بھی برقرار ہیں مثلاً وہ پریم چند کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

''وہ انسانی فطرت کو جانتے ہیں اگرچہ نفسیاتِ انسانی کی گہرائیاں ان کے بس کی نہیں۔''

(اشارے، ص ۱۸)

حالانکہ پریم چند نے نفسیاتِ انسانی کی گہرائیوں میں ڈوب کر ''معصوم بچہ'' ''مالکن'' اور ''نئی بیوی'' کہانی تخلیق کی۔ وہ ایک جگہ اور لکھتے ہیں کہ:

www.taemeernews.com

''پریم چند مرد عورت کی محبت کو بیان
نہیں کر سکتے۔''

(ص ۱۸)

جبکہ ان کی پہلی تخلیق، ناولٹ '' ایک ماموں کا رومان'' مذکورہ بیان کی تردید کے لیے کافی ہے۔ اس کے علاوہ ''گؤدان'' میں گوبر، دھنیا اور 'میدانِ عمل' میں منّی، سکھدا، امرکانت کی محبت جذبۂ عشق کو مزید حسن، گہرائی اور کشش عطا کرتے ہیں اور ظاہر کرتے ہیں کہ پریم چند مرد عورت کی محبت کو بھی بخوبی بیان کر سکتے ہیں۔ سرور صاحب تنقیدی اشارے میں صفحہ نمبر ۳۲ پر لکھتے ہیں کہ:

''پریم چند ابھی کہانیاں ہی لکھ رہے تھے
کہ اردو میں ادبِ لطیف کا اثر شروع ہوا
اور بہت جلد افسانے اس رنگ میں لکھے
جانے لگے۔''

جدید تحقیق اس بیان کے برعکس ہے۔ ۱۹۰۷ء تک پریم چند کا کوئی بھی افسانہ شائع نہیں ہوا تھا جبکہ ادبِ لطیف سے وابستہ کئی فنکار اس جانب توجہ دے چکے تھے مثلاً:

۱۔ علی محمود کا افسانہ ''چھاؤں'' مخزن، جنوری ۱۹۰۴ء میں چھپ چکا تھا۔

۲۔ علی محمود کا افسانہ 'ایک پرانی دیوار' مخزن، اپریل ۱۹۰۴ میں چھپ چکا تھا۔

۳۔ وزارت حسین کا افسانہ 'مرگِ محبوب' اردوئے معلّی جون ۱۹۰۵ء میں چھپ چکا تھا۔

۴۔ حکیم یوسف حسن کا افسانہ 'پُر اسرار عمارت' انتخاب لاجواب ۱۹۰۵ء میں چھپ چکا تھا۔

۵۔ یلدرم کا افسانہ ''احمد'' علی گڑھ ماہانہ مئی ۱۹۰۶ء میں چھپ چکا تھا۔

۶۔ یلدرم کا افسانہ 'غربت و وطن' اردوئے معلّی اکتوبر ۱۹۰۶ء میں چھپ چکا تھا۔

۷۔ یلدرم کا افسانہ ''دوست کا خط'' مخزن نومبر ۱۹۰۶ء میں چھپ چکا تھا۔

۸۔ سلطان حیدر جوش کا افسانہ ''نابینا بیوی'' مخزن، دسمبر ۱۹۰۷ء میں چھپ چکا تھا۔

اِن کے علاوہ خود پریم چند کا پہلا افسانہ ''عشق دنیا و حُبِ وطن'' جو ماہنامہ 'زمانہ' کانپور کے شمارہ اپریل ۱۹۰۸ء میں شائع ہوا، ادبِ لطیف کی غمازی کرتا ہے۔ اس افسانہ کا مرکزی کردار پوری طرح رومانی رنگ میں رنگا ہوا ہے۔

(تفصیلی معلومات کے لیے ملاحظہ ہو راقم کی کتاب '' اردو افسانہ ترقی پسند تحریک سے قبل'' مطبوعہ ۱۹۹۱ء)

سرور صاحب کا ایک اور بیان بڑا اختلافی ہے اور وہ یہ کہ '' پریم چند آخر وقت میں ترقی پسند ادب کے ہمنوا بن گئے۔''

(اشارے، ص ۳۵)

حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ پریم چند نے ترقی پسند تحریک کی رہنمائی کی، اسے راہ دکھلائی، اس کے لیے زمین ہموار کی۔ اس لیے ان کی حیثیت ہمنوا کے بجائے رہبر کی ہے۔ وہ کبھی کسی مینی فیسٹو کے مطابق چلنے والے ادیب نہیں تھے۔ اس کا اعتراف بہت بعد میں خود سرور صاحب نے اپنے ایک مضمون (پریم چند اور ہم) میں کیا ہے:

www.taemeernews.com

"دراصل پریم چند مارکسزم کے
فلسفے سے زیادہ واقفیت نہیں رکھتے تھے۔
انہیں عوام سے ہمدردی تھی۔ زمین دار
کے مقابلے میں کسان سے، سرمایہ دار کے
مقابلے میں مزدور سے، ظالم کے مقابلے
میں مظلوم کے ساتھ تھے۔ وہ انسان دوستی
کی ان روایات کے امین تھے جو صوفیوں
اور سنتوں کی دین ہیں۔"

(فکرِ روشن، ص ۱۸۲)

سرورؔ صاحب افسانہ 'کفن' کے متعلق لکھتے ہیں:

"پریم چند نے ایک مرتبہ تو حقیقت کو
مردانہ وار دیکھا ہے۔"

(اشارے، ص ۳۵)

حقیقت سے مراد کیا ہے؟ سماجی حقیقت نگاری، معاشی حقیقت نگاری، نفسیاتی حقیقت نگاری یا پھر وہ حقیقت جس کا اظہار گھیسو اور مادھو کے ذریعے ہوا؟ میرے خیال میں حقیقت نگاری کے پہلے بڑے علمبردار کے لیے یہ جملہ عام قاری کو غلط فہمی میں مبتلا کرتا ہے۔
وہ تنقیدی اشارے میں ایک اور جگہ لکھتے ہیں کہ:

"'ان داتا' بنگال کے قحط کی سچی تصویر
نہیں خیالی مرقع ہے۔"

(ص ۳۶)

اس الم ناک حادثے پر اردو میں ڈھیروں افسانے لکھے گئے جن میں دیویندر ستیارتھی کا 'نئے دھان سے پہلے' خواجہ احمد عباس کا 'ایک پائلی چاول' اختر اورینوی کا 'جنگل' میرزا ادیب کا 'کنگال دیس میں' ریوتی سرن شرما کا 'دراڑیں' علی عباس حسینی کا 'میخانہ' اور صدیقہ بیگم کا افسانہ 'چاول کے دانے' بہت مشہور ہوئے لیکن کرشن چندر کا 'ان داتا' ان سب پر حاوی رہا ہے اور اس کی اہم وجہ قحط زدگان کی حالتِ زار کی سچی اور بے لاگ تصویر کشی ہے۔
یہ جزوی اختلاف محض جملہ معترضہ کے طور پر ہے جس سے گریز کرتے ہوئے اصل موضوع کی طرف آتا ہوں۔ افسانے کے علاوہ سرورؔ صاحب نے ناول پر بھی لکھا ہے۔ ناول پر ان کے تنقیدی خیالات کا مطالعہ کرنے سے احساس ہوتا ہے کہ سرورؔ صاحب ناول کے فن، ناول کی عالمی ارتقائی تاریخ سے بخوبی واقف ہیں اور اردو ناول کے بارے میں ان کا نقطہ نظر تنقیدی اصابت رائے کا ثبوت ہے۔ ان کی تنقید کا ایک خاص امتیاز یہ بھی بیان کیا جا سکتا ہے کہ وہ چھوٹے چھوٹے جملوں میں بڑی بڑی باتیں کہہ جاتے ہیں۔ ناول پر گفتگو کرتے ہوئے بھی ان کا یہ ایجازِ بیان، اعجازِ اظہار کا مظاہرہ کرتا رہتا ہے مثلاً وہ کہتے ہیں کہ:

"ناول نوعمر ہے تو اس پر تنقید بھی نوعمر
ہے۔ یہ بات افسوس کے قابل ہے مگر
ماتم کے قابل نہیں۔"

(اردو فکشن، ص ۲)

دیکھیے کیسا بلیغ جملہ ہے۔ افسوس اور ماتم کے نازک فرق سے جو بھی واقف ہوگا وہ اس جملے پر عش عش کر اٹھے گا۔ افسوس ایک گزراں کیفیت ہے جو متاسف پر بہت زیادہ منفی اثرات مرتب نہیں کرتی جبکہ ماتم متاسف کے غیر معمولی اور متاسفانہ ردِ عمل کا شکار ہونے کا اشارہ ہے۔ یہ منفی اثر بھی ہے اور منفی

www.taemeernews.com

تفاعل بھی۔ سرور صاحب اردو والوں کو منفی اثر اور عمل سے بچانا چاہتے تھے جیسا کہ انہوں نے جملے کے پہلے حصہ میں ناول اور اس کی تنقید کے نوعمر ہونے کے مسئلے کو قابلِ افسوس تو تسلیم کیا مگر قابلِ ماتم قرار نہیں دیا۔ اور یہ کوئی رواروی میں دیا گیا بیان نہیں تھا، ایک سوچی سمجھی رائے تھی اور اس رائے کا پس منظر تھا۔ اور اسی پس منظر کے تحت انہوں نے ۲۷ تا ۲۹ اگست ۱۹۷۱ء میں ایک سہ روزہ سیمنار شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں منعقد کرایا تھا جو اس اعتبار سے منفرد تھا کہ اس میں جتنے نقاد تھے ان سے کچھ زیادہ ہی فن کار تھے جنہوں نے اپنے تخلیقی تجربات کی روشنی میں فکشن کے مختلف گوشوں پر بھرپور روشنی ڈالی تھی۔

پروفیسر آل احمد سرور جب ناول نگاری کو افسانہ نگاری کی بہ نسبت زیادہ دشوار گذار قرار دیتے ہیں تو اسی کے ساتھ ساتھ کامیاب ناول نگاری کے لیے ایک ماحول کی موجودگی کو بھی شرط گردانتے ہیں۔ ان کے خیال میں ناول کے لیے فضا اسی وقت سازگار ہوتی ہے جب:

۱۔ نثر کے تعمیری حسن کا پورا احساس فکشن نگار کو ہو چکا ہو۔
۲۔ ہر قسم کی نثر کے اچھے نمونے سامنے آ چکے ہوں۔
۳۔ شخص اور اس کی عکاسی بذاتِ خود ایک کارنامہ سمجھی جائے۔
۴۔ ایک ایسا متوسط طبقہ وجود میں آ چکا ہو جس میں خواندہ لوگوں کی خاصی تعداد ہو۔
۵۔ جب چھپے ہوئے حروف کی اتنی عادت پڑھنے والوں کو ہو جائے کہ وہ تحریر کے آہنگ کو دیکھ سکیں اور اُس سے لطف لے سکیں، تحریر میں تقریر اور اُس کی خطابت کا لطف تلاش نہ کریں۔
۶۔ نثر اتنی پختہ ہو جائے کہ وہ شاعری سے زیور نہ مانگے بلکہ اپنے حسن کی رعنائی پر نازاں ہو سکے۔
(اردو فکشن، ص ۳۔۴)

مذکورہ بالا چھ نکات بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ انہیں اگر تاریخی پس منظر میں سمجھنے کی کوشش کی جائے تو احساس ہوگا کہ سرور صاحب نے بنیادی نکات کی طرف اشارے کیے ہیں۔ ضرورت ہے کہ آج کے نقاد ناول پر گفتگو کرتے ہوئے مذکورہ بالا نکات پر بھی ذرا تفصیل سے اظہارِ خیال کریں۔

سرور صاحب ناول، افسانہ اور داستان پر اتنی عمیق نظر رکھتے ہیں کہ بہت آسان اور رواں دواں انداز میں تینوں کو ایک دوسرے سے ممیز کر دیتے ہیں۔ افسانے کے ضمن میں تو کچھ گفتگو ہو چکی، اب ناول اور داستان کے صنفی امتیازات کے سلسلے میں ان کی رائے ملاحظہ کیجیے:

۱۔ ہمارے یہاں ناول سے پہلے داستانوں کا ایک شاندار سرمایہ موجود ہے جس کی عظمت کا اعتراف ضروری ہے مگر جو ناولوں سے بالکل مختلف فن سے تعلق رکھتا ہے۔
۲۔ طلسمی اور عجیب و غریب کی ناول میں گنجائش نہیں۔
(فکشن، ص ۲۔۳)

پہلے بیان میں سرور صاحب نے داستان کو ناول سے بالکل الگ فن قرار دیا ہے اور دوسرے بیان میں یہ بتایا ہے کہ ناول میں طلسمی ماحول اور عجیب و غریب واقعات کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ سرور صاحب چونکہ

www.taemeernews.com

ناول پر اظہار خیال کر رہے تھے اس لیے انہوں نے ناول کے فن سے ایک بالکل الگ فن ''داستان'' پر عموی تبصرہ کیا ہے مگر میرے خیال میں یہ عموی تبصرہ بھی سرور صاحب کے دانش ورانہ رویے کا ثبوت ہے۔انہوں نے ایک جملہ ''طلسمی اور عجیب وغریب'' کہہ کر بات مکمل کر دی مگر داستان کے ضمن میں ایک اقتباس خاطر نشان کرنا چاہتا ہوں:

''داستان میں مافوق الفطرت اشیاء، واقعات اور کرداروں کی کثرت ہوتی ہے، جادو کی چیزوں، جادو کے واقعات، طلسمی شہروں، طلسمی خزانوں، جن، بھوت اور پری جیسی مخلوق کا ذکر عام ہوتا ہے۔ علت اور معلول کا رشتہ قدم قدم پر ٹوٹتا ہے۔آدمی بندر بن جاتا ہے اور بندر نستعلیق زبان میں گفتگو کرتا ہے۔آدمی پتھر کے مجسمے میں تبدیل ہو جاتا ہے اور اپنے نجات دہندہ کا انتظار کرتا ہے۔ درخت کو ذرا سا ہلانے پر اشرفیوں کے سات سات کنویں نمودار ہو جاتے ہیں۔ داستانوں کا دور چونکہ عوام کا دور نہ تھا بلکہ بادشاہوں، وزیروں، نوابوں، شہزادوں، شہزادیوں کا دور تھا اس لیے داستان میں مرکزی اہمیت انہیں کو دی جاتی ہے، بیشتر کردار مثالی ہوتے ہیں۔ داستان، ناول یا افسانہ کے برعکس ہماری عملی اور خارجی دنیا سے بلند و برتر ایک خیالی اور مثالی دنیا کی کہانی ہے جس میں مثالی کردار بستے ہیں اور مثالی واقعات پیش آتے ہیں جو بالآخر کسی مثالی نتیجے تک پہنچ جاتے ہیں۔''

(کشاف تنقیدی اصطلاحات۔ مرتبہ حفیظ صدیقی، ص ۷۷ تا ۷۸)

اب اگر داستان کے تعارف کے ضمن میں مذکورہ بالا اقتباس کو پیش نظر رکھتے ہوئے پروفیسر آل احمد سرور کے درج ذیل خیالات کا تقابلی مطالعہ کیا جائے تو داستان اور ناول کے درمیان کا فرق بالکل مکمل کر سامنے آجائے گا۔سرور صاحب کہتے ہیں:

تعریف :

''ناول ایک بیانیہ فارم ہے۔اس میں ایک مثالی (Typical) عمل ہوتا ہے جس کی موضوعی اہمیت (Thematic Value) ہے...... ناول معصومیت کے عالم سے تجربے کی منزل تک کے سفر کا بیان ہے، اُس نادانی سے جو بڑے مزے کی چیز ہے، یہ آدمی کو زندگی کے واقعی روپ کے عرفان تک لاتی ہے۔''

(فکشن، ص ۶)

موضوع :

''ناول کا موضوع انسانی رشتے ہیں۔اسی لیے اس میں حقیقت ایک مقررہ، پہلے سے طے شدہ عقائد کے مجموعے کی شکل میں نہیں بلکہ حقیقت کے اس تجربے کی شکل میں ہوتی ہے جس کا ایک ارتقائی عمل ہے

www.taemeernews.com

...... ناول تہذیب کا عکاس ، نقاد اور پاسبان ہے۔''

(فکشن، ص ۴)

پلاٹ :

''جب تک زندگی کو طبیعاتی علوم کے دیے ہوئے قوانین کی مدد سے سمجھا جاتا رہا، ہر چیز میں باقاعدگی، تناسب، تنظیم، پلاٹ کی چستی پر زور دیا گیا۔ جب یہ اندازہ ہوا کہ کائنات ایک ریاضی کا فارمولا نہیں ہے بلکہ وہ ایک ایسی سڑک ہے جس پر کچھ بلب روشن ہیں۔ بلبوں کے نیچے اور کچھ دور تک روشنی ہے اور بیچ میں اندھیرا۔ اس لیے اب پلاٹ پر اتنا زور نہیں جتنا پہلے تھا۔ فارسٹر نے کہا تھا کہ پلاٹ ناول کی ریڑھ کی ہڈی ہے، لیکن اب پلاٹ اور کردار نگاری دونوں کے متعلق ہمارا تصور بدل گیا ہے۔ نفسیات کے علم اور لاشعور اور تحت شعور کے مطالعے نے کردار کے باطن کو روشن کر دیا ہے۔''

(فکشن، ص ۱۰)

کردار :

''ناول کا ہیرو ازالۂ فریب کے ایک سلسلے سے گزرتا ہے۔ وہ ایک طفلانہ اُمید سے ایک قانع تخیل تک سفر کرتا ہے...... ناول کے ہیرو کا اینٹی ہیرو ہونا زیادہ قرینِ قیاس ہے۔ ایسا ہیرو جو تمام صفات کا مجموعہ نہیں ہے...... ناول کے ہیرو کے سفر کو نارتھ روپ فرائی نے Quest یا تلاش کا نام دیا ہے جو ایک محدود فضا سے ایک وسیع فضا کے لیے ہے۔ یہ تلاش زمان و مکان دونوں میں ہوسکتی ہے۔ اس جستجو کی منزل آئے یا نہ آئے مگر ناول کا ہیرو آخر میں یہ رمز پالیتا ہے کہ ہیرو ازم کے لیے کوئی مستقبل نہیں ہے اور وہ خود بھی ایک بالکل معمولی آدمی ہے ...... ناول کا ہیرو ایک اور آدم ہے جو بچپن کی جنت سے نکل آیا ہے۔''

(فکشن، ص ۶)

تفاعل :

''ناول کا عمل Demythification کا عمل ہے...... ناول ازالۂ فریب، شکستِ طلسم اور کنایہ یا ہجوِ ملیح سے کام لیتا ہے ...... ناول ایک کنایاتی افسانوی فارم (Ironic Fictional Form) ہے۔

(فکشن، ص ۷)

بنیادی عنصر :

''اپنے فارم کے لحاظ سے اور صنفی لحاظ سے یہ رومان کے خلاف ہے۔ رومانی حسیت کی اس میں گنجائش نہیں ...... ناول کی اپنی حقیقت نگاری سب سے بنیادی چیز ہے۔ اس کے علاوہ دو اور

www.taemeernews.com

اہم عناصر ...... ایک اعتراف جس کی وجہ سے خودنوشت کے نقوش ناول میں در آتے ہیں ، دوسرے Anatomy جس کے ذریعے سے فلسفیانہ اظہارِ خیال کی گنجائش نکل آتی ہے...... علامتی ناول اور افسانے کو یہ کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ یہ ترشے ترشائے ، واضح ، متناسب ، صاف ستھرے ، روزِ روشن کی طرح عیاں فن کو دھندلا ، طلسمی ، خواب آلود اور ہر شئے کو کچھ اور بنا دیتا ہے۔ اس کے باوجود ناول کی اصلی اور بڑی روایت یعنی حقیقت پسندی ختم نہ ہوگی بلکہ علامت پسندی کے دوش بدوش جاری رہے گی۔"

(فکشن، ص ۹۔۱۱)

داستان کا جو تعارف "کشاف" کے حوالے سے صفحاتِ ماقبل میں کرایا گیا اور ناول کے بارے میں سرور صاحب کے خیالات کا موازنہ کیا جائے تو احساس ہوگا کہ داستان اور ناول دو الگ الگ اصناف ہیں کیونکہ ناول حقیقت بیانی سے اپنا دامن نہیں چھڑا سکتا ، اور داستان مافوق الفطرت اشیاء و واقعات اور کرداروں سے خود کو الگ نہیں کر سکتی ، ناول کا موضوع انسانی رشتے ہیں ۔ داستانوں میں علت و معلول کا رشتہ قدم قدم پر ٹوٹتا ہے ۔ ناول میں بقول سرور صاحب ہیروازم کے لیے کوئی جگہ نہیں ، داستانوں میں بیشتر کردار مثالی ہوتے ہیں ، طلسمی اور عجیب وغریب کی ناول میں گنجائش نہیں جبکہ یہ سب کچھ داستان کے لیے ضروری ہے ۔ اس لیے سرور صاحب کا یہ کہنا کہ داستان ناول سے بالکل مختلف فن ہے ، دُرست ہے ۔ لیکن بیسویں صدی میں یورپ اور اردو میں بھی ناول میں داستان کے عناصر کی موجودگی کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ۔ اس کے باوجود افسانے اور ناول کے ساتھ ساتھ داستان بھی فکشن کا حصہ بن سکتی ہے یا نہیں ، یہ الگ بحث ہے جس پر اس وقت گفتگو کا موقع نہیں مگر میرے خیال میں اس مسئلے پر گفتگو ضرور ہونی چاہیے ۔

پروفیسر آل احمد سرور نے ناول اور رومان کے مابین فرق کو واضح کرنے میں دقتِ نظری کا ثبوت دیا ہے گو کہ فکشن پر گفتگو کرنے والے ناقدوں نے اس مسئلے کو خاصا گنجلک بنا دیا ہے ۔ ناول کی تنقید میں ناول کو رومان سے الگ کر کے دیکھنے کا رویہ تو کم از کم اردو میں شاذ و نادر رہا ہے ۔ اب تک کی صورتِ حال یہ ہے کہ بعض ناولوں کے بارے میں کہا گیا کہ یہ رومانی ناول ہے ، کبھی کہا گیا فلاں ناول سماجی ہوتے ہوئے رومانی ہو گیا ۔ اس نوع کے جملے کثرت سے لکھے جاتے ہیں کہ اس ناول کا فلاں فلاں باب خاصا رومانی ہے ۔ کبھی یہ بھی اطلاع دی گئی کہ فکشن کے فلاں نمونے میں رومان ، جنس اور حقیقت کا سنگم ہے ۔ ناقدوں کی اب تک کی گفتگو سے یہی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ رومان قصہ کے مختلف اجزائے ترکیبی میں سے ایک اہم جزو ہے لیکن سرور صاحب ان تمام خیالات سے الگ ایک بالکل ہی مختلف خیال اور سوچ اردو والوں کو عطا فرماتے ہیں ۔ ان کی رائے میں :

www.taemeernews.com

۱۔ موضوع کے لحاظ سے ناول رومان سے مختلف ہے، رومان کا ہیرو اپنے کو ہیرو ثابت کرتا ہے، ناول کے ہیرو کا اینٹی ہیرو ہونا زیادہ قرینِ قیاس ہے۔

۲۔ ناول کا عمل تو رومان کے عمل سے ملتا جلتا ہے مگر ناول کا ہیرو آخر میں یہ رمز پالیتا ہے کہ ہیرو ازم کے لیے کوئی مستقبل نہیں۔

۳۔ ناول کے ایک سرے پر رومان اور دوسرے پر فلسفیانہ قصے جیسے گلیور کا سفر نامہ۔ ناول رومان کے مقابلے میں فلسفیانہ قصے سے قریب تر ہے۔

۴۔ ناول اور فلسفیانہ قصے دونوں رومان سے اس لیے گریزاں ہیں کہ رومان زندگی کو تخیل کے دُھندلکے کی مدد سے دیکھتا ہے۔ یہاں شخصی ترجمانی ہوتی ہے۔ یا تو اس میں جذبات کا رنگ ہوتا ہے یا اساطیر کی شاعری کی حدود سے اس میں ایک طلسماتی فضا پیدا کی جاتی ہے۔

۵۔ ناول ازمنۂ وسطیٰ کے رومانوں سے پیدا ہوا۔ اور اب اپنے فارم کے لحاظ سے اور صنفی لحاظ سے یہ رومان کے خلاف ہے۔ رومانی حسیت کی اس میں گنجائش نہیں۔ ڈان کوئکزوٹ پن چکیوں کو دیو سمجھتا ہے۔ دیوؤں کو پن چکی کہنے والے بھی مل جائیں گے لیکن سانکوپینزا پوچھتا ہے "کیسے دیو؟" (What Giants)۔ اِس بنیادی سوال میں ناول اور رومان کا فرق مضمر ہے۔

۶۔ ناول اور فلسفیانہ قصے دونوں میں رومانی حسیت کو شبہے کی نظر سے دیکھا جاتا ہے، جو چیز رومان کو دلکش بناتی ہے وہ ناول کے لیے زہرِ قاتل ہے۔

۷۔ رومان آج بھی زیادہ مقبول ہے کیونکہ یہ آج بھی انسان کے رباب کے بہت سے تاروں کو چھیڑتا ہے۔ رومان دراصل ایک فراری آرٹ ہے۔

۸۔ علامتی ناول حقیقت پسند ناول کے بعد وجود میں آیا مگر اس کا رشتہ فطرت کے ایک ناقابلِ انکار قانون کی بنا پر رومان سے مل جاتا ہے۔ یہ رشتہ جدید ادب کے دوسرے شعبوں میں بھی واضح ہے جہاں تخیل کی اہمیت ہے۔

(فکشن، ص ۷۔۹)

مذکورہ بالا آٹھ اقتباسات سے پروفیسر آل احمد سرور کا تنقیدی موقف واضح ہو جاتا ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ

(۱) ناول اور رومان صنفی لحاظ سے الگ

(۲) ناول اور رومان موضوع اور مواد کے لحاظ سے مختلف

(۳) ناول اور رومان کی حسیت جدا جدا

(۴) ناول کا کردار رومان کے کردار سے متغائر

(۵) ناول اپنی سرشت میں بھی فلسفیانہ قصوں کی بہ نسبت رومان سے کم قریب ہے

(۶) ناول اور رومان کے عمل میں مماثلت کی مشابہت پیدا ہوتی ہے مگر یہ مشابہت سے زیادہ التباس ہے۔

(۷) جو چیز رومان کو دلکش بناتی ہے وہ ناول کے لیے زہر ہلاہل ہے۔

(۸) رومان ایک فراری آرٹ ہے یعنی ناول حقائق کا سامنا کرنے والا آرٹ ہے۔

تو سوال یہ ہے کہ جب صنفی، موضوعی، حسیت، کردار نگاری، سرشت، عمل اور منہاج ہر پہلو سے رومان ناول سے الگ وجود ہے تو پھر اب تک

www.taemeernews.com

داستان، افسانہ اور ناول قصے کے صرف تین اصناف کا ہی تذکرہ کیوں ہوتا رہا؟ کیا اردو میں رومان نام کی صنف نہیں ہے؟......

کیا اردو میں 'شاہد رعنا' سے 'تلاشِ رنگِ رایگاں' تک سب ناول ہے؟

'تلاشِ بہاراں'، 'چہرہ بہ چہرہ روبرو'، 'شب گزیدہ'، 'بہت دیر کردی'، 'دشتِ سوس' 'خوشیوں کا باغ'، اور 'دِوِیہ بانی' ناول ہے یا رومان؟...... 'فرات' میں شتمل، 'مکان' میں نیرا، 'دِوِیہ بانی' میں بندیا کے کردار کا جو رومانی رویہ ہے وہ اُسے ناول کا کردار بنا رہنے دے رہا ہے یا نہیں؟

صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے!!

☆☆☆

صحافت اور ادبی صحافت

www.taemeernews.com

عتیق احمد صدیقی*

سرور صاحب: مدیر ہماری زبان

پروفیسر آل احمد سرورؔ ہمارے ان دانشوروں میں تھے جن کی بالغ نظری، وسیع الخیالی، اعتدال پسندی، بیدار مغزی اور وسعت مطالعہ نے ان کو ایک خاص مقام عطا کیا۔ مدت العمر ان کے علمی شغف نے نظر میں گہرائی پیدا کی تو متنوع علمی شوق نے وسعت و گیرائی۔ اگر ایک طرف غور و فکر کا عمل جاری تھا تو دوسری طرف نئی سے نئی کتابیں اور جرائد و رسائل ان کے زیرِ مطالعہ رہتے۔ اگر ایک طرف اردو ادب سے ان کی علمی و عملی وابستگی تھی تو دوسری طرف مغربی ادبیات خاص طور پر امریکی ادب سے بھی ان کو گہرا شغف تھا اور ان کے آئے دن بدلتے رجحانات سے متعلق وہ اپنے علم کو تازہ رکھنے کی کوشش کرتے۔

نرم خوئی ان کا مزاج تھی اور مثبت نقطۂ نظر ان کی طبیعت ثانیہ! ناخوشگوار، نامساعد اور انتہائی مایوس کن حالات میں بھی وہ کوئی نہ کوئی مثبت پہلو پیدا کرتے اور قوت فکر و عمل سے نئی راہ تلاش کر لیتے۔ سخت سے سخت اور مہمل سے مہمل مخالف رائے کو بھی وہ سننے کو آمادہ رہتے۔ اس کے مختلف پہلوؤں کو پرکھنے کے بعد ہی اس کو رد یا قبول فرماتے۔ اس سے ان کی تحریروں خاص طور پر تنقید میں ایک توازن پیدا ہوا۔ کم و بیش ساٹھ سال ان کا قلم رواں دواں رہا۔ ادبی تنقید ان کا خاص موضوع تھا، لیکن اس دوران انہوں نے فکری، علمی، تہذیبی، معاشرتی مسائل پر بھی بہت کچھ لکھا، اس لیے کہ وہ ان پر برابر غور و فکر کرتے رہے۔

اپنی اور بہت سی مصروفیتوں کے ساتھ انہوں نے ۱۹۵۶ء سے ۱۹۷۴ء تک انجمن ترقی اردو کے ترجمان ''ہماری زبان'' کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیے۔ جنوری ۱۹۵۶ء میں سرورؔ صاحب نے ہماری زبان کی ادارت سنبھالی تو یہ پندرہ روزہ اخبار تھا۔ لیکن آزادی کے بعد اردو زبان کے ساتھ ملک میں جو معاملہ ہوا اور اہل اردو میں اپنی زبان کے تحفظ کا جو احساس پیدا ہوا، اس کی وجہ سے پورے ملک میں خصوصاً شمالی ہند میں زبان سے متعلق کوششوں نے ایک تحریک کی صورت اختیار کر لی۔ ہر تحریک میں عوامی رابطہ کی ضرورت ہوتی ہے اور

* پروفیسر، سابق صدر شعبہ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

www.taemeernews.com

اخبار اس کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ اردو تحریک کو مضبوط بنانے کے لیے ضروری تھا کہ انجمن کے ترجمان کو بھی مضبوط بنایا جائے۔ چناں چہ اردو زبان کو پندرہ روزہ کے بجائے ہفتہ وار بنانے کی تجویز ہوئی۔ اس کے جواز میں سرور صاحب نے لکھا:

"اردو کی بقا کی جدوجہد اس منزل پر آگئی ہے کہ ایک پندرہ روزہ اخبار پوری طرح اس مقصد کو پورا نہیں کر سکتا۔ آج کی تیز گام زندگی میں روزانہ ایسے واقعات ہوتے ہیں جن کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ آئے دن ایسی تقریریں ہوتی ہیں، ایسی تحریکیں اٹھتی ہیں، اردو کی موافقت اور مخالفت میں ایسے خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے کہ پندرہ روزہ اخبار کے دامن میں ان سب کی سمائی نہیں ہو سکتی ...... ان سب پہلوؤں پر توجہ کے لیے ایک ہفتہ وار اخبار ضروری ہے۔"

(ہماری زبان: ۱۵/اکتوبر ۱۹۵۶ء)

اگرچہ منصوبہ کے مطابق ۱۵/اکتوبر سے اسے ہفتہ وار کر دینا طے تھا، لیکن بعض قانونی مجبوریوں کی وجہ سے یکم دسمبر ۱۹۵۶ء سے ہی اسے ہفتہ وار شائع کیا جا سکا۔ اس وقت سے ۱۹۷۴ء تک (اس مدت کو چھوڑ کر جب وہ ہندوستان سے باہر رہے) وہ برابر ہماری زبان کے اداریے لکھتے رہے۔ کبھی طویل، کبھی مختصر۔ ان کا اصلی محور تو اردو تحریک ہی تھی ...... اردو کی ترویج و ترقی، تعلیمی نظام میں اردو کی حیثیت اور اس کا مقام، رسم خط اور زبان کی اصلاح کی تجاویز، مخالفین اردو سے وارد ہونے والے اعتراضات اور حملوں کا جواب، اردو کی تہذیبی حیثیت وغیرہ ...... لیکن اس کے علاوہ اور بہت سے تہذیبی، ثقافتی، علمی، فکری، ادبی مسائل بھی زیرِ بحث آتے رہے اور ان پر نپی تلی رائے کا اظہار کیا گیا۔ قومی اور بین الاقوامی مشاہیر کے انتقال پر تاثرات کا اظہار بہت سے اداریوں میں کیا گیا۔

ان اداریوں کو صحافتی تحریروں کے ذیل میں رکھا جا سکتا ہے جن کی حیثیت وقتی ہوتی ہے اور جن کو اکثر و بیشتر قلم برداشتہ لکھا جاتا ہے۔ ان میں عام طور پر نہ ادبی چاشنی کی توقع کی جاتی ہے، نہ گہرے غور و فکر کی۔ نہ ان میں اتنی گنجائش ہوتی ہے کہ کسی مسئلہ کے تمام پہلوؤں کو تفصیل کے ساتھ پیش کیا جا سکے۔ اختصار و جامعیت ان تحریروں کا تقاضا ہوتا ہے کہ کم از کم الفاظ میں بات پوری کر دی جائے۔ لیکن جن اہل قلم کو نگارش کا عطیہ قدرت سے ودیعت ہوا ہوتا ہے اور انہوں نے مشق تحریر بھی کی ہوتی ہے، وہ ان سب امور پر قابو پا لیتے ہیں۔ سرور صاحب کی بظاہر قلم برداشتہ تحریروں میں بھی غور و فکر کی روشنی اور زبان و بیان کی رعنائی نظر آتی ہے۔ ان سادہ اور مختصر تحریروں میں بھی گہرائی اور گیرائی کے پہلو نظر آتے ہیں۔ زبان و بیان کے اعتبار سے چست و درست اور استدلال کے اعتبار سے مضبوط و مستحکم!

ہماری زبان انجمن ترقی اردو کا ترجمان تھا (اور ہے)۔ انجمن کا بنیادی کام جہاں اردو کو فروغ دینا، اور اردو حلقوں میں مادری زبان کے لیے

www.taemeernews.com

بیداری پیدا کرنا اور اس کے استحکام و نشر و اشاعت کے لیے کوشش کرنا تھا، وہیں اس کی تائید و حمایت میں آواز بلند کرنا، سیاسی محاذ پر نہ صرف اس کی نمائندگی کرنا بلکہ مخالف آوازوں کا رد کرنا، اردو کے لیے رائے عامہ کو ہموار کرنا، اردو کی مانگوں کو سرکاری حلقوں تک پہنچانا، دفتر شاہی کے ذریعہ اردو کی حق تلفیوں کو اجاگر کرنا وغیرہ امور بھی انجمن کے لائحہ عمل میں شامل تھے۔ کوئی تنظیم تحریک کی صورت اسی وقت اختیار کر سکتی ہے جب زیادہ سے زیادہ لوگ اس کے ساتھ وابستہ ہوں اور اس کے مقاصد سے پوری طرح ہمدردی رکھتے ہوں، نیز یہ مقاصد بھی واضح ہوں۔ ۱۹۴۷ء کے بعد اردو دشمنی کا ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا تھا اور سرکاری حلقوں کی یہ نیت صاف نظر آنے لگی تھی کہ اردو کے راستوں کو ہر طرف سے روک دیا جائے اور اسے زندگی کے ہر کاروبار خاص طور پر تعلیم سے بے دخل کر دیا جائے اور اس کے مٹانے کی ہر تدبیر اختیار کی جائے۔ ان حالات کا تقاضا تھا کہ اردو کی بقا کی کوششوں کو ایک تحریک بنا دیا جائے۔ سرور صاحب کے بیشتر اداریے اسی مقصد کے تحت لکھے گئے۔

ان اداریوں میں تین جہتیں واضح طور پر نظر آتی ہیں: اردو دشمنوں کے اعتراضات کے جوابات، اردو سے متعلق حکومت کی پالیسیوں کے تجزیے اور موجودہ نامساعد حالات میں اہل اردو کی ذمہ داریاں۔

اردو سرزمین ہند پر پیدا ہوئی۔ یہاں کے مختلف طبقات اور بولیوں کے میل جول کے زیر اثر پلی بڑھی۔ اپنے ارتقائی مراحل میں آریائی کھڑی بولی کی منزل پر پہنچی تو اسی کی ایک شکل اردو کہلائی۔ کھڑی بولی کو اساسی حیثیت حاصل تھی، لیکن اس میں عناصر دوسری بولیوں کے بھی شامل ہوتے رہے اور اردو ان سب کو اپنے اندر جذب کرتی رہی۔ جو اس کے مزاج سے میل نہ کھا سکے، وہ ٹاٹ باہر ہو گئے۔ اسی لیے اردو کی اصل و نسل کا تعلق کسی نے پنجابی سے جوڑا، کسی نے ہریانی سے، کسی نے برج بھاشا سے، کسی نے کسی اور علاقائی بولی سے۔ اردو ملک گیر زبان کی حیثیت میں ابھرتی رہی۔ انیسویں صدی کی ابتدا میں جب فورٹ ولیم کالج میں کھڑی بولی کو دیوناگری رسم خط میں لکھ کر ہندی کو ادبی شکل دینے کی داغ بیل ڈالی گئی تو اردو کے پاس تین صدیوں سے زیادہ کا سرمایہ موجود تھا۔ ملک میں شمال سے جنوب اور مشرق سے مغرب تک اس کا چلن تھا۔ انیسویں صدی میں فارسی کی جگہ جب اسے سرکاری زبان بنا دیا گیا تو اس کی حیثیت اور مستحکم ہو گئی۔ لیکن انیسوں صدی کے ساتویں دہے میں جب دیوناگری رسم خط کو سرکاری طور پر استعمال کیے جانے کا مطالبہ کیا جانے لگا اور ہندی کو اردو کا حریف بنا کر پیش کیا گیا تو اردو ہندی تنازعہ کی داغ بیل پڑ گئی اور برطانوی عیاری کے زیر اثر نہ صرف ایک سیاسی مسئلہ بن گیا، بلکہ ہندو مسلم مناقشہ کی بنیاد بھی بن گیا اور اس طرح زبان جس کا اصولاً کسی مذہب سے کوئی تعلق نہیں تھا مذہبی خطوط پر تقسیم کی جانے لگی۔ آزادی کے بعد یہ تقسیم اور زیادہ شدت اختیار کر گئی۔ اگرچہ جمہوریہ ہند کے نئے آئین نے ملک کی کثیریت

www.taemeernews.com

(Plurality) کو مد نظر رکھتے ہوئے یہاں کے باشندوں کے...... بلا تفریق مذہب، رنگ، علاقہ...... مساوی حقوق تسلیم کیے اور اردو کو منجملہ دیگر زبانوں کے قومی زبان بھی قرار دیا، مگر عملاً اردو کو تمام حقوق سے محروم کر دیا۔ خاص طور پر شمالی ہند میں۔ ایک طرف حکومت کی پالیسیاں تھیں جن میں بہت سے دل خوش کن اعلان کیے جاتے تھے، لیکن ساتھ ہی اس کا بھی اہتمام ہوتا تھا کہ یہ عملی شکل اختیار نہ کر لیں، دوسری طرف مختلف حلقوں سے اردو پر طرح طرح کے اعتراضات بلکہ الزامات کی یورش تھی۔ ان حالات میں اردو تحریک چلانا اور اسے آگے بڑھانا بلکہ زندہ رکھنا ہی کافی دشوار کام تھا۔ انجمن نے اسے جاری رکھا۔ سرور صاحب کے اداریے ان تمام محاذوں پر اردو کا دفاع کرتے رہے اور ارباب حل و عقد کے سامنے اردو کا مرافعہ پیش کرتے رہے۔

معاملات، خواہ کسی بھی نوعیت کے ہوں، سیاست کے پالے میں جا پڑیں تو ان میں گرما گرمی پیدا ہو جانا لابدی ہو جاتا ہے۔ اردو کا معاملہ بھی اسی حادثہ کا شکار ہو گیا۔ اردو مخالف حلقوں کی طرف سے انتہائی لغو اعتراض کیے گئے، اشتعال انگیز حد تک...... اردو غیر ملکی زبان ہے! اردو فرقہ واریت کو بڑھاوا دیتی ہے! اردو دو قومی نظریہ کی حامی ہے! اردو پاکستان کی زبان ہے! اس کے حقوق کے مطالبے کرنے والے ملک کے غدار ہیں! اردو مسلمانوں اور مسلم فرقہ پرستی کی زبان ہے! اردو ملک مخالف جذبات کو پروان چڑھاتی ہے! اردو کوئی زبان ہی نہیں، وہ تو صرف ہندی کی ایک شیلی ہے! اردو صرف ملک کے چند ایک شہروں تک محدود ہے وغیرہ وغیرہ...... یہ اور ایسے بہت سے اعتراضات مختلف حلقوں سے برابر اٹھائے جاتے تھے۔ ان کا حقیقت سے تو کوئی تعلق تھا نہیں، لیکن ملک کی اکثریت ان سے ضرور گمراہ ہوتی تھی اور اردو مخالف فضا تیار ہوتی تھی۔ جہاں کہیں سے بھی یہ آوازیں اٹھیں، سرور صاحب نے ان پر توجہ کی اور جہاں ضروری سمجھا مدلل انداز میں ان کا رد کیا۔ لیکن اعتدال کا دامن کبھی نہ چھوڑا۔ متانت اور میانہ روی جوان کا مزاج تھی، ان کی تمام تحریروں میں قائم رہی۔

رانچی (بہار) میں فرقہ وارانہ فسادات ہوئے اور زبردست جانی و مالی نقصان ہوا تو پورے بہار بلکہ پورے ملک کی فضا مکدر ہو گئی۔ مشہور سرودے رہنما جے پرکاش نرائن نے فرقہ واریت کی مذمت بھی کی اور فسادات پر اظہار افسوس بھی کیا۔ وہ پہلے بھی بہار کے مختلف شہروں میں فرقہ وارانہ فسادات کے خلاف اظہار خیال کرتے رہے تھے۔ لیکن اس موقع پر انہوں نے بہار کی حکومت کو یہ مشورہ بھی دیا کہ فی الحال وہاں اردو کو دوسری سرکاری زبان نہ بنایا جائے جس کا مطالبہ بہار کے اہل اردو کی طرف سے آئینی اور قانونی دائرے کے اندر رہ کر برابر کیا جا رہا تھا۔ فرقہ وارانہ فسادات کی مذمت نہایت مناسب بات تھی، اس آگ کو بھڑکانے والوں کی مذمت بھی ضروری تھی، مگر ان فسادات کو بہانہ بنا کر اردو کے راستے کو روک دینے کی کوشش کسی طرح بھی روا نہیں تھی۔ دوسرے لفظوں میں گویا یہ کہنا تھا کہ اردو فرقہ پرستی کو بڑھاوا دیتی ہے۔ مسلمان/

www.taemeernews.com

اہل اردو جو پہلے ہی زخم خوردہ تھے، یہ بات ان کی جراحتوں پر نمک چھڑکنے کے مترادف تھی۔ سرور صاحب نے اپنے ایک اداریے میں نرائن جی کے سیاسی قامت، ان کے خلوص، ان کی بے تعصبی اور وسیع المشربی کو تو سراہا، لیکن اس مشورے پر تاسف کا اظہار کیا۔ آئین ہند کی مختلف دفعات کا حوالہ دیتے ہوئے سرور صاحب نے لکھا:

''اردو کو کسی ریاست کی سرکاری زبان قرار دینا ہر طرح آئینی، جمہوری، قومی، تہذیبی اور سیکولر تقاضوں کے مطابق ہے۔''

اسی بحث کو آگے بڑھاتے ہوئے انہوں نے اتر پردیش اور بہار میں اردو کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کا ذکر کیا اور لکھا کہ یہ سراسر آئین کی اور قانون کی خلاف ورزی ہے۔ ان ناانصافیوں کا تدارک ہونا چاہیے نہ یہ کہ ایک معقول آئینی مطالبہ پر قدغن لگادی جائے۔ انھوں نے اردو کو خاص اغراض کے لیے سرکاری زبان تسلیم کیے جانے کی حمایت کرتے ہوئے لکھا:

''جس (مقصد) کے لیے دستور میں گنجائش ہے اس مطالبہ کو کسی طرح فرقہ وارانہ نہیں کہا جا سکتا ...... اگر کچھ فرقہ پرست اس کی مخالفت کرتے ہیں تو اس مخالفت کی بنا پر مطالبے کی صحت اور معقولیت کو کیسے نظر انداز کیا جا سکتا ہے ......موجودہ تنگ نظری کی فضا کی وجہ سے معقول اور قومی اور جمہوری اصولوں کے مطابق مطالبے کو نظر انداز کرنا یا اس پر غور نہ کرنے کی صلاح دینا ہمارے نزدیک فرقہ واریت کو غیر ارادی طور پر شہ دینا ہے۔'' (اردو تحریک ص ۷۶)

بیسویں صدی کے ساتویں دہے میں کانگریس کی وزارت ختم ہو کر کئی جماعتوں کے اشتراک سے جو وزارت بنی وہ اردو کو بہار کی دوسری سرکاری زبان بنانا چاہتی تھی، لیکن اس وزارت میں شامل جن سنگھ (حال کی بھارتیہ جنتا پارٹی) نے اس کی کھل کر زبردست مخالفت کی۔ اسی زمانے میں جن سنگھ کے معروف رہنما شری بلراج مدھوک کا اردو کی مخالفت میں ایک بیان شائع ہوا، جس کا لب لباب یہ تھا کہ اردو کوئی علیحدہ زبان نہیں، ہندی کی ایک شیلی ہے، اس کا رسم خط بدل دینا چاہیے اور یہ شکوہ بھی کہ مسلمان اردو کی حمایت کیوں کرتے ہیں۔ سرور صاحب نے اس بیان کے متعلق لکھا کہ:

''انہوں نے اردو کے متعلق وہی پرانی اور بے سروپا باتیں دہرائی ہیں جس کا جواب بار بار دیا جا چکا ہے اور جن کا کھوکھلا پن اچھی طرح آشکار ہو چکا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ جن سنگھ نے اپنے ذہن کو اتنا محدود کر لیا ہے کہ بعض حقائق سے آنکھیں چار کرنے کی آج بھی اس میں سکت نہیں ہے...... یہ تینوں باتیں ایسی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ جن سنگھ حقائق پر غور نہیں کرتی بلکہ اس کا پہلے سے طے شدہ ایک نقطۂ نظر ہے اور وہ سب پر یہ نقطۂ نظر لادنا چاہتی ہے۔'' (اردو تحریک، ص ۱۰۲)

www.taemeernews.com

انھوں نے تینوں باتوں کو اپنی جوابی تحریر میں شامل کیا۔ مسلمانوں اور اردو کے تعلق سے انھوں نے لکھا:

''اگر مسلمان جو ہندوستانی قوم کا ایک اہم عنصر ہیں، کسی زبان کی حفاظت کے لیے آواز بلند کرتے ہیں تو یہ قوم کی ایک اہم جماعت کی آواز ہے اور اس طرح قومی آواز ہے۔ اسے فرقہ پرستی کہنا خود فرقہ پرستی اور تنگ نظری کا ثبوت دینا ہے۔''

(ایضاً، ص ۱۰۳)

بہار اور اتر پردیش میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کے طور پر منظور کرانے کا مطالبہ کیوں کیا جا رہا ہے، اس کے بارے میں سرور صاحب نے لکھا:

''چونکہ بیس برس کے تجربے سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ جو سہولتیں اب تک اردو کو دی گئیں ان پر عمل نہیں ہوا بلکہ الٹے اس کے چلن اور اس کی ترقی کے راستے میں رکاوٹیں ڈالی گئیں، اس لیے اب اردو دوستوں کا مطالبہ فطری ہے کہ دستور کے مطابق جہاں اردو والوں کی قابل لحاظ آبادی ہے وہاں اسے سرکاری زبان تسلیم کیا جائے۔ یہ ایک قومی مطالبہ ہے۔''

(ایضاً، ص ۱۰۴)

اس دور کے اہم کانگریسی رہنما سمپورنا نند جی جو اتر پردیش میں مختلف وزارتوں پر فائز رہے، اردو کے سخت ترین مخالفوں میں رہے۔ وہ وزیر تعلیم رہے تو اردو کی بیخ کنی کے لیے جو کچھ کر سکتے تھے کیا اور وزیر اعلیٰ بنے تو بھی اپنی اسی پالیسی کو آگے بڑھایا۔ وہ موقع بے موقع اردو کے مخالف بیان دیتے رہے۔ یہ تسلیم کرتے ہوئے کہ وہ ہمارے مشہور و ممتاز دانشوروں میں ہیں اور آزادی کی جد و جہد نیز ملک کی تعمیر و ترقی میں ان کا نمایاں حصہ ہے، سرور صاحب نے لکھا:

''انھوں نے نہ ہمارے غیر مذہبی ریاست کے تصور کو دل سے قبول کیا ہے، نہ جمہوریت کی رواداری اور فراخ دلی کو، نہ مشترک تہذیب کی اس بنیاد کو جس کے متعلق اب کسی اختلاف کی گنجائش نہیں ہونی چاہیے...... لسانی اقلیتوں کے متعلق ان کا رویہ اور جو کچھ بھی ہو ہمدردانہ نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو کے سلسلے میں شروع سے ان کے یہاں ایک تنگ نظری ملتی ہے...... اگر کسی نے اردو کے ساتھ کچھ انصاف کی کوشش بھی کی ہے تو انھوں نے اس میں سیکڑوں خطرے دیکھ لیے ہیں۔''

(ہماری زبان ۲۲/۷/۶۱)

اس تمہید کے بعد سرور صاحب نے سمپورنا نند جی کے بیانات کا بطلان کرتے ہوئے اردو کی حیثیت اور اس کے حق کو مدلل انداز میں پیش کیا اور لکھا:

''اگر اتر پردیش میں اردو کو اس کا حق دیا گیا اور اسے سرکاری طور پر تسلیم کیا گیا تو اس سے قومی وحدت اور سالمیت کو خطرہ

www.taemeernews.com

نہ ہوگا۔ یہ وحدت اور مضبوط ہوگی۔"

(ایضاً)

اور یہ آگاہی بھی دی:

"جب تک اس حق کو تسلیم نہیں کیا گیا اس وقت تک اردو بولنے والے شاکی رہیں گے اور ملک کی ترقی میں اطمینان اور خوش دلی کے ساتھ حصہ لینے کے قابل نہ ہوسکیں گے۔" (ایضاً)

شری لیش پال جو ہندی کے معروف مصنف اور ترقی پسند حلقہ سے وابستہ تھے، ان کے بارے میں سرور صاحب کا خیال تھا کہ:

"کہنے کو وہ اشتراکی نظریۂ حیات کے علمبردار ہیں، مگر زبان کے معاملہ میں کسی فرقہ پرست تنگ نظر سے کم نہیں اردو کی مخالفت کو انہوں نے اپنا مشن قرار دے رکھا ہے۔...... لیش پال کی بنیادی خامی یہ ہے کہ وہ جمہوریت پر اعتقاد نہیں رکھتے۔ اسی لیے اقلیتوں کے معاملہ میں ان کا ذہن صاف نہیں ہے۔ وہ کہنے کو اشتراکی ہیں مگر ان کے یہاں دہشت پسندوں کی سی فکر ہے۔"

(ہماری زبان، ۲۲/۵/۶۱)

اردو کی مخالفت میں لیش پال جی کی کوئی تحریر شائع ہوتی تو سرور صاحب اس کا نوٹس ضرور لیتے کیونکہ وہ ہندی کے چوٹی کے لکھنے والوں میں تھے اور کچھ لوگ ضرور ان کے خیالات سے متاثر ہوتے تھے۔ سرور صاحب ان کے خیالات کی تردید کرتے رہے۔ انہوں نے لیش پال جی اور ایسے ہی دوسرے لوگوں کی اردو مخالفت کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا کہ یہ محض ایک زبان کی مخالفت کا معاملہ نہیں بلکہ:

"لیش پال کو یہ ناگوار ہے کہ جمہوریت کے حامی اور وطن کے بہی خواہ ہندوستان کی ساری زبانوں کے ساتھ انصاف چاہتے ہیں اور وہ ہندوستان کی ساری تاریخ اور اس کی مشترک تہذیب سے محبت رکھتے ہیں۔"

(ہماری زبان، ۲۲/ ۵/۶۱ء)

سیاست کی اپنی منطق ہوتی ہے۔ وہ وقتی حالات و معاملات پر ساری توجہ صرف کرتی ہے اور اس کے پیش نظر وقتی نفع نقصان ہی ہوتا ہے۔ لیکن مدبرانہ سیاست دور اندیشی سے کام لیتی ہے، کسی بھی اقدام کے دور رس اثرات کو مد نظر رکھتی ہے۔ مدبر ہم اسی کو کہتے ہیں جو عارضی اور وقتی طبقاتی یا فرقہ وارانہ مفاد سے بالاتر ہوکر ملک وقوم کی فلاح کے بارے میں سوچے۔ اس کی نظر میں وسعت، قلب میں فراخی اور ذہن میں کشادگی ہوتی ہے۔ انصاف پسندی اور حق گوئی اس کا شعار ہوتا ہے۔ گاندھی جی اور ان کے چیلے ونوبا بھاوے جی ہمارے ایسے ہی رہنماؤں میں شمار ہوتے ہیں اور ہماری قومی زندگی میں ایک محترم مقام پر فائز رہے ہیں۔ جب ونوبا جی نے اردو کے بارے میں اپنے ایک بیان میں کہا کہ:

"اردو ہندوستان میں فروغ پاسکتی ہے اور قومی زندگی میں ایک اہم رول ادا کرسکتی ہے،

www.taemeernews.com

بشرطیکہ وہ ناگری رسم خط میں لکھی جائے۔"

تو اردو حلقوں میں سخت مایوسی کا احساس ہوا۔ وہ ونوبا جی جیسے مدبر سے یہ توقع نہیں رکھتے تھے کہ تاریخ، روایت اور دستور ہند سب کو نظر انداز کر کے وہ ایسا بیان دیں گے۔ اردو کے رسم خط کی تبدیلی کی بات وہی کر رہے تھے جو اردو کے وجود ہی کو قبول نہیں کرتے تھے یا اسے ملیامیٹ کر دینا چاہتے تھے۔ سرور صاحب نے اردو رسم خط کو باقی رکھنے کی حمایت میں ایک زبردست اداریہ قلم بند کیا اور اس پر زور دیا کہ "اردو زبان اپنے تاریخی رسم خط کے ساتھ ہندوستان کی قومی زبانوں میں سے ایک زبان ہے" اور اس طرف توجہ دلائی کہ:

"قومی یک جہتی ایک زبان یا ایک رسم خط سے پیدا نہیں ہوتی۔ قومی یک جہتی کے لیے ضروری ہے کہ اکثریت اقلیت کے جذبات و نفسیات کا خیال رکھے اور کسی وقت یہ محسوس نہ ہونے دے کہ اس پر کوئی چیز طاقت یا تعداد کے بل پر لادی جا رہی ہے۔ قومی یک جہتی کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ملک کی ساری تہذیبی دولت پر فخر ہو۔ خواہ وہ اکثریت کی میراث ہو یا اقلیت کی۔"

(اردو تحریک: ص ۱۶۵)

رسم خط کی تبدیلی کا مسئلہ اردو کے دانا دشمنوں نے ہی نہیں بلکہ بعض نادان دوستوں نے بھی اٹھایا۔ شاید ہر طرف سے اٹھنے والے اردو مخالف شور و غل سے متاثر و مرعوب ہو کر بعض اہل اردو نے بھی اس تبدیلی کی حمایت کی۔ وقتاً فوقتاً مختلف افراد کی طرف سے یہ آواز اٹھتی رہی۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ ان کی مخلصانہ رائے تھی یا ابن الوقتی! لیکن اردو کے لیے ناگری رسم خط اختیار کرنے کا سیدھا سا مطلب یہ تھا کہ اس دعوے کو مان لیا جائے کہ اردو الگ زبان نہیں بلکہ ہندی کی شیلی ہے اور جلد از جلد اسے ہندی میں ضم کر دیا جائے۔ اردو کی صفوں سے یہ بات اٹھنا خاصا تشویش ناک تھا۔ یہ آوازیں تعداد میں کتنی ہی کم اور بے اثر رہی ہوں، لیکن مخالفین کے حلقوں میں ان کی پذیرائی ہوتی تھی اور ان کو تقویت ملتی تھی اور سرور صاحب کے الفاظ میں:

"ان لوگوں کی سادہ لوحی یا معصومیت یا مصلحت پسندی کی وجہ سے اپنے لوگ شبہ میں پڑ گئے ہیں کہ کہیں ہم اپنے رسم خط پر اصرار کر کے غلطی تو نہیں کر رہے ہیں ...... ایسی تجویزیں زیادہ تر ان لوگوں کی طرف سے پیش کی گئی ہیں جو یا تو ہر چیز کو وقتی سیاست کی نظر سے دیکھتے ہیں یا اردو کے سارے سرمائے سے ناواقف ہیں۔"

(اردو تحریک: ص ۷۷)

انھوں نے اردو رسم خط سے متعلق متعدد اداریے لکھے اور مختلف اعتراضات کی مدلل تردید کی، اصلاح کی تجاویز بھی پیش کیں۔ ان کی ان تمام تحریروں کا لب لباب یہ ہے کہ:

(۱) رسم خط کے فرق سے قومی وحدت متاثر نہیں ہوتی۔

(۲) زبان اور رسم خط کا کوئی ازلی رشتہ نہیں ہوتا، مگر

www.taemeernews.com

زبان ابتدا سے جس رسم خط سے وابستہ ہوجاتی ہے، وہ اس کا جزو لاینفک بن جاتا ہے۔

(۳) دنیا کا کوئی رسم خط مکمل ہونے کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔ اردو رسم خط میں بھی جو خامیاں ہیں ان کو دور کرنے کی کوشش ہونی چاہیے۔ خوش نمائی کی صورتوں کے بجائے افادی صورتوں کو اختیار کرنا چاہیے۔

(۴) اردو زبان اور رسم خط کے لیے ایک اٹل عقیدہ پیدا کرنا ہوگا۔

غرض کہ جس گوشے سے بھی اردو کو تنقید بے جا کا ہدف بنایا گیا، سرور صاحب نے اس کا نوٹس لیا اور اردو کے دفاع میں قلم اٹھایا۔ مخالفین کے جا بے جا اعتراضات پر اشتعال میں آجانا اور جذبات میں بہہ جانا کچھ مستبعد نہیں ہوتا۔ لیکن سرور صاحب نے سنجیدگی، متانت اور لہجہ کی نرمی کا دامن کبھی ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ اوپر کے حوالوں اور اقتباس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ انہوں نے ہمیشہ اپنی بات نپے تلے الفاظ اور شائستہ انداز میں کہی۔ یہی انداز ان کا طرۂ امتیاز اور ان کی تمام تحریروں کا وصف خاص رہا ہے۔

قومی دستور ساز اسمبلی نے جب ہندوستان کا آئین مرتب کیا تو ہندی کو ملکی رابطہ کی زبان بنانا تو منظور کیا، لیکن اس بات کو بھی نظر انداز نہیں کیا کہ ہندوستان ایک کثیر لسانی ملک ہے اور ان میں سے بہت سی زبانیں ہندی سے زیادہ نہیں تو اس کے برابر ہی ترقی یافتہ ہیں۔ ان سب کو قومی زبانیں قرار دیا گیا۔ اردو بھی ان میں سے ایک ہے۔ یہ سارے ملک میں بولی، سمجھی، پڑھی اور لکھی جاتی ہے۔ لیکن اس دستوری تحفظ اور عومی حیثیت کے باوجود آزادی کے بعد اس کی راہ میں طرح طرح کی رکاوٹیں پیدا کی جاتی رہیں۔ دفتروں سے، عدالتوں سے، تعلیمی نظام سے اس کو خارج کرنے کی شعوری کوششیں کی جاتی رہیں۔ مخفی بھی، علانیہ بھی۔ ہندوستان کو جمہوریہ قرار دیا گیا تھا اور دستور نے تمام باشندوں کو یکساں حقوق کی ضمانت دی تھی جس میں تمام زبانوں کا تحفظ بھی شامل تھا۔ اس جمہوریت کی لاج رکھنے کو مختلف اوقات میں طرح طرح کے قانون بنائے گئے، لیکن عملاً ان قوانین کی دھجیاں بھی اڑائی جاتی رہیں اور کسی سرکاری سطح پر بھی ان کے نفاذ کے بارے میں باز پرس نہیں کی گئی۔ اس کے نتیجہ میں بقول آل احمد سرور:

> ''اردو کے سلسلے میں آزادی کے بعد سے تقسیم کے پیدا کردہ مسائل کی وجہ سے انصاف نہیں ہوا ہے۔ یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے اور کسی قسم کی لیپ پوت سے اس حقیقت کو کوئی اور رنگ نہیں دیا جاسکتا۔''
> (اردو تحریک، ص ۹)

ہماری زبان کے اداریوں میں اس طرح کی ناانصافیوں کو واشگاف کیا جاتا رہا، ان کے خلاف آواز اٹھائی جاتی رہی، سرکاری اور سیاسی حلقوں کو متوجہ کیا جاتا رہا۔

سب سے اہم معاملہ تعلیمی نظام کا تھا۔ کسی زبان کو اگر تعلیمی نظام سے خارج کردیا جائے تو اس کے سوتے خشک ہونا شروع ہوجاتے ہیں اور اس کے پنپنے کے امکان معدوم۔ شمالی ہند کا پنجاب سے بہار

www.taemeernews.com

تک کا علاقہ اردو کا گڑھ تھا اور اتر پردیش اس کا زاد بوم۔ اتر پردیش ہی میں اردو سب سے زیادہ عصبیت کا شکار ہوئی۔ تعلیمی اصولوں سے لے کر دستور ہند تک نے نظام تعلیم میں مادری زبان کی اہمیت کو تسلیم کیا تھا۔ خاص طور پر ابتدائی تعلیم مادری زبان میں دیے جانے پر اصرار تھا۔ لیکن یہاں جن بچوں کی مادری زبان اردو تھی، انھیں اس حق سے محروم کر دیا گیا۔ یہاں ہر طرح کی ناانصافی کو روا رکھا گیا، ہر قانون کی صورت مسخ کردی گئی اور اس کے چیتھڑے اڑا دیے گئے۔ اتر پردیش کو یک لسانی ہندی ریاست قرار دیا گیا، مادری زبان کے ساتھ علاقائی زبان کو متبادل کے طور پر سہ لسانی فارمولے میں شامل کیا گیا اور علاقائی زبان کی آڑ میں اردو کا راستہ روک دیا گیا۔ تیسری زبان کے لیے جدید ہندوستانی زبان کے بجائے آٹھویں شیڈول کی زبانوں کی شق شامل کرکے سنسکرت کو لازمی کر دیا گیا، دس اور چالیس کا فارمولا بنایا گیا تو ان اعداد کو کبھی پورا ہی نہیں ہونے دیا گیا، وغیرہ۔ غرض کہ مختلف اوقات میں جو قوانین بنائے گئے، ان کی تنفیذ کو ناممکن بنا دیا گیا۔ انجمن نے ان ناانصافیوں کے خلاف آواز اٹھائی۔ سرور صاحب نے متعدد اداریے ان مسائل پر لکھے، حکومت کو توجہ دلائی، اس پر متنبہ کیا کہ ایک لسانی معاملے کو سیاسی نہ بنایا جائے۔ اردو کو ابتدائی، ثانوی اور اعلی سطح پر ذریعہ تعلیم بنایا جائے اس کی وکالت کی۔ انہوں نے لکھا:

"اردو کی بقا اور ترقی کا راز اس کی ابتدائی، ثانوی اور اعلی منزل پر تعلیم میں ہے۔"

(اردو تحریک، ص ۹۷)

اس میں بھی خاص طور پر ابتدائی منزل پر اردو میں تعلیم پر زور دیا۔ تاکہ بنیاد درست ہو جائے اور یہ مشورہ بھی دیا کہ اگر حکومت کی طرف سے انتظام نہ ہو تو اپنے اسکول کھولنے چاہییں۔ انھوں نے اس بات پر تشویش کا اظہار کیا کہ حکومت کے رویوں کی وجہ سے اردو والوں میں مایوسی پیدا ہوتی جارہی ہے۔ انہوں نے لکھا:

"ہمیں کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حکومت کی غفلت اور مقامی حکام کی دھاندلی کی وجہ سے لوگ اتنے مایوس ہوتے جارہے ہیں کہ درخواستیں بھی بڑی تعداد میں نہیں دی جاتیں۔"

(اردو تحریک ص ۹۸)

اپنی تمام اردو کشی کے باوجود اتر پردیش کی حکومت یہ دعوے کرتی رہی ہے کہ اس نے اردو کے لیے بہت سی سہولتیں فراہم کی ہیں۔ ان میں عام طور پر ان تمام قوانین وضوابط کو پیش کر دیا جاتا ہے جو کاغذ پر بنائے گئے اور جن کے نفاذ کی کوئی صورت پیدا نہیں ہوئی۔ ایسے ہی دعووں پر مشتمل ایک کتابچہ حکومت نے شائع کیا تو سرور صاحب نے "کیا اتر پردیش میں اردو کو واقعی سہولتیں ملتی ہیں؟" کے عنوان سے ایک طویل اداریہ لکھا اور نکتہ وار ان دعووں کا جائزہ لیا جو بظاہر درست نظر آتے تھے، لیکن تھے بے حقیقت۔ سرور صاحب نے لکھا:

"اس میں ادھوری حقیقت ہے

www.taemeernews.com

اور سب جانتے ہیں کہ ادھوری حقیقت بعض اوقات صریح غلط بیانی سے زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔" (ایضاً ص ۱۰۶)

اور آخر میں اس نتیجہ پر پہنچے!

"خلاصہ یہ کہ اتر پردیش کی حکومت کا یہ دعویٰ کہ وہ اردو کی توسیع اور ترقی کے لیے وہ سب کر رہی ہے جو ایک قومی حکومت ملک کی ایک قومی زبان کے لیے کرسکتی ہے، بالکل غلط ہے۔ اتر پردیش کی حکومت نے اس سلسلے میں بڑی غفلت برتی ہے۔ وہ اپنا فرض پورا کرنے میں بالکل ناکام رہی ہے اور اس کی وجہ سے اردو داں آبادی میں بجا طور پر سخت شکایت اور برہمی ہے۔"

(ایضاً، ص ۱۰۹)

غرض کہ جہاں حکومت اور اس کے عمال و حکام کی غفلت یا دانستہ کوششوں سے اردو کے حقوق کی پامالی کا احساس ہوا، سرورؔ صاحب نے وہیں آواز اٹھائی۔ وہ نہ دوسروں کی نامعقول باتوں پر مشتعل ہوتے تھے، نہ اپنی تحریروں سے دوسروں کو اشتعال دلاتے تھے، بلکہ اپنی فطری نرم خوئی سے کام لیتے ہوئے، وہ اردو کے مطالبات کو (آئینی، قانونی اور جمہوری دائرے میں رہتے ہوئے) موثر اور مدلل انداز میں پیش کرتے رہے۔ انجمن اور سرورؔ صاحب دونوں نے ہی احتجاج و مطالبات کا وہ انداز اختیار نہیں کیا جس میں شدت ہو۔ وہ اس انداز فکر کی تاثیر وافادیت پر یقین رکھتے تھے۔ انہوں نے لکھا:

"جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اپنا آئینی حق استعمال کرنا اور اردو کی حفاظت کے لیے ایک خاموش، پرامن اور سنجیدہ پروگرام بنانا بیکار ہوتا ہے، انہیں بھی یہ سوچنا چاہیے کہ دراصل اس طریقے سے ہماری مشکلات کتنی آسان ہو جاتی ہیں، ہمارے مطالبے کی سچائی کتنی واضح ہوتی ہے، ہمارا اخلاقی پہلو کتنا اجاگر ہوتا ہے، قومی یک جہتی اور امن واتحاد کے لیے ہماری مساعی کتنی ہردلعزیز ہوتی ہیں اور ہم مجموعی طور پر اپنی منزل سے کتنے قریب ہوتے ہیں۔"

(ہماری زبان، ۱۰/۵/۱۹۵۸ء)

"اردو اور اردو دوستوں پر جو سختی گزرنا تھی گزر چکی۔ اب حالات بدل رہے ہیں۔ اردو کی ہندوستانی بنیاد، اس میں ہماری مشترکہ تہذیب کی جلوہ گری، اس کے ادب کی رنگا رنگی اور جامعیت کا احساس عام ہو رہا ہے۔ اس قومی سرمایہ پر لوگ فخر کرنے لگے ہیں، اردو کے ساتھ انصاف کا جذبہ ترقی کر رہا ہے...... ریاستی حکومتوں کے رویّہ میں بھی تبدیلی ہو رہی ہے۔ یہ سب ملک میں جمہوری عناصر کی تقویت اور اردو دوستوں کی بیداری کا ثبوت ہے۔"

(گزر گئی ترے مستوں پہ وہ بھی تیرہ شبی: ہماری زبان: ۸/۱/۱۹۵۸ء)

www.taemeernews.com

حالانکہ مستقبل نے ثابت کر دیا کہ یہ سب تصورات سراب تھے۔ حکومت کے سارے اعلانات طفل تسلیوں سے زیادہ نہ تھے، بلکہ اونگھتے لوگوں کو تھپتھپانے کے مترادف تھے کہ وہ گہری نیند سو جائیں، نہ ہم منزل سے قریب ہوئے، نہ ریاستی حکومت کے رویّہ میں تبدیلی ہوئی، نہ اردو کے ساتھ انصاف ہوا۔ منزلیں گم ہوگئیں اور اب تو نشان راہ بھی مٹتے جارہے ہیں۔ کچھ ہی عرصے کے بعد خود سرور صاحب نے بھی حقیقت حال کو محسوس کرنا شروع کر دیا۔ چنانچہ ۱۹۷۳ء میں لسانی اقلیتوں کے کمشنر کی رپورٹ پر تبصرہ کرتے ہوئے انہوں نے لکھا:

> ''ہمیں کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ملک میں اخلاقی زوال اس درجہ کو پہنچ گیا ہے کہ اب جس گروہ کے پاس سیاسی طاقت نہیں ہے، اس کے لیے دستور میں کتنے ہی تحفظات ہوں اور جمہوریت اور سیکولرزم کا کچھ ہی تقاضا کیوں نہ ہو، نہ مرکز کی حکومت اپنا فرض پہچانے گی، نہ ریاستی حکومتیں اور نہ پارلیمنٹ کے ممبروں کو کچھ کرنے کا خیال آئے گا۔''

(ہماری زبان: ۱۱/۹/۳/۱۹۷۳ء)

یہ نہیں کہ انھوں نے اردو مخالف آوازوں پر ہی اپنی توجہ مرکوز رکھی۔ یہ تو دفاعی کام تھا، اس کو بھی وہ بخوبی انجام دیتے رہے۔ لیکن اس سے زیادہ اہم بات تو تعمیر و تشکیل کی تھی کہ ان نامساعد حالات میں اہل اردو کے حوصلوں کو بلند رکھا جائے، ان کو وہ اقدامات کرنے پر اکسایا جائے جن سے اردو کو فروغ حاصل ہو، مخالفتوں کی وجہ سے اردو جس پس روی کا شکار تھی، اس کو روکا جائے۔ انصاف کا تقاضا یہی تھا کہ خود اہل اردو ہاتھ پر ہاتھ دھر کر نہ بیٹھیں بلکہ وہ کوششیں کرتے رہیں جو تمام تر مخالف حالات کے باوجود وہ کر سکتے ہیں اور جن میں کوئی مانع نہیں ہے۔ انہوں نے اپنے متعدد اداریوں میں اہل اردو کو مخاطب کیا۔ ان کو بھڑکانے اور مشتعل کرنے کے لیے نہیں بلکہ خود کچھ کرنے کی ترغیب دینے کے لیے۔ ایک اداریے میں انہوں نے ایم۔ اے حسن کی اس تحریر کی تائید کی کہ:

> ''اگر واقعی ہمیں اپنی زبان محبوب ہے اور ہم اس کو پوری آن بان کے ساتھ زندہ رکھنا چاہتے ہیں، تو دوسروں کا بھروسا چھوڑ کر صرف یہ سوچیں کہ آپ اپنے حدود میں اردو کے لیے کیا کر سکتے ہیں''۔

اور اس کے بعد کاموں کی ایک فہرست دی، انہوں نے اس پر زور دیا کہ:

> ''......زیادہ ضروری یہ کام ہے کہ اپنے اپنے حلقے میں ابتدائی تعلیم اردو کے ذریعہ سے دینے کا خود انتظام کریں یا ریاستی حکومت اور مقامی اداروں کے ذریعہ سے کرائیں۔ بنیادی تعلیم بہرحال اردو میں ہر بچّے کو دلوانا ہمارے لیے لازمی ہے۔''

(اردو تحریک: ص۴۴)

تعلیم کسی بھی زبان کی ریڑھ کی ہڈی ہوتی ہے۔ اگرچہ وہ ثانوی اور اعلیٰ تعلیمی ادارے قائم

www.taemeernews.com

کرنے کی طرف بھی توجہ دلاتے رہے، لیکن ابتدائی تعلیم پر زیادہ اصرار اس لیے بھی تھا کہ اصل اور عوامی بنیاد یہیں رکھی جاتی ہے۔

کبھی اہل اردو کو غیرت دلائی کہ وہ صرف حکومت سے مطالبے کرتے ہیں، لیکن خود اپنے کرنے کے جو کام ہیں، وہ نہیں کرتے۔ حالانکہ:

''جو لوگ اردو کو اپنی مادری زبان کہتے ہیں......ان کے بھی کچھ فرائض ہیں۔ پہلا فرض یہ ہے کہ وہ اپنے طور پر اردو کے لیے کچھ کریں۔ جو لوگ اردو کے اسکول چلا سکتے ہیں، وہ اسکول چلائیں، جو اسکولوں کے لیے چندہ دے سکتے ہیں 'چندہ دیں' جو اخبار اور رسائل خرید سکتے ہیں، اخبار اور رسائل خریدیں، جو کتابیں لکھ سکتے ہیں، کتابیں لکھیں۔ غرض کہ ہر اردو داں دامے، درمے، سخنے، قدمے کچھ نہ کچھ کرے۔ کیا ہم ایمانداری سے کہہ سکتے ہیں کہ اردو دوست ایسا کر رہے ہیں''۔

(اردو تحریک: ص ۶۹)

مشاعرے اردو تہذیب کا ایک اہم جز رہے ہیں، ان سے تہذیب ادب بھی ہوئی ہے اور ذہنی تفریح بھی مہیا ہوئی ہے۔ مشاعرے کی مجلسیں شعراء کے کلام کی کسوٹی ہوتی تھیں۔ باذوق سامعین کی داد میں ان کا تنقیدی شعور بھی شامل ہوتا تھا، اس لیے عام سامعین کی ادبی اور فکری تربیت بھی ہوتی تھی۔ جس ماحول میں شاعروں کی روایت پروان چڑھی، جب وہ بدلا تو سبھی کچھ بدل گیا۔ ادبی مزاج بدل گیا، ذوق زبان بدل گیا، فکری رجحانات بدل گئے، مجلسی آداب میں تبدیلی پیدا ہوگئی۔ نتیجتاً مشاعرے کی فضا بھی بدلی اور اس کی ادبی وتہذیبی حیثیت مضمحل ہوئی۔ اس پر ادبی حلقوں میں بجا طور پر تشویش پیدا ہوئی۔ سرور صاحب نے مختلف اوقات میں مشاعروں کی صورت حال پر اظہار خیال کیا۔ ان کی افادیت اور عوامی اپیل کا اعتراف کرتے ہوئے، ان نقائص کی طرف بھی اشارہ کیا جو اس تہذیبی ادارے میں راہ پا گئے ہیں۔ مشاعروں کو سستی تفریح کا ذریعہ بنا لیا گیا ہے، منتظمین کا رویہ غیر سنجیدہ ہوتا ہے، مشاعروں کو سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، ایسے وزرا یا حکام سے مشاعروں کا افتتاح کرایا جاتا ہے جنہیں نہ شعر وادب سے کوئی دلچسپی ہوتی ہے نہ ان کا فہم، سامعین میں زیادہ تر لوگ اردو سے بالکل نابلد ہوتے ہیں جو نہ شعری نزاکتوں کو سمجھتے ہیں، نہ ان کے حسن کا ادراک رکھتے ہیں، شعراء گلے بازی سے مشاعروں کو ''فتح'' کرنا چاہتے ہیں، وہ چٹ پٹے شعر سنا کر عوام کے سستے جذبات کو متاثر کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ وہ بجا طور پر اس نتیجہ پر پہنچے:

''ان سب باتوں نے مل کر ایک افراتفری پیدا کر دی ہے۔ مشاعروں میں سننے والوں کی تعداد تو بڑھ رہی ہے، مگر ان کی افادیت کم ہو رہی ہے۔ اس لیے ان کی اصلاح ضروری ہے۔''

تحریک ص ۲۰۷) (اردو تحریک، ص ۲۴۶)اردو

انہوں نے یاد دلایا کہ:

www.taemeernews.com

''اچھا مشاعرہ منتظمین کے سلیقے، شعرا کی ذمہ داری کے احساس اور سامعین کے ضبط و نظم، تینوں سے وجود میں آتا ہے۔ اردو دوستوں کے پاس عوام سے تعلق کا یہ ایک اچھا آلہ تھا، ہم اپنی غیر ذمہ داری کی وجہ سے اسے مسخ کر رہے ہیں۔ ابھی اس کی اصلاح ہوسکتی ہے''۔

(ہماری زبان: ۱۵/۱/۱۹۶۳ء)

خاصی بڑی تعداد ان اداریوں کی بھی ہے جو مشاہیر کی وفات پر لکھے گئے۔ یہ صرف تعزیتی تحریریں نہیں ہیں بلکہ ان میں ان حضرات کے کارناموں کا بھی بھرپور جائزہ لیا گیا ہے اور ان کو قرار واقعی خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے۔ یہ سب ایسی شخصیتیں ہیں جنہوں نے علم و ادب کی شمعیں جلائیں، جن سے دانشوری کی راہیں روشن ہوئیں۔ مثلاً میر عثمان علی خاں، نریش کمار شاد، عبدالقادر سروری، پروفیسر حبیب، تسکین قریشی، سید عبداللطیف، غلام محمد صادق، آدت ناتھ جھا، اشائن بک، شیخ محمد اکرام، ضیاء بدایونی، بنّے بھائی (سجاد ظہیر)، تاراچند وغیرہ۔

ایسے اداریوں کی بھی خاصی بڑی تعداد ہے جن میں لسانی و ادبی مسائل اٹھائے گئے۔ یہ پہلے لکھا جاچکا ہے کہ اردو رسم خط کے بارے میں سرور صاحب نے کئی اداریے لکھے۔ ان میں وہ اداریے بھی ہیں جو رسم خط کے دفاع میں ہیں کہ کسی زبان کو اور اردو کو بھی اس کے رسم خط سے جدا نہیں کیا جاسکتا اور اس لیے اردو کو اپنے رسم خط کے ساتھ ہی باقی رہنا چاہیے۔ اور وہ اداریے بھی ہیں جن میں اردو رسم خط کا جائزہ لیا گیا ہے کہ اس میں کس طرح کی ترمیم و اصلاح کی ضرورت ہے۔ تحریر کو جہاں تک ممکن ہو، تلفظ کا آئینہ ہونا چاہیے اور التباس و ابہام کی صورتوں کو کم کرنے کی کوشش ہونی چاہیے۔ وہ نستعلیق کے مقابلے میں نسخ کو ترجیح دیتے تھے تاکہ طباعت کے لیے ٹائپ کو استعمال کیا جاسکے اور اس کی رفتار و خوبصورتی میں اضافہ ہو۔ اب تو کمپیوٹر نے نستعلیق کو اختیار کرکے بہت سے مسائل کا حل کردیا ہے اور اس بحث کی ضرورت ہی نہیں رہی۔

ادبی و فکری مسائل پر اداریوں کی کافی بڑی تعداد ہے۔ ان میں بعض پورے پورے مضامین کی حیثیت رکھتے ہیں اور کئی قسطوں میں شائع ہوئے ہیں۔ ان میں عصری فکری مسائل پر گفتگو کی گئی، ان کے مختلف پہلوؤں کو سامنے لایا گیا۔ دوسروں کو دعوت فکر دی گئی۔ مقصد یہ نہیں تھا کہ متنازعہ امور کو ابھار کر بحث مباحثہ کی صورت پیدا کی جائے بلکہ صرف یہ کہ لوگ سوچنے کی طرف مائل ہوں، سماج میں ایک طبقہ ایسا ضرور ابھرے جو مسائل پر سنجیدگی سے غور و فکر کرے، وقتی مسائل کو بھی وسیع تر زمانی و مکانی تناظر میں دیکھے، انسانی بنیادی اقدار کو اس طرح اجاگر کرے کہ وہ افراد کی فکر کا ہی نہیں بلکہ عمل کا حصہ بن جائیں، انسانیت کے شرف و عظمت میں اضافہ ہو۔ اسی سے علم و فکر کا کارواں آگے بڑھتا ہے۔ اسی سے انسانیت کی راہیں روشن ہوتی ہیں اور اسی سے قوموں کو رفعت و سربلندی حاصل ہوتی ہے۔ یہی دانشوری کی بنیاد ہے، بقول سرور:

www.taemeernews.com

''زندگی کے بدلے ہوئے تقاضوں کو سمجھنا
اور سمجھانا زندگی کے تسلسل و تغیر دونوں پر
نظر رکھنا ہی سچی دانشوری ہے۔''
(افکار کے دیے: ص ۷)

سرور صاحب کو ملال ہے کہ:

''اردو میں دانشوری کی روایت بہت
مستحکم اور توانا نہیں رہی۔''
(افکار کے دیے، ص ۷)

سرسید سے اس روایت کے شروع ہونے کے باوجود اس کو خاطر خواہ فروغ نہیں ملا۔ سرور صاحب اس دانشوری کی جوت جگانا چاہتے تھے۔ ان کی ان تحریروں کے موضوعات خاصے متنوع ہیں۔ ادب، تہذیب و ثقافت، تعلیم، مشرق و مغرب اور ان کی کشمکش، علوم و فنون، عقیدہ و عمل، عصری میلانات ورجحانات، جمہوریت، وطن دوستی، قومی وحدت وغیرہ ایسے موضوعات تھے جن پر انہوں نے کھلے ذہن سے غور وفکر کیا اور ان پر خامہ فرسائی کی۔ ان تحریروں میں فکر و فلسفہ کے موتی جابجا بکھرے نظر آتے ہیں۔

کہیں کہیں ان تحریروں کا اسلوب مرصع ہے۔ فکر کی تابانی کے ساتھ اسلوب کی شگفتگی بھی کارفرما ہے۔ نثر میں جابجا اقبال اور غالب کی شعری ترکیبیں آمیز نظر آتی ہیں جن سے عبارت کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے:

''شباب کے سوز و ساز اور درد و داغ
اور اس کی آرزو اور جستجو سے ہم آہنگ
ہونے کی کوشش کرنی چاہیے۔''
(افکار کے دیے: ص ۱۰۸)

''ان (ٹیگور) کے مطالعہ سے ہمیں
زندگی اور انسانیت سے کسی حال میں
مایوس نہ ہونے کی صلاحیت ملتی ہے
اور آج کے دور میں اس کی ضرورت
سب سے زیادہ ہے کہ انسان مایوس نہ
ہو یعنی اپنا سب کچھ لٹانے یعنی ٹھکانے،
لگانے کے لیے تیار رہے۔''
(افکار کے دیے: ص ۱۲۰)

''ان (اقبال) کے یہاں...... جو تخیل کی
پرواز ہے، جو علوم کی روح ہے، جو
مستی اندیشہ ہائے افلاکی ہے اور اس
کے ساتھ جو زمین کے ہنگاموں کو سہل
کرنے کا عزم ہے وہی خاص چیز اور اس
کی اہمیت ہے۔''
(افکار کے دیے: ص ۱۲۸)

''ہمارے ملک میں طرف دار بہت
ہیں سخن فہم کم''
(افکار کے دیے: ص ۱۶۵)

''یہ صحیح ہے کہ ستاروں کی گزرگاہوں کا
ڈھونڈنے والا ابھی زندگی کی شب تاریک کو
سحر نہیں کر سکا ہے۔''
(افکار کے دیے: ص ۶۵)

''سب خطرات کے باوجود انسان ہر لحظہ
نئے طور کی جستجو کرتا رہے گا اور اس کا
مرحلۂ شوق کبھی طے نہ ہوگا۔''
(افکار کے دیے: ص ۶۵)

سرور صاحب نے ایک طویل مضمون

www.taemeernews.com

''افکار کے دیے جلاتے رہو'' کے عنوان سے لکھ کر اپنے قارئین کی فکر ونظر کو بیدار کرنے کی کوشش کی۔ یہ مضمون نومبر۔دسمبر ۱۹۵۸ء کے پانچ شماروں میں شائع ہوا۔ اس میں ملکی اور قومی اہمیت کے بہت سے مسائل اٹھائے گئے۔ آزادی، جمہوریت، قومی وحدت، ملک کے باشندوں کی رنگا رنگی، سیکولرزم، سوشلزم، سماجی انحطاط، قدروں کا زوال وغیرہ۔ بعد میں ایسے ہی بہت سے فکر انگیز مضامین 'ہماری زبان' کے صفحات میں شائع ہوتے رہے۔ ان تحریروں سے صرف ان کی وسعت مطالعہ ہی کا اندازہ نہیں ہوتا بلکہ وسعت نظری، فراخ دلی اور اجتماعی شعور کی وکالت بھی ہوتی ہے۔ وہ محدود دائروں اور خولوں سے باہر نکلنے کی تلقین کرتے ہیں۔طبقہ داری نقطۂ نظر کے بجائے وہ قومی نقطۂ نظر کی حمایت کرتے ہیں۔ ان کا اصرار تھا کہ:

''ہمیں ایک قومی، جمہوری اور مہذب نقطۂ نظر پیدا کرنا ہوگا۔'' دانش و بینش کے جواہر پارے ان تحریروں میں ہر جگہ جگمگاتے نظر آتے ہیں:

''تنگ نظری، مذہب ہو یا سیاست، تہذیب ہو یا سائنس، سب میں بری ہے۔ اپنے پر اعتماد سے فراخ دلی آتی ہے اور فراخ دلی سے خیالات کے پرامن تصادم اور افکار کے خاموش ٹکراؤ کا موقع ملتا ہے۔ پھر خیالات اور عمل میں تطبیق کی راہیں کھلتی ہیں۔''

(افکار کے دیے: ص ۸۶)

''ہر کام میں سب سے پہلے ایک مضبوط عقیدے کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ عقیدہ ایک بنیاد ہے، جس پر عمل کا شاندار محل تیار ہو سکتا ہے۔''

(افکار کے دیے: ص ۹۲)

''قوم افراد ہی کا تو مجموعہ ہوتی ہے۔ افراد میں عقیدے کی مضبوطی اور کردار کی پختگی پیدا ہوگی اور وہ انسانیت کی قدروں کو اپنائیں گے تو قوم بھی ترقی کرے گی۔ ہمیں افراد میں عقیدے اور عمل کی شمع روشن کرنی ہے۔ قوم کی زندگی میں اس سے چراغاں ہوگا۔''

(افکار کے دیے: ص ۱۱۵)

''ادب میں سیاست کا شعور ضروری ہے۔ مگر ادب کو اس وقتی اور ہنگامی سیاست سے کچھ بلند ہونا چاہیے۔ ادب کو ہنگامی سیاست کے مبالغہ آمیز پیرائے سے ہٹ کر چیزوں اور کاموں میں تناسب 'توازن' مناسب آہنگ ڈھونڈنا چاہیے۔''

(افکار کے دیے: ص ۹۶)

۱۹۶۹ء میں جب وہ شکاگو یونیورسٹی کی دعوت پر چھ ماہ کے لیے امریکہ جا رہے تھے، ''کچھ اپنے متعلق'' عنوان سے اداریہ میں لکھا:

''اس عرصے (تیرہ سال) میں میں نے جو اداریے لکھے ہیں، ان میں اردو زبان و ادب کے مسائل کے علاوہ تہذیب، تعلیم، قومی زندگی، علم وفن کے بہت سے پہلوؤں پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ اہم

www.taemeernews.com

اشخاص و واقعات پر بھی رائے زنی کی
گئی ہے اور قابل قدر میلانات کی طرف
بھی اشارے ہوئے ہیں، ان میں یادیں
بھی ہیں، خواب بھی اور فکر و نظر بھی۔ یہ
میرے پڑھنے والوں کا کام ہے کہ ان
تحریروں کی خوبی یا خامی کا فیصلہ کریں۔"
یہ خودستائی یا تعلی نہیں ہے، بلکہ انکسار و
توازن کے ساتھ حقیقت حال کا اظہار ہے۔ ایک سچے،
مخلص اور ایماندار اہل قلم کی طرح ان تحریروں کی
تحسین کا فیصلہ انہوں نے قارئین پر چھوڑ دیا۔ اور
اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ ان تحریروں
کو اس وقت بھی تحسین اور قدر و منزلت کی نظر سے
دیکھا گیا اور آج بھی ان میں سے بیشتر آب و تاب
کے ساتھ زندہ ہیں اور فکر و نظر کی جوت جگا رہی ہیں۔

☆☆☆

www.taemeernews.com

امتیاز احمد*

آل احمد سرور کی ادبی صحافت

(علی گڑھ میگزین، سہیل اور اردو ادب کے حوالے سے)

اردو کے ادبی منظر نامہ پر پروفیسر آل احمد سرور لگ بھگ تین دہائیوں تک چھائے رہے۔ اس چھائے رہنے میں ان کی ادبی صحافت نے خاصا اہم رول ادا کیا۔ اس کے ذریعے انہوں نے مابعد تقسیم کے ہندوستان میں اردو تحریک کی رہنمائی کی، اردو والوں کی کھوئی ہوئی خود اعتمادی بحال کی، اردو کے تنقیدی، تحقیقی اور تخلیقی ادب کو سمت و رفتار اور پلیٹ فارم عطا کیا، اور اسی کے ذریعے ان کی کچھ اہم صلاحیتیں بھی اردو دنیا کے سامنے ابھر اور نکھر کر سامنے آئیں۔

سرور صاحب کی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۳۳ء میں علی گڑھ میگزین کی ادارت سے ہوا۔ اس تقرر کے بارے میں اپنی خودنوشت 'خواب باقی ہیں' میں انہوں نے لکھا ہے:

> ''منظور صاحب (خواجہ منظور حسین، ریڈر شعبۂ انگریزی) علی گڑھ میگزین (اردو) کے نگراں تھے۔ چنانچہ داخلے (ایم۔اے انگریزی) کے ایک مہینے کے بعد انہوں نے مجھے علی گڑھ میگزین کا ایڈیٹر مقرر کر دیا۔ اور ہدایت کی کہ مضمون لینے کے لیے رشید احمد صدیقی، خواجہ غلام السیدین، اشفاق حسین، بشیر ہاشمی سے ملوں۔ اس زمانے میں اختر رائے پوری اور حیات اللہ انصاری بی۔اے میں تھے۔ منظور صاحب کا خیال تھا کہ ان میں سے کسی ایک کو جوائنٹ ایڈیٹر بنایا جائے۔ مگر بات نہ بنی۔ مجھے یاد آتا ہے کہ رشید صاحب سے ملنے کو جب منظور صاحب نے کہا تو یہ بھی کہا کہ شاید وہ میگزین کے لیے مضمون لکھنے کو تیار نہ ہوں۔ مگر مجھے ان سے ملنا چاہیے۔''
>
> (خواب باقی ہیں، ص ۴۷)

اس سلسلہ کی مندرجہ ذیل معلومات بھی ہمیں ان کی خود نوشت سے ہی ملتی ہیں:

> ''علی گڑھ میگزین کے لیے میں نے جنوری ۱۹۳۳ء کے شمارے کے مضامین

---

* لکچرر، شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

www.taemeernews.com

مرتب کرکے دسمبر ۱۹۳۲ء کے آخر میں
یونیورسٹی پریس میں دے دیے تھے۔"

سرورؔ صاحب کی ادارت میں علی گڑھ میگزین کے چار شمارے بالترتیب جنوری ۱۹۳۳ء، اپریل ۱۹۳۳ء، جولائی ۱۹۳۳ء اور اکتوبر ۱۹۳۳ء میں شائع ہوئے۔ پہلے شمارے کے اداریے میں سرورؔ صاحب نے اس شمارے کے متعلق دو باتوں کا خاص طور سے ذکر کیا ہے جو بڑی حد تک ان کی ادارت میں شائع ہونے والے تمام شماروں کے سلسلہ میں ہے:

"اول تو ہم نے کوشش کرکے اس کا
التزام رکھا ہے کہ ہر شعبۂ فن کے مضامین
میگزین کی زینت ہوں ...... دوسرے
اس نمبر میں ایک مضمون بھی ایسا نہیں جو
علی گڑھ سے باہر کا ہو۔"

یہ ایک طرح سے وہ رہنما اصول تھے جن پر سرورؔ صاحب نے اپنے دور کے چاروں شماروں میں پورا اترنے کی کوشش کی۔ کبھی وہ اس میں کامیاب رہے اور کبھی ناکام۔ لیکن یہ قدم بہر حال مستحسن تھا۔ اس سلسلہ میں ان کا خیال تھا کہ:

"ممکن ہے یہ بعض کے نزدیک ایک نقص
ہو لیکن ہمارے خیال میں میگزین پر پہلے طلبا
کا بعدۂ اسٹاف اور اس کے بعد جاکر
بیرونی اہل قلم کا حق ہے۔"

لیکن اس خواہش کے باوجود انہیں یہ بھی لکھنا پڑا کہ:

"حصہ نظم کو بہتر بنانے کے لیے خارجی حلقوں
سے امداد طلب کرنے میں کوئی حرج نہیں۔"

سرورؔ صاحب کے دور ادارت میں جن لوگوں کی تحریریں علی گڑھ میگزین میں شائع ہوئیں ان میں خاص طور سے اہم اصغر گونڈوی، حسرت موہانی، میکش اکبرآبادی، ضیاء احمد بدایونی، حفیظ جالندھری، احسن مارہروی، علامہ اقبال، سید سلیمان ندوی، جگر مرادآبادی، عبدالماجد دریابادی، اختر انصاری، رشید احمد صدیقی، سیماب اکبرآبادی، عظیم بیگ چغتائی، اسرار الحق مجاز، فانی بدایونی، خواجہ منظور حسین، حیات اللہ انصاری اور آل احمد سرورؔ کے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

دوسرے شمارے کے اداریے میں سرورؔ صاحب نے میگزین کے قلمی تعاون کے لیے پروفیسر رشید احمد صدیقی کا خاص طور سے شکریہ ادا کیا ہے۔ ان کے الفاظ ہیں:

"اس ضمن میں جناب رشید احمد صدیقی
صاحب خاص شکریہ کے مستحق ہیں۔ ۱۹۲۴ء
سے یعنی جناب خواجہ منظور حسین صاحب
کے زمانۂ ادارت سے میگزین ان کے
رشحات قلم سے محروم تھا۔ بارے اب جا کر ع
کفر ٹوٹا خدا خدا کرکے
ممدوح کی بے نیازی و تغافل شعاری اس
درجہ بڑھی ہوئی ہے کہ آپ سے مضمون
لینے کے لیے نہ معلوم کتنے صبر آزما مدارج
سے گذرنا پڑتا ہے۔ الحمد للہ ہم آخر میں
کامیاب ہوئے اور آئندہ کے لیے اعانت
کا بھی وعدہ لے لیا۔"

ان شماروں کی خاص بات یہ ہے کہ ہر

www.taemeernews.com

شمارے میں سرورؔ صاحب نے یونیورسٹی کے حالات و واقعات اور سرگرمیوں کا بہت تفصیلی ذکر کیا ہے خواہ وہ کھیل کا میدان ہو یا کسی مہمان کی آمد، یونیورسٹی کے امتحانات ہوں یا تہذیبی سرگرمیاں تمام معاملات پر سرور صاحب نے اپنے اداریے میں تفصیل سے لکھا ہے۔ دوسرے شمارے کی ایک خاص چیز سرور صاحب کا وہ مضمون ہے جو انہوں نے 'انگارے' پر لکھا تھا۔ یہ ایک Bold تحریر ہے اور شاید ناآزمودہ کار کی جرأت بھی! شاید اسی وجہ سے اپنی عمر کے آخری دنوں میں بھی وہ اپنی اس تحریر کا اکثر ذکر کرتے تھے۔ اس مضمون میں انہوں نے انگارے پر خاصی سخت تنقید کی ہے۔

اس مضمون کے علاوہ بھی ان شماروں میں سرورؔ صاحب نے مختلف کتابوں پر تبصرے کیے ہیں جن میں خاص طور سے اہم 'نوجوان ورتھر کی داستان غم' اور 'مغل اردو' ہے۔ یہ تبصرے مختصر لیکن بھرپور ہیں، اور مستقبل کے آل احمد سرورؔ کا پتہ دیتے ہیں۔

سرور صاحب کی ادبی صحافت کا دوسرا اہم پڑاؤ رسالہ ''سہیل'' تھا جو رشید احمد صدیقی اور آل احمد سرور کی ادارت میں ۱۹۳۶ء میں شائع ہوا۔ اپنی خود نوشت میں سرور صاحب اس کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''جنوری ۱۹۳۵ء میں شعبہ میں آنے سے پہلے رشید صاحب کے کہنے سے میں نے رسالہ ''سہیل'' کے دوبارہ اجرا کے لیے مضامین جمع کیے تھے۔ رسالہ جنوری ۱۹۳۶ء میں نکلا۔ ایڈیٹر رشید صاحب اور جوائنٹ ایڈیٹر میں۔ رسالہ میں میں نے خاصی تفصیل سے کئی کتابوں اور رسالوں پر تبصرے کیے تھے۔ مولوی عبدالحق صاحب نے ان تبصروں کی تعریف کی۔ رسالہ ''سہیل'' چار سو سے زیادہ صفحات کا تھا۔ اور ادبی حلقوں میں اس کا خاصا چرچا رہا۔ مگر پھر نہ نکل سکا۔ ہم دونوں کی ہمت ہی نہ ہوئی۔''

(خواب باقی ہیں، ص ۷۹)

اس سلسلہ میں سرورؔ صاحب نے کتنی محنت کی اور کس طرح کی خدمات انجام دیں اس کا اندازہ پروفیسر رشید احمد صدیقی کے ان فرمودات سے ہوتا ہے۔ شذرات کے تحت لکھتے ہیں:

> ''سہیل'' کی ترتیب، طباعت، اور اشاعت میں اول تو میں خود اپنا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ میں نے کوئی ایسی حرکت نہیں کی جس سے میں براہ راست یا ناظرین سہیل براہ ترکستان کسی نااہل یا نامعقول کے شکر گذار ہونے پر مجبور ہوتے۔ گو اس کا وعدہ نہیں کرتا کہ آئندہ بھی میں ایسا کروں گا۔ اپنے بعد اپنوں ہی میں سے سب سے زیادہ احسان مند میں آل احمد سرور صدیقی ایم۔ اے کا ہوں جنہوں نے سہیل کی خاطر نہ اپنی عزت و عافیت کی پروا کی نہ دوسروں کی۔ میرے شوق فضول کو انہوں نے

www.taemeernews.com

اپنی جرأت رندانہ سے جہاں تک پہنچایا وہ ناظرین کے سامنے ہے۔ مجھے بذاتہ سرور صاحب کے سلیقہ، ذہانت اور تن دہی پر اس درجہ اعتماد ہے کہ میں ہر ایسے کام کو اپنے سر لے لیتا ہوں جس میں سرور صاحب میرے معین و مددگار ہو سکتے ہیں یعنی ان سے بیگار لی جا سکتی ہے۔ اس قسم کے کام آتش کو اپنی جوانی میں بہت کرنے پڑے۔ اس لیے سرور صاحب سے کام لینے میں باہر والوں سے جو سرخ روئی ہوتی ہے وہ تو اپنی جگہ مُسَلَّم ہے لیکن اصلی نفع وہ تسکین ہے جو سرور صاحب کی بیگار سے میرے جذبۂ انتقام کو پہنچتی رہتی ہے۔ دعا ہے کہ آئندہ چل کر ان کو بھی کوئی سرور مل جائیں۔ ہاں تو تکلفات برطرف 'سہیل' میں سب کچھ کیا دھرا سرور صاحب کا ہے اور اس سلسلہ میں ہر تعریف و تحسین کے مستحق وہ ہیں۔''

سرور صاحب کی مذکورہ محنت کا اندازہ بہ یک نظر اس شمارے کو دیکھ کر ہو جاتا ہے۔ پکاسو سے لے کر چغتائی تک مختلف مصوروں کی بنائی ہوئی تصویریں ہوں یا اصغر، جگر، جوش، اقبال سہیل، اختر انصاری، علامہ اقبال اور اثر لکھنوی کی شعری تخلیقات، یا پھر سجاد انصاری، اشفاق حسین، احسن مارہروی، خواجہ غلام السیدین، اختر انصاری، ابو اللیث صدیقی، معین الدین دردائی، سلیم الزماں صدیقی، عبدالستار صدیقی، ڈاکٹر ذاکر حسین، یا ڈاکٹر اشرف اور سلطان حیدر جوش کی نثری تحریریں، سب سرور صاحب کے ذوق نظر کا ثبوت پیش کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔

یہ بات خاص طور سے قابل ذکر ہے کہ اس مجلہ میں ایک ساتھ مصوری کے میلانات، قومی ادب، اسلامی معاشرت، اناطول فرانس کا فلسفہ، اردو کے تاریخی ماخذ اور نظم نگاری کی اہمیت جیسے مختلف النوع موضوعات پر مضامین شامل ہیں۔

ترتیب کے کام سے الگ ہٹ کر دیکھیں تو اس شمارے میں سرور صاحب کی تین تحریریں شامل ہیں جو ۱۹۳۶ء کے آل احمد سرور سے ہمیں متعارف کراتی ہیں۔ ایک پچیس سالہ نوجوان سے۔ جس نے اپنا ادبی سفر ابھی چار سال پہلے شروع کیا ہے۔ اسی سے اس بات کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ان تحریروں نے اس وقت کے قارئین کو کس طرح متاثر کیا ہوگا۔ یہ تحریریں درج ذیل ہیں:

۱۔ یادرفتگاں
۲۔ جبریل مشرق
۳۔ باب تنقید

''یادرفتگاں'' کے تحت سرور صاحب نے جن شخصیات کا ذکر کیا ہے وہ ریاض خیر آبادی، عزیز لکھنوی، نظم طباطبائی، جگت موہن لال رواں، نصیر حسین خیال، آغا حشر کاشمیری، اور مولوی ممتاز حسین ہیں۔ ان مختصر وفیات میں بھی سرور صاحب نے ان بزرگوں کے اصل کارناموں کے اجمالی ذکر کے ساتھ ساتھ ان کی بنیادی خصوصیات کی نشاندہی

www.taemeernews.com

کر دی ہے۔ مثلاً ریاض کے بارے میں لکھتے ہیں:

''آپ اگر چہ اسیر لکھنوی کے شاگرد تھے مگر دنیائے سخن میں داغ دہلوی کے جانشین بن کر رہے۔''

اسی طرح نظم طباطبائی کے باب میں یہ مختصر نثر پارہ دیکھیے جو ان کے سارے کارناموں کا احاطہ کر لیتا ہے:

''آپ صرف ایک خوش گو شاعر ہی نہ تھے بلکہ عربی و فارسی کے جید عالم بھی تھے۔ چنانچہ لسانیات پر کئی رسالے آپ سے یادگار ہیں۔ آپ نے اگر ایک طرف غالب کی شرح لکھ کر اردو پر احسان کیا تو دوسری طرف امرؤ القیس جیسے بلند پایہ شاعر کے کلام کی بھی شرح لکھی۔ حیدر آباد کے قیام کے دوران آپ نے کئی مفید ادبی خدمات انجام دیں اور دارالترجمہ کے کام میں بہت کچھ ہاتھ بٹایا۔ گرے کے مشہور مرثیہ کا ترجمہ آپ نے جس خوبی سے کیا تھا اس سے ہر اردو داں واقف ہے۔''

'جبریل مشرق' جو اقبال کے دوسرے مجموعے 'بال جبریل' پر طویل تبصرہ ہے مستقبل کے آل احمد سرور کی تنقیدی صلاحیتوں کا پتہ دیتا ہے۔ سرور صاحب کا مخصوص توازن اور اعتدال یہاں بھی برقرار ہے۔ ایک اقتباس دیکھیے:

''بانگ درا' اور 'بال جبریل' کے شاعر میں بہت فرق ہے۔ اگرچہ آب روان کبیر کے کنارے خواب شروع سے دیکھے جاتے ہیں، خاک مدینہ و نجف روز اول سے آنکھ کا سرمہ ہے اور تہذیب حاضر کی چمک ابتدا سے آنکھوں کو خیرہ کرتی ہے مگر شاعر کے انداز بیان میں نمایاں فرق ہو گیا ہے۔ جوش کی جگہ سنجیدگی نے، خندۂ دنداں نما کی جگہ ایک لطیف تبسم نے، اور شعلۂ جوالہ کی برق سامانیوں کی جگہ ایک مسلسل، متوازی اور محیط ضیاباری نے لے لی ہے۔ پہلے شمع و شاعر ہو یا طلوع اسلام شاعر کا قلم بقول شخصے ٹھاٹھیں مارتا ہوا چلا جاتا تھا۔ ایک طوفان تھا جس میں بلندی تخیل اور پیرایۂ بیان نہایت خوبصورتی سے سموئے گئے تھے۔ اب ایک ہلکا سکوت ہے جو بجائے خود ایک جہان معنی اپنے اندر رکھتا ہے۔ دوسرے ہر نظم بجائے خود مستقل تھی اور اپنی جگہ پر 'بال جبریل' میں طرز بیان دوسرا ہے۔ تخیل جو پہلے فضاؤں میں رقص کرتا تھا الفاظ میں ناچ رہا ہے۔ نشہ اتر گیا ہے اور اس کی جگہ ایک ہلکی لطیف کیفیت نے لے لی ہے۔ اب وہ طوفانی خروش نہیں، الفاظ کوثر سے دھلے ہوئے نگینہ میں جڑے ہوئے نکلتے ہیں۔ غزلیں اور نظمیں سب معلوم ہوتا ہے بہ یک وقت یا کم از کم ایک طرح کے وجدان کے ماتحت لکھی گئی ہیں۔''

(سہیل ۱۹۳۶ء، ص ۱۶۔۱۷)

www.taemeernews.com

سرور اقبال کی عظمت کو تسلیم کرتے ہیں اور اسی لیے سردار جعفری سے محبت کرتے ہیں ع

کہ ہم دونوں ہیں گو مجرم مگر مجرم ہیں اقبالی

لیکن اس کے باوجود ان سے بعض معاملات میں انہیں اختلاف ہے۔ اور اس اختلاف کے اظہار میں بھی انہیں کوئی تکلف محسوس نہیں ہوتا۔ مثلاً 'فرمان خدا فرشتوں کے نام' کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ ''نظم میں سوائے اس کے کوئی خوبی نہیں ہے کہ جوش سے لکھی گئی ہے'' یا ''لینن خدا کے حضور میں'' کے بارے میں ان کے اپنے تحفظات ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

> ''شاعر نے اسے بارگاہ ایزدی میں اپنی گمراہیوں کی صفائی پیش کرتے دکھایا ہے۔ یہ تصور صحیح نہیں...... اقبال نے اس کو ایک کافر کی حیثیت سے پیش کیا ہے جو ممکن تھا کہ ایمان لے آتا حالانکہ یہ بات حقیقت سے دور ہے۔''
>
> (ایضاً، ص ۲۱)

اسی طرح ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''تہذیب جدید سے اقبال کی نفرت بعض جگہ خوف بلکہ سراسیمگی کی صورت اختیار کر گئی ہے۔ ''سنیما'' ''ایک نوجوان کے نام'' دونوں میں جو نقطۂ نظر بیان کیا گیا ہے وہ بہت پیش پا افتادہ اور پرانا ہو چکا ہے۔''
>
> (ایضاً، ص ۲۴)

اس تبصرہ کا سب سے اہم حصہ وہ ہے جو ''جبریل و ابلیس'' سے متعلق ہے۔ ان کے خیال میں یہ نظم مجموعہ کی جان ہے۔ اس کے علاوہ دو اور نظمیں ''مرید ہندی اور پیر رومی کا مکالمہ'' ''آدم کا استقبال روح ارضی کی طرف سے'' ہے۔

باب تنقید کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصہ میں اردو ادب کی عمومی صورت حال کا جائزہ ہے اور دوسرے حصے میں مختلف کتابوں پر تبصرے ہیں۔ اس حصہ میں جو کتابیں زیر بحث آئی ہیں وہ درج ذیل ہیں:

۱۔ سرود زندگی از اصغر گونڈوی
۲۔ شعلۂ طور از جگر مراد آبادی
۳۔ کار امروز از سیماب اکبر آبادی
۴۔ نغمۂ روح از اختر انصاری
۵۔ دیوان مومن مرتبہ ضیاء احمد بدایونی
۶۔ کمال داغ مرتبہ حامد حسن قادری
۷۔ مسدس حالی (صدی ایڈیشن)
۸۔ رنگین زمانہ از محبوب حسن صوفی
۹۔ زندگی از چودھری افضل حق
۱۰۔ جوش فکر از سلطان حیدر جوش
۱۱۔ مکتوبات نیاز از نیاز فتح پوری
۱۲۔ لیلیٰ کے خطوط از مجنوں گورکھپوری
۱۳۔ مجنوں کی ڈائری از مجنوں گورکھپوری
۱۴۔ آغاز ہستی ترجمہ مجنوں گورکھپوری
۱۵۔ مجلس مرتبہ احمد شاہ بخاری پطرس
۱۶۔ تاریخ جمالیات از مجنوں گورکھپوری
۱۷۔ منشورات از کیفی
۱۸۔ اصول تعلیم از خواجہ غلام السیدین

اس باب کا مقصد بیان کرتے ہوئے

www.taemeernews.com

سرور صاحب لکھتے ہیں:

''اس تاریخی تبصرہ کا مقصد ایک طرف تو اس سال کی اہم کتابوں کا تذکرہ ہے دوسرے ان رجحانات کا تجزیہ مقصود ہے جو ہمارے اس جدید ادب کی گود میں پرورش پا رہے ہیں۔ بالفاظ دیگر یہ اوراق تشریحی بھی ہیں اور تنقیدی بھی۔

دو امور اس کام کے مؤید ہوئے۔ ایک تو یہ خیال کہ اس قسم کے خاکوں سے ہمارے جدید ادب کی تصویر رفتہ رفتہ بنائی جا سکتی ہے۔ دوسرے چونکہ ہماری تنقیدیں ابھی تک بکھرے ہوئے اور بے ترتیب نقوش کی حد سے آگے نہیں بڑھیں اس لیے ان سب کو ایک رشتے میں منسلک کرنا اور ایک عام نقطۂ نظر سے دیکھنا زیادہ وقیع، زیادہ مفید، اور زیادہ اہم ہوسکتا ہے اور اس سے خیالات کو سلجھانے اور نظریات کو نئے سرے سے جانچنے میں بھی مدد مل سکتی ہے۔''

(ایضاً، ص ۳۸۹)

رجحانات والے حصہ میں اردو شاعری پر اقبال کے اثر کا خاص طور سے ذکر کیا گیا ہے۔ لیکن حیرت اس وقت ہوتی ہے جب سرور صاحب جنوری ۱۹۳۶ء میں یہ لکھتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ:

''پیامی شاعری بھی اقبال کی تقلید میں شروع ہوئی۔ بعض اچھے شعراء کے یہاں اس نے مقامی رنگ، مقامی الفاظ اور ماحول کی منظر کشی کی شکل اختیار کر لی۔ انہوں نے اپنے نغمات سے ساری فضا کو سرشار کیا۔ انہوں نے اپنے اپنے حلقے کی برکات اور نعمتوں کے گن گائے اور بغیر آورد کے اپنے پڑھنے والوں کے دل میں اس چیز سے محبت پیدا کی۔ بعض حلقوں میں پیامیہ شاعری جدیدیت (ترقی پسندی) کی بڑھتی ہوئی رو میں بہہ گئی اور اس نے ایک بے معنی چیخ اور ہذیان کی صورت اختیار کر لی۔ اس زمرے میں وہ تمام کوششیں آتی ہیں جو سرمایہ دار و مزدور، زمیندار و کسان، باغی و غدار، کی کشاکش کو نمایاں کرتی ہیں۔ یہاں سچی شاعری کم ہے۔ خطابت اور گرج زیادہ۔ ان کا مقصد تخریب ہے۔ صدیوں کی آبیاری اور خون پسینہ ایک کرنے کے بعد جو کچھ تعمیر ہوا ہے اسے گرا دینا چاہتے ہیں۔ مگر اس کی جگہ کیا بنائیں گے، کون سے بت کی پرستش کریں گے یہ معلوم نہیں۔''

(ایضاً، ص ۳۹۲)

حیرت ہوتی ہے کہ جس وقت ترقی پسند تحریک کی باقاعدہ طور پر خشت اول بھی نہیں رکھی گئی تھی سرور صاحب اس کے بنیادی مسائل کی تہہ تک کیسے پہنچ گئے۔ حیرت اس بات پر بھی ہوتی ہے کہ کیا یہ وہی آل احمد سرور ہیں جن کے گھر پر لکھنؤ میں مستقبل میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے جلسے ہونے تھے۔

www.taemeernews.com

دوسرے حصے میں جہاں کتابوں پر تبصرے ہیں مومن اور داغ کے بارے میں ان کے یہ جملے خاص طور سے قابل ذکر ہیں:

''ندرت اسلوب میں مومن کی برتری مسلّم ہے مگر ہمارے خیال میں صدق جذبات میں بہت سے اچھے شعراء ان کے ہمسر ہیں۔''

(ایضاً،ص۴۰۴)

''حقیقت یہ ہے کہ داغ پہلے شاعر ہیں جنہوں نے اردو میں حقیقت نگاری کو رواج دیا۔ان سے پہلے جذبات کا خون کیا جاتا تھا اور حقیقت پر اتنے پردے ڈال دیے جاتے تھے کہ وہ موہوم سی ہوکر رہ جاتی تھی۔''

(ایضاً،ص۴۰۵)

داغ کے سلسلہ میں انہوں نے حامد حسن قادری کے نقد کا خاص طور سے ذکر کیا ہے:

۱۔ زبان (انتخاب الفاظ،لطف بندش،صفائی بیان، روانی) میں داغ کسی اردو شاعر سے کم نہیں اور اپنے زمانے میں بے نظیر ہیں۔

۲۔ مضمون آفرینی

(الف) جدت ادا۔مومن،غالب کے بعد داغ کا درجہ ہے۔

(ب) رفعت فکر و لطافت تخیل۔مومن و غالب اور امیر مینائی کے بعد داغ کا نمبر ہے۔

(ج) وسعت و کثرت مضامین۔داغ کا کوئی خاص درجہ نہیں۔

۳۔ جذبات و معاملات (عاشقانہ)!یہاں داغ اپنے قدما سے بہتر نہیں ہیں۔اپنے معاصرین میں امیر کے بعد اور جلال سے پہلے ہیں۔

۴۔ بوالہوسانہ۔میں داغ سب سے نمبر لے گئے ہیں۔

۵۔ شگفتگی و شوخی،زندہ دلی۔یہ ان کا کارنامہ ہے۔

سرور صاحب کی اپنی تحریروں سے قطع نظر کر لیں تو بھی پورا رسالہ ان کی خوش سلیقگی اور مدیرانہ صلاحیتوں کا بہترین مظہر ہے۔

سرور صاحب کی ادبی صحافت کا تیسرا پڑاؤ سہ ماہی 'اردو ادب' ہے۔'خواب باقی ہیں' کے صفحہ ۱۵۷ پر اس سلسلہ میں رقم طراز ہیں:

''جب ۱۹۴۹ء میں ذاکر صاحب انجمن ترقی اردو (ہند) کے صدر مقرر ہوئے تھے تو انہوں نے مجھ کو لکھا تھا کہ آپ اس کے جنرل سکریٹری کے عہدے پر آجائیے۔اس وقت میں نے انہیں جواب دیا تھا کہ میں انجمن کا کل وقتی کارکن ہونا پسند نہیں کرتا۔اگر کبھی علی گڑھ آنا ہوا تو اعزازی خدمت کروں گا۔اس کے بعد مولانا آزاد کے کہنے پر ذاکر صاحب نے قاضی عبدالغفار کو سکریٹری مقرر کیا تھا۔مجھے انجمن کا لائف ممبر اور اردو ادب کا ایڈیٹر۔اردو ادب لکھنؤ سے جولائی ۱۹۵۰ء سے نکلنا شروع ہوا۔''

اس وقت ۱۹۷۳ء تک سرور صاحب اردو ادب کے ایڈیٹر رہے۔جولائی ۱۹۵۰ء میں اس کا

www.taemeernews.com

پہلا شمارہ شائع ہوا جو ۱۵۲ صفحات پر مشتمل تھا۔ اس کے اندرونی سرورق پر درج ذیل اطلاعات درج تھیں:

۱۔ انجمن ترقی اردو (ہند) کا یہ سہ ماہی رسالہ جنوری، اپریل، جولائی اور اکتوبر میں شائع ہوتا ہے۔

۲۔ یہ خالص ادبی رسالہ ہے جس میں زبان و ادب کے ہر پہلو پر بحث ہوتی ہے۔ حجم کم از کم ڈیڑھ سو صفحات ہوتا ہے۔

۳۔ قیمت سالانہ دس روپیہ، فی پرچہ ڈھائی روپیہ۔

۴۔ مضامین کے متعلق آل احمد سرور صاحب ریڈر شعبہ اردو، لکھنؤ یونیورسٹی، ۷۔ بیرو روڈ لکھنؤ سے خط و کتابت کی جائے اور خریداری اور دیگر انتظامی امور کے متعلق مہتمم انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ کو لکھنا چاہیئے۔

یہ شمارہ نامی پریس لکھنؤ سے چھپا اور علی گڑھ سے شائع ہوا۔ اس پہلے شمارے کے اداریے میں 'حرف آغاز' کے عنوان سے سرور صاحب نے لکھا تھا:

"تقسیم ہند کے بعد جو ہولناک واقعات پیش آئے ان کا اثر تہذیبی اور علمی اداروں پر بھی پڑا۔ دہلی میں جب قیامت صغریٰ قائم ہوئی تو انجمن ترقی اردو ہند کا دفتر بھی اس سے محفوظ نہ رہ سکا۔ اگر مولانا ابوالکلام آزاد آخر وقت میں کتب خانہ کی حفاظت کے لیے فوجی انتظام نہ کرتے تو شاید یہ قیمتی خزانہ بالکل برباد ہو جاتا۔ پھر بھی فوجی گارڈ کے آنے سے پہلے سکریٹری کا سامان اور دفتر اور کتب خانہ کا ایک حصہ ضائع ہو چکا تھا۔ اس دور جنوں کو رخصت ہوتے کافی دیر لگی اور یوں بھی علمی اور تہذیبی کام بڑی دیر میں فروغ پاتے ہیں۔ اور بڑی جلد تباہ ہو سکتے ہیں۔ جب یہ طے ہوا کہ موجودہ حالات میں انجمن ترقی اردو کا کام ہندوستان اور پاکستان میں بالکل علیحدہ، آزاد اور خود مختار حیثیت سے ہوگا تو علی گڑھ میں اس کا صدر دفتر قائم کیا گیا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اس کے صدر اور قاضی عبدالغفار اس کے سکریٹری مقرر ہوئے۔ مجلس نظما کی نئے سرے سے تشکیل ہوئی۔ انجمن کا نیا دستور وضع ہوا اور یکم مئی ۱۹۵۰ء کے جلسہ میں متفقہ طور پر منظور ہوا۔ انجمن کا پندرہ روزہ اخبار 'ہماری زبان' جنوری ۱۹۵۰ء سے نکل رہا ہے اور اب جولائی ۱۹۵۰ء سے اس کا سہ ماہی ادبی رسالہ 'اردو ادب' شائع کیا جا رہا ہے۔

انجمن ترقی اردو ہند کے رسالے 'اردو' نے ۱۹۲۲ء سے ۱۹۴۷ء تک اردو میں تحقیق و تنقید کا ایک اعلیٰ معیار قائم کیا۔ اس نے ماضی کے سیکڑوں تاریک گوشوں کو روشن کیا۔ اس نے ادبی بت توڑے اور بنائے۔ اس نے تنقید کو تحسین و تاثر سے آگے بڑھا کر علمی اور سائنٹفک بنایا۔ تقسیم کے بعد ہم ڈاکٹر مولوی عبدالحق کی رہنمائی سے محروم ہو گئے۔ ہماری دعا

www.taemeernews.com

ہے کہ ان کے زیر سایہ پاکستان میں اردو تحریک پھلے پھولے اور برگ و بار لائے۔ کراچی سے رسالہ 'اردو' کا اجرا پاکستان سے ایک اعلیٰ علمی و ادبی رسالہ کا اجرا ہے۔ ہم اس کا خیر مقدم کرتے ہیں اور اس کے لیے ایک روشن مستقبل کے آرزومند ہیں۔ لیکن ہم کو اپنے گھر کی فکر قدرتی طور پر زیادہ ہے۔ ہماری کوشش یہ ہوگی کہ 'اردو ادب' رسالہ 'اردو' کے اعلیٰ علمی و تحقیقی معیار کو برقرار رکھے اور اسے جدید ادبی ضرویات و میلانات سے ہم آہنگ کرے۔ ہم ہندوستان کے تمام ارباب فکر ونظر کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ اردو ادب کی شمع کو روشن کرنے میں ہماری مدد کریں۔

کچھ لوگ ہندوستان میں اردو کے مستقبل سے مایوس ہو چکے ہیں۔ ہمیں ان سے اتفاق نہیں۔ صدیوں کے تہذیبی سرمایے اور ادبی خزانے عارضی جنون و تعصب سے برباد نہیں ہو سکتے، نہ چند قوانین کے نافذ کرنے یا ارباب سیاست کی مصلحت اندیشیوں سے وہ زبان جو عوام کے دلوں اور زبانوں پر چڑھ چکی ہے مٹائی جا سکتی ہے۔ ہمیں ہندی سے کوئی بیر نہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہندی سنسکرت کی غلامی کا جوا اپنے کندھے سے اتار پھینکے اور ایک آزاد، خود مختار، اور جدید زبان کی حیثیت سے ترقی کرے۔ ہمیں یقین ہے کہ بعض تنگ نظر اشخاص سنسکرت آمیز ہندی کی جو تحریک چلا رہے ہیں وہ چونکہ تاریخ، وقت کی رفتار، اور زمانے کی ضروریات کا ساتھ نہیں دے سکتی اس لیے زیادہ عرصے تک کامیاب نہیں ہو سکتی۔ ہم جانتے ہیں کہ آسان اور عام فہم ہندی کا فروغ اردو ادب کے لیے بھی مفید ہے اور ہندی اور اردو میں جو ازلی رشتہ ہے اسے اور مستحکم کیا جا سکتا ہے۔ ہمارا ایمان ہے کہ اردو صرف ان ہندوؤں اور مسلمانوں اور سکھوں کی زبان نہیں ہے جو اس کو ہر وقت اپنانے کے لیے تیار ہیں بلکہ یہ ہندوستان اور اس کی عظیم الشان تہذیب کا گراں قدر سرمایہ ہے۔ اس پر ضرب ہندوستان کی پوری تاریخ پر ضرب ہے اور اس کی ترقی، ہندوستان میں عوام دوستی، سماجی خیر اور انسان پرستی کی روایات کی ترقی ہے۔ تاج محل کی حسن کاری، میر و غالب، نظیر و انیس، اکبر و اقبال کی رنگا رنگی اور میر امن، سرسید، حالی، پریم چند کی سادہ پرکاری جس تہذیب کی آئینہ دار ہے وہ ہندوستان کی روح کی ترجمان ہے۔ آج اسے کچھ عرصے کے لیے پابند کیا جا سکتا ہے، لیکن زیادہ دیر تک اس سے غفلت برتی نہیں جا سکتی:

www.taemeernews.com

گرچہ مثل غنچہ دِلگیریم ما
گلستاں میرد اگر میریم ما

اردو زبان سے عشق اب تک جاگیردارانہ خصوصیات کا حامل رہا ہے۔ اردو ایک ایسی محبوبہ ہے جس کے ساتھ چند رومانی تصورات وابستہ ہیں جس کی خاطر جان بھی دی جا سکتی ہے۔ لیکن جس کی ایک خاص ادا ہی ہمیں پسند ہے۔ اس بت ہزار شیوہ کو موجودہ زندگی کی روز افزوں ضروریات کے پس منظر میں دیکھنا ہے۔ اس کے بدلتے، نکھرتے، بڑھتے، پھیلتے، دوسری زبانوں کا رس جذب کرتے اور انہیں اپنا لہو دیتے بھی دیکھنا ہے۔ اسے فارغ البال طبقوں کی عیاشی کے لیے وقف کرنے کے بجائے عام زندگی کے تقاضوں کے دوش بدوش لانا ہے۔ اسے نئے صنعتی اور جمہوری اور سائنٹفک مسائل سے آشنا کرنا ہے، اس میں علم کی گہرائی اور عشق کی تازگی سمونی ہے۔ اس کے لیے پڑھنے والوں کا ایک بڑھتا ہوا حلقہ پیدا کرنا ہے اور اس حلقہ کو روحانی اور ذہنی خلش کی چارہ گری کرنی ہے۔ اسے ہندوستان کی بنیادیں اور دنیا کی تازہ ہوائیں عطا کرنی ہیں۔ یہ کام بہت مشکل ہے لیکن بڑا مقدس کام ہے اور یہی کام زندہ رہنے والا ہے:

رہے نہ ایبک و غوری کے معرکے باقی
ہمیشہ تازہ و شیریں ہے نغمۂ خسرو

اردو کی تحقیق اب تک ایک محدود دائرے میں گھومتی رہی ہے۔ اس نے شاعروں اور ادیبوں اور ان کے کارناموں کے متعلق منتشر معلومات فراہم کرنے پر اکتفا کی ہے۔ اس نے زندگی کے عام حالات، تاریخی میلانات، سماجی مسائل اور اقتصادی الجھنوں سے دامن بچایا ہے۔ ایک طور پر یہ اب تک خلا میں رہی ہے۔ ہم اسے وزن و وقار عطا کرنا چاہتے ہیں۔ ہم اردو تنقید کو شاعری کی آمریت، مقامی گروہ بندی اور صنعتی معیاروں سے نکالنا چاہتے ہیں۔ ہمارے ذہن میں نثر کا دوسرا آہنگ بھی ہے۔ ہم تنقید کے ذریعے سے تجربات کی پرکھ اور قدروں کے تعین کا کام لینا چاہتے ہیں۔ ہم ادبی ذوق کی صحیح قیادت کی کوشش کر رہے ہیں۔ اور اچھا ادبی ذوق خود ایک تہذیبی برکت ہے۔

'اردو ادب' ارباب فکر و نظر کو دعوت دیتا ہے کہ وہ خاص طور پر اصلاح زبان، اصلاح رسم الخط، قدیم اردو ادب کے شہ پاروں، اٹھارہویں اور انیسویں صدی کی ذہنی اور ادبی زندگی، بیسویں صدی کے اہم میلانات، ہندوستان کی جدید زبانوں کی موجودہ خصوصیات، مغربی اور

www.taemeernews.com

مشرقی ادبیات کے رجحانات پر مضامین لکھیں۔ ان مضامین میں سے خاص خاص کو بعد میں کتابی صورت میں شائع کیا جائے گا۔"

(اردو ادب، جولائی ۱۹۵۰ء، ص ۵۔۷)

اقتباس کچھ زیادہ طویل ہو گیا۔ اس میں سرور صاحب کی Rhetorics کا بھی دخل ہے اور ان حالات کا بھی جن کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ لیکن ان سب سے قطع نظر جو بات سب سے اہم ہے وہ سرور صاحب کا وہ Vision ہے جس سے وہ چیزوں کو دیکھ رہے ہیں اور ان کا تجزیہ کر رہے ہیں۔ اس Vision کے ساتھ سرور صاحب نے 'اردو ادب' کی ادارت شروع کی اور لگ بھگ تیئیس برسوں تک اپنے اس Vision کو پھیلاتے رہے۔ اس دوران صرف ۱۹۶۹ء کا آخری اور ۱۹۷۰ء کا پہلا شمارہ سرور صاحب کے سفر امریکہ کی وجہ سے پروفیسر مسعود حسین خاں کی ادارت میں شائع ہوا۔ رسالہ کے اجرا کے دوسرے ہی سال یعنی ۱۹۵۱ء میں سرور صاحب نے اردو ادب کا حسرت نمبر شائع کیا جس میں اس وقت کی نامور ترین ہستیوں کے مضامین شامل تھے۔ قاضی عبدالودود، عبدالقادر سروری، مجنوں گورکھپوری، احتشام حسین، اختر اورینوی، یوسف حسین خاں، ضیاء احمد بدایونی۔ اور سرور صاحب کے مضامین اس شمارے میں شامل تھے۔ سرور صاحب نے اس شمارے کے لیے خاص طور سے دو مضامین تحریر کیے۔ اس خصوصی نمبر کے علاوہ اپنے دور ادارت میں سرور صاحب نے جو خصوصی شمارے شائع کیے ان کی تفصیل درج ذیل ہے:

۱۔ تخلیق نمبر ۱۹۶۳ء شمارہ نمبر ۴

اس شمارے میں جمیل مظہری، اختر الایمان، وحید اختر، باقر مہدی، راہی معصوم رضا، سلام مچھلی شہری، قیصر قلندر، اختر انصاری، چودھری محمد نعیم، منیب الرحمٰن، نشور واحدی، آل احمد سرور، رضا کریم رضا، اور بدر جمالی کی شعری تخلیقات اور ترجمے اختر انصاری، اختر اورینوی، قاضی عبدالستار، اور رام لعل کے افسانے اور عابد رضا بیدار کا ایک مضمون ''شاد عارفی---ایک تاثر'' شامل ہے۔

۲۔ نہرو نمبر ۱۹۶۴ء شمارہ نمبر ۳ و ۴:

یہ شمارہ دو سو اڑسٹھ (۲۶۸) صفحات اور سات تصاویر پر مشتمل ہے۔ اس میں پروفیسر سرور، پروفیسر ہمایوں کبیر، ڈاکٹر تاراچند، پنڈت سندر لال، فراق گورکھپوری، سعید احمد اکبرآبادی، ابو سالم، ڈاکٹر وحید اختر، ڈاکٹر جعفر حسن، صابرہ زیدی، جگن ناتھ آزاد، ریاض الرحمٰن خاں شیروانی، شعیب اعظمی، معین الرحمٰن، عبدالغفار شکیل، حسن عسکری، پلکھنوی، اور احسن نشاط کے مضامین اور جمیل مظہری، میکش اکبرآبادی، آل احمد سرور، نشور واحدی، علی جواد زیدی، جگن ناتھ آزاد، سلام مچھلی شہری، راہی معصوم رضا، سید حرمت الاکرام، فضل متین، علقمہ شبلی، دور آفریدی، اے سی بہار، وقار صدیقی، میر تیلین علی خاں، صلاح الدین نیر، اسرار اکبرآبادی، ڈاکٹر کرن سنگھ، شبنم قادری، اور اختر انصاری کی نظمیں شامل ہیں۔

www.taemeernews.com

۳۔ تخلیق نمبر ۱۹۶۵ء شمارہ ۴

یہ شمارہ ۱۵۹ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس شمارے میں اختر الایمان، منیب الرحمٰن، جگن ناتھ آزاد، خلیل الرحمٰن اعظمی، وحید اختر، باقر مہدی، شاذ تمکنت، قیصر قلندر، سید فضل المتین، سلام مچھلی شہری، ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ، اختر انصاری، عمیق حنفی، معین احسن جذبی، مسعود علی ذوقی، اور آل احمد سرور کی نظمیں، روش صدیقی، نشور واحدی، سلیمان اریب، خلیل الرحمٰن اعظمی، شاذ تمکنت، آل احمد سرور، راہی معصوم رضا، بشیر بدر اور شہریار کی غزلیں، راجندر سنگھ بیدی، کوثر چاند پوری، اور رام لعل کے افسانے، آتش پر آنند نرائن ملا کا ڈرامہ، جان رسکن کا ایک انشائیہ اور نوادر کے تحت مشاہیر کے چند غیر مطبوعہ خطوط شامل ہیں۔

۴۔ تخلیق نمبر ۱۹۶۶ء شمارہ ۴

یہ شمارہ ۱۷۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس شمارے میں حیات اللہ انصاری، کوثر چاند پوری، اور رام لعل کے افسانے، اختر الایمان، روش صدیقی، منیب الرحمٰن، مسعود علی ذوقی، سلام مچھلی شہری، بلراج کومل، باقر مہدی، وحید اختر، عمیق حنفی، شمس الرحمٰن فاروقی، اور شمشی طہرانی کی نظمیں، اختر انصاری اور سلیمان اریب کی رباعیات، میکش اکبر آبادی، آل احمد سرور، علی جواد زیدی، روش صدیقی، نشور واحدی، مسعود علی ذوقی، خلیل الرحمٰن اعظمی، سلیمان اریب، وحید اختر، شاذ تمکنت، شمس الرحمٰن فاروقی، شہریار اور بشیر بدر کی غزلیں، ڈاکٹر محمد حسن اور گوپی چندن کے ڈرامے، عابد رضا بیدار کی ڈائری اور کچھ غیر مطبوعہ خطوط شامل ہیں۔

۵۔ غالب نمبر ۱۹۶۹ء شمارہ ۱

یہ شمارہ ۲۰۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس شمارے میں درج ذیل مضامین شامل ہیں:

۱۔ غالب کی عظمت — آل احمد سرور
۲۔ ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں — گیان چند
۳۔ نسخۂ حمیدیہ چند غلط فہمیوں کا ازالہ — ابو محمد سحر
۴۔ حیات غالب۔ ایک مطالعہ — محمد انصار اللہ نظر
۵۔ غالب۔ ایک ایرانی کی نظر میں — کبیر احمد جائسی
۶۔ مرزا غالب۔ ایک مطالعہ — ڈاکٹر نعیم احمد
۷۔ تخاتہ جاوید اور غالب — عبدالقوی دسنوی
۸۔ بیدل اور غالب — حسن عسکری پلکھنوی
۹۔ غالب۔ تحقیق۔ اپریل فول — نادم سیتاپوری
۱۰۔ دیوان غالب (نسخۂ بھوپال) کی کہانی — سید حامد حسین
۱۱۔ غالب کی تین غزلوں پر تضمین — محمد رضا
۱۲۔ مکاتیب غالب اور ان کی ادبی افادیت — احمد ابراہیم علوی
۱۳۔ غالب کی قصیدہ نگاری — بشیر احمد
۱۴۔ غالب کا پیکر غزل — ذکاء الدین شایاں

ان مضامین کے علاوہ کچھ شعری تخلیقات بھی شامل ہیں۔

۶۔ ذاکر نمبر ۱۹۶۹ء شمارہ ۳

یہ شمارہ ۱۵۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس شمارے میں درج ذیل مضامین شامل ہیں۔

۱۔ ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہوں جسے — رشید احمد صدیقی
۲۔ ڈاکٹر ذاکر حسین — پروفیسر غلام السیدین
۳۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کی ادبی خدمات — آل احمد سرور

www.taemeernews.com

۴۔ ابوخاں کی بکری اور چودہ کہانیاں
اسلوب احمد انصاری
۵۔ ذاکر صاحب رحم علی الہاشمی
۶۔ ڈاکٹر ذاکر حسین ایک معاشی کی حیثیت سے
اولاد احمد صدیقی
۷۔ ڈاکٹر ذاکر حسین قومیت کے ایک حسین پیکر
محی الدین احمد
۸۔ بچوں کی تعلیم و تربیت کے بارے میں
ذاکر صاحب کے کچھ خیالات باقر مہدی
۹۔ ذاکر صاحب کی یاد میں آل احمد سرور

ان مضامین کے علاوہ ایک قطعہ تاریخ وفات، ذاکر صاحب کی چار تحریریں، اور آل احمد سرور، خلیل الرحمن اعظمی، وحید اختر، شہریار، سید نظر برنی، واحد پریمی، حرمت الاکرام، صبا جائسی، اور سید نور العین کی منظوم خراج عقیدت بھی اس شمارے کی زینت ہیں۔

ان خصوصی شماروں سے قطع نظر اردو ادب کے عام شمارے بھی کچھ کم اہمیت کے حامل نہیں۔ ان عام شماروں میں بھی جو اہم مضامین بکھرے ہوئے ہیں ان کی تعداد اچھی خاصی ہے۔ ان میں سے کچھ اہم تحریروں کی نشاندہی اس طرح کی جاسکتی ہے:

۱۔ لغت اور استعمال عام از رشید حسن خاں
مطبوعہ مارچ ۱۹۵۷ء
۲۔ بچن اور ان کی شاعری از عبدالعزیز عمیق حنفی
مطبوعہ مارچ ۱۹۵۷ء
۳۔ قیدی پرومیتھوس ترجمہ خلیق احمد نقوی
مطبوعہ اپریل تا جون ۱۹۵۲ء
۴۔ مارکسی لسانیات ترجمہ شفیق نقوی
مطبوعہ اپریل تا جون ۱۹۵۲ء
۵۔ تلامذۂ غالب از مالک رام
مطبوعہ اپریل تا جون ۱۹۵۲ء
۶۔ فنکار کی کنارہ کشی از فریک کرموڈ
ترجمہ رحم علی الہاشمی مطبوعہ ۱۹۷۰ء شمارہ ۲
۷۔ قصہ مہر افروز و دلبر از ڈاکٹر محمد انصار اللہ
مطبوعہ ۱۹۷۰ء شمارہ ۲
۸۔ حاتم اور ان کے دیوان کا قدیم ترین مخطوطہ
بخط مصنف از اکبر حیدری کاشمیری
مطبوعہ ۱۹۷۰ء شمارہ ۲
۹۔ طوفان (شیکسپیر کے ڈرامے Tempest کا ترجمہ) از رحم علی الہاشمی مطبوعہ ۱۹۷۰ء شمارہ ۴
۱۰۔ امریکی شاعری از محمد یٰسین مطبوعہ ۱۹۶۲ء شمارہ ۱
۱۱۔ مرزا عبدالقادر بیدل از کوثر چاندپوری
مطبوعہ ۱۹۶۲ء شمارہ ۱
۱۲۔ کلیات سودا کے دو قلمی نسخے از محمود الٰہی زخمی
مطبوعہ ۱۹۶۲ء شمارہ ۲، ۳
۱۳۔ میر کا ایک غیر مطبوعہ مرثیہ از محمود الٰہی زخمی
مطبوعہ ۱۹۶۲ء شمارہ ۴
۱۴۔ مثنویات مومن از ضیاء احمد بدایونی
مطبوعہ ۱۹۵۷ء جون
۱۵۔ میر کی ایک غیر مطبوعہ مثنوی اور غزل از گیان چند
مطبوعہ ۱۹۵۷ء جون
۱۶۔ اردو کے کوزی تجھوے (Retroflex Phonemes of Urdu) از چودھری محمد نعیم
مطبوعہ جون ۱۹۵۷ء

www.taemeernews.com

۱۷۔قطب الدین فیروز بیدری اور اس کا پرت نامہ
از نذیر احمد مطبوعہ ۱۹۵۷ء جون
۱۸۔ ایطا کے بعض متعلقات از رشید حسن خاں
مطبوعہ ۱۹۵۷ء جون
۱۹۔ ادبی تنقید اور تحلیل نفسی از سید شبیہ الحسن
مطبوعہ ۱۹۵۷ء جون
۲۰۔ حافظ کا ذہنی ارتقا از وارث کرمانی
مطبوعہ ۱۹۵۷ء ستمبر
۲۱۔ نوسر ہار مصنفہ اشرف از ڈاکٹر نذیر احمد
مطبوعہ ۱۹۵۷ء ستمبر
۲۲۔ توازن۔زندگی اور ادب میں از آل احمد سرور
مطبوعہ ۱۹۵۰ء جولائی
۲۳۔سودا کا ایک قصیدہ؟ از امتیاز علی عرشی
مطبوعہ ۱۹۵۰ء جولائی
۲۴۔ رامائن اور عربی فارسی لفظ از مصطفیٰ خاں مداح
مطبوعہ ۱۹۵۰ء جولائی
۲۵۔ قدیم دکنی شاعر مشتاق کے زمانے کے تعین کے
سلسلہ میں از ڈاکٹر نذیر احمد
مطبوعہ ۱۹۵۸ء جون
۲۶۔ایران کا بنیاد گزار شعر نو۔نیما یوشیج۔
ایس۔اے۔ایچ عابدی مطبوعہ ۱۹۵۸ء جون
۲۷۔ یونانی المیہ کا خالق۔ایس کیلس از خلیق نقوی
مطبوعہ ۱۹۵۱ء جولائی
۲۸۔ مثنوی کدم راؤ پدم راؤ از سخاوت مرزا
مطبوعہ ۱۹۶۶ء شمارہ ۲
۲۹۔ گلشن ہند: حیدر بخش حیدری از مختار الدین احمد
مطبوعہ ۱۹۶۶ء شمارہ ۳

۳۰۔ خواجہ میر درد از شمس الرحمٰن فاروقی
مطبوعہ ۱۹۶۶ء شمارہ ۳
۳۱۔ سودا کی غزلیں از خلیق انجم
مطبوعہ ۱۹۶۱ء شمارہ ۴
۳۲۔ میر کے دیوان کا ایک قلمی نسخہ از محمود الٰہی زخمی
مطبوعہ ۱۹۶۱ء شمارہ ۴
۳۳۔اردو کی آوازیں از گیان چند
مطبوعہ ۱۹۶۱ء شمارہ ۴
۳۴۔مکاتیب امیر مینائی از ابو محمد سحر
مطبوعہ ۱۹۶۱ء شمارہ ۴
۳۵۔ خطوط داغ از امتیاز علی عرشی
مطبوعہ ۱۹۵۶ء ستمبر
۳۶۔ گوئٹے از حسن ایم مطبوعہ ۱۹۵۶ء ستمبر
۳۷۔اردو اور ہندی کا تلفظ از گراہم بیلی
ترجمہ چودھری محمد نعیم مطبوعہ ۱۹۵۶ء دسمبر
۳۸۔اردو قواعد نویسی کا مختصر جائزہ از نیر اقبال
مطبوعہ ۱۹۶۷ء شمارہ ۱
۳۹۔اردو لغت نویسی کے مسائل از سید خواجہ حسینی
مطبوعہ ۱۹۶۷ء شمارہ ۱
۴۰۔ابن سینا بحیثیت ادیب از قاسم غنی
ترجمہ کبیر احمد جائسی مطبوعہ ۱۹۶۷ء شمارہ ۳
۴۱۔سیموئل ٹیلر کولرج۔تعارف از رحم علی الہاشمی
مطبوعہ ۱۹۶۷ء شمارہ ۴
۴۲۔بوڑھا جہاز راں از کولرج
ترجمہ رحم علی الہاشمی مطبوعہ ۱۹۶۷ء شمارہ ۴
۴۳۔ ٹینی سن کا ان میموریم ترجمہ رحم علی الہاشمی
مطبوعہ ۱۹۶۹ء شمارہ ۲

www.taemeernews.com

۴۴۔احمد کسروی تبریزی از کبیر احمد جائسی
مطبوعہ ۱۹۶۹ء شمارہ ۲

۴۵۔عبدل دہلوی اور اس کا ابراہیم نامہ
از مسعود حسین خاں مطبوعہ ۱۹۶۹ء شمارہ ۴

۴۶۔آرٹ کا یونانی تصور از جی لاؤس ڈکنس
ترجمہ رحم علی الہاشمی مطبوعہ ۱۹۶۹ء شمارہ ۴

۴۷۔امیر الشعرا احمد شوقی از سید احتشام احمد ندوی
مطبوعہ ۱۹۶۸ء شمارہ ۱

۴۸۔شعر کی موسیقیت از ٹی۔ایس۔ایلیٹ
ترجمہ رحم علی الہاشمی مطبوعہ ۱۹۶۸ء شمارہ ۳

۴۹۔شعر اور ڈرامہ از ٹی۔ایس ایلیٹ
ترجمہ رحم علی الہاشمی مطبوعہ ۱۹۶۸ء شمارہ ۴

۵۰۔قدامہ بن جعفر از سید احتشام احمد ندوی
مطبوعہ ۱۹۶۸ء شمارہ ۴

۵۱۔زبان کی نوعیتی گروہ بندی از عصمت جاوید
مطبوعہ ۱۹۶۸ء شمارہ ۴

۵۲۔نطشے کی ادیبانہ حیثیت از حسن اسیم
مطبوعہ ۱۹۶۰ء دسمبر

۵۳۔اردو افعال از غلام ربانی
مطبوعہ ۱۹۶۰ء دسمبر

ان منتخب مضامین پر نظر ڈالیں تو اندازہ ہوگا کہ سرور صاحب کے دور ادارت میں اردو ادب کے مضامین کا دائرہ کتنا وسیع تھا۔ ایک طرف قواعد اور لسانیات پر مضامین شامل ہیں تو دوسری طرف عالمی ادبیات کے شہہ پاروں کے تراجم اور ان پر تنقیدی مضامین ہیں، تیسری طرف اردو کا قدیم شعری سرمایہ ہے تو چوتھی طرف لغت اور عروض کے مسائل پر بحثیں۔

اس دوران 'اردو ادب' کے صفحات پر سرور صاحب نے جن کتابوں پر تبصرے کیے ان میں خاص طور سے اہم خون کی لکیر، نقدِ حیات، یادگارِ حالی، یادگارِ فرحت، ستاروں سے ذروں تک، سازِ لرزاں، حیاتِ سرسید، مراثی شاد، حیات اجمل، آہنگ، فروزاں، ضیائے حیات، دستِ صبا، چاند نگر، حرفِ تمنا، روزگارِ فقیر، مکتوباتِ عبدالحق، نقشِ جمیل، مکاتیبِ اقبال، محمد علی، میر تقی میر —— حیات اور شاعری، اور زیرِ لب پر سرور صاحب کے تبصرے ہیں۔ ان میں سے بعض باقاعدہ تنقیدی مضمون کی حیثیت رکھتے ہیں اور سرور صاحب نے اپنے تنقیدی مضامین کے مجموعوں میں انہیں شامل بھی کیا ہے۔

علی گڑھ میگزین، سہیل، اور 'اردو ادب' کے بعد سرور صاحب کی ادبی صحافت کے دو اور نمونے 'ہماری زبان' اور 'اقبالیات' کی شکل میں سامنے آئے جو اس مقالہ کے دائرے سے باہر ہیں۔ لیکن سرور صاحب کی ادبی صحافت کے صرف ان تین نمونوں کو بھی سامنے رکھیں تو آل احمد سرور کے ذہنی ارتقا کو بڑی آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے۔ باوجودیکہ یہ تینوں رسالے بظاہر سرور صاحب کی شخصیت کے جلوۂ صد رنگ کے صرف چند پہلوؤں کو پیش کرتے ہیں لیکن یہ پہلو ان کی شخصیت کے خشتِ اول کی حیثیت رکھتے ہیں۔

☆☆☆

www.taemeernews.com

میرزا سعید الظفر چغتائی*

تنقیدی اشارے آج

"تنقیدی اشارے" آل احمد سرور کے ریڈیو نشریے ہیں جن میں سے سولہ پہلی بار انہوں نے ۱۹۴۲ء میں یکجا چھاپے تھے۔ سات سال بعد دوسرا ایڈیشن، دیباچہ کے مطابق، ہر مضمون میں "کہیں کہیں ترمیم" کے ساتھ آیا۔ اس کے لیے "افسانہ نگاری پر آدھا مضمون دوبارہ لکھا۔" اور چار نئے مضامین: خطوط میں شخصیت، اردو میں تنقید، حیاتِ شبلی اور مجھے کون کون سی کہانیاں پسند ہیں، اضافہ ہوئے۔ ۱۹۵۵ء کے تیسرے اڈیشن میں "زہرِ عشق" پر مضمون بڑھا۔ ریڈیو نشریوں کی پابندیٔ اوقات اور عام پسندی کی شرطوں نے ان تنقیدی مضامین پر بہت اچھا اثر ڈالا۔ "بنیادی مسائل اور خاص خاص رجحانات یا نمایاں خصوصیات کا ذکر ہو جاتا ہے...... بات صاف اور سلجھے...... انداز میں کی جاتی ہے...... زبان...... آسان اور علمی تحقیق کے بجائے پیرایۂ بیان کی دل آویزی پر توجہ" رہتی ہے۔ جسے ادیب "اپنے انداز" اور "آب و رنگ" کو قائم رکھتے ہوئے "عام فہم" بناتا اور "ذہن نشین کراتا ہے" کہ "ادبی اور علمی مسائل سے آشنا ہونا بھی اچھی، مفید اور ترقی پذیر زندگی کے لیے ضروری" ہے۔ میں نے ۱۹۵۱ء میں اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن پڑھا تھا۔ آدھی صدی بعد ذہن میں صرف اس کے سائے رہ گئے تھے اور گمان ہوتا تھا کہ اتنے ماہ و سال کے گزران نے اسے ازکار رفتہ اور پچھلے زمانہ کا تبرک بنا دیا ہوگا۔ لیکن پھر پڑھا تو تازگی بھی محسوس ہوئی اور وہ بصیرت بھی حاصل ہوئی جس سے ایک پندرہ سالہ طالب علم بہرہ یاب نہیں ہو سکتا تھا۔ آج کے تاثرات لکھ رہا ہوں۔

کتاب کی ترتیب میں "اردو تنقید" کی بات نمبر ۱۸ پر کہی گئی ہے۔ مگر میں اسی سے اپنی بات شروع کرنا زیادہ معنی خیز سمجھتا ہوں۔ مصنف نے کتاب کی تمہید ختم کرتے کرتے اپنا یہ اہم تنقیدی اصول بیان کیا ہے:

> "انگریزی ایک عالم گیر اور شاندار تاریخی میراث کی مالک زبان کی حیثیت سے ہمیں بہت کچھ دے سکتی ہے...... ہاں

* پروفیسر و سابق صدر، شعبۂ فزکس علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

www.taemeernews.com

انگریزی ادب کے اصولوں کو اٹل سمجھنا
یا صرف اس معیار سے اپنی ہر چیز کو پسند یا
ناپسند کرنا صحیح نہیں۔ ادبی اصول عالم گیر
بھی ہیں اور مقامی بھی۔ کسی میں ایک پہلو
پر زیادہ زور دیا گیا ہے کسی میں دوسرے پر"۔

اب ہمیں انگریزی زبان و ادب کی جگہ یوروپی زبان و ادب پڑھنا چاہیئے۔ اس کتاب سے ۱۹۵۵ء تک کے بہت سے اردو ناقدوں کی کاوشوں پر کم یا زیادہ روشنی پڑتی ہے: حالی، عبدالحق، وحید الدین سلیم، عبدالرحمٰن بجنوری، عظمت اللہ خاں، نیاز فتحپوری، سجاد حیدر یلدرم، مہدی افادی، سجاد انصاری، قاضی عبدالغفار، پریم چند، سجاد ظہیر، احمد علی، اختر رائے پوری، فراق، مجنوں، فیض، احتشام حسین، اختر انصاری، عزیز احمد، تاثیر، کلیم الدین، میراجی، عبدالعلیم اور سردار جعفری، محمد حسین آزاد جن کی 'آبِ حیات' نے اپنے مخصوص اُسلوب میں اپنے زمانے تک کے اردو شاعروں اور ادیبوں کے بارے میں پڑھنے والوں کا ذہن مدتوں تک کے لیے صحیح اور غلط متاثر کر دیا تھا، اس فہرست میں نہیں ہیں۔ آغاز حالی سے ہوتا ہے جو "شاعری کو...... زندگی سے قریب لانا چاہتے تھے:

"حالی نے شاعری کو ایک شوق فضول
کے بجائے قومی اور تہذیبی شعور......
سنوارنے اور نکھارنے کا آلہ سمجھا...... اخلاقی
قدروں کو بھی اہمیت دی مگر اخلاق کے
تصور کو محدود اور مبہم رکھا...... ادب میں
سادگی، اصلیت اور جوش کی اہمیت جتا کر
......شاعری کو زندگی، انسانوں اور سچے
جذبات سے قریب کر دیا......غزل سے
انکار نہیں کیا مگر غزل کی اصلاح کو ضروری
سمجھا......ان کے اجتہاد کی تاریخی اور ادبی
اہمیت مسلّم ہے......مرثیہ اور مثنوی میں
اخلاق اور واقعہ نگاری پر زور دے کر
اردو ادب میں اعلا انسانی قدروں اور
حقیقت نگاری کے لیے میدان ہموار
کیا۔ (انہیں) تجربات میں فرق کرنا
آتا ہے......قدروں کا احساس رکھتے
ہیں مگر تجربات اور قدروں کی وضاحت
نہ کر سکے۔ مغربی ادب سے زیادہ واقف
نہ تھے...... ہمارے ادب کی خامی کا
احساس شدت سے رکھتے تھے...... جانتے
تھے کہ ہمارے پاس کیا ہے۔ کیا ہونا
چاہیئے پر بھی نظر تھی، مگر کیسے ہو، کے لیے
وہ ہماری زیادہ مدد نہ کر سکے۔"

'شوق فضول' پر مجھے اقبال کا مصرع:

"جو کام کچھ کر رہی ہیں قومیں انہیں مذاقِ سخن نہیں ہے"

یاد آتا ہے اور اخلاق کے مبہم تصور پر ع

برہنہ حرف نہ گفتن کمالِ دانائی است

سرورؔ کا کہنا ہے کہ، غزل اور قصیدے کا ناپاک دفتر، بیانِ مُطلق نہیں، اس سے ایک مخصوص قسم کی شاعری مراد ہے جس میں "لکھنؤ اور دہلی اسکول کے درمیانی شعراء نے صنائی اور فن کی پرستش سے شاعری کو مصنوعی اور محدود کر دیا تھا"۔ کیوں نہ کہیئے کہ ہر کہیں

www.taemeernews.com

دور انحطاط ہو یا نہ ہو، ''اصفہان کے متشاعروں''، کے پاس کہنے کو کچھ نہیں ہوتا۔ پھر اپنے ایک دوسرے مضمون 'ہندوستانی ادب میں حالی کا درجہ' میں لکھتے ہیں: ''قصیدہ سے چونکہ مبالغہ، جھوٹ اور خوشامد کی عادتوں کو ترقی ہوتی ہے اور ان سے قوموں میں ضعف پیدا ہوتا ہے، اس لیے حالی اس کی مذمت کرتے ہیں'' ...... جملہ کا آخری حصہ اسرار خودی کی بازگشت معلوم ہوتا ہے، جس سے اقبال پر حالی کے اور اقبال کے سرور پر اثرات کا اندازہ ہوتا ہے۔ اقبال فنونِ لطیفہ کے ایک بڑے نظریہ ساز تھے، مگر سیاسی اسباب سے ان خطوط پر کوئی ادبی یا فنی تحریک نہ چل سکی۔ ہاں بہت سے لکھنے والوں نے ان کا اثر ضرور قبول کیا۔

قدریں کیا ہیں، کیا ہونی چاہئیں، وہ کیسے بدلتی ہیں، ان کا اِثباتی پہلو کیا اور کتنا ہے اور منفی پہلو کس قدر، یہ سب باتیں آج بھی ہمارے سوچنے کی ہیں۔ خاص طور پر اس لیے کہ ہم نے ہندوستان میں شاید ہی کبھی اس طرح سوچا ہو، لیکن کیا ہو اور کیسے ہو، کے بارے میں مَیں کہوں گا کہ 'تنقید و تخلیق' کے مسئلے پر 'ذہنِ جدید' میں سرور نے اپنے آخری دنوں میں مداخلت کی تو کہا ''ناقد اچھے اور بڑے ادب کی وضاحت کرکے ذوق سلیم کی تربیت کرتا ہے'' مگر اس بات سے جان بوجھ کر پرہیز کیا کہ ناقد مصنّف کو لکھنا بھی سکھاتا ہے یا نہیں۔ قاضی عبدالستار ایک بار شاید گستاف فلوبیر کا یہ قول سناتے تھے کہ 'صرف بڑا اہل قلم جانتا ہے کیا نہیں لکھنا چاہیے'۔

۱۹۹۰ء میں چھپے مجموعہ 'پہچان اور پرکھ' میں سرور اپنا طریقۂ تنقید یوں بیان کرتے ہیں:

> ''ادب کا مطالعہ اس لیے کہ وہ ادب ہے۔ اس کا مخصوص طریقۂ کار ہے۔ اس کی مخصوص بصیرت ہے جو کسی علم کی بصیرت سے کمتر ہے نہ بہتر، مگر ہے قابلِ قدر، پہلے فنکار کی شخصیت کا مطالعہ ...... جس حد تک وہ فن کے مطالعہ میں مدد دے۔ ماحول کا علم جو ادب کا تناظر دے۔ اس سماج کا احساس جس میں ادیب سانس لیتا ہے اور اس پس منظر کے ساتھ فن کا غائر مطالعہ ...... لفظ کی وہ جادوگری جو لفظ کی تہہ داری کو پہلوداری کے ذریعہ کائناتی بناتی ہے۔ وہ تنظیم و تناسب جو فن کا جوہر ہے اور وہ بصیرت جو اس کا انعام ہے ...... مجھے نظر یہ سے زیادہ نظر سے سروکار ہے۔''

اس مضمون کے اگلے پیراگراف میں مولوی عبدالحق اور وحید الدین سلیم کا نام ساتھ ساتھ آیا ہے اس لیے کہ ان دونوں نے حالی کے اصولوں سے مدد لے کر ''ہمارے سرمایہ کا ...... تفصیل سے ...... جائزہ لیا ہے ...... دونوں بڑے اچھے محقق ہیں۔ تاریخ پر بھی نظر رکھتے ہیں مگر فلسفہ اور نفسیات کا علم انہیں نہیں تھا، اس لیے بڑے نقاد نہیں۔''

عبدالرحمٰن بجنوری نے غالب کا جو اعلیٰ، ...... جذباتی ...... اور شاعرانہ تعارف کیا ہے اس کو سرور نے اس حد تک سراہا ہے کہ وہ دلچسپ اور تخلیقی ہے۔ اس کے ذریعہ پڑھنے والا جرمن شعراء، ''شیکسپیئر، براوننگ

www.taemeernews.com

اور خود بجنوری سے دوچار' ہوتا ہے اور اسے تنقید پڑھنے کا ذوق پیدا ہوتا ہے۔ مگر سرور نے نہ بجنوری کو اچھا نقاد مانا نہ بڑا۔ عظمت اللہ خاں نے غزل کی جس طرح مذمت کی اسے سرور باغیانہ اور تخریبی کہتے ہیں مگر ''انہوں نے غزل کی نارسائی اور پراگندگی کی جو سنجیدہ وضاحت کی، اس میں فکر کے عنصر اور اس کی اہمیت پر زور دیا اور ہندی بحروں کے ترنم پر جو توجہ دلائی'' اس کا اعتراف کرتے ہیں۔ محی الدین زور اور عبدالقادر سروری کی تحریریں انگریزی تحریک کے اصول تفصیل سے بیان کرتی ہیں لیکن ان کا ہمارے ادب پر اطلاق پھیکا ہے۔ سرور انہیں رد کر کے آگے بڑھ جاتے ہیں کہ ''ان سے معلومات میں اضافہ ہو سکتا ہے، ذہن میں روشنی پیدا نہیں ہوتی۔''

ادب لطیف کے ضمن میں نیاز فتح پوری کے ''نازک جمالیاتی احساس'..... قدیم ادبی سرمایہ سے گہری ...... اور جدید سرمایہ سے خاص واقفیت ...... ان کی تعمیری اور تخریبی دونوں صلاحیتوں، اور شخصیتوں سے شغف کی بنا پر سرور ان کی تعریف کرتے ہیں اور اپنے کلاسیکی ادب کو آب و رنگ عطا کرنے کے لیے انہیں حالی کے بعد سلیم اور عبدالحق سے بڑا نقاد ٹھہراتے ہیں۔

اس کے بعد سرور نے ترقی پسند تنقید پر قدرے تفصیل سے لکھا ہے۔ وہ ترقی پسند تحریک کے عروج کا زمانہ تھا، لیکن سرور نے اس وقت بھی اس کے اونچ نیچ دونوں کی باتیں کہی ہیں۔ شروع میں اقبال اور ٹیگور پر حملوں کی روشنیوں میں اس کی سطحیت اور فرعونیت، اور پھر مجاز اور کیفی کی نظموں کو محض مقصد اور نصب العین کے لیے دیکھنے میں اس کا اکہرا پن واضح کیا ہے۔ لیکن اس کی بڑائی میں لکھا کہ اس نے ''تنقید کو اعلاترین ادب قرار دے کر (یہاں مہدی افادی کا وہ جملہ یاد آتا ہے جو ان پر اپنے مضمون میں سرور نے نقل کیا ہے، اور جو اس جگہ خود اُن پر صادق آتا ہے: ''یہ میرا اصلہ تھا، غلطی نہ کیجیے گا، ہر تحصیلدار کا نہیں۔'' صرف 'تھا' کی جگہ 'ہے' اور 'تحصیلدار' کی جگہ 'نقاد' پڑھ لیجیے۔) اور تنقید کے ذریعہ منفرد ادبی کارناموں میں ایک مسلسل تصور حیات کو دیکھنے کی کوشش کر کے ..... ادب کو بڑے فائدے پہنچائے ..... جذبہ اور فکر کی ہم آہنگی ضروری ٹھہرائی ...... اور ادب کو سائنس، اقتصادیات، نفسیات اور تاریخ سے جوڑ کر اس کو '' زندگی کی وسعتیں'' دیں۔ انہوں نے حالی پر فراق کی تنقید، نظیر پر مجنوں کی رائے، ترقی پسند ادب پر فیض کے مضامین، اختر انصاری کی افادی ادب اور عزیز احمد کی 'ترقی پسند ادب' پر کتاب کو ہمارے تنقیدی سفر میں سنگِ میل قرار دیا ہے۔ وہ مارکسی تنقید کو اس لیے سراہتے ہیں کہ ''افادیت میں حسن ہے لیکن افادیت کو وسیع معنی میں لینا چاہیے۔'' وہ برٹرینڈ رسل کا حوالہ دیتے ہیں کہ ''مارکسزم سائنس کی تاریخ اور تاریخ کی سائنس ہے''، اور لکھتے ہیں کہ ''مارکسی تنقید کے خلاف جو مضامین لکھے جاتے ہیں ان میں علمیت کم اور تعصب زیادہ (ہوتا) ہے۔'' کم سے کم اس زمانہ میں سرور مارکسی نظریہ سے خاص کر اس لیے خوش تھے کہ وہ ''ماضی وحال کا ایک واضح سلسلہ قائم کرتا ہے اور مشرق ومغرب کی تقسیم، کو 'ذہنی کجی' قرار دیتا ہے۔'' مجھ (سعید الظفر) کو نہیں معلوم کہ بعد میں انہوں نے

www.taemeernews.com

اس رائے سے رجوع کیا ہو...... آخرِ عمر میں سرورؔ اب تک کی اردو تنقید پر ایک نظر پھر ڈالنا چاہتے تھے، مگر فالج کے حملہ نے انہیں مایوس کر دیا۔

سرورؔ نے کلیم الدینؔ کی تنقیدوں میں قطعیت، مغربیت اور تخریب پر گرفت کی ہے مگر ان کے ''عالم گیر اصولوں پر زور، تعمیری صلاحیتوں پر اصرار اور ادب و تنقید میں فن کی بلندی اور گہرائی پر توجہ'' سراہی ہے۔ نفسیاتی تنقید کا ذکر کرتے وقت ایک طالب علم کے منہ سے یہ بات کہلائی ہے کہ ''مذہبی کتابوں میں تو کچھ نہیں، ہاں، بعض مفسروں کی شرحوں میں بہت کچھ ملتا ہے۔'' پھر یہ محاکمہ کیا ہے کہ ''نفسیاتی تنقید میں ...... فن کار کی شخصیت کو سائنسی طریقہ سے سمجھنا چاہیے، محض اپنے ذوق کی چیزیں نہ ڈھونڈنا چاہیے۔''

اس کتاب میں آل احمد سرورؔ نے حالیؔ، چکبستؔ، اقبالؔ، فانیؔ، سرشارؔ، آغا حشرؔ، سرسیدؔ، مہدی افادی اور شبلیؔ نعمانی کی ادبی شخصیتوں اور کارناموں کا بھرپور جائزہ لیا ہے۔ انہوں نے اردو تک محدود نہ رکھ کر حالیؔ کا درجہ 'ہندوستانی ادب' میں متعین کیا ہے۔ مولوی عبدالحق نے گاندھی جی سے کہا تھا، اگر اس بدقسمت ملک کی ایک زبان ہوئی تو وہ 'مناجاتِ بیوہ' کی زبان ہوگی۔ کسی اور اردو ادیب میں ان کی ہمہ گیری مشکل سے ملتی ہے۔ حالیؔ اردو میں اصولِ تنقید اور اس کے اطلاق کے بانی، دوسروں ہی پر نہیں خود پر بھی، منفرد غزل گو، مقصدی شاعری میں اقبالؔ کے رہبر، سوانح نگاری میں شبلی کے پیش رو اور غالبؔ کے سب سے اہم شارح تو ہیں ہی، انگریزی زبان کے بے ضرورت استعمال کے باوجود سرورؔ اردو نثر میں معیاری اُسلوبِ نگارش پیدا کرنے کے لیے بھی ان کے کارنامے کے معترف ہیں۔

'حیاتِ شبلی' میں جو سیّد سلیمان ندوی کی اس نام کی کتاب پر تبصرہ ہے، یہ حکم لگانے کے بعد کہ ''اردو نثر کے، عناصرِ خمسہ میں عروسِ زندگی کی حنا بندی سب سے زیادہ سرسیّد، حالیؔ اور شبلیؔ نے کی ہے، نذیر احمد اور آزاد اب دوسری صف میں ہیں۔'' 'حیاتِ شبلی' اور 'حیاتِ جاوید' کی اس مشابہت کے پیش نظر کہ دونوں میں اپنے اپنے ہیرو کی زندگی کے روشن پہلو بیان کیے گئے ہیں، سرور نے حیاتِ جاوید کے قبح و حُسن پر ایک صفحہ سے زیادہ لکھا ہے اور اعتراف کیا ہے'' حالیؔ کی یہ کمزوری ضرور ہے کہ وہ وہاں بھی خاموش رہتے ہیں جہاں خاموشی گناہ ہے۔ انہوں نے سرسیّد کی بہت سی کوتاہیوں کی تاویلیں کی ہیں اور بعض اوقات کتاب 'اعتذار' معلوم ہوتی ہے''۔ ...... اور ختم یوں کرتے ہیں: مگر پھر بھی حیات جاوید اردو کی بہترین سوانح عمری، اُنیسویں صدی کی تعلیمی، ادبی، مذہبی اور سیاسی کش مکش کا ایک دلکش اگرچہ یک طرفہ مرقع اور حالیؔ کے ...... اسلوب کا بڑا اچھا نمونہ ہے۔ معین احسن جذبیؔ کی کتاب ''حالیؔ کے سیاسی شعور'' سے مترشح ہوتا ہے کہ کمالِ شرافت کی بنا پر حالیؔ جہاں سرسید کی ترجمانی کرتے وہاں اپنی رائے ظاہر نہ کرتے تھے۔ مگر جہاں اپنے خیالات لکھتے ہیں وہاں ورنہ سرسید کا کوئی حوالہ نہیں دیتے۔ حالیؔ کے تصوّرات 'مضامین حالیؔ' کی دو جلدوں میں ملتے ہیں۔ شاعری میں غزل و رباعی، مسدّس مدّ وجزر

www.taemeernews.com

راسلام، برکھا رُت، حُبِّ وطن، شکوۂ ہند، مناجاتِ بیوہ، چُپ کی داد، سوانح میں حیاتِ سعدی، یادگارِ غالب، حیاتِ جاوید اور تنقید میں مقدمۂ شعر و شاعری اور شرحِ غالب کا ذکر کر کے ۱۹۴۰ء میں لکھنے والے نے حالی پر بہ اجمال وہ کچھ لکھ دیا ہے جس کی تفصیل کی آج بھی بہت گنجائش ہے۔ اس کا یہ کہنا کہ ''حیاتِ جاوید'' اتنی مقبول اس لیے نہیں ہوئی جیسی 'یادگارِ غالب' کہ 'غالب کی شخصیت سرسیّد...... سے زیادہ دلچسپ ہے، پوری حقیقت نہیں۔ اس میں تاویلات اور ترک و اخذ کو بہت دخل ہے۔

سرور اس بات کو اہمیت دیتے ہیں کہ اپنے 'مذہبی، سیاسی اور تنقیدی تصوّرات میں (اتنے) فرق'' کے باوجود سرسیّد چاہتے تھے کہ ان کی سوانح ''اُور وسعت'' کے لیے حالی کے بجائے شبلی لکھیں، اور مہدی افادی کے اس قول کی تائید کرتے ہیں کہ'' وہ (شبلی) تاریخ کے معلّمِ اول تھے: انہوں نے اردو میں تاریخ کو واقعہ نگاری سے نکال کر علوم کی حد میں داخل کیا اور فلسفہ و تاریخ کا امتزاج کیا۔'' مگر سید سلیمان ندوی سے اختلاف کرتے ہیں: ''انہیں (شبلی کو) عہدِ جدید کا معلّم غلط کہا، یہ لقب سرسیّد ہی کو زیب دیتا ہے۔''

مضمون کے بڑے حصّہ میں شبلی اور سرسیّد کے افکار کا موازنہ ہے: ''انہوں نے قدیم اسکول کو بچا لیا ورنہ سرسید کی تحریک اسے ختم کر دیتی۔...... شبلی کے لیے علی گڑھ کا میدان بہت جلد تنگ ہو گیا...... سرسیّد ترکوں کے مخالف تھے، شبلی ان کے شیدائی، سرسیّد انگریزوں کے حامی تھے، شبلی انگریزوں پر نکتہ چینی سے باز نہ آتے تھے۔ سرسیّد جمہوریت کے مخالف تھے اور انتخاب کو بُرا سمجھتے تھے، شبلی کی رائے دوسری تھی۔ سرسیّد 'الفاروق' لکھنے کے خلاف تھے، شبلی اس کو اپنی زندگی کا کارنامہ سمجھتے تھے...... ذاتی عقائد میں فرق تھا۔ کچھ سیاسی اختلافات تھے، کچھ ذاتی چشمک تھی، ...... وہ (شبلی) تعلیم نسواں کے حامی تھے، عورتوں کی ترقی اور سماجی زندگی میں ان کی شرکت کو اچھا سمجھتے تھے۔'' خود شبلی کا حوالہ دیتے ہیں: ''رائے میں ہمیشہ آزاد رہا۔ سرسیّد کے ساتھ سولہ برس رہا۔ بارہا بحثیں رہیں۔'' دوسری طرف ''شبلی سرسیّد کی طرح اپنے رفیقوں کو ساتھ رکھنا نہ جانتے تھے...... شبلی کا ذوقِ علمی، ان کی شاعری کا رَس، ان کے ذہن کی بَرّاقی اور آزادی، یہ واقعہ ہے کہ سرسیّد نے شبلی کو شبلی بنا دیا، نئے اُفق کے تصوّر سے ان کا ذہن بہت وسیع ہو گیا...... وہ سرسیّد سے بھی آگے دیکھ رہے تھے...... شبلی کبھی قدیم رنگ کے علماء میں شیر و شکر نہ ہو سکے اور انہیں ہمیشہ شبہ کی نظر سے دیکھتے رہے۔ اس بات سے شبلی آج ہماری نظر میں (بہت) بلند ہو جاتے ہیں۔''

شبلی کی تصانیف میں سرور المامون، سیرۃ النبی، الکلام (جس میں سرسید کا نام تک نہ آنے پایا اور جس پر مسٹر عبدالماجد نے والناظر لکھنؤ میں بڑے اعتراضات کیے تھے) کو خاص طور پر سراہتے ہیں اور ان کی نظموں کے اقتباس پیش کرتے ہیں۔ لیکن زور دیا ہے تو خطوطِ شبلی پر، جن میں خاص کر، فیضی بہنیں مخاطب ہیں، کیونکہ ''ان کے مطالعہ کیے بغیر آپ ایک عالم، ایک مصنّف اور مولوی تک (تو) پہنچ سکتے ہیں، اس شبلی کی روح کو نہیں سمجھ سکتے جس کی حکیمانہ نکتہ سنجیوں

www.taemeernews.com

اور شاعرانہ شوخیوں سے اردو ادب میں شادابی اور رفعت آگئی ہے۔'' اس موقع پر میں پڑھنے والوں کو مولانا عبدالماجد دریابادی کا مضمون ''شبلی، مصنف، مصنف گر'' یاد دلاتا ہوں جو انہوں نے دارالمصنفین کی جبلی تقریبات کے موقع پر آج سے کوئی پینتیس سال پہلے لکھا تھا۔ ان دونوں مضامین کو ساتھ ساتھ پڑھنے سے دونوں اہل قلم کے اندازِ بیان اور طرزِ نگاہ کے تقابل کے ساتھ ساتھ شبلی کی بڑائی بھی اظہر من الشمس ہو جاتی ہے۔ شبلی کا والہانہ تغزل ان کی فارسی غزلوں میں نظر آتا ہے جو ان کی ایک انفرادیت بھی ہے۔

اکبر الہ آبادی سے سرور کو پوری زندگی دلچسپی رہی اور انہوں نے ان پر وقفہ وقفہ سے کئی مضمون لکھے۔ تنقیدی اشاروں کے ''اکبر، شخصیت اور آرٹ'' میں یہ وضاحت اہم ہے: ''اکبر کے آرٹ کا کمال ان کے فن کی انتہائی بلندی، ان کی شاعری کی معراج ۱۸۸۴ء سے ۱۹۱۲ء تک نظر آتی ہے۔ اس سے پہلے وہ اپنے آپ کو پا نہ سکے تھے۔ اس کے بعد وہ شاعر سے زیادہ صوفی اور اللہ والے بن گئے۔'' ان کے آرٹ کے لیے لکھتے ہیں: ''ان کے فقرے ایسے برجستہ اور چبھے ہوئے ہوتے ہیں کہ جن پر ان کا وار سب سے زیادہ ہوتا ہے وہ بھی ہنسے بغیر نہیں رہ سکتے، مگر اکبر ہنسی ہنسی میں ...... قافیے سے ...... الفاظ کے ذرا سے پھیر سے ...... اپنا کام نکال لیتے ہیں۔'' پھر یہ کہ اکبر نے غالب کی ظرافت پر یوں اضافہ کیا کہ ''غالب نے اپنی شوخی، معنی آفرینی، لطافت سے کام لے کر زندگی کا لطف بڑھا دیا، مگر ظرافت سے زندگی کے دھارے کو کسی طرف موڑنے کا کام اکبر سے پہلے کسی نے نہ لیا تھا۔'' اکبر کے آرٹ کا ایک اور اختصاص ان کی اصطلاحیں ہیں ''جن کی آڑ میں وہ بڑے بڑے مضامین بیان کر گئے ہیں۔ بدھو، کلو، وفاتی، جمن، شیخ، مس، پیر طریقت اکبر کے یہاں بار بار آتے ہیں''۔ ''مشرقی اور مغربی عورت (کے) موازنہ'' پر اکبر کے اشعار نقل کر کے سرور لکھتے ہیں: ...... ''دراصل یہ صرف قدامت پرستوں ہی کی آواز نہیں، ہندوستان کی روح بول رہی ہے۔'' لیکن آج کے ہندوستان اور شاید پاکستان کی بھی تعلیم یافتہ خواتین اکبر کے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھتیں اور کہتی ہیں کہ سرور کا جدید نما ذہن قدامت سے کتنا متاثر تھا۔ یہ سچ ہے کہ ہندوستان کی یا اس کی اکثریت کی روح آج بھی قدامت پسند ہے۔ اور اسی رجحان کو مشرق کہتے ہیں مگر یہ بات بھی صاف ہے کہ سرور نے اکبر کے لیے جو صرف مثبت رویہ اپنایا وہ یک طرفہ ہے۔ آل احمد سرور ہوں یا آن ماری شمل، اکبر کا جو دلچسپ انتخاب یہ لوگ پیش کرتے ہیں اس کی خوبیاں اپنی جگہ مسلم ہیں مگر 'کلیاتِ اکبر' مسلسل پڑھنے سے ذہن پر جو مایوسی اور اکتاہٹ طاری ہوتی ہے اور جس سماجی یبوست اور نحوست کا احساس ہوتا ہے اس پر، ایک اشارہ ہی سہی، ہونا ضرور تھا۔ دوسری طرف اکبر کے اشعار میں بکثرت اپنے زمانہ کے واقعات پر کہیں واضح اور کہیں مبہم اشارے ملتے ہیں۔ ان کی تاریخی اہمیت ہے اور ان پر سنجیدہ تحقیق کی ضرورت ہے۔

چکبست پر مضمون سے ہم شاعر کے لکھنوی

www.taemeernews.com

پس منظر، اس کی تعلیم یافتگی، اصلاح معاشرہ کی حمایت، مگر عورتوں کی آزادی کے بارے میں ''حذرِ ادب''، نظموں میں حبِ وطن کا وفور، ہندوستانی مشاہیر کا ذکر، رامائن کا ایک سین، غزلوں میں بھی پیامی رنگ، ادبی مقالات میں قدامت پسندی مگر داغ پر ان کے مضمون کا ناقدوں کے لیے مشعل راہ ہونا سکھتے ہیں۔''وہ اپنے تندرست، جاندار اور تھوڑے سے محدود تصور کی وجہ سے بعض بڑی 'قطعی' باتیں کہہ جاتے ہیں...... ان کی رائے ماننے پر ہم مجبور نہیں مگر اس کی عزت کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔'' قاری شاید معرکۂ چکبست و شرر پر بھی چند جملے پڑھنا چاہتا ہو، جس میں تعصب اور کسی حد تک زبان درازی کا الزام دونوں پر آتا ہے، مگر سرور اس کا ذکر نہیں کرتے۔

اقبال پر سرور نے جتنا لکھا ہے وہ اردو دانوں سے پوشیدہ نہیں۔ اس مجموعہ کے ۱۹۳۹ء میں لکھے مضمون میں انہوں نے طلباء کے لیے اقبال کے تصورات کا خلاصہ اس تنبیہ کے ساتھ پیش کیا ہے ''یہ کہنا کہ اقبال محض ایک فلسفی ہے اقبال کی بڑی توہین ہے۔'' ان پر رومی، نطشہ اور برگساں، جمال الدین افغانی، مجدد الف ثانی، بیدل اور غالب کے اثرات ہیں۔ وہ مثبت قدروں، انسان اور زندگی کے اثبات پر اور اس طرزِ عمل پر کہ جہاں سے اپنے کام کی بات ملے لے لو اور بقیہ ترک کر دو، زور دیتے ہیں۔ سرور خودی و بے خودی، زندگی، عشق، حرکت، سخت کوشی اور مرد مومن کی اقبالی اصطلاحیں سمجھاتے ہیں۔ پھر اقبال کے وطن، آزادی، مساوات، سوشلزم اور زندگی کے بلند مقاصد بیان کر کے ان کے اندازِ بیان کی دل آویزی پر بات ختم کر دیتے ہیں کہ اس تعارف میں اتنی ہی گنجائش تھی۔ اس مضمون میں سرور نے فکرِ اقبال کے معلوم پہلوؤں کی تلخیص کر دی ہے، اپنی طرف سے کوئی خاص بات نہیں لکھی ہے، لیکن اقبال کا یہ مختصر تعارف بہت سے طالب علموں کے بہت کام آیا۔

فانی بدایونی پر ایک طویل مضمون 'پہچان اور پرکھ' میں ملتا ہے جس میں ان کی ایک غزل اور بہت سے اشعار پیش کیے گئے ہیں۔ مگر 'اشاروں' میں یہ مختصر نقشِ اول اس تشریح کا بڑا کامیاب اجمال ہے۔ پہلے تو اپنے عام تنقیدی رویے کے مطابق فانی کی سیرت نگاری کی ہے کہ انہوں نے اپنے خاندان کا مسلسل زوال دیکھا۔ وکالت اس لیے زیادہ نہیں چلی کہ انہیں اس پیشہ سے نفرت تھی (شاید شاعری اور مطالعہ کے علاوہ ہر کام سے، سعید الظفر)۔ بڑے خلیق اور متواضع تھے، خود دار اور غیرت مند بھی۔ (خود سرور کی طرح) معاصرین کی برائی کبھی نہیں کی۔ دوسروں کا کمال سراہا۔ یگانہ اور جگر کے خاص طور پر مداح تھے۔ حقیقت نگار شاعر کے طور پر تلخیٔ حیات سے نہ صرف واقف تھے بلکہ اسے عزیز بھی رکھتے تھے۔''وہ ساری عمر غزل کہتے رہے...... اور اسی کو سب کچھ سمجھتے رہے...... فانی کا یہ بھی خیال تھا کہ جس دنیا میں شاعر کا ظہور ہوتا ہے وہ دنیا اس کی اپنی دنیا سے بہت پیچھے ہوا کرتی ہے۔ انہیں اس کا اندازہ نہ ہو سکا کہ یہ بلندی فرضی ہے، ورنہ شاعر دراصل اپنے ماحول، اجتماعی اثرات، ذہنی الجھنوں

www.taemeernews.com

اور مادی مشکلات سے اثر لیے بغیر نہیں رہ سکتا۔"

فانی کی شاعری کی بابت سرور لکھتے ہیں کہ "ان کا رنگ میر اور غالب دونوں کے رنگوں سے بنا ہے اگرچہ اس میں حسرت کی جھلک بھی ہے۔" آخری عمر کے مجموعوں (عرفانیات اور وجدانیات) میں "صاف اور سادہ اشعار بہت ملتے ہیں۔ ان میں خیال ہی سادہ نہیں کہیں کہیں بلاغت بھی آگئی ہے۔ فلسفیانہ اظہار آخر تک ہے مگر فلسفیانہ اشکال کم ہو گیا ہے۔ میر کی چھوٹی......اور طویل بحریں بھی بکثرت ملتی ہیں۔ ان کی زندگی اور شاعری میں اتنی ہم آہنگی ہے کہ دوسری جگہ کم نظر آئے گی۔" دوسرے مضمون میں سرور نے فانی کو لکھنؤ کے ہم عصر شعراء ہی نہیں جگر اور اصغر سے بھی بڑھا دیا ہے۔

رتن ناتھ سرشار کے حالات زندگی زیادہ معلوم نہیں۔ سرور نے ان کی شخصیت کا خاکہ بنانے میں ان کی تحریروں سے مدد لی ہے۔ کشمیری پنڈت تھے۔ عربی و فارسی کی تعلیم پائی تھی۔ مدرسی اور اخباروں میں مضمون نگاری سے زندگی شروع کی۔ ہیئیت پر شمس الضحیٰ نام سے سلیس اردو میں کتاب لکھی۔ 'اودھ اخبار' میں ایڈیٹر مقرر ہوئے تو اس کے لیے 'فسانۂ آزاد' باقساط اور قلم برداشتہ لکھنے لگے، جو لکھنے والے کی خوبی اور افسانہ کی خامی دونوں کی دلیل ہے۔ ان کا یہ شاہکار آزاد افسانہ کتابی شکل میں چھپا۔ جب سے "سرشار......فسانۂ آزاد (سے اور ان کی دوسری تحریریں ان کی وجہ سے زندہ ہیں۔" "انہوں نے بہت لکھا، بے خیالی سے لکھا اور بے تکان لکھا......اپنی تصانیف پہ نظر ثانی نہیں کی......(اس کے باوجود) ان کے ستھرے پن اور فطری رنگ پر حیرت ہوتی ہے۔"

اب فسانۂ آزاد میں دیکھیے: '......لکھنؤ کی لٹی ہوئی تہذیب کا ......زندگی کے عین مطابق......نقشہ...... نواب اپنے مصاحبین کے جھرمٹ میں گھرے کبھی بٹیر کے اڑ جانے پر ماتم کرتے ہیں، کبھی جنگ روم (ترکی) و روس میں اس (میاں آزاد) کے کارناموں پر خوش ہوتے ہیں، کبھی اس کا مقبرہ بنواتے ہیں، کبھی کھدوا دیتے ہیں، کبھی خوجی کو گالی دیتے ہیں، کبھی خلعت سے نوازتے ہیں، مہریاں کبھی نوابوں سے آنکھیں لڑاتی ہیں، کبھی کہاروں سے، ضلع جگت میں طاق ہیں......نوکر آقا سے فقرہ بازی کرتا ہے، آقا نوکر سے نہیں چوکتا۔ بوڑھے، نوجوان، بچے، مرد، عورتیں، نواب، امیر، رئیس، سپاہی، چور، شہ سوار، ریفارمر، شاعر، بانکے، شوقین، رنگے سیار سب کی بھیڑ ہے......سب آپس میں دست و گریبان......محبت، دوستی، رشک و حسد، میل ملاپ، جنگ، خوں ریزی، ہنسی مذاق، معصومیت، شیطنیت سب ہی سے تو واسطہ پڑتا ہے......ایک فقید المثال واقعیت......جسے......بھلایا نہیں جاسکتا۔"

آغا حشر کی شخصیت اور فن پر ایسا مضمون میں نے اور کہیں نہیں دیکھا۔ اس میں سرور نے آغا حشر کی شخصیت اور ڈرامہ نگاری تفصیل سے اور مثالوں کے ساتھ بیان کی ہے۔ ان کے ذہن اور فن کا ارتقا پیش کیا ہے۔ ان کا تقابل مارلو سے کیا ہے اور لکھا ہے کہ وہ شیکسپیئر سے نہیں' جیسا کہ مشہور ہوا بلکہ مارلو سے قریب تھے۔ وہ اچھے شاعر تھے اور اپنی شاعری سے ڈرامہ کو موثر بناتے تھے۔ جہاں چاہتے

www.taemeernews.com

اصل قصہ میں ترمیم کر لیتے، اشخاص کو ہندوستانی لباس دے دیتے، جہاں چاہتے سین کے سین نکال دیتے، جہاں چاہتے دوسرا سین داخل کر دیتے۔ کامک کے نام سے فضول اور بے معنی کردار شامل کردیتے۔۔۔۔ان میں فنی کمزوریاں بکثرت ہیں۔۔۔۔۔۔ (انہوں نے) ایک بھی غیر فانی کردار زندگی کو نہ دیا۔۔۔۔ ان کا مذاق دراصل گالی گلوج، لات گھونسے، پھکڑ، دھول دھپّے والا ہے۔۔۔۔۔ (اپنے) دوسرے دور میں حشر نے گانوں میں کچھ کمی کی۔ منظوم گفتگو بھی کچھ کم ہوئی، مگر مقفّٰی عبارت بدستور قائم رہی۔'' ان کا انتقال ہوا تو (اردو) ڈراما محض تفریحی نہیں رہا تھا بلکہ سنجیدہ اور مہذّب ہوگیا تھا۔۔۔۔ زندگی کے مختلف پہلوؤں پر دھیان دلانا آ گیا تھا۔۔۔۔ بولی بھی سہل ہوگئی اور۔۔۔۔ لہجہ بدل گیا تھا۔ یہ سب تبدیلیاں حشؔر کی کوششوں سے نہیں ہوئیں مگر حشؔر کی مدد سے بھی ہوئیں۔'' مجموعی طور پر وہ ''کردارنگاری میں کمال حاصل نہ کر سکے۔''

اس کے بعد سرؔور کا بہت بھاری اور منفرد مضمون ''خطوط میں شخصیت'' لیتا ہوں، جس میں غالبؔ، شبلیؔ، اکبرؔ، مہدیؔ افادیؔ، احسنؔ مارہروی، رشید احمد صدیقیؔ اور عبدالماجد دریابادی وغیرہ کی ادبی شخصیتوں کا ان کے خطوط کی روشنی میں جائزہ لیا گیا ہے۔ پہلے تو شخصیت، ادب اور خطوط کے ربط باہم پر ایک اجمال دیکھیے: ''سچائی کی طرح شخصیت کی تعریف آسان نہیں، لیکن جب ہم شخصیت سے دوچار ہوتے ہیں تو فوراً پہچان لیتے ہیں۔۔۔۔۔ ادب میں تازگی شخصیت، ندرت، سچائی اور زندگی سے آتی ہے۔ شخصیت کی گرمی سے بے جان الفاظ بولنے لگتے ہیں۔۔۔۔ ناول اور ڈراما میں شخصیت کا اظہار اور طرح ہوتا ہے، شاعری میں اور طرح۔۔۔۔ افتادِ طبع کو سمجھنے کے لیے خطوط کا مطالعہ سب سے زیادہ اہم ہے۔۔۔۔۔'' پھر نفسِ خطوط کے متعلق۔۔۔۔ اچھا خط۔۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔۔ ہے جس میں لکھنے والا اپنے مخاطب سے باتیں کرتا نظر آئے۔۔۔۔ قاضی عبدالغفار کے لکھے۔۔۔۔ ''لیلیٰ کے خطوط'' خط نہیں مضمون ہیں۔ یہ انشائیے لطیف ہیں۔'' مگر ابوالکلام کی 'غبارِ خاطر' کا ذکر نہیں کیا، جس پر یہ بات زیادہ صاف طور پر صادق آتی ہے۔

اب خط لکھنے والے ادیبوں، شاعروں کا حال پڑھتے جایئے: ''غالبؔ پہلے شخص ہیں جو اپنے خطوط میں اپنی شخصیت کو بے نقاب کرتے ہیں۔۔۔۔۔ یہ خط فطری اور بے تکلف ہیں۔۔۔۔۔ (ان میں) نمائش اور ظاہرداری مقصود نہیں پیلشن کی تلاش۔۔۔۔۔ پینے پلانے کا تذکرہ۔۔۔۔۔ (نوابوں سے) عرضِ مدّعا۔۔۔۔۔تعریف۔۔۔۔ اطلاع۔۔۔۔۔ کہ (تمہارے) نام سے ایک صاحب کے اعتراضوں جواب چھپوا دیا ہے۔۔۔۔ وہ غالبؔ۔۔۔۔۔ جس کے قدم زمین پر جمے ہیں، جس میں زندگی گزارنے کا حوصلہ اور برق سے شمعِ ماتم خانہ روشن کرنے کا ولولہ ہے،۔۔۔۔۔ جو اپنے نام سے فائدہ اٹھاتا ہے مگر اپنے فن کو ذلیل نہیں کرتا۔۔۔۔۔ (جس میں) زندگی، انفرادیت اور ایک ابدی تازگی ہے۔۔۔۔۔ وہ ہر جگہ منفرد ہے۔۔۔۔۔ جس انداز سے مانگتا ہے دوسرے اس انداز سے دے نہیں سکتے۔۔۔۔۔۔

سرسیّد اور حالیؔ کے خط (اپنی اپنی) ایک وحدت رکھتے ہیں۔ سرسیّد کے یہاں ایک ہی رنگ،

www.taemeernews.com

ایک ہی سُر، ایک ہی جذبہ ملتا ہے۔ ان کی شخصیت میں سب سے نمایاں ان کی دردمندی اور خلوص ہے۔ (مگر وہ) غالبؔ کے خطوط کی طرح دلچسپ نہیں۔ حالیؔ بھی سرسیدؔ کی طرح ہیں۔

ہاں شبلیؔ اور اکبرؔ کے خط...... اگر منظرِ عام پر نہ آئے ہوتے تو ہمیں ان دونوں کی فطرت کا اندازہ) نہ ہوتا۔ 'مکاتیب شبلیؔ' میں (وہ) ایک عالمِ دین اور ادیب کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔ 'خطوطِ شبلیؔ' میں ان کے اصلی خیالات سامنے آتے ہیں...... (جن سے) زندگی اور اس کی دشواریوں کا اندازہ کرنا چاہئے...... شبلیؔ کے خطوں سے میری نظر میں ان کی عزت بہت زیادہ ہوگئی اور اکبرؔ کچھ گر گئے...... (جو) خطوں میں اس قدر کمزور مصلحت ہیں۔ ادھر وار کرتے تھے ادھر معافی مانگتے تھے۔ وار کرنا فطرت کی طرف سے تھا اور معافی مانگنا انہوں نے اپنا شعار بنا لیا تھا۔ جُزرس اور چڑچڑے...... ہنسنا ہنسانا ان کی عادت ہوگئی تھی...... مگر یہ ایک اوپری قالب تھا جس کے اندر ایک سوکھی سہمی طبیعت تھی۔ کچھ یہ بھی ہے کہ اکبرؔ کے جو خط چھپے ہیں وہ ان کے بڑھاپے کے ہیں''۔

''نیازؔ کے خطوں میں ایک دل کش اور وقیع ادبیت ہے...... طنز بھی ہے اور ظرافت بھی...... ان کا اسلوب نہیں بدلتا...... شعر پڑھنا...... خاص تلمیحوں سے کام لینا...... مگر...... اس میں کوئی ارتقا نہیں...... ہلکے اور گہرے رنگ نہیں...... زندگی سے زیادہ کتاب ہے...... نیازؔ افسانوں میں بھی دراصل انشا پرداز تھے اور خطوں میں بھی۔''

''مہدیؔ (افادی) کے خط بڑے دلچسپ ہیں...... ان کی رنگین اور جمالیاتی شخصیت کی وجہ سے۔ مگر نیازؔ کی طرح یہاں بھی ایک تکلف ہے...... کردار آپس میں گفتگو نہیں کرتے بلکہ ایک فقرہ دوسرے فقرے سے باتیں کرتا ہے......''

''اس کے مقابلہ میں محمد علیؔ (جوہر) کے خطوں میں ساری خوبیاں ملتی ہیں، اگرچہ ادبیت نہیں ہے...... بڑے خود پسند، متلون مزاج، ضدی اور انتہا پسند تھے...... مگر ان کے خط جیتے جاگتے، ہلکے پھلکے اور شگفتہ ہیں۔ ان میں عالم و عامی بھی کے لیے سامان موجود ہے۔ بناوٹ نہیں، ذہانت، شوخی، برجستگی اور...... اپنے مظاہرے سے آپ خوش ہونے کا جذبہ ہے۔ یہ وہ فنکار ہے جو اپنی تخلیق میں مست ہے۔''

''اقبالؔ کے خطوں سے ان کی نظموں کے سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ ذہن کی روشنی، علمی و ادبی مذاق...... سیکھنے اور جاننے کی صلاحیت، ہر شخص سے اس کی قابلیت کے مطابق گفتگو کی عادت...... ایک دریا...... اپنے باوقار انداز سے...... بہتا چلا جاتا ہے۔

'' جوشؔ کی شاعری میں گرمی، ولولہ، رقصِ حیات ہے مگر ان کے خطوں میں لطف و انبساط نہیں۔ وہ نثر نہیں لکھ سکتے۔ (بعد کے جوشؔ نے یہ قول غلط ثابت کیا)...... بہت جلد خفا ہو جاتے ہیں۔ دوسرے سے پوری طرح کھلتے نہیں۔ انہیں اپنے سے محبت ہے۔''

''احسنؔ مارہروی کی شاعری پھیکی اور...... خط بڑے مزیدار ہوتے ہیں۔...... فلک پیما اچھے مضمون نگار ہیں مگر ان کے خط ان کے مضامین سے

www.taemeernews.com

بھی زیادہ جاندار ہیں۔"

"رشید احمد صدیقی کے خطوط اگر شائع ہو جائیں تو غالب کے بعد انہیں کا درجہ قرار دیا جائے (گا)......(اب کہ اکثر شائع ہو چکے ہیں، یہ پیشن گوئی من وعن صحیح ثابت ہوئی۔ سعید الظفر) رشید صاحب بے تکلف دوستوں میں کھلتے ہیں......خطوں میں پر تکلف اور مصنوعی سنجیدگی نہیں......وہ لیڈر نہیں اچھے رفیق ہیں، اور زندگی کی اونچ نیچ یہاں تک کہ اپنی اونچ نیچ پر ہنس سکتے ہیں......ان کے یہاں زخموں کی بہار نہیں، لالہ وگل کی بہار ہے۔"

"مولانا عبدالماجد کے مضامین میں جو جذباتیت ہے وہ خطوں میں غائب ہو جاتی ہے۔ وہ بھی دلچسپ خط لکھتے ہیں۔ برمحل اشعار کے دلدادہ ہیں اور رعایتِ لفظی کے عاشق۔ مگر آرٹ کا اتنا سلیقہ ہے کہ اس میں لطف پیدا ہو جاتا ہے۔"

اور مضمون کے آخر میں سرور خبردار کرتے ہیں کہ شخصیت کے تعین میں "صرف خطوں پر بھروسا کرنا اسی طرح خطرناک ہے جس طرح صرف گفتگو پر۔ دونوں میں زندگی ہے مگر استواری لازم نہیں۔"

"مکاتیب مہدی" پر مضمون" خطوط میں شخصیت" کے اجمال کی تشریح ہے: یہ کتاب ادب وانشاء کا چمن بھی ہے اور نقد ونظر کا معیار بھی......مہدی کی بالغ نظری اور ان کے پُرلطف اندازِ بیان کے بڑے بڑے قائل تھے......ان خطوط (کا)......لکھنے والا ادب کا مذاق فطرت کی طرف سے لے کر آیا تھا......بلا کی شوخ اور شگفتہ طبیعت پائی تھی۔......اُن کی طبیعت کی رنگینی الفاظ میں بکھرتی رہتی تھی۔......مہدی کا ادبی ذوق نہایت پاکیزہ تھا۔ دوم درجے کی چیز ان کی نظر ہی میں نہ آتی تھی۔......وہ سب کچھ کر سکتے تھے لیکن کتابوں سے علیحدہ نہیں ہو سکتے تھے......یہ خطوط بے ساختہ اور بے تکلف نہیں۔ مہدی کی ادبی کاوشوں کا نتیجہ ہیں۔......مہدی مولویوں کے سامنے رند اور ہنسوڑوں کے سامنے مقطع بن کے آتے تھے۔......ان کا دماغ مغربی تھا اور دل مشرقی۔ انگریزی اصطلاحوں کے مترادفات تلاش کرنے کی انہیں دھن تھی۔ وسائل دودکشی، عوائد الرّسمیہ، ادب العالیہ، ......تنقید عالیہ، ......اختراعِ فاقہ،......وظیفۂ لب (Lip-service)، عہدِ زفاف، یہ سب ان کی ایجادیں ہیں۔......غیر ستائشی جنبشِ لب، خمیازۂ شباب، مقیاس الشباب، زہرۂ شب، محبت کا ثمر اولین، ان سب سے حسن آفرینی، معنی آفرینی اور اختصار تینوں کا حق ادا ہو جاتا ہے اور تحریر میں چمک آجاتی ہے۔

"ان خطوں کی اہمیت......اس وجہ سے بھی ہے کہ ان میں ادبی مباحث، کتابوں، رسالوں اور بہت سے ادیبوں پر اچھی خاصی تنقیدیں مل جاتی ہیں۔......باتوں باتوں میں بڑے پتے کی باتیں کہہ جاتے ہیں......(جیسے) 'جس فلسفیانہ سانچے میں ہم اسے ڈھالنا چاہتے ہیں کیا شاعر (غالب) بھی ہر جگہ اس نکتہ سے واقف تھا؟' یا 'ریاض......عروس سخن کا آشنائے ازلی ہے۔ آپ لٹریچر کی جن نزاکتوں پر مٹے ہوئے ہیں وہ ریاض کے قلم کی آوازِ بازگشت ہے' یا "ایک خاتون کی جنبشِ لب شکریہ سے گراں بار نظر آئی۔ یہ میرا اصلہ تھا۔ غلطی نہ کیجیے گا، ہر تحصیلدار کا نہیں' اور مضمون کے آخر میں مہدی افادی کو یہ

www.taemeernews.com

جذباتی خراجِ تحسین ملاحظہ ہو جو انشاء و سرور کا بھی شاہکار ہے:

ممکن ہے مہدی کی رائے ......
''بعض ادیبوں کے متعلق ...... ہمیں بدلنی پڑے ...... لیکن قیاس یہ ہے کہ مکاتیب پھر بھی دلچسپی سے پڑھے جائیں گے۔ ان میں وہ جوانی ہے جس پر عمر کا اثر نہیں ہوتا، وہ مستی ہے جو شرابِ انگور کی ممنون نہیں۔ وہ بانکپن ہے جس پر بانکپن نثار ہے۔ سادگی قربان، وہ سادگی ہے۔ تحصیلوں اور قصبوں کی بے کیف زندگی میں رہ کر بھی یہ صاحبِ ذوق حُسن کا پرستار رہا۔ شمعِ انجمن ہو یا چراغِ خانہ جہاں روشنی تھی اسے عزیز تھی اور جہاں روشنی کا پتہ نہ تھا وہاں بھی وہ اپنی حرارتِ عشق سے شعلۂ حُسن روشن کر لیتا تھا۔ اس نے کتنے مولویوں کو انسان بنانے کی کوشش کی۔ کتنے بدمذاقوں کی اصلاح کی۔ کتنے بے راہ رووں کو ٹوکا۔ وہ اس میں کامیاب ہوا ہو یا نہیں، لیکن اس کی کوشش کیا اس کی ادبی زندگی کی ضمانت نہیں؟''

اردو شاعری میں خمریات ایک منفرد اور مکمل مضمون ہے۔ اس تحریر کے بعد شاعری کی اس صنف میں کوئی معتدبہ اضافہ نہیں ہوا۔ اس لیے اس میں افادیت ہی کی نہیں، 'ابدیت' کی بھی بو آتی ہے۔

''(فارسی کی طرح) اردو کی ابتدائی شاعری بھی تصوف کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے۔ شاعری اور درویشی مترادف الفاظ تھے۔ صوفیوں کی طریقت کا راستہ شریعت سے الگ تھا۔ شراب، ساقی، پیرِ مغاں عام اصطلاحات کے معنی کچھ اور تھے۔ تصوف کے معنی اس طرح نظم کرنا کہ غزل کی لطافت قائم رہے...... قدماء کا کمال تھا...... ولی اورنگ آبادی ...... اس مادّی دنیا سے بھی نا آشنا نہ تھا...... لیکن میر کے یہاں ...... تصوف کی چاشنی سے زیادہ عشقِ مجازی کی گرمی ہے۔ ...... شراب کے مضامین برابر ملتے ہیں۔ انشا جیسا درباری شاعر بھی برف لگا کر صراحیِ مے طلب کرتا ہے۔ ناسخ کے زمانہ میں خمریات میں رہی انداز آ چلا تھا۔ (مگر) آتش کے یہاں تصوف اور عشق دونوں کی گرمی ہے۔

''جس طرح عربی میں ابونواس اور فارسی میں خیام کی خمریات مشہور ہیں، اسی طرح اردو میں غالب کی۔ ...... لکھا ہے، مشاہدۂ حق کی گفتگو میں (بھی) بادہ و ساغر کہے بغیر کام نہیں چلتا۔ لیکن ان کی شراب صاف صاف شراب پر تکالی ہے۔ انہیں بہشت اگر عزیز ہے تو اس شراب کی وجہ سے ...... ان کے محبوب کا سب سے بڑا حُسن ہے...... ع

چہرہ فروغِ مے سے گلستاں کیے ہوئے

...... محفل کا ہر گوشہ شیشہ باز کا سر ہے ...... ہوا میں شراب کی تاثیر ہے۔ اپنی مستی کی آڑ میں محبوب سے بے تکلف ہو جاتے ہیں۔ بہشت و دوزخ کا استہزا بھی اسی ذیل میں آتا ہے۔ ...... غالب کی خمریات میں ان کی رفعتِ تخیل اور لطافتِ بیان کے ساتھ ان کا ذوقِ مے کشی بھی شریک ہے۔ ...... ان کے اشعار میں شراب کی تمام مستی موجود ہے اور کہیں کہیں ...... ع

آبگینہ تندیِ صہبا سے پگھلا جائے ہے

www.taemeernews.com

''داغؔ کا حال بھی غالبؔ کا سا ہے۔داغؔ کی شوخی و بیباکی رندانہ مضامین میں خوب نمایاں ہوتی ہے اور اگر کوئی محاورہ نظم کرنے کا موقع مل جاتا ہے تو شعر اور بھی چمک جاتا ہے۔ یہ رنگ امیرؔ کے یہاں رہی اور داغؔ کی تقلید میں ہے مگر یقین نہیں آتا کہ...... یہ شعر امیرؔ کا ہے:

انگور میں تھی یہ مے پانی کی چند بوندیں
پر جب سے کھنچ گئی ہے تلوار ہو گئی ہے

ان (امیرؔ) کے ایک شاگرد ریاضؔ خیرآبادی نے ...... خمریات میں خاص طور پر کمال حاصل کیا۔ ریاضؔ کی طبیعت میں غیر معمولی شوخی تھی۔ (وہ) ساری عمر جوان رہے اور ساری عمر عاشق۔ حُسن کی شوخی کا تو سب نے ذکر کیا ہے مگر ریاض ...... کے یہاں ایسی چلبلی مسکراہٹ، ایک ایسی شوخی ہے جس کا جواب حُسن کے پاس بھی نہیں۔ انہوں نے ساری عمر شراب کے مضامین کہے۔...... تیرہ سو چھیاسٹھ ۱۳۶۶ اشعار خمریات ...... یہاں شراب سے وہ کیفیت مراد ہے جو عشق میں حاصل ہوتی ہے یا جوانی کے راستے میں آتی ہے۔

شادؔ عظیم آبادی کے دو معرکہ آرا شعر پیش کرنے کے بعد سرور جگرؔ کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''مگر اس دور میں جگرؔ کی شاعری خمریات کے لیے خاص طور پر ممتاز ہے۔ جگرؔ ایک رند مشرب، رند وضع شاعر ہیں۔ ان کے یہاں جو شراب ہے اسے بادۂ تصوف سے کوئی علاقہ نہیں۔ (اپنی شاعری کے دوسرے دور میں علاقہ ہو گیا تھا۔ س۔ظ)...... ان کی دلچسپی جتنی صہبا سے ہے اتنی ساقی سے نہیں ...... جس جوش و خروش سے وہ اپنی مستی یا بادہ و ساغر کا ذکر کرتے ہیں وہ ان کی اپنی زندگی سے لیا گیا ہے۔ ان کی شاعری ان کی زندگی ہے اور ان کی زندگی ان کی شاعری۔''

''نظموں میں بھی خمریات کا عنصر کافی ہے۔ مثنویوں کے علاوہ ساقی نامے علاحدہ سے بھی ملتے ہیں۔ (یہ) اس قدر مقبول ہوئے کہ ...... (مرثیوں میں) انیسؔ نے بہار کا ذکر کیا تو ان کے نواسے پیارے صاحب رشیدؔ نے ساقی نامہ کا اضافہ کر دیا۔ نظیرؔ زندگی اور ان کی نعمتوں کو بڑے مزے لے لے کر بیان کرتے ہیں (مگر ان کے) شراب کے مضامین میں روایتی رنگ ہے۔ ساغرؔ اور جوشؔ کے یہاں خمریات کا عنصر بہت ...... ہے۔ جوشؔ نے ...... ''ساقی سے خطاب'' میں ...... تنگ نظری پر بڑی خوبی سے طنز کی ہے۔ چکبستؔ نے کہیں کہیں بادہ و ساغر کے پردے میں مشاہدۂ حق کی گفتگو کی ہے...... (لیکن) اقبالؔ نے ...... خمریات کے پرانے کوچہ میں ایک نیا راگ چھیڑا ہے۔ بالِ جبریل میں شامل 'ساقی نامہ' اقبال کی بہترین نظموں میں ہے۔ یہاں شاعر ساقی سے جو شراب مانگتا ہے وہ زندگی، حرکت، عمل، خودی کی بلندی اور انسان کی معراج سے عبارت ہے۔''

خمریات کے بر خلاف مزاح نگاری

www.taemeernews.com

اردو ادب میں آج بھی جاری ہے۔'' اردو میں مزاحیہ نگاری'' 'اودھ پنچ' اور اس کے لکھنے والوں کے بیان سے شروع ہوتی ہے۔ پھر اہلِ قلم میں غالبؔ سر فہرست ہیں۔ ان کے بعد سیّد محفوظ علی بدایونی، مولانا ظفر علی خاں اور سلطان حیدر جوشؔ آتے ہیں۔ تیسرے دور میں فرحت اللہ بیگ، پطرس بخاری اور رشید احمد صدیقی سے ملاقات ہوتی ہے۔ ان کے بعد عظیم بیگ چغتائی، شوکت تھانوی اور ملّا رموزی کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں، حسن نظامی کا ذکر آتا ہے اور امتیاز علی تاج ممتاز ہوتے ہیں۔ اختتامی کلمات سے پہلے کنھیا لال کپور کا نام آجاتا ہے۔ سرور صاحب لکھتے ہیں:

'' غالبؔ ایک بہت بڑا شاعر، بہت بڑا نثّار، بہت بڑا ظریف اور بہت بڑا انسان تھا۔ ظرافت غالبؔ کی جزوِ غالب تھی، اور اسی بناء پر حالیؔ نے انہیں حیوانِ ظریف کہا ہے۔ غالبؔ کے خطوط میں ظرافت کی پاکیزہ اور ستھری مثالیں کثرت سے ملتی ہیں۔ تعزیت ہو یا دوستوں کے کلام کی اصلاح، آپ بیتی ہو یا جگ بیتی، ادبی مسائل ہوں یا شاعرانہ شوخیاں، دنیا جہاں روتی یا بسورتی ہے غالبؔ وہاں مسکرادیتے ہیں۔ جدت طرازی اور بات میں بات پیدا کرنا غالبؔ کا کمال تھا۔ وہ دوسروں ہی پر نہیں اپنے پر بھی ہنس سکتے تھے، وہ قہقہے کے قائل نہیں، صرف زیرِ لب مسکراتے ہیں۔ اس لحاظ سے وہ اردو کے اڈیسن ہیں۔ اڈیسن زندگی کو ایک تماشائی کی حیثیت سے دیکھتا ہے۔ اس کا دل کش، رواں اور متبسم طرز انگریزی نثر کی معراج ہے۔ غالبؔ تماشائی نہیں، خود تماشا ہیں۔ گہرے اور تیز چھینٹوں کے بجائے دونوں ہلکے رنگوں کی آمیزش سے اپنی تصویر بناتے ہیں۔

'' نذیر احمد کے طرز میں بھی...... بڑی بلیغ...... ظرافت پائی جاتی ہے مگر (وہ) مزاح نگار نہیں۔'' مزاحیہ نگاری ۱۸۷۷ء میں 'اودھ پنچ' سے شروع ہوئی۔ اس کے اڈیٹر منشی سجاد حسین کا ناول حاجی بغلول یا احمق الذی پڑھیے تو آپ کو Pick Wick Papers کا لطف آئے گا۔ گلیڈسٹن اور نظام حیدرآباد کے نام ان کے خطوط دیکھیے تو آپ کو معلوم ہوگا، سیاسی مسائل میں ظرافت کی چاشنی کیسے پیدا کی جاتی ہے۔ 'لوکل علیہ الرحمہ' کے نام سے ان کے مضامین میں موسم کے تبصرہ کے لوگ منتظر رہا کرتے تھے...... معاشرتی نقطۂ نظر سے 'پنچ' قدامت کا پیرو اور سیاسی نقطہ سے جدیدیت (نیاپن، اصطلاح نہیں) کا حامی تھا۔ آزادیٔ ہند کا حامی اور کانگریس کا طرف دار۔ حالیؔ، داغؔ، شررؔ، سرشارؔ پنچ کی چھیڑ چھاڑ سے کم لوگ محفوظ رہے ہوں گے۔ (مسدسِ مدّ و جزرِ اسلام کے ایک ایک متعلق بند نہ صرف ہزار ہزار پھبتیوں پر بھاری پڑتے ہیں بلکہ یہ بتاتے بھی ہیں کہ اودھ پنچ وغیرہ کے اس پھکڑ پن کا ان جیسے شریف اہلِ قلم پر کیا اثر مرتب ہوتا ہے۔) پنچ کے مضمون نگار خود ہنستے ہیں اور اپنی ہنسی سے دوسروں کو ہنساتے ہیں۔ ان کے طنز میں تیزی ہے مگر زہرناکی نہیں۔'' لیکن سرشارؔ پر اپنے مضمون میں سرور لکھتے ہیں:

'' اودھ پنچ (کے) اختلاف میں شخصی اور ذاتی رنگ بھی پیدا ہوگیا تھا۔

www.taemeernews.com

آخر یہی چیز اس پرچے کو لے ڈوبی۔"

"پنچ کے رنگ کو (ریاض کے)
فتنہ اور عطرِ فتنہ نے قیامت کر دیا۔ پنچ
جدید تہذیب کے علم برداروں کو چھیڑتا
ہے مگر فتنہ کی دنیا حسن وعشق کی دنیا ہے۔
یہ حسینوں کو اس لیے چھیڑتے ہیں کہ ان
کی گالیوں میں انہیں مزہ آتا ہے۔"

"سید محفوظ علی کے مضامین
ظرافت کے بلند ترین نصب العین ...... پر
پورے اترتے ہیں۔...... (عالمانہ اور چجا
تلا اندازِ بیان)...... انہیں پڑھ کر کوئی
قہقہہ نہیں لگاتا بلکہ ہنستا بھی نہیں۔ مگر ان
میں وہ تازگی، شگفتگی اور نفاست ہے کہ
روح میں بالیدگی پیدا ہو جاتی ہے۔"

ظفر علی خاں "اچھے شاعر، اچھے نثر نگار، اچھے مقرّر اور اچھے جرنلسٹ ہیں۔ یہی ان کی سب سے بڑی خوبی اور...... خامی ہے۔...... بڑا اچھا لکھتے ہیں مگر ان کی تحریروں میں ابدیت نہیں۔...... سلطان حیدر جوش...... علی گڑھ کے پرانے کھلنڈرے ہیں اور 'جہل مرکب' کے پیرو، (جس) کا سب سے اچھا نمونہ ولایت علی بمبوق کے مشہور مضمون 'پٹواری' میں ملتا ہے۔...... (افسانوں میں) شوخی، شرارت، مذاق کے ساتھ ساتھ فلسفہ کا امتزاج...... اگرچہ...... تکلف زیادہ ہے۔

"فرحت اللہ کی ظرافت زبان سے پیدا ہوتی ہے، پطرس کا خیال خندہ آور ہوتا ہے...... لکھنے والا خود نہیں ہنستا مگر آپ مسکرائے بغیر نہیں رہ سکتے۔

...... اتنا تھوڑا سرمایہ لے کر بقائے دوام کے دربار میں بہت کم لوگ داخل ہوئے ہوں گے۔...... پطرس نے اردو میں پیروڈی بڑی خوبی سے پیش کی ہے۔

(عظیم بیگ) چغتائی (کولتار، شریر بیوی، الشذری) "واقعات سے ظرافت پیدا کرتے ہیں۔ شوکت (تھانوی)، (سودیشی ریل) زبان کی چاشنی سے فضا تیار کرتے ہیں۔...... اکثم صرف ہنسوڑ ہیں۔ ...... رموزی کے یہاں سوجھ بوجھ تو ہے مگر نقالی زیادہ ہے...... جب وہ ناصحانہ رنگ اختیار کرتے ہیں اور روتے ہیں تو ان پر ہنسی آتی ہے اور ان کی ہنسی پر رونا آتا ہے۔...... امتیاز علی تاج کی کتاب 'چچا چھکن' خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔...... (ان کے) مضامین 'فلک پیا'...... میں مذہب، تہذیب، تمدن، معاشرت، شعر و ادب سب پر نہایت بے باک تنقیدیں ہیں...... سوسائٹی کے فاسد مادّہ پر نشتر زنی کرتے ہیں...... یہ حُسن کے بڑے ادا شناس ہیں اور ان کے انداز میں بڑا بانکپن ہے۔...... کنھیا لال کپور نے طنز میں خاص نام پیدا کیا ہے۔ ان کے دوستوں نے انہیں بچھو سے تشبیہ دی ہے۔ 'غالب ترقی پسندوں کی محفل میں' ان کی کامیاب پیروڈی ہیں۔"

مزاح وطنز کے لیے اس مضمون میں ایک مختصر ذکر رشید احمد صدیقی کا بھی ہے مگر ایک دوسری جگہ ان کے مضامین بلکہ نثریوں کے مجموعہ 'خنداں' پر مفصل تبصرہ ملتا ہے اور وہاں رشید احمد صدیقی کی "رفیع و وقیع" نثر اور ان کے طنز و مزاح پر زیادہ تفصیل ملتی ہے۔ اس لیے میں ان دونوں جگہوں کے حوالے اکٹھا کیے دیتا ہوں:

www.taemeernews.com

''رشید احمد صدیقی کے مضامین سے صرف خواص ہی لطف لے سکتے ہیں۔ (ان) کے یہاں ظرافت کی جان طنز ہے۔ جب سارے پند و نصائح بیکار ہو جاتے ہیں تو طنز کا ہلکا سا نشتر اپنا کام کر جاتا ہے۔'' (اس کا منفی پہلو بھی ہے۔ اس طرح طنز کا کے جذباتیت کو عقل و شعور پر غالب کر دیا جاتا ہے کہ اس کا شکار اپنے نفع و ضرر یا اصل معاملے کے اچھے بُرے ہونے کا احساس کھو دیتا ہے۔)'' طنز و ظرافت کی مثال پرانے زمانہ کے جادو یا عملیات (کی روایت) سے دی (جاتی) ہے...... کہ ان میں کہیں بھی خامی رہ جائے تو دشمن کے بجائے خود عامل شکار ہو جاتا ہے ...... ان کے یہاں مقامی رنگ بہت زیادہ ہے اور جو لوگ علی گڑھ کی اقامتی زندگی، کچی بارک اور پکی بارک کی چپقلش جمل مرکب اور یونین سے واقف نہیں وہ طنز کی واقفیت اور گہرائی کو پورے طور پر محسوس نہیں کر پاتے ...... ان کے طرز میں یکسانیت (بھی) نہیں ...... واحد متکلم کا صیغہ ضرورت سے زیادہ استعمال کرتے ہیں (کرتے تھے مگر بعد میں اتنا نہیں ۔ س۔ ظ)، ان میں بیک وقت گفٹ (Swift) کی تیزی (رعایت لفظی کا کیا کہنا! س۔ ظ) برنارڈ شا کی بت شکنی، چسٹرٹن کی طباعی تینوں کے نمونے ملتے ہیں۔ ان کے قصے نئے نہیں ہوتے مگر انداز بیان (انہیں) دلچسپ بنا دیتا ہے...... ذاتی کمزوریوں سے اتنی دلچسپی نہیں جتنی قومی اور اجتماعی خامیوں سے۔ چند گہرے اور شوخ چھینٹوں سے اپنی تصویر بناتے ہیں اور ...... اس طرح سجاتے ہیں کہ منہ سے بولنے لگتی ہے۔ ارہر کے کھیت اور پارلیمنٹ کو ایک صف میں لا کھڑا کرنا اور شاعر، فلسفی اور مولوی کی گمراہیوں کو ایک نظر میں دیکھ لینا (ان) کا کمال ہے۔ عورت اور باغ سے انہیں بڑی دلچسپی ہے (جیسی ہر نارمل مرد کو ہونی چاہیے۔ س۔ ظ)...... ان کی ظاہری شگفتگی اور زندہ دلی کی تہہ میں ایک ذہنی کرب، ایک دلی اذیت چھپی ہے ...... پطرس کی ظرافت ان کے مقابلہ میں بڑی زود ہضم اور ہلکی پھلکی ہے ...... رشید احمد صدیقی کی ظرافت زیادہ وزنی ہے اور اسی وجہ سے کہیں کہیں (ثقالت) بھی (ملتی ہے)۔ 'خنداں' خاص و عام کے لیے ہے۔ اس کا طرز زیادہ عام فہم، اس کے موضوع زیادہ ہمہ جہت اور ہمہ گیر، اس کے کردار زیادہ معروف اور اس کے مضامین زیادہ جامع اور مختصر ہیں''۔ لیڈر اور لیڈری کے لوازمات پر خوب توجہ کی ہے۔ ایک جلسہ کا سین، لیڈری کے خواہاں پر تبصرہ، واعظ کا استقبال، لیڈروں کے اقسام، فصلی، گشتی، مادرزاد، اللہ والے، وبائی، شکی، اشتہاری اور خاموش۔ بھتی تصویریں، تشبیہیں اور استعارے، بہت سے کردار ...... جو ...... سامنے آتے ہیں ...... تو سورج چمکتا رہتا ہے اور غم یاس پاس نہیں بھٹکتا۔ اس تبصرہ میں سرور نے نہ صرف خنداں بلکہ اس کی مدد سے اس وقت تک کے رشید احمد صدیقی کو بھی نچوڑ دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ انہوں نے (رشید احمد صدیقی) اس کے بعد بہت لکھا اور کئی طرح سے۔ اس کے فن کا ایک مجموعی جائزہ اسلوب احمد انصاری کی کتاب ''اطراف رشید'' میں ملاحظہ فرمائیں۔

ناولوں اور افسانوں پر سرور کے مضامین

www.taemeernews.com

لینے سے پہلے کچھ 'زہر عشق' کے متعلق لکھ دینا مناسب ہے جس کے ہندی ایڈیشن کے لیے انہوں نے اپنے انتقال سے چند ہی دن پہلے نیا تعارف املا کرایا تھا اور اس کے کئی ابیات تاثر کے ساتھ برجستہ لکھائے تھے۔ مولانا عبدالماجد، جوش، حالی اور خواجہ احمد فاروقی کے حوالوں کے جلو میں سرور اہمیت دیتے ہیں مجنوں کی رائے کو:

''زہر عشق کی مقبولیت کا راز اس کی عمومیت میں ہے اور اس کا شمار ادبیات عامہ میں۔ اسی خصوصیت نے مثنوی کو عامیانہ بنایا اور اسی نے غیر فانی۔ اسی نے شوق کو بدنام کر کے زندہ رکھا۔''

سرور اخلاقی تنقید کا ذکر کرنے کے بعد اس مثنوی پر آرٹ کے نقطۂ نگاہ سے نظر ڈالتے ہیں: ''زہر عشق کے قصے میں ...... سراپا زیادہ، حقیقت نگاری کم ہے اگر چہ...... شوق اپنے دور کے سارے شعراء کے مقابلہ میں بہتر حقیقت نگار ہیں۔ نفسیات سے واسطہ انہیں کچھ یوں ہی سا ہے...... زہر عشق کی زیادہ تر مقبولیت مہ جبیں اور اس کے عاشق کی آخری ملاقات کی وجہ سے ہے، جس پر آنے والی موت کا سایہ پڑ رہا ہے۔ ...... دنیا کی بے ثباتی کا جو نقشہ پیش کیا ہے اس کی خوبی یہ ہے کہ یہاں بیان کرنے والا موت سے ہم کنار ہو کر سب کہہ رہا ہے۔...... (یہ) لکھنؤ کے عیش پرست اور رنگین ماحول کی ایک سادہ اور سچی تصویر ہے۔ اس کے درد و اثر کا راز مہ جبیں کی بغاوت ہے...... جو اس زمانہ میں خودکشی ہی میں ظاہر ہو سکتی ہے۔ (اور یہ) کہ سچے اور فطری جذبات کے سچے بیان کی مقبولیت ہمیشہ رہے گی۔ مگر زندگی میں معنی و مقصد...... اور تجربات...... کی قدر و قیمت پرکھنے پر ''زہر عشق'' کا درجہ اچھا ہوگا مگر بڑا نہیں۔...... اس میں کچھ شوخ و شنگ تصویریں ہیں...... کچھ پُر اثر مکالمے، کہیں کہیں داغ کی سی شاعری کا چٹخارہ...... یہ چند نازک اور حسین لمحات کا ایک دل کش مرقع ہے۔...... اس میں جذبات کی تھرتھراہٹ ہے...... مگر ان میں دیر تک متاثر کرتے رہنے اور ایک گہری خلش بننے کا سامان کم ہے۔''

اردو ناول کے ارتقاء اور افسانہ نگاری پر اس مجموعہ میں تین مضامین ہیں۔ پہلے تو داستانوں کے بارے میں لکھتے ہیں:

''کہ ان کو پڑھ کے آدمی مبہوت ہو سکتا ہے، قائل نہیں ہو سکتا...... وہ تھوڑی دیر کے لیے زندگی اور اس کے مسائل کو بھول جاتا ہے، زندگی اس کو نہیں بھولتی۔'' پھر کہتے ہیں:

''...... ناول اور زندگی کا چولی دامن کا ساتھ ہے...... ناول سے بہت سے کام لیے گئے ہیں،...... طنز...... وعظ و نصیحت،...... سیاسی، مسائل...... مذہبی عقیدے،...... علمی مباحث۔ مگر یہ سب ضمنی ہیں۔ ناول کا اصل مقصد تفریحی ہے، دلچسپی قائم رکھنا...... یہ زندگی کی تصویر بھی ہے اور تفسیر بھی...... ناول میں زندگی کے مختلف تجربات اور مناظر ہوتے ہیں۔ واقعات کا ایک سلسلہ ہوتا ہے۔ پلاٹ، کردار، مکالمہ، منظر نگاری اور فلسفۂ زندگی کی جھلک...... ایک ذہنی سفر کا آغاز...... فطرت انسانی سے پردہ اٹھانے کی کوشش...... ابتداء، وسط اور تکمیل۔

''انگریزی میں رچرڈسن اور فیلڈنگ ناول

www.taemeernews.com

کے مُوجد کہے جاتے ہیں۔ اردو میں نذیر احمد کے مراۃ العروس اور توبۃ النصوح کو اوّلیت حاصل ہے۔ پھر سرشار کا فسانۂ آزاد آتا ہے۔ نذیر احمد کے ناول تعلیمی، اخلاقی، مذہبی ہیں۔ ان میں پلاٹ مکمل اور واضح ہے مگر اشخاص جامد و ساکن، نذیر احمد کے تعارف سے زندہ نہ کہ اپنے عمل سے۔...... قصہ میں خود جابجا دخل انداز ہوتے ہیں...... مسلم خاندانوں کی اندرونی معاشرت...... کی تصویریں...... سچی اور بے لاگ کھینچی ہیں۔ اصلاحی ہونے کے باوجود دلچسپ اور مقصدی ہونے کے باوجود زندہ۔ فسانۂ آزاد (جس کی تصویروں کی جھلکیاں سرشار کے ذیل میں اوپر آچکی ہیں) ناول کی تعریف پر پورا نہیں اُترتا۔...... ایک آزاد افسانہ ہے...... کردار نگاری کچھ زیادہ تسلی بخش نہیں۔...... فسانۂ عجائب کی ترقی یافتہ صورت ہے۔...... (سرشار) کارٹون اچھے بناتے ہیں۔ (مگر) خوجی ان کی خلاقی کا اچھا نمونہ ہے...... (اور) ان کی خلاقی اور ماحول کی مصوری انہیں نذیر احمد سے بڑا ناولسٹ بناتی ہے۔''

یہاں چند سوالات اُبھرتے ہیں، جن کا جواب نہیں ملتا۔ افسانہ اور ناول میں کیا تعلق ہے؟ آزاد افسانہ سے کیا مُراد ہے؟ یہ بات دلچسپ ہے کی سرشار جو اپنی خلاقی اور ماحول کی عکاسی کی بنا پر شرر سے بڑے ناولسٹ ہیں، انہوں نے ایسا شاہکار لکھا جو ناول کی تعریف پر پورا نہیں اُترتا۔

شرر کے یہاں پلاٹ کے ارتقاء میں چستی اور حُسنِ ترتیب دونوں ہیں۔ وہ سرشار سے بہتر صناع ہیں۔ مگر شرر کے عربی سپاہی ہندوستانی جذبات سے متاثر معلوم ہوتے ہیں...... اور ان کا صرف نام عربی ہے۔ شرر کے سب ہیرو یکساں ہیں۔ ان میں کوئی انفرادی خوبی نہیں۔ فطرت کی بھول بھلیاں اور جذبات کی گہرائیاں شرر کے بس کی نہیں۔ صرف موہنا میں...... المیہ کی ہیروئن کی دلآویزی ہے۔ اس میں فردوسی کی میوہ، زہر عشق کی (مہہ جبیں)، (ٹالسٹائی کی اناکرے نینا کی سیرت) کی بلندی اور ارادہ کی پختگی اور عشق کی حرارت ہے۔ (امراؤ جان ادا وغیرہ کے)'' مرزا رسوا نے حقیقت نگاری کو شعار بنایا...... ناولوں کو اپنے زمانے کی تصاویر سے سجایا، بسایا۔ روزمرہ کی زندگی سے پلاٹ اخذ کیے اور معمولی شخصیتوں...... کی عظمت و دل آویزی کا احساس دلایا...... وہ معلمِ اخلاق ہونے کے علاوہ فنکار بھی ہیں اور فن میں ضبط و نظم اور ڈرامائی احساس کے قائل ہیں۔

'' راشد الخیری کے ناول عورت کی داستان ہیں مگر اُن کی اکتا دینے والی یکسانیت اُنہیں اِس میدان میں کوئی بڑا درجہ نہیں دیتی۔'' مجھے زندگی کے تجربوں سے معلوم ہوا کہ ان کی داستانیں ناقابل یقین حد تک حقیقت سے قریب ہیں۔ تقدیس مشرق، اتنی ہی گھناؤنی تھی، (س۔ ظ)۔

اس کے بعد سارا مضمون پریم چند کے لیے وقف ہے: '' وہ دراصل افسانہ نگار ہیں۔ (ناولوں میں) ان کے ''گئودان'' اور ''گوشۂ عافیت'' سب سے بہتر ہیں۔ پریم چند کا میدان اتنا ہی وسیع ہے جتنی یہ کائنات (مبالغہ!)۔ وہ اچھے قصہ گو اور درجنوں جیتے جاگتے کرداروں کے خالق ہیں...... مقامی رنگ، مقامی خصوصیات...... انسانی فطرت کو جانتے

www.taemeernews.com

ہیں مگر نفسیات انسانی کی گہرائیاں ان کے بس کی نہیں ...... کردار پیدا کرنا اور انہیں پر کھنے اور پھلنے پھولنے کا موقع دینا خوب آتا ہے۔...... حقائق نگاری میں شعرزائی...... شاعر بھی ہیں فلسفی بھی۔...... تصوّرِ حیات کے مالک،...... غریبوں، مظلوموں کے بہت بڑے ہمدرد، کسانوں کے جذبات، ذہنی زندگی کے مرقعے ...... جہالت، غربت اور بیماری، رسم و رواج کا بھوت، دولت کی تقسیم، مذہب کے نام پر انسانیت کا خون پریم چند سے دیکھا نہیں جاتا۔...... ان کا خیال ہے کہ انسان کی فطرت بالکل سفید یا بالکل سیاہ نہیں ہوتی ...... ہماری سیرت ہی ہماری تقدیر ہے۔...... زندگی میں افراد کی فتح وشکست نہیں ہوتی بلکہ گروہ یا مقصد کی ہوتی ہے۔...... ان کی زبان ناہموار ہے...... فارسی و ہندی...... طرز سادہ، عام فہم اور زوردار ہے۔سادگی میں جوش پیدا کرنا ان کا کمال ہے۔''

آخر میں سجاد ظہیر کے 'لندن کی ایک رات' کرشن چندر کی 'شکست' عزیز احمد'' کے گریز'' اور عصمت چغتائی کی 'ٹیڑھی لکیر' کا ذکر ہے۔ یہ مضمون بیسویں صدی کے نصف اوّل تک کی اردو میں ناول نگاری کا ایک مثبت تعارف ہے۔ پچھلے پچاس برس میں اس کے موخرالذکر اہل قلم کے علاوہ قرۃ العین حیدر، عبداللہ حسین، حیات اللہ انصاری، ممتاز مفتی، انتظار حسین، قاضی عبدالستار، شوکت صدیقی، خدیجہ مستور، جیلانی بانو، بانو قدسیہ، جمیلہ ہاشمی، صالحہ عابد حسین، الیاس احمد گدی اور عبدالصمد وغیرہ ناول نگاروں نے جو شاہکار پیش کیے ان کا مختصر تعارف بھی ایک دفتر کا متقاضی ہے۔ اردو ناول پر یوسف سرمست کی کتاب بھی ۱۹۶۰ء سے آگے نہیں جاتی۔

اردو افسانہ پر 'اشاروں' میں دو مضمون ملتے ہیں: 'اردو افسانہ نگاری سن ۴۰ کے قریب لکھا گیا ہوگا۔ اور 'مجھے کون سی کہانیاں پسند ہیں' اس کے آٹھ دس برس بعد۔ کئی باتیں دہرا گئی ہیں۔ بعد کی تحریر میں منفرد افسانوں پر زیادہ تفصیل ملتی ہے، پہلی میں افسانہ نگاروں اور ادبی دبستانوں پر توجہ زیادہ ہے۔ میں دونوں کا ملا جلا تاثر پیش کر رہا ہوں۔ پہلے تو پُرانی کہانیوں کا نہ بھولنے والا جادو یاد آتا ہے۔ جادو کی چھڑی سے پرستان پہنچ گئے۔ (میں نے پہلے پہل کمپیوٹر پر مقناطیسی چھڑی کا استعمال پندرہ برس ہوئے آسٹریلیا میں دیکھا تو یہ جادو جاگ اٹھا، س،ظ)۔ ''شہزادے کی بہادری، شہزادی کا حُسن، خون کا دریا (لکھنؤ یونیورسٹی کے زمانہ میں، یہ گومتی تھی اور پل پری زادگاں، منکی برج تھا) اور سہرے کا پھول ...... پھر...... کیوپڈ سائیکی، خارستان...... گلستان اور کہکشاں کا ایک سانحہ، اچھے لگنے لگے۔ انہیں پڑھ کے دل کی لگی بجھتی بھی تھی اور بھڑکتی بھی تھی۔ یہ افسانے نہ تھے، اچھے خاصے نیم برہنہ رقص تھے۔ (یہ سرور کی ہی آپ بیتی نہیں، اس زمانہ کی جگ بیتی ہے۔)

اردو میں انگریزی کے واسطہ سے چیخوف اور موپاساں کا تعارف ہوا، مگر اثر زیادہ چیخوف کا ہوا کیونکہ موپاساں کی حقیقت نگاری یہاں ممکن نہ تھی اور چیخوف کی مشرقیت، روحانیت اور نفسیاتی تجربے اثر کر گئے۔

www.taemeernews.com

شروع میں پریم چند کی کہانیاں پھیکی سیٹھی، بے جان سی (لگیں)......(رفتہ رفتہ ذوق بدلا) شیرینی میں تلخی کا احساس ہوا...... پھر پریم چند کے افسانوں نے اور سب افسانوں کی یاد دل سے محو کر دی۔ دو بیل......حج اکبر......نجات کا تصور، برات، شطرنج، بڑے بھائی، شکوہ شکایت، نئی بیوی، کفن پڑھے اور پھر پڑھنے کو جی چاہا...... مجھے پریم چند کی بہت سی خامیوں کا احساس ہے مگر مجھے ان کے افسانوں میں جیتے جاگتے انسان اور جانی پہچانی زندگی ملتی ہے۔ وہ فطرت کی حسین کو بھی دیکھ لیتے ہیں اور اس میں بدنما انسانیت بھی، جس سے ان میں محبت اور اس کے حسین، مقدس، اور پاکیزہ بنانے کی خواہش بھی ہے۔ پریم چند آخر وقت ترقی پسند ادب کے ہم نوا بن گئے تھے۔ 'کفن' ان کے اس دور کی بڑی اچھی نمائندگی کرتی ہے......اردو کی بہترین کہانیوں میں ہے......ایک لفظ بھی بیکار نہیں، ایک نقش بھی دھندھلا نہیں۔...... پریم چند نے ایک مرتبہ تو زندگی کو مردانہ وار دیکھا اور بتایا......دیکھو یوں بھی ہوتا ہے زمانہ میں!''

کرشن چندر (جنہیں بعد میں بہتر لکھنے والے سامنے آنے پر سرور نے گرا دیا) اس وقت افسانہ کی (اردو) دنیا میں پریم چند کے بعد سب سے بڑی شخصیت تھی (معترضین کے نزدیک) وہ بعض وقت افسانہ نہیں مضمون لکھتے تھے۔ انہیں نہ کردار نگاری کا سلیقہ تھا نہ اپنے کرداروں سے گہری واقفیت، ان کے یہاں رومانیت حقیقت پر غالب تھی اور سیاست......ضرورت سے زیادہ......اشخاص سے زیادہ حالات پر نظر رکھتے تھے۔ مگر ان کے یہاں......رومان، افسانویت، زندگی کی تصویریں، تندرست رجائیت، دل دوز شخصیت اور ایک روشن سیاسی تصور کی جھلک ملتی (تھی)۔...... ان نے ہندوستان کی بدصورتی اور حسن دونوں کو گلے سے لگایا ہے اور بدصورتی میں بھی حُسن دیکھا ہے......ان داتا بنگال کے قحط......(کے) خیالی مرقع میں (اس) نے حقیقت کی تابنا کی بھر دی ہے......اس نے افسانہ سے بڑی خوبی کے ساتھ...... زندگی کا بڑا مقدس کام لیا ہے۔'' ان کے مجموعوں میں' ٹوٹے ہوئے تارے، زندگی کے موڑ پر، ہم وحشی ہیں، اور 'سمندر دور ہے' خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

''عصمت چغتائی کی بساط کرشن چندر سے محدود ہے...... ہندوستان کے متوسط طبقہ اور مسلمانوں کے شریف خاندانوں کی بھول بھلیاں کو جرأت اور بے باکی سے بے نقاب کیا ہے...... باغی کا ذہن، ایک شوخ عورت کی طلاقتِ لسانی، فنکار کی بے لاگ اور بے رحم نظر......ڈرامائی کیفیت، قصہ پن، کردار نگاری، واقعیت اور بے جھجک صداقت، چھیڑ چھاڑ اور آنکھ مچولی کا آرٹ، مکالموں کی نفاست اور خوبصورتی...... گھریلو با محاورہ، جاندار اور رچی ہوئی زبان، ......'دوزخی' اس رنگ کی اردو میں پہلی کامیاب کوشش ہے۔...... عصمت ہر شیرینی میں تلخی ملا دیتی ہے اور ہر حسین خواب کو توڑ پھوڑ کے رکھ دیتی ہے۔

''راجندر سنگھ بیدی افسانہ کی تنظیم اور دروبست میں کرشن چندر اور عصمت چغتائی دونوں سے آگے ہیں۔ انہوں نے افسانوں کو اپنے مشاہدہ کی دنیا تک محدود رکھ کے اپنا نقصان نہیں کیا......ان کے

www.taemeernews.com

پلاٹ اور کردار نگاری دونوں کی (انفرادیت)...... تذبذب اور انجام کی نفاست، دردمندی اور خاموش حُزن ابدیت کے ضامن ہیں۔ہڈیاں اور پھول، زین العابدین، اور 'گرہن' زبان کی لغزشوں اور ٹیڑھی میڑھی انشاپردازی کے باوجود انسان کو متاثر کیے بغیر نہیں رہتے۔

''منٹو کی شخصیت زیادہ دل کش اور افسانے زیادہ پائیدار ہیں۔......اس کی نثر موپاساں اور مام دونوں سے بہت زیادہ متاثر ہے۔اچھا فنکار ہے۔جس نے افسانے لکھنے سیکھے نہیں، افسانہ نگار پیدا ہوا۔مناسب موڑ کا ماہر، کہیں بے جا طوالت نہیں۔ انسانی فطرت سے اچھی طرح واقف ہے، کردار نگاری کا بڑا اچھا سلیقہ رکھتا ہے۔کم سے کم الفاظ میں ایک کردار پیش کر دیتا ہے مگر ایک مخصوص اور محدود زندگی سے سروکار رکھتا ہے۔ ذہن کا مریض، جنسی، تلذذ اور بے راہ روی سے دلچسپی لیتا ہے۔ہتک، کالی شلوار، پٹھانے، نیا قانون، بانو گولی ناتھ اور کھول دو(کا خالق سعادت حسن منٹو)......اہم ہے لیکن اس کی بڑائی میں شک ہے۔''

افسانوں کا ذکر سرور اس طرح ختم کرتے ہیں:''اگر آپ کہانیوں کے ذریعہ سے زندگی کی تلخیاں بھلانا چاہتے ہیں تو بھول کر بھی آج کل کے افسانے نہ پڑھیے۔ ان میں وہ سب باتیں آ گئی ہیں جو اقبال کے ابلیس نے جہان رنگ و بو میں پائی تھیں، یعنی ع

''سوز و ساز و درد و داغ و جستجو و آرزو''

سنا ہے کبھی جواہر لال نہرو کے سوال پر کہ افسانہ اور ناول میں کیا فرق ہے، سرور نے جواب دیا تھا،''چھوٹے اور بڑے کا۔'' لیکن اشاروں میں اس موضوع پر مجھے یاد نہیں کہ کچھ ہو۔

فاخر حسین (لندنی) نے البتہ اس موضوع پر ایک کتاب میں کسی ہسپانوی نقاد کی بڑی کارآمد موشگافیاں دی ہیں۔ آزادیِ ہندوستان کے بعد کے افسانوں کا ذخیرہ، ہم سب جانتے ہیں، اس سے پہلے کے افسانوں سے کہیں زیادہ اور خاصا اہم ہے۔ان میں سے اکثر ان مضمونوں کے بعد لکھے گئے ہیں۔

میں نے اس تحریر کے لیے 'تنقیدی اشارے' اس لیے چنے کہ آل احمد سرور کی کسی اور تحریر سے میں نے اس سے زیادہ لطف نہیں اٹھایا ہے۔ بیسویں صدی کے نصف اول تک کی اردو نثر و نظم کے معتدبہ سرمایہ کا یہ ایک پُر مغز اور شگفتہ تعارف ہے، جس کے بعض عنوانات پر تفصیلی کام کی گنجائش اب بھی نکلتی ہے۔سنجیدہ طالب علم اسے پڑھ کر اب سے پچاس سال پہلے تک کے اردو ادب کا بہت معقول علم حاصل کر سکتا ہے۔ اس وقت تک کے ادبی اماموں کے علاوہ اس میں جن ادبی میدانوں کا بھرپور جائزہ شامل ہے ان میں 'خمریات' اور 'خطوط میں شخصیت' پر کوئی قابل ذکر اضافہ ضروری نہیں معلوم ہوتا۔ ہاں ناول، افسانہ اور مزاح نگاری کے ضمن میں جب سے اب تک بڑا تخلیقی اضافہ ہوا ہے اور ان پر اس کتاب کے جائزے مفید پس منظر پیش کرتے رہیں گے۔ اس دور کی بہت سی ادبی شخصیتیں اور تحریریں اب تک زندہ ہیں اور ان کے بارے میں کلاسیکی معلومات ہماری گھٹی میں پڑ گئی ہیں۔ 'اشاروں' کے

www.taemeernews.com

پڑھنے پر معلوم ہوتا ہے کہ ان کا کتنا بڑا حصہ ہمارے ذہن تک سرورؔ کے قلم سے یا اس کے واسطہ سے پہنچا ہے۔ کتاب میں بہت سے ادیب اور ادب پارے ایسے بھی ملتے ہیں جنھیں ہم فراموش کر چکے ہیں مگر وہ یاد رکھنے کے قابل ہیں۔ اس تعارف میں خود میں نے بہت سے اہم لوگوں یا نگارشات کا ذکر نہیں کیا ہے۔ کتاب پڑھنے والا انہیں دوبارہ یکجا دریافت کر لے گا۔ ۱۹۸۰ء تک کے اردو ادب پر مختصر اور ٹھوس معلومات کے لیے سیّد احتشام کی ''اردو ادب کی تنقیدی تاریخ'' پڑھنے کی سفارش کرتا ہوں۔

سرورؔ کا تنقیدی ہی نہیں عام رویّہ بھی متوازن تھا۔ وہ نہ 'آلوچک' (مذمت کار) تھے نہ تقریظ نگار۔ تحریر ہو یا اہل قلم ہوں جس پر لکھتے ہمدردی کے ساتھ لکھتے لیکن ان کے مثبت رویّے میں اکثر موضوع کے منفی پہلو چھپ جاتے یا فراموش ہو جاتے۔ وہ شاعر، ادیب اور ناقد کی سماجی ذمہ داریوں کے ہمیشہ قائل رہے، مگر ادبیت سے معرا تحریروں کو اپنے لکھنؤ کے زمانہ میں بھی نہیں گردانتے تھے۔ 'ترقی پسندی'، اور 'جدیدیت' یا 'ادب برائے ادب' کی تحریکوں سے ان کے ذہنی تعلق کا خلاصہ بھی ہے۔ اپنے آخری زمانہ کے ایک خط میں 'ذہن جدید' کے ایڈیٹر کو لکھا یا کہ 'ادب میں انداز بیان کی اہمیت زیادہ ہے'۔ یہ نہیں کہا کہ محض انداز بیان بھی کوئی چیز ہے۔ ان 'اشاروں' کا کوئی مضمون 'انگریزی شاعری' کے علاوہ سرسری نہیں۔ اور تحریر شدہ موضوعات پر دور رس یا تفصیل کے علاوہ کوئی اور کہنے کی بات نظر نہیں آتی، حالانکہ کوئی چیز آخری یا مکمل نہیں ہوتی۔

سرورؔ کا ادب کے متعلق ایک مربوط رویّہ اور ادبی تنقید کا ایک باضابطہ نظام تھا۔ یوروپی اور ہندوستانی ادب اور تنقید کے نئے خیالات پڑھتے، سنتے مگر اپنی سفارشوں اور تحسین کا زور کم زیادہ کرنے سے زیادہ اپنی فکر نہ بدلتے۔ انہیں ہر مکتب تنقید سے اتفاق نہ تھا۔ ان کی بعد کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کن خیالوں کو وہ زیادہ قابل اعتناء نہیں سمجھتے تھے اور ان سے کھل کے اختلاف کرتے تھے۔ وہ منشاء قاری کو نظر انداز کر دینے کے مخالف تھے اور ساختیات کی بحثوں کو نقد ادب کے لیے بیکار سمجھتے تھے۔

سن ۱۹۵۵ء کے بعد کے بالغ نظر سرورؔ کے کارنامے اس تحریر کی حدود میں نہیں آتے اور نہ یہاں ان کی شخصیت معرض بحث میں ہے مگر مضمون کے آخر میں اتنا ضرور کہوں گا کہ سائنسی طرز عمل سے لگاؤ، بے تعصبی، معروضیت، وسعت، اور کشادہ ذہنی پیدا کرنے میں سرورؔ کو اپنے حیاتیاتی سائنس کے اچھے طالب علم ہونے سے ضرور مدد ملی ہوگی۔

☆☆☆

www.taemeernews.com

آصف نعیم*

خواب اور خلش

میری سرور صاحب سے پہلی ملاقات تو اس وقت ہوئی جب انہوں نے میرا علی گڑھ میگزین کی مجلس ادارت کے انتخاب کے لیے انٹرویو لیا تھا۔ اس کے بعد شمس الرحمٰن فاروقی جب وہ علی گڑھ آتے ان کے ساتھ ان کی رہائش گاہ پر بھی حاضر ہوتا تھا۔ ۱۹۷۹ء میں جب کشمیر یونیورسٹی نے مجھے شعبۂ فارسی میں استاد کی حیثیت سے منتخب کیا تو اس وقت سرور صاحب وہیں تھے۔ کشمیر میں یہ کبھی کبھی کی ملاقاتیں شخصی تعلقات میں تبدیل ہوگئیں۔ وہ مجھ سے اپنی محبت کا اظہار میری ہمت افزائی کی شکل میں کرتے تھے۔ انہوں نے اقبال انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام منعقد ہونے والے سمناروں میں مقالے لکھوائے۔ مباحثوں میں شرکت کی اجازت دی اور اقبال چیئر جب اقبال انسٹی ٹیوٹ میں تبدیل ہوگئی تو اس کے استحکام کے لیے مجھ سے بھی کام لیا۔

سرور صاحب کی شخصیت بڑی پہلو دار تھی۔ وہ ایک اعلیٰ استاد تھے، ایک پُرکشش مقرر، ایک باخبر نقاد اور ایک شائستہ شاعر۔ فکر و نظر کے اس خصوصی شمارے کے لیے جب پروفیسر صفوی نے مجھے کچھ لکھنے کی دعوت دی تو یہ خیال آیا کہ ان کے مختلف پہلوؤں پر کئی نقطۂ نظر سے بہت کچھ لکھا جائے گا لیکن ان کے شاعری پر کم لوگوں کی نظر جائے گی۔ میں ان کی شاعری پر ہی اپنے تاثرات کا اظہار کروں تو بہتر ہے۔ اس وقت خواب اور خلش جو اکتوبر ۱۹۹۱ء میں منظر عام پر آیا تھا اس کو سامنے رکھ کر میں اپنے معروضات کا اظہار کر رہا ہوں۔

سرور صاحب نے ترقی پسند تحریک، حلقۂ ارباب ذوق اور جدیدیت تینوں اہم ادبی دبستانوں میں شرکت کی ہے ان کا ساتھ دیا ہے ان کا اثر قبول کیا ہے اور اس اثر کو اپنی افتادِ طبع کے مطابق اپنی فکر کا جزء بنایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں براہ راست شاعری کا زور اور لطف بھی موجود ہے اور بالواسطہ شاعری کی کیفیت معنی بھی (معنی خیزی نہیں)۔ سرور صاحب کی ادبی تربیت مشرقی کلاسیکی ادب کی اعلیٰ قدروں میں ہوئی ہے۔ مغربی ادب سے خواہ وہ کلاسیکی ہو خواہ رومانی خواہ جدید وہ اپنا ذہن وسیع

* ریڈر، شعبۂ فارسی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

www.taemeernews.com

اور روشن تو کرتے ہیں لیکن میر، غالب اور اقبال سے دست بردار نہیں ہوتے۔ مغرب کے فکر و فن سے وہ انداز بیان کے نئے زاویے تو لے آتے ہیں لیکن انہیں مشرقی ماحول میں ہی پیش کرتے ہیں۔

خواب اور خلش سرور صاحب کی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ ہے۔ خواب اور خلش اور سلسبیل میں تقریباً چھپن سال کا فاصلہ ہے۔ یہ فاصلہ نسلوں کا فاصلہ ہوتا ہے۔ شعری زبان میں کئی طرح کی تبدیلیاں آچکی ہیں۔ ادبی منظر نامہ بدل چکا ہے۔ اس تبدیلی کے باوجود ایسا نہیں ہے کہ ۱۹۳۵ء کے سرور صاحب ۱۹۹۱ء کی نسل کے لیے بے گانہ ہوں اور نئی نسل ان کے لب ولہجہ اور ان کی زبان کو اجنبی پا رہی ہو۔ اس کا راز سرور صاحب کی وہ تخلیقی توانائی ہے جس نے ہر تبدیلی کو اپنے اندر خاموشی سے جذب کر لیا ہے۔ Structuralisim, Semiotics اور Deconstruction کے لسانیاتی ابلاغ کے بدلے ہوئے Daigram میں بھی سرور صاحب ماضی کا حصہ نہیں نظر آتے۔

سرور صاحب کی شاعری آہستہ روی اور نرم گفتاری کی شاعری ہے۔ یہ نرم گفتاری اور آہستہ روی ان کی میانہ روی اور سلامت روی کی زائیدہ ہے۔ ان کی سلامت روی اگرچہ تنقید میں بڑی حد تک مضر بھی ثابت ہوئی ہے لیکن یہی سلامت روی ان کی شاعری میں انہیں نرم گفتاری اور آہستہ روی کا بردان دے گئی ہے۔ اس ہنر کی وجہ سے ان کا لہجہ اور ان کے Passions بکھرنے نہیں پاتے۔

۱۔ بلا سے آج نظام حیات برہم ہے
بلا سے اپنے چراغوں میں روشنی کم ہے
بلا سے دل میں ہیں زخم اور آنکھ پرنم ہے
بلا سے زیست ہمارے لیے جہنم ہے
خوشی یہ ہے کہ حقیقت ہوئی ہے خواب کی بات
نشاط روح ہے تسخیر ماہتاب کی بات

یہ آدمی جسے جینا ابھی نہیں آیا
خود آگہی کا قرینہ ابھی نہیں آیا
ملی شراب تو پینا ابھی نہیں آیا
قبا کے چاک کو سینا ابھی نہیں آیا
یہ صبح و شام کا حلقہ بھی توڑ سکتا ہے
کلائی وقت کی چاہے تو موڑ سکتا ہے

نہ علم کی کوئی حد ہے نہ عزم پر کوئی بند
مقام شوق ہے اب ماہتاب سے بھی بلند
نگاہ گرچہ ستاروں پہ ڈالتی ہے کمند
دل اب بھی یاروں کے حرص وہوا کے ہیں پابند
فضا کی سیر بھی ہو امن و آشتی بھی رہے
قدم ہو چاند پہ بھی دل میں روشنی بھی رہے
(دل میں چاندنی بھی رہے)

۲۔ یہ سواد شام کا ہے کرم کہ مزاج کی ہی نہاد ہے
جو کیا تھا وہ تو بھلا دیا جو نہ کر سکے وہی یاد ہے
دل ناصبور کا کیا کروں اسے کس طرح سے مناؤں میں
کبھی سوگوار بہار میں تو کبھی خزاں میں بھی شاد ہے

کوئی دونوں میں کوئی ربط نہاں ہے شاید
بت کدہ چھوٹا تو اللہ کا گھر بھی نہ ملا

www.taemeernews.com

ان کی محفل میں نظر آئے سبھی شعلہ بکف
اپنے دامن میں مگر کوئی بھی چنگاری نہ تھی

زندگی بن گئی دیوانوں کی ایک دوڑ سرورؔ
ہم سے کتنے ہیں جو اس دوڑ میں رہ جاتے ہیں

مثال نمبر ۱ ان کی نظموں سے منتخب ہے اور مثال نمبر ۲ ان کی غزلوں سے۔ غور طلب بات یہ ہے کہ نظم اور غزل دونوں میں زبان سے معاملہ کرنے کا رویہ ایک ہی طرح کا ہے۔ لہجے کی نرمی اور زبان کی شائستگی دونوں میں ایک ہی نوعیت کی ہے۔ ان کی نظمیں بھی اسی کلاسیکی اقدار کی بازیافت ہیں جس کے تناؤ اور آویزش سے ان کی غزلوں کی لسانی بافت تیار ہوئی ہے۔ سرور صاحب کی تربیت کلاسیکی اقدار میں ہوئی تھی۔ وہ اصلاً کلاسیکی رویے کے ادیب ہیں اور چونکہ ہماری کلاسیکی روایت غزل کی شعریات سے ترتیب پذیر ہوئی ہے اسی لیے ان کی نظموں میں بھی غزل کی شعریات کی گونج سنائی دیتی ہے۔

سرور صاحب کی شاعری میں جن جذبات اور محسوسات کا اظہار ہوا ہے وہ رومانیوں کی طرح شخصی اور انفرادی نہیں ہے۔ وہ اپنے انفرادی محسوسات کو بھی کلاسیکیوں کی طرح Non Private بنا کر پیش کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں محسوسات کے اظہار میں ایک توازن ملتا ہے اور توازن کے ساتھ ساتھ بیان میں صفائی اور شائستگی بھی۔

خشک کھیتی ہے مگر اس کو ہری کہتے ہیں
کم نگاہی کو بھی وہ دیدہ وری کہتے ہیں

جو تیرے در سے اٹھا پھر وہ کہیں کا نہ رہا
اس کی قسمت میں رہی در بدری کہتے ہیں

یوں جو افتاد پڑی ہم پہ وہ سہ جاتے ہیں
ہاں کبھی بات جو کہنے کی ہے کہہ جاتے ہیں

غزال شہر تو اب اپنی وحشت کھو چکا یارو
چلیں دیہات کی الھڑ جوانی کا فسوں دیکھیں

غبار مصلحت نے ہر نظارہ کر دیا دھندلا
بشر کی بے قراری اور فطرت کا سکوں دیکھیں

کب مہر لگاتا ہے ستاروں پہ بھی کوئی
بولی کہیں لگتی ہے بہاروں پہ بھی کوئی
بندش نہیں فطرت کے نظاروں پہ بھی کوئی
یہ پھول بہاروں نے جسے ناز سے پالا
رہنے دے اسے سب کی نگاہوں کا اجالا
(یہ پھول بہاروں نے جسے ناز سے پالا)

ان اشعار کی اساس اگرچہ کسی گہرے تجربے پر نہیں ہے اور نہ زبان میں حافظانہ حلاوت اور شان و شوکت، لیکن پھر بھی سب شعر نفاست اور سب ترکیبیں اندازِ صفائی کا قابلِ تحسین حسن لیے ہوئے ہیں۔

سرور صاحب کی شاعری خاص کر خواب اور خلش کی شاعری کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ وہ صرف قدیم لفظیات کے شاعر ہیں اور نہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ قدیم لفظیات سے دامن کشاں ہیں۔ لفظیات قدیم ہوں چاہے جدید ان کے برتنے اور ان کے ساتھ معاملات کرنے کا طریقہ ان کا اپنا ہے۔ ان کی لفظیات کے تلازمات کا منطقہ وہ

www.taemeernews.com

فطرت پسندی اور انسانی روح کی آزادی ہے جو رومانیت پسندوں کا سرمایہ تو رہا ہے لیکن رومانیت پسندی سے ان کے اخذ و استفادہ کی نوعیت کلاسکیت کے حوالے سے ہی ہے۔

قدیم و جدید لفظیات سے اپنے طور پر معاملات کرنے کی مثال میں 'پہلگام' 'انا کا شیشہ' 'بہت دنوں میں حقیقت یہ آشکار ہوئی' 'باپ اور بچہ' کا مطالعہ نتائج سے خالی نہ ہوگا۔ تم کیسے شاعر ہو؟'' باپ اور بچہ'' ''عید آتی ہے گذر جاتی ہے'' '' بتاؤ کہ تم مجھ سے کیا چاہتے ہو'' اور اس مجموعے کی دیگر اور نظموں میں سرور صاحب نے کوتاہ و بلند مصرعوں کی جدید ھیئت بھی اپنایا ہے، لیکن اس طرح کہ وہ ھیئت کی پابندی نہیں کر رہے بلکہ ھیئت کو اپنے نظام الفاظ کا پابند بنا رہے ہیں۔ سرور صاحب نظم کی ہیئت کو کس طرح اپنے نظام کا پابند بناتے ہیں اس کی وضاحت کے لیے '' مگر خیالوں میں اب بھی دیئے تو جلتے ہیں'' کا مطالعہ مفید مطلب ہوگا۔

دھواں دھواں سے یہ چہرے پہ بال خاکستر
کہ جیسے تھم گیا طوفان، سرد ہوگئی آگ
کہ جیسے بجھ گئی باد خزاں سے شمع بہار
کہ جیسے لٹ گیا کہرے سے بزم مہ کا سنگھار

مگر نگاہوں میں ایک لو تو ٹمٹماتی ہے
مگر لبوں پہ مچلتا ہے نالۂ پیہم
مگر خیالوں میں اب بھی دیئے تو جلتے ہیں
مگر سوالوں میں باقی ہے تیغ کا دم خم

ہم اپنی منزل مقصود کے تصوّر میں
چلے تو کتنے ہی خوابوں نے راہ روشن کی
جنوں کا جوش تھا وحشت کا سر پہ سایہ تھا
خبر نہ جیب کی رکھی نہ ہم نے دامن کی

خموش وادیاں نغموں سے ہو گئیں آباد
اندھیری راہوں پہ جلنے لگے لہو کے چراغ
بساط لالہ و گل پر بھڑک اٹھے شعلے
خرد کی بزم میں ملنے لگا جنوں کا سراغ

نہ جانے کتنے ستاروں کی رہگذر ناپی
نہ جانے کتنی بہاروں کے میکدے چھانے
نہ جانے کتنے فسانوں کا فلسفہ جانا
نہ جانے کتنے حقائق بنائے افسانے

مگر یہ قافلۂ گل بھٹک گیا آخر
اجاڑ دشت میں باد سحر بھی کیا کرتی
بصیرتیں تو بزرگوں کے ساتھ ختم ہوئیں
یہ حال تھا تو ہماری نظر بھی کیا کرتی

یہ اپنی بزم خموشاں یہ سہمے سہمے نفوس
ہر ایک اپنی خودی کی لیے ہوئے قندیل
کسی کے پاس عقیدہ نہ کوئی حسن عمل
نہ کوئی جلوۂ روشن نہ کوئی خواب جمیل

ہر اک کرن سے گریزاں ہر ایک سائے کے ساتھ
متاع فکر و نظر بیچ بیچ جیتے ہیں
رفو گری کو ہنر کا کمال سمجھے ہیں
یہ دھجیاں ہیں عقیدوں کی جن کو سیتے ہیں

www.taemeernews.com

یہ اپنی بزم ہے اس کا گلا کریں کس سے
فغاں کہ شعلے کو خاشاک نے کیا مدھم
مگر خیالوں میں اب بھی دیے تو جلتے ہیں
مگر سوالوں میں باقی ہے تیغ کا دم خم
(مگر خیالوں میں اب بھی دیے تو جلتے ہیں)

یہ نظم نو بندوں پر مشتمل ہے۔ پہلے بند میں تیسرا اور چوتھا مصرع ہم قافیہ ہے۔ بقیہ بندوں میں دوسرے اور چوتھے مصرعے ہم قافیہ ہیں۔ یہ نظم مایوسی، امید، تجسس کے درمیان عزم کا ایک عمودی سفر طے کرتی ہے۔ اس نظم میں تجربہ پیچیدہ نہیں ہے نہ اظہار میں ابہام کی پیچیدگی ہے جو شاعری کو معنی کی سطح پر تہہ دار بناتی ہے پھر بھی اس نظم میں حزم واحتیاط کا ایسا حسن موجود ہے جس کی وجہ سے یہ نظم عام سطح سے بلند ہوگئی ہے اور یہی حزم واحتیاط اس نظم کی ہیئت کا مایۂ اصلی ہے۔

'بزم مہ کا سنگھار' 'تیغ کا دم خم' 'بساط لالہ و گل' 'بزم خموشاں' 'خودی کی قندیل' 'خواب جمیل' 'فغاں کے شعلے' جیسی ترکیبوں کے وسیلے سے رک رک کر شریفانہ انداز سے بات کہنے کے سلیقے نے اس نظم کی کشش کو دوبالا کر دیا ہے۔

سرور صاحب کی شاعری اگرچہ رعایت لفظی کے اہتمام، پیکروں کی تخلیق، مضمون آفرینی اور معنی آفرینی کے التزام سے عاری ہے اور بڑی شاعری کے زمرے میں نہیں آتی پھر بھی ان کے شعری سرمائے کو قابل استفادہ اور پُر وقار ضرور قرار دیا جاسکتا ہے۔ جب Harold Bloom (بحوالہ The Anxiety of Influence '1973') کی زبان میں شعرا belatedness کے احساس میں مبتلا ہونے لگیں اور انہیں ایسا لگے کہ ان کے Poetic Fathers تمام میسر Poetic Inspirations صرف کر چکے ہیں تو انہیں اپنی Originality کو assert کرنے کے لیے سرور صاحب کی طرح نرم روی، ارتکاز، شائستگی، نفاست، انداز کی صفائی اور توازن کا راستہ اختیار کر لینا چاہیے تا کہ وہ از سر نو ادب کا سفر شروع کر سکیں۔

☆☆☆

یادیں اور باتیں

www.taemeernews.com

بیگم سرور سے خصوصی ملاقات

سرور نمبر کے قارئین کے لیے بیگم آل احمد سرور سے خصوصی ملاقات اور انٹرویو کے اقتباسات ایک مخصوص پیش کش ہیں - سرور صاحب کی علمی اور ادبی زندگی کے پہلوئوں پر لکھنے والے بہت ہیں جنھوں نے مختلف رسائل اور جرائد میں ان موضوعات پر قلم اٹھایا ہے ، لیکن ان کی ذاتی زندگی، ان کے جذبات اور احساسات ، بچوں اور گھر والوں سے ان کے روابط اور خود بیگم سرور سے ان کے گھرے قلبی تعلق کا آئینہ بیگم سرور کی یہ گفتگو ہے جس کو پیش کرنے کا شرف صرف فکر و نظر کو حاصل ہو رہا ہے - مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں کہ شاید سرور صاحب کی اپنی خود نوشت میں ان کی شخصیت ایسے جاذب اور جیتے جاگتے انداز میں ابھر کر سامنے نہیں آتی جیسی اس مختصر گفتگو میں نظر آتی ہے - علالت اور ضعف کے باوجود بیگم سرور نے اڈیٹر فکر و نظر سے تقریباً ۳ گھنٹے گفتگو کی، جس کو ر کارڈ کیا گیا - ان کی حیرت انگیز یادداشت اور بے ساختہ انداز نے سرور صاحب کی زندگی کے بے شمار پہلوئوں میں جان ڈال دی ہے - بیگم سرور کی یہ گفتگو کہیں شگفتگی سے بھر پور ہے تو کہیں دل گداز : خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہو گئیں۔

بیگم سرور کی زبان سے سرور صاحب کی ایسی بہت سی نظمیں بھی نقل کی جارہی ہیں جو خالص ذاتی نوعیت کی ہیں اور اب تک کہیں شایع نہیں ہوئیں -

حسن اتفاق سے اس انٹرویو کے وقت سرور صاحب کی صاحب زادی مہ جبیں اور نواسی رخشندہ بھی موجود تھیں - وہ بیگم سرور کو بہت سی باتیں یاد دلوارہی تھیں اور گاھے گاھے گفتگو میں حصہ لے رہی تھیں - بیگم سرور کے علاوہ ہم ان دونوں کے بھی نہایت ممنون ہیں -

آزرمیدخت صفوی
اڈیٹر

آ۔د: آپ کی پیدائش کہاں ہوئی ؟

ب۔س: میری پیدائش بدایوں میں ہوئی۔ میرے گھر کا نام شیش محل تھا جس کا کچھ حصہ اب بھی برقرار ہے۔ میرے والد کے چچازاد بھائی اوران کے بچے اب بھی وہاں رہتے ہیں۔

آ۔د: آپ کے والد کیا کرتے تھے؟

ب۔س: میرے والد کلکٹر تھے۔ ان کا نام رحمٰن بخش قادری تھا۔ میری تین مائیں تھیں۔ پہلی بیوی کی موت کے بعد میرے والد نے دوسری شادی کی تھی۔ میری ماں کا جب انتقال ہوا میں شاید ڈھائی سال کی تھی۔ مجھے کچھ یاد نہیں۔ وہ ٹی۔ بی کی مریض تھیں۔ میرے ماں باپ آپس میں رشتے دار تھے۔ میرے والد کا ٹرانسفر ہوتا رہتا تھا۔ گورکھپور، سہارنپور، آگرہ اور بنارس میں رہے۔ دوبار الہ آباد ٹرانسفر ہوا۔ الہ آباد میں بھگت سنگھ

www.taemeernews.com

اور فیروز گاندھی سے ملنا جلنا ہوتا تھا۔ فیروز گاندھی جیل گئے تھے تو سرکاری ملازم ہوتے ہوئے بھی میرے والد نے ان کی مدد کی تھی۔

آ۔د: سرور صاحب کا آبائی وطن کہاں ہے؟

ب۔س: بدایوں میں ہے۔ وہ مولوی ٹولے میں رہتے تھے۔ ان کا ایک مکان بک گیا ہے۔ دوسرے کا بھی مردانہ حصہ بیچ دیا ہے اور زنانہ باقی ہے۔

آ۔د: کیا آپ شادی سے پہلے سرور صاحب کو جانتی تھیں؟

ب۔س: ہاں جانتی تھی کیونکہ وہ بھی بدایوں کے تھے۔ ان کا ذکر ہمارے یہاں ہوتا تھا۔ ان کی بڑی بہن میرے پھوپھی زاد بھائی کی بیوی تھی اور میری پھوپھی زاد بہن ان کی منگیتر تھی لیکن اس لڑکی کا انتقال ہوگیا تھا۔

آ۔د: کیا شادی سے پہلے آپ نے سرور صاحب کو دیکھا تھا؟

ب۔س: کوئی خاص ملاقات نہیں تھی۔ بس ایک دو دفعہ دیکھا تھا۔ ہماری دوسری بہن کی شادی تھی۔ ہمارے اور پھوپھی کے گھر کے بیچ میں ایک بڑی کھڑکی تھی۔ ہم لوگ بڑے جوش میں اس کھڑکی پہ کھڑے باتیں کر رہے تھے کہ اچانک سرور صاحب اور ان کے بڑے بھائی ابن احمد پھوپھی کے گھر میں داخل ہوئے۔ ان لوگوں کی نظر ہم پر پڑی اور ہماری نظر ان پر پڑی۔ ہم فوراً اندر چلے گئے۔ بس دو ایک دفعہ ایسے ہی دیکھا تھا۔

آ۔د: آپ کی شادی کب ہوئی؟

ب۔س: ۳/اگست ۱۹۳۶ء کو میری شادی ہوئی۔ سرور صاحب کی والدہ تنویر فاطمہ اور خالہ طفیل فاطمہ نے مجھے سر آنکھوں پر بٹھایا۔ چونکہ سرور صاحب کی joint family تھی، ساس، سسر، دیور وغیرہ سبھی ساتھ رہتے تھے۔ اس لیے مجھے اکیلا پن کبھی محسوس نہیں ہوا۔

آ۔د: شادی سے پہلے سرور صاحب کے بارے میں آپ کے ذہن میں ایک تصور رہا ہوگا۔ شادی کے بعد وہ آپ کو کیسے لگے؟

ب۔س: (ایک طویل قہقہہ)...... وہ بہت گورے تھے تب۔ ان کے خاندان میں سب سانولے ہیں۔ ۲۵۔۳۰ سال کی عمر تک ان کے بال سفید ہو گئے تھے۔ جب ہم رامپور گئے تھے تو لوگوں نے یہ سمجھا کہ ہم ان کی دوسری بیوی ہیں۔ اولاد احمد بھی ہمارے ساتھ تھے۔ رامپور والوں کو لگا کہ یہ ان کی پہلی بیوی کے بچے ہیں۔ ایک دلچسپ بات سنو۔ شادی کے بعد ہم گھونگھٹ نکالے بیٹھے تھے۔ سرور صاحب کمرے میں داخل ہوئے اور پوچھنے لگے ''آج چاند کس کے پاس ہے''؟ میں نے سوچا شاعر آدمی ہیں کیا جواب دوں،

www.taemeernews.com

بے اختیار کہہ دیا ''میرے''!

آ۔د: شادی کے بعد سرور صاحب کی ادبی مصروفیات کیا تھیں۔ گھر میں ان کے کیا معمولات رہتے تھے۔ گھر کے کام میں وہ آپ کا ہاتھ بٹاتے تھے؟

ب۔س: شادی سے پہلے ان کی ایک کتاب ''سلسبیل'' چھپ چکی تھی۔ وہ پہلے ہی establish ہو چکے تھے۔ ان کا اصل نام آل احمد صدیقی ہے اور سرور تخلص تھا۔ شادی کے بعد میں مسز سرور ہو گئی۔ ہمارے یہاں رات کے گیارہ بجے تک سب سو جاتے تھے۔ وہ رات کو دیر تک جاگتے تھے اور پڑھتے لکھتے رہتے تھے۔ ہمارے یہاں بجلی نہیں تھی۔ اس وقت کہیں بجلی نہیں تھی۔ سب کے یہاں لالٹینیں جلتی تھیں۔ ہمارے یہاں بھی رات بھر لالٹینیں جلتی رہتی تھیں۔ گھر کے کام میں ہاتھ بٹاتے تھے۔ ہمارے ساتھ اکثر shopping کو جاتے تھے۔

آ۔د: سرور صاحب لکھنے پڑھنے کا کام زیادہ تر کہاں بیٹھ کر کرتے تھے؟ پڑھتے یا لکھتے وقت کیا وہ کسی خاص جگہ بیٹھنا پسند کرتے تھے؟

ب۔س: وہ اکثر گھریلو ماحول کے بیچ میں لکھتے پڑھتے تھے۔ انہوں نے الگ سے کوئی study نہیں بنوائی تھی۔ ان کی ایک typical chair ہے جس کے ہاتھ نکلے ہوئے ہیں۔ اپنی ساری کتابیں اور سارے مضامین لکھنے کے بعد اسی پہ رکھتے تھے۔ ان کا concentration بہت زبردست تھا۔ جب لکھ رہے ہوتے تھے تو اس وقت نظر اٹھا کر نہیں دیکھتے تھے۔ شور و ہنگامہ ہو تو تنہائی میں بیٹھنا پسند کرتے تھے۔ زیادہ تر تو رات ہی کو لکھتے تھے۔

آ۔د: آپ آخری بار بدایوں کب گئیں؟

ب۔س: ۱۹۸۷ء میں آخری بار بدایوں گئی تھی۔

میری خالہ کا انتقال ہو گیا تھا۔ میں اکیلی گئی تھی۔ سرور نہیں گئے تھے۔ وہ اس سے پہلے گئے تھے۔ بدایوں میرا دل ہے۔

رخشندہ: ابا کو علی گڑھ سے عشق تھا۔ اس لیے وہ علی گڑھ میں رہنا پسند کرتے تھے۔

آ۔د: کبھی آپ دونوں میں آپس میں لڑائی ہوتی تھی؟ آپ خفا ہوتی تھیں یا وہ آپ سے خفا ہوتے تھے۔

ب۔س: ہاں، بہت لڑائی ہوتی تھی۔ (اس پر سبھی ہنس دیے) طبیعت زیادہ تر خراب رہتی تھی۔ وہ اس بات پر ناراض ہوتے تھے کہ آپ وقت پر دوا نہیں لیتی ہیں۔ وہ اکثر دوا اور ہاتھ میں پانی کا گلاس لیے کھڑے رہتے تھے اور میں الٹا انہیں ڈانٹتی تھی کہ یہ کیا میرے پیچھے پڑے ہو دوا لے کر۔ اکثر غصے میں برتن توڑ دیا کرتے تھے۔ ایک بار میں نے بھی غصہ میں آ کر ان سے زیادہ برتن توڑ دیے۔ ہماری ایک برتن کی الماری تھی۔ اب بھی وہ ٹوٹی ہوئی موجود ہے۔ اس میں برتن رکھے رہتے تھے۔ اس وقت بڑے عمدہ انگریزی سیٹ ہوتے تھے۔ سرور نے ایک پیالی غصے میں اٹھا کر

www.taemeernews.com

پھینک دی۔ ہمیں بھی غصہ آیا۔ ہم نے پورا سیٹ توڑ دیا۔ اچھی بات یہ ہوئی کہ پھر انہوں نے برتن پھینکنا ہی چھوڑ دیا۔

آ۔د: آپ کی ترکیب کام آ گئی۔

ب۔س: جی بالکل کام آ گئی۔ میں اس پر بھی ناراض ہوتی تھی کہ وقت پر کھانا کھالیں لیکن وہ اس کا خیال نہیں رکھتے تھے۔ دوست احباب کے ساتھ باتوں میں الجھ گئے تو کھانا پینا بھی بھول گئے۔ چار چار گھنٹے بیٹھ کر باتیں کر رہے ہیں۔ دوستوں کے آنے کا کوئی وقت نہیں تھا۔ کوئی آٹھ بجے آ رہا ہے، کوئی نو بجے اور کوئی ایک بجے۔ کھانا میز پر لگا ہوا ہے اور یہ بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔ اس سے میرا موڈ آف ہو جاتا تھا۔ اس سے بڑی کھینچا تانی ہوتی تھی۔ کبھی کبھی بول چال بھی بند ہو جاتی تھی۔ وہ بچوں سے message بھجوایا کرتے تھے۔ لیکن بات کرنے کی پہل ہمیشہ وہی کرتے تھے۔ شروع میں سرور ان باتوں پر بھی بہت ناراض ہوتے تھے جیسے وقت پر چائے نہ ملی ہو یا پان صحیح نہ بنے ہوں۔ اس پر انہوں نے ایک چھوٹی سی نظم بھی کہی تھی:

کیا بتاؤں آجکل گھر میں اندھیر ہے
چائے آنے میں تکلف ناشتے میں دیر ہے
ریڈیو کھولے ہوئے بیٹھا ہے کوئی اس طرح
اہل ایماں حوض کوثر کے کنارے جس طرح
کوئی خراٹوں کی کرتا ہے عجب بستر پہ مشق
کوئی اندازجنوں کی کر رہا ہے گھر میں مشق

بعد میں ان کا غصہ بہت کم ہو گیا تھا۔

آ۔د: سرور صاحب شعر کہتے تھے تو آپ کو سناتے تھے؟

ب۔س: کوئی شعر کہتے یا کوئی کتاب چھپتی تو پہلے مجھ کو دیتے تھے۔ میرے اوپر انہوں نے بڑی لمبی لمبی نظمیں کہی ہیں۔ مجھے ابھی تک وہ مہندی یاد ہے جو انہوں نے میرے لیے کہی تھی:

لگالو نازنیں ہاتھوں میں اپنے زاہدہ مہندی
بتائے گی تمہیں عیش و مسرّت کا پتہ مہندی
دلہن کیا ہے سراپا حسن کی تصویر ہے بالکل
دوبالا اور بھی اس کو کرے گی خوشنما مہندی
سجا کر لائی ہے مالن اسے پھولوں کی کشتی میں
دلہن کا حسن بھی دلکش ہے اور ہے خوشنما مہندی

سرور نے مہ جبیں کے لیے ایک نظم لکھی تھی جسے وہ بچپن میں بہت گاتی تھی:

میری بیٹی جب بڑی ہو جائے گی
سارے گھر میں روشنی پھیلائے گی
ماں کی نظروں میں جوانی آئے گی
باپ کے دل کی کلی کھل جائے گی
میری بیٹی جب بڑی ہو جائے گی
حور جنت خود نچھاور لائے گی
سادگی معصومیت بن جائے گی

گھریلو نظمیں بہت کہتے تھے اور پڑھ کر سناتے تھے:

www.taemeernews.com

دفتر کے کام کا نہیں دادے کو کچھ بھی دھیان
بھولی ہوئی ہیں اپنی علالت کو دادی جان
ماں کو ہوا ہے فرطِ مسرّت سے اختلاج
اچھی تو ہیں پر ان کو دوا کی ہے احتیاج
چولہے کے پاس بیٹھی ہے مریم کڑھی لیے
تسنیم بھی وہیں پہ ہے اپنی ہنسی لیے

(تسنیم سرور کی بہن ہے جو پاکستان میں رہتی ہے اور مریم بھانجی ہے۔)

ہمارے ایک چچا تھے رضوان جن کی داڑھی تھی۔ سرور ان کا مذاق اڑاتے تھے۔ ان کا سہرا بھی لکھا تھا:

رضواں پہ بھی اک رند خرابات کا عالم
داڑھی میں چھپائے ہوئے جذبات کا عالم
یخ بستہ دلوں میں بھی حرارت ہوئی پیدا
اللہ رے ساقی کی کرامات کا عالم

ان کے ایک چچازاد بھائی تھے جو ننھے میاں کہلاتے تھے۔ یہ کشمیر گئے ہوئے تھے۔ وہاں ننھے میاں کی پہلی سالگرہ پر ایک نظم کہی:

کشمیر میں بھی قلب و نظر جگمگا گئی
ننھے میاں کی سالگرہ یاد آ گئی
جلوؤں کا اک جہان نگاہوں میں ہے میری
میرٹھ کی ایک شام نگاہوں میں ہے میری
گھر میں ہر ایک فرد خوشی سے نہال تھا
لہریں سی اٹھ رہی تھیں دلوں کا یہ حال تھا

آ۔د: ماشاء اللہ آپ کو خوب یاد ہے۔ آپ کا حافظہ بہت اچھا ہے۔

مہ جبیں: ابا اپنے اشعار بھول جاتے تھے مگر اماں کو یاد رہتے تھے۔ ان کی سب پرانی چیزیں، بیٹی کی مہندی، نواسی کی مہندی سب اماں کو یاد ہیں۔ باہر کی دنیا کی شاعری میں اور گھر کی شاعری کی زبان میں بہت فرق ہے۔ گھر اور بچوں سے متعلق جو نظمیں وہ کہتے تھے وہ بہت آسان زبان میں ہوتی تھی۔
اماں جوتے والا شعر کس موقع پر کہا تھا؟

ب۔س: ہماری طبیعت خراب تھی۔ علاج کے لیے دلی گئے تھے۔ اتفاق سے چپل اٹھ گئے (چوری ہو گئے)، ہم چپل تلاش کر رہے ہیں اور یہ خاموش بیٹھے ہوئے تھے۔ تھوڑی دیر میں ہم کو سنایا:

افسوس چپل کھو گیا کیسا مقدر سو گیا
لائی تھی خود بازار سے
لاکھوں میں چھانٹا تھا اسے
چھ آنے دے کر آئی تھی
بازار جا کر لائی تھی۔

آ۔د: کبھی آپ نے شعر کہے ہیں؟

ب۔س: شروع میں ایک افسانہ لکھا تھا۔

آ۔د: آپ کو پڑھنے کا شوق پہلے سے تھا یا شادی کے بعد پیدا ہوا؟

ب۔س: ہمارے خاندان میں سب کو پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ البتہ میں نے بی۔ اے تب کیا ہے جب میرے بچے پڑھ چکے تھے۔

مہ جبیں: اماں کہتی ہیں کہ اگر ان کو پڑھایا گیا ہوتا تو یہ

www.taemeernews.com

انجینیر ہوتیں۔ Fuse جوڑنے سے لے کر پنکھا ٹھیک کرنا اور flush ٹپک رہا ہے تو اس کو بھی ٹیپ سے جوڑنا یہ سب کام اماں کر لیتی تھیں۔

آ۔د: آپ نے بی۔اے میں کون کون سے سبجکٹ پڑھے ہیں؟

ب۔س: میرے پاس بی۔اے میں Philosophy، ہندی اور فارسی تھی۔

آ۔د: ہندی آپ نے Advance پڑھی؟

ب۔س: نہیں۔اردو Advance پڑھی تھی۔

مہ جبیں: اماں کی ہندی بہت اچھی ہے۔یہ ہندی کے پورے پورے ناول پڑھ لیتی ہیں۔

آ۔د: سرور صاحب ہندی زبان سے کس حد تک واقف تھے؟

ب۔س: بہت کم۔اوتھی صاحب سرور کے colleague تھے۔وہ باقاعدہ ہمارے یہاں آتے تھے۔سرور نے ان سے script پڑھی تھی۔ہمارے یہاں ہندی کا بھی ایک اخبار لیا جاتا تھا۔وہ اسے پڑھ لیتے تھے۔ہندی الفاظ بھی استعمال کرتے تھے۔

آ۔د: آپ کو پڑھنے میں دشواری ہوتی تھی تو سرور صاحب آپ کی مدد کرتے تھے؟

ب۔س: ہاں۔کرتے تھے۔کوئی چیز سمجھ میں نہیں آتی تھی تو سمجھاتے تھے۔

آ۔د: سرور صاحب آپ کا نام لیتے تھے یا بیگم کہتے تھے اور آپ انہیں کس نام سے پکارتی تھیں؟

ب۔س: وہ مجھے بیگم صاحبہ کہتے تھے اور میں انہیں سرور کہتی تھی۔

مہ جبیں: ابا نے آپ کو خط میں لکھ کر ایک نظم بھیجی تھی۔ کون سی تھی؟

ب۔س: جب ہم لکھنؤ میں تھے اور سرور علی گڑھ آ گئے تھے، اس وقت انہوں نے میرے اوپر ایک نظم کہی:

زندگی بے کیف سی ہے زاہدہ تیرے بغیر
لطف جینے میں نہیں کچھ بھی رہا تیرے بغیر
سامنے ہو تو، تو یہ دنیا بہار رنگ و بو
اور یہی دنیا ہے زندان بلا تیرے بغیر
سر جو اپنا زانوئے جاناں سے لذت یاب تھا
اب وبال دوش ہو کر رہ گیا تیرے بغیر
لوگ کہتے ہیں کہ کیوں کھوئے ہوئے رہتے ہو تم
کیا بتاؤں اپنی الفت کا پتہ تیرے بغیر

ا۔د: ہم نے سرور صاحب کی خودنوشت پڑھی تو اندازہ ہوا کہ وہ سیر و سفر کو بہت پسند کرتے تھے۔آپ ان کے ساتھ کہاں کہاں گئیں؟

ب۔س: میں تو ہر جگہ ساتھ تھی جہاں جہاں وہ گئے۔ کشمیر، مسوری، نینی تال، شملہ، بمبئی۔ راجندر سنگھ بیدی ان کے بہت اچھے دوست تھے۔ہم بمبئی میں ان کے یہاں ٹھہرے تھے۔اس کے علاوہ امریکہ، جرمنی، انگلینڈ، شکاگو، روم، اٹلی وغیرہ۔روم میں سرور کی جیب کٹ گئی تھی۔اٹلی میں چور بہت ہوتے ہیں۔بڑا دلچسپ قصہ ہے۔اتفاق سے وہاں ان کا ایک شاگرد نکل آیا۔جب ہم ٹرین میں بیٹھ رہے تھے تو اس نے کہا دیکھیے

www.taemeernews.com

سرور صاحب یہاں چوری بہت ہوتی ہے ہوشیار رہیے گا۔ بھلا یہ کہاں ماننے والے۔ ایک جگہ اپنا بٹوا کاؤنٹر پہ رکھ کے بھول آئے۔ کچھ اشرفیاں خریدی تھیں۔ وہ بھی پرس میں تھیں۔ ہم کافی پینے نیچے اترے۔ واپسی میں کسی نے پرس چرالیا۔ اب کس سے کہیں۔ سب صاف کردیا تھا۔

ا۔د: پھر کیا ہوا۔ بڑی مشکل ہوئی ہوگی۔

ب۔س: اتفاق سے میرے پاس کچھ پیسے تھے۔ ہم نے کہا جب آئے ہیں تو ضرور گھومیں گے۔ بہت اچھی جگہ ہے۔ ہمیں پیدل بھی بہت چلنا پڑا پیسے جو نہیں تھے۔ (قہقہہ) ....

انہیں پہاڑوں کا بہت شوق تھا۔

کتنی چیزیں ہیں جو وہ اب بھی دیکھنا چاہتے تھے۔ کشمیر وہ دوبارہ جانا چاہتے تھے۔ کہیں Sun-set کا دیکھنا چاہتے تھے تو کہیں Sun-rise کا۔ اس قسم کی خواہشات بہت زیادہ تھیں۔

ا۔د: سرور صاحب کافی دنوں تک کشمیر میں رہے۔ اقبال انسٹی ٹیوٹ میں کام کیا۔ کیا کشمیر جاکے وہ مطمئن تھے؟

ب۔س: کشمیر میں انہوں نے بہت کام کیا۔ وہاں علی میاں تھے۔ وامق جونپوری اسی زمانے میں واپس آچکے تھے۔ شام کو ادیبوں اور شاعروں کا مجمع ہوتا تھا لیکن طالب علموں کو پڑھنے کا زیادہ شوق نہیں تھا۔ اس سے سرور کو بڑی کوفت ہوتی تھی۔ ہم لوگ یونیورسٹی کیمپس میں رہتے تھے۔ اسی زمانے میں کشمیر میں پہلا بم پھٹا تھا۔ سرور کو خدا نے بچالیا۔ ان کے برابر والے کمرے میں بم پھٹا تھا۔ پوری دیوار منہدم ہوگئی تھی۔ پڑوسیوں سے ہمارے تعلقات بہت اچھے تھے۔ سب کو سرور کی فکر تھی۔ تھوڑی دیر بعد یہ واپس آئے۔ ان دنوں مشیر الحق، آفاق، جمال عبدالواحد، جاوید قدوس بھی وہیں تھے۔

آ۔د: سرور صاحب کس طرح کا لباس پہننا پسند کرتے تھے۔ اپنا لباس خود خریدتے تھے یا آپ خرید کرلاتی تھیں؟

ب۔س: شروع میں جب ہماری شادی ہوئی تو یہ سوٹ نہیں پہنتے تھے۔ چوڑی دار پاجامہ اور اچکن پہنتے تھے۔ سوٹ پہننا بعد میں شروع کیا۔ ان کو خود سے کوئی خاص رنگ یا کپڑے کا خیال نہیں تھا۔ ان کے اوپر نیلا رنگ بہت اچھا لگا کرتا تھا۔ سب لوگ ان کے لیے نیلی شرٹ بہت لاتے تھے۔ زیادہ تر کپڑے چھوٹا بیٹا جرمنی سے بھیجا کرتا تھا۔ ان کو خود کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ جب میں سفید کپڑے پہنتی تھی تو انہیں بہت برا لگتا تھا۔ زیادہ تر شوخ رنگ کے کپڑے لاتے تھے۔ وہ جہاں بھی جاتے تھے میرے لیے ساڑی ضرور لاتے تھے۔ ایک دفعہ میرے لیے ساڑیاں لائے۔ ایک ساڑی مجھ سے پوچھے بغیر رشید جہاں کو دے دی۔ میرا موڈ آف ہوگیا۔ میں نے کہا اب تمہاری

www.taemeernews.com

لائی ہوئی چیز کبھی نہیں پہنوں گی۔

مہ جبیں: اماں کو بیگ اور جوتوں کا بہت شوق تھا۔ ابا اکثر تحفے میں لایا کرتے تھے۔

آ۔ د: سرور صاحب کھانے میں کیا پسند کرتے تھے؟

ب۔س: انہیں کھچڑا، رساول، کریلے بہت پسند تھے اور ارہر کی دال بھی پسند تھی۔ گلا صاف رکھنے کو وہ چنے بہت کھاتے تھے۔ کھانے کے بعد کوئی نہ کوئی میٹھی چیز ضرور کھاتے تھے جسے وہ ''اوپر کی چیز'' کہتے تھے۔ وہ پائے بہت پسند کرتے تھے۔ ایک مرتبہ شہریار کو نہ جانے کیا سوجھی کہہ دیا سب سے۔ اب ہر جگہ سے پائے پک کے آرہے ہیں۔ کوئی دعوت کر رہا ہے، کوئی گھر بھیج رہا ہے۔ ہر جگہ پائے۔ مجھے پائے بالکل پسند نہیں تھے۔ سوال یہ ہے کہ اتنے پائے روز کون کھائے۔

آ۔ د: آپ بھی پکاتی تھیں گھر میں؟

ب۔س: نہیں۔ خانساماں پکاتا تھا۔ مجھے کچن کے کام سے الجھن ہوتی تھی۔ اب بھی ہوتی ہے۔ مجھے روٹی پکانا اب بھی نہیں آتا۔

مہ جبیں: اماں کو Potato mince بنانا آتا ہے بس۔ جب یہ لکھنؤ میں تھیں وہاں انہوں نے Baking کا کورس کیا تھا۔ انڈے کا حلوہ بہت عمدہ بناتی ہیں۔

آ۔ د: سرور صاحب بچوں میں دلچسپی لیتے تھے؟

ب۔س: بہت زیادہ۔ بچوں کو وہ کہانیاں سناتے تھے۔ ہر سطح پر اچھی اچھی باتیں بتاتے تھے۔ نظمیں یاد کرواتے تھے۔ خود بھی پڑھ کے سناتے تھے۔ ایک مرتبہ ملٹن کی Paradise Lost اپنی یادداشت سے پڑھ کے سنائی تھی اور مطلب بھی بتائے تھے۔ بچوں کے ساتھ کیرم کھیلتے تھے۔ ہنسی مذاق ہوتا تھا۔ تاش میں نے انہیں سکھا دیا تھا۔ بیت بازی بہت ہوتی تھی۔

مہ جبیں: ہم لوگوں کے بچپن میں دو ٹیمیں بنتی تھیں۔ ایک ٹیم میں اماں اور دوسری ٹیم میں ابا ہوتے تھے۔ اماں کے سب شعروں کو ابا القط کر دیتے تھے کیونکہ اماں کو شعر تو بہت یاد تھے لیکن وزن کا خیال نہیں کرتی تھیں اور ابا لاحول پڑھتے ہوئے نکل جاتے تھے! ہم لوگوں کے بچپن میں گڈے گڑیا اور راجا رانی کی کہانیوں کی بجائے ابا ہمیں غالب، اقبال اور میر کے قصے سناتے تھے۔ ہم لوگوں کو سالگرہ پر چھوٹی چھوٹی نظمیں لکھ کر دیتے تھے۔ ابا کو لفظوں سے بڑا عشق تھا۔ وہ کہتے تھے کہ ذرا سا بھی کہیں شک ہو تو فوراً ڈکشنری دیکھو۔ اس پر وہ بہت اصرار کرتے تھے۔ یہ بات اب ہم لوگ اپنے بچوں کو سکھاتے ہیں۔ ہم لوگوں کو بنانے میں ان کا بہت ہاتھ ہے۔

رخشندہ: وہ محض ہمارے نانا نہیں ہیں بلکہ انہوں نے ہماری زندگی کا سنگِ بنیاد ہی رکھا ہے۔ نہ صرف میرا بلکہ میرے بڑے بھائی اور دو چھوٹی بہنوں کا بھی۔ وہ ہماری زبان کی

www.taemeernews.com

اصلاح بھی کرتے تھے۔ جب ہم بہت
چھوٹے تھے تو دلی چلے گئے تھے۔ وہاں
زبان کا خیال نہیں رہتا تھا۔ایک مرتبہ میں
نے کہا فلاں نے بولا۔انہوں نے فوراً ٹوکا
'بولا' مت کہا کرو،فلاں نے کہا۔ انہوں
نے ہمیں بہت سے نئے الفاظ بھی سکھائے۔
اس طرح بہت صاف ستھری اردو ہمیں
ورثے میں ملی۔W.B.YEATS کی ایک نظم
کی آخری دولائنیں بہت پڑھا کرتے تھے:

The best lack all conviction.
And the best one full of passionate funny.

ب۔س: وہ بچوں کے ساتھ گھنٹوں باتیں کرتے رہتے
تھے۔اپنے نواسے،نواسیوں سے بھی بہت
محبت کرتے تھے۔انہیں اپنے ساتھ Walk
پر لے جاتے تھے۔ بچوں پر انہوں نے
ایک نظم لکھی ''تین فتنے'' جو چھپی بھی تھی۔
کچھ اس طرح تھی:

تین فتنوں کا ماجرا سنئے
قصہ دلچسپ ہے ذرا سنئے

آ۔د: وہ تین فتنے کون کون تھے؟

ب۔س: صدیق، مہ جبیں اور جاوید چھوٹا والا۔
اس کے بعد انہوں نے چار فتنے لکھے۔
یہ نواسی نواسے تھے:

نمبر ایک بڑا ہی نیک کھائے کیک پیے ملک شیک
نمبر دو کہے رو رو مجھے بھی دو مجھے بھی دو
نمبر تین بڑی مسکین ....
نمبر چار بڑی عیار بڑی مکار ہماری یار

عرفی کے لیے انہوں نے یہ شعر کہا تھا:

یوں تو بچے اور بھی ہیں لمبے اور چوکور بھی ہیں
عرفی کی کیا بات ہے لیکن عرفی کی کیا بات

جاوید کے لیے لکھا تھا:

جاوید مقاصد میں عطا ہو تجھے رفعت
رفعت وہ ستاروں کی جہاں آنکھ جھپک جائے

آ۔د: سرور صاحب نے کبھی چاہا کہ ان کا کوئی بچہ
اردو کو بطور سبجیکٹ اختیار کرے؟

ب۔س: اردو تو سب جانتے ہیں ہمارے یہاں۔
خود انہوں نے سکھائی اور trained کیا
لیکن ان کے ذہن میں یہ نہیں تھا کہ وہ خود
اردو میں ہیں تو ان کے بچے بھی اردو
پڑھیں۔ کسی پر دباؤ نہیں ڈالا۔اسی لیے
بڑے بیٹے نے انگلش اور چھوٹے بیٹے
نے Psychology پڑھی لیکن اردو سب کو
بہت اچھی آتی ہے۔

آ۔د: سرور صاحب کے دوستوں میں گھر کون کون
آتا تھا؟

ب۔س: رشید صاحب بہت آتے تھے۔ایک لطیفہ سنو۔
ہمارا بڑا بیٹا صدیق چھوٹا سا تھا۔سرور ایک
دفعہ کہیں باہر جانے لگے تو اس نے پوچھا
ابا کہاں جا رہے ہیں۔ یہ کچھ جھنجلائے
ہوئے تھے کہہ دیا جہنم میں۔ رشید صاحب
آئے اور صدیق سے پوچھا ابا کہاں گئے

www.taemeernews.com

ہیں۔ اس نے کہا ''جہنم'' میں۔! ان کے علاوہ چغتائی صاحب (فزکس والے)، مسعود حسین خاں اور بھی بہت سے لوگ آتے تھے۔ صبح لوگوں کی بھیڑ لگی رہتی تھی۔

احتشام صاحب جب بھی آتے تھے ہمارے یہاں ٹھہرتے تھے اور شعر سنانے کی فرمائش کرتے تھے۔ اختر الایمان بھی ہمارے یہاں قیام کرتے تھے۔ اور بہت سے لوگ آتے رہتے تھے اور ہمارے یہاں ٹھہرتے تھے۔ اس زمانے میں ترقی پسند تحریک سے وابستہ بھی لوگ ان کے دوست تھے۔

آ۔د: سرور صاحب کو بھی یہ احساس ہوتا تھا کہ ان کے دوست یا ان کے شاگرد ان کا زیادہ وقت لیتے ہیں اور انہیں پڑھنے لکھنے کا موقع نہیں مل پاتا ہے۔

ب۔س: میری دانست میں تو نہیں۔ اگر کوئی آجاتا تھا تو گھنٹوں ان سے باتوں میں مصروف رہتے تھے۔ انہیں وقت کا احساس بھی نہیں ہوتا تھا۔

آ۔د: سرور صاحب اپنے خاندان کے لوگوں سے کس طرح ملتے تھے۔ ان کی خوشی یا غم میں شریک ہوتے تھے؟

ب۔س: خاندان والوں سے وہ بڑی رواداری برتتے تھے۔ اکیلی میں کبھی نہیں رہی۔ کوئی نہ کوئی ساتھ میں ضرور رہتا تھا۔ ان کے خاندان کے لوگ مستقل میرے ساتھ رہے۔ شادی کے موقع پر ضرور شریک ہوتے تھے۔

آ۔د: سرور صاحب علی گڑھ میں بہت دنوں تک شعبۂ اردو میں رہے، ہیڈ بھی رہے۔ وہاں کے مسائل وہ آپ سے discuss کرتے تھے۔

ب۔س: ہمیشہ کرتے تھے۔ بغیر مشورے کے کوئی کام نہیں کرتے تھے۔ گھر میں .Ph.D کے تھیسس آتے تھے یا جو کتابیں آتی تھیں وہ پہلے میں پڑھتی تھی پھر انہیں اپنی رائے دیتی تھی۔

آ۔د: وہ لوگوں کا اچھا پہلو زیادہ دیکھتے تھے یا برا؟

ب۔س: اچھا۔ مجھے غصہ بہت آتا تھا اور بہت جلدی آجاتا تھا۔ ان کو غصہ بہت کم آتا تھا۔ مجھے آج تک یاد نہیں کہ سرور نے کبھی کسی کی برائی کی ہو۔

رخشندہ: وہ کبھی کسی کی برائی نہیں کرتے تھے۔ اگر اس شخص کی تعریف ممکن نہ ہو تو چپ ہو جاتے تھے۔

آ۔د: سرور صاحب optimist تھے یا pessimist؟

ب۔س: بہت زبردست optimist تھے۔ کبھی کبھی ہم لوگوں میں زبردست اختلاف ہو جاتا تھا۔ مثلاً ایک بار پاکستان سے عبدالحق صاحب کی جانب سے بڑا اچھا offer آیا۔ ہم نے کہا پاکستان جائیں گے۔ انہوں نے کہا:

مجھے ہر ناصح مشفق یہی تلقین کرتا ہے
کہ بزم غیر میں یوں رائیگاں رہنے سے کیا حاصل؟
گلوں کا کیا ہے وہ تو طاق نسیاں ہو ہی جائیں گے
شگوفوں کو اسیر ابتلا کرنے سے کیا حاصل

آ۔د: سرور صاحب کے پاس لوگوں کے بے شمار خط آتے ہوں گے۔ کیا وہ پابندی سے اس کا

www.taemeernews.com

جواب دیتے تھے؟

ب۔س: ہاں۔ خط کا جواب ضرور دیتے تھے۔ خواہ اسٹوڈنٹ ہو خواہ دوست واحباب، بچہ ہو یا کوئی unknown لیکن خط کا جواب ضرور دیتے تھے۔ پوسٹ کارڈ بہت لکھا جاتا تھا۔ پہلے پوسٹ کارڈ کا ہی رواج تھا۔

آ۔د: سرور صاحب کبھی ٹیلیویژن یا فلم وغیرہ دیکھتے تھے؟

ب۔س: سرور کو کوئی دلچسپی نہیں تھی لیکن مجھے فلم دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ اپنے دوستوں کے ساتھ چلی جاتی تھی۔

مہ جبیں: ممی بتا رہی تھیں کہ ایک بار کرنل زیدی (وائس چانسلر) کے ساتھ ممی اور کچھ لوگ ابا کو کھینچ تان کے لے گئے تھے۔ یہ دونوں وہاں بیٹھ کے یونی ورسٹی کی politics کی باتیں کرنے لگے۔ بیچ بیچ میں جب خیال آیا دیکھ لیا۔

آ۔د: ان کو موسیقی سے کچھ دلچسپی تھی؟ گانا سننے کا شوق تھا یا نہیں؟

ب۔س: موسیقی سے دلچسپی نہیں تھی۔ گانے نہیں سنتے تھے۔ آخر میں انہوں نے ایک ٹیپ ریکارڈر منگوا لیا تھا اور اپنے پاس رکھنے لگے تھے۔ کچھ cassettes بھی تھے اور خود بھی کبھی گنگنایا کرتے تھے۔

آ۔د: سنا ہے ڈپارٹمنٹ میں چائے، کافی وغیرہ بنائے جانے کا رواج خود سرور صاحب نے شروع کروایا۔

ب۔س: ہاں۔ ان کے زمانے میں میاں خاں تھے۔ پرانے چپراسی، بدایوں کے رہنے والے تھے انہوں نے شروع کیا۔ اس سے پہلے رواج نہیں تھا۔

آ۔د: دنیا کی سیاست میں دلچسپی رکھتے تھے؟

ب۔س: اخبار باقاعدہ پڑھتے تھے۔ دو اخبار انگریزی کے ہندو اور ہندوستان ٹائمز اور ایک ہندی کا اخبار لیا جاتا تھا۔ چائے کے بعد اخبار ضرور دیکھتے تھے۔ آخر میں ایک لڑکے کو رکھے ہوئے تھے جو اخبار پڑھ کر سناتا تھا۔ ریڈیو پر خبریں بہت سنتے تھے خصوصاً B.B.C. کی خبریں۔ رات کو بغیر نیوز سنے ہوئے نہیں سوتے تھے۔ جس دن فالج کا اثر ہوا بارہ بجے تک نیوز سننے کے بعد لیٹے تھے۔ تین چار بجے ہوں گے مجھے آواز دی۔ میں پاس گئی اور پوچھا کیا بات ہے۔ انہوں نے کہا مجھے Stroke ہوا ہے۔ زبان پر اثر نہیں ہوا تھا۔ وہ اپنی بیماری سے کبھی ہراساں اور خوفزدہ نہیں ہوتے تھے۔

آ۔د: انتقال سے دو مہینے پہلے میری ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ بالکل ہشاش بشاش تھے۔ "فکر ونظر" سے متعلق بہت سی باتیں کیں۔

آ۔د: سرور صاحب پر مذہب کا کتنا اثر تھا؟

ب۔س: مذہبی تھے۔ ان کا خاندان مولویوں کا تھا۔ داڑھی کبھی نہیں تھی لیکن دہریہ بھی نہیں رہے۔ مذہب کو کبھی انہوں نے اپنے اوپر سوار نہیں کیا۔ مذہبی تھے لیکن کٹر نہیں تھے۔

www.taemeernews.com

مہ جبیں: باواز بلند شعر تو پڑھتے تھے لیکن باواز بلند قرآن شریف مجھے یاد نہیں میں نے سنا ہو البتہ آخری رات تلاوت کی تھی۔ ہم لوگ یاد کرتے ہیں تو حیرانی ہوتی ہے۔

آ۔د: سرور صاحب بحیثیت شاعر کبھی مشاعرے وغیرہ میں جاتے تھے اور اپنا کلام پڑھتے تھے؟

ب۔س: مشاعرے میں جاتے تھے مگر اپنا کلام نہیں پڑھتے تھے۔ ایک آدھ جگہ پڑھا ہوگا۔ صدارت کرتے تھے تو پڑھتے تھے۔ سنا ہے لکھنؤ میں پڑھا تھا۔ لال قلعہ میں بہادر شاہ ظفر پر ''دلّی کی آخری شمع'' organise کیا تھا تو اس میں پڑھا تھا۔ علی گڑھ میں ۲۶ رجنوری اور ۱۵ راگست کا مشاعرہ ہوتا تھا تو اس میں پڑھتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ شاید ۲۶ رجنوری اور ۱۵ راگست کا مشاعرہ سرور صاحب نے ہی شروع کروایا تھا۔ اس سے پہلے نہیں ہوتا تھا۔

آ۔د: ایک زمانہ وہ تھا علی گڑھ کا جب سرور صاحب نے یہاں اپنے کیریر کا آغاز کیا تھا اور ایک زمانہ اب ہے علی گڑھ کا۔ وہ کچھ فرق محسوس کرتے تھے، کبھی آپ سے اس کا ذکر کرتے تھے؟

ب۔س: بہت کرتے تھے۔ کہتے تھے values کا فرق ہوگیا ہے۔ لوگوں کے برتاؤ میں فرق آگیا ہے۔ زبان سے لے کر رکھ رکھاؤ، ہر چیز، اخلاق سب بدل گئے۔ یہ تمام باتیں ان کو بہت ناگوار معلوم ہوتی تھیں۔

آ۔د: سرور صاحب کا بہت سا کلام ابھی غیر مطبوعہ ہے اس کے بارے میں آپ نے کوئی منصوبہ بنایا ہے؟

مہ جبیں: ابا کے غیر مطبوعہ کلام کی پوری فائل تیار ہے جس کا نام ہم نے ''لفظ'' رکھا ہے۔ یہ تقریباً ڈیڑھ سو صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ ابا کی Auto biography کا ایک حصہ میں نے انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔ خاص طور سے وہ حصہ جو ذرا Personal ہے۔ وہ ساہتیہ اکیڈمی میں Auto-biography نمبر میں چھپا ہے۔ کچھ حصہ Annual Urdu Studies کے لیے بھیج رہی ہوں۔

☆☆☆

www.taemeernews.com

کبیر احمد جائسی*

سرور بنام جائسی

[پروفیسر کبیر احمد جائسی فارسی کے ممتاز عالموں میں سے ہیں جنھوں نے تاجیکی اور فارسی پر قابل ذکر کام کیا ہے۔ پروفیسر جائسی کا پروفیسر آل احمد سرور سے تعلق خاصا قریبی اور خاصے طویل عرصہ پر محیط رہا ہے۔ علی گڑھ میں انجمن ترقی اردو ہند کے اخبار 'ہماری زبان' سے لے کر سری نگر میں اقبال انسٹی ٹیوٹ کی ملازمت تک اور اس کے بعد زندگی کے آخری دنوں میں بھی ان کا پروفیسر سرور سے تعلق رہا۔ پروفیسر سرور کے یہ خطوط تعلق خاطر کے اسی طویل عرصہ کی یادگار ہیں۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ پروفیسر سرور کے یہ خطوط تفصیلی حواشی کے ساتھ مرتب کیے جاتے لیکن وقت کی تنگی کے باعث پروفیسر جائسی نے ہماری درخواست پر یہ خطوط بغیر کسی تعارف یا حواشی کے ہمیں عنایت فرمادیے۔ ان نوازش ہاے پیدا و پنہاں کے لیے پروفیسر جائسی کے ہم تہ دل سے شکر گزار ہیں]

ادارہ

شملہ

۱۳/اپریل (۱۹۷۶ء)

مائی ڈیر کبیر جائسی۔

آپ کا ۲/اپریل کا خط علی گڑھ ہوتا ہوا، چند دن ہوئے مجھے شملے میں ملا۔ مبارکباد کا شکریہ، اس بات سے خوشی ہے کہ موجودہ جانب داری اور گروہ بندی کے دور میں مجھ جیسے ''آزاد مرد'' کی بری بھلی خدمات کا اعتراف ہوا۔ یہاں مارچ اور اپریل کے پہلے ہفتے میں سخت سردی، بارش اور اولوں کا سلسلہ رہا۔ اب موسم معتدل ہو سکا ہے۔ صحت کی خرابی کی وجہ سے سیمنار میں شرکت نہ کر سکا اس کا افسوس ہے۔ یہ کون صاحب تھے جنھوں نے میری بات کو توڑ مروڑ کر پیش کیا ہے۔ جہاں تک یاد آتا ہے علی گڑھ میں فکشن پر سیمنار میں کسی نے کہا تھا کہ قرۃ العین نے Herman Hesse کے ناول Sidharta سے سرقہ کیا ہے میں نے اس پر ایلیٹ کا قول دہرایا تھا کہ بڑے فنکار دوسروں سے صرف استفادہ ہی نہیں کرتے بعض اوقات ڈاکہ بھی ڈالتے ہیں مگر یہ ڈاکہ ایک نیا تخلیقی کارنامہ ہوتا ہے گویا میں نے قرۃ العین کی تعریف میں یہ بات کہی

---

*پروفیسر و سابق ڈائرکٹر انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، علی گڑھ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

www.taemeernews.com

تھی۔ اگر اس کو قرۃ العین پر اعتراض سمجھا جائے تو سوائے اس کے کہ اُن حضرت کی نیت اور عقل اور سخن فہمی پر ماتم کروں اور کیا کرسکتا ہوں۔ آپ کی کتاب کی چونکہ میں نے اکیڈمی کے انعام کے لئے سفارش کی تھی اس لئے اب تک ریویو نہ لکھ سکا۔ اب لکھوں گا۔ خیریت اور کوائف سے باخبر رکھیے۔

مخلص

آل احمد سرور

شملہ

۳ ستمبر ۷۶ء

عزیزم کبیر جائسی

ابھی خط ملا۔ میں آپ کی کتاب پر ریویو علی گڑھ سے ہی بھیج دیتا مگر مجھے ۱۸ اگست کو ایک تار ملا کہ یہاں میری فوری ضرورت ہے۔ آیا تو کتاب ساتھ لانا بھول گیا۔ اب دس ستمبر کو دہلی میں ہوں گا اور گیارہ بارہ کو علی گڑھ میں۔ کتاب ساتھ لاؤں گا اور پندرہ ستمبر تک آپ کو ریویو بھیج دوں گا۔

آپ نے اپنی جو حالیہ داستان لکھی ہے اسے پڑھ کر تعجب ہوا۔ آپ کے مضمون میں جو باتیں لکھی گئی ہیں ان کی بنا پر آپ پر یہ الزام لگانا کہ یوسف صاحب کی کتاب آپ کے مضمون سے ماخوذ ہے بالکل بے جا بات ہے۔ مقامات اقبال اس وقت ذہن میں نہیں ہے اسے بھی دیکھوں گا۔ آپ جب ایک دفعہ یوسف صاحب سے مل چکے تو اب آپ کو کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔ اگر انھوں نے آپ کی بات نہیں سنی تو یہ بات انصاف سے بعید تھی اور اُن سے اس کی توقع نہ تھی۔ خیر آپ نے اپنا اخلاقی فرض ادا کر دیا۔ میرے خیال میں تو اس کی وجہ سے آپ کو پریشان نہ ہونا چاہیے۔ یار لوگوں نے اپنی عادت کے مطابق حاشیہ آرائی اور الزام تراشی کی ہے۔ اگر کسی وقت موقع ملے تو ڈاکٹر مسعود حسین خاں سے بات کر لیجے لیکن میرے خیال میں ابھی نہیں۔ بلکہ اگر کسی اور سلسلے میں اس کی بات بھی ہو جائے تو بہتر ہے۔

بہر حال میرا ریویو اب آپ کو پندرہ ستمبر کے بعد ضرور مل جائے گا۔

آپ اپنا کام کرتے رہیے۔

میں اچھی طرح ہوں۔

مخلص

آل احمد سرور

سری نگر

۳۔ اکتوبر ۷۷ء

جائسی صاحب مکرم

آپ کا ۲۶ ستمبر کا خط ملا۔ آپ سے شرمندگی ہے کہ اس سے پہلے آپ کو نہ لکھ سکا۔ آپ نے ادبیات تاجکستان کا جو نسخہ بھیجا تھا وہ مجھے مل گیا تھا اور میں نے علی گڑھ ہی میں اس پر ایک نظر ڈالی تھی۔ چونکہ رسید نہیں بھیج سکا اس لیے آپ کو قدرتاً فکر رہی ہوگی میرے خیال میں اس سرسری کتاب کے ترجمے میں آپ نے اپنی صلاحیت ناحق صرف کی۔ آپ تو فارسی ادب پر گہری نظر رکھتے ہیں اور آپ کی تنقیدی صلاحیت بھی مسلّم ہے اس لیے آئندہ ایسی کتابوں کے ترجمے کے بجائے اپنے غائر مطالعے کی بنیاد پر کوئی تنقیدی کام ہاتھ میں لیجیے اس کے یہ معنی نہیں کہ آپ نے ترجمہ اچھا نہیں کیا وہ تو بڑا

www.taemeernews.com

بے ساختہ اور رواں ہے۔

مجھے یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ آپ جامعہ میں مستقل ہو گئے۔ چلیئے اس طرف سے تو اطمینان ہوا۔ اب آپ اپنے علمی کاموں کو باقاعدہ ایک منصوبے کے تحت جاری رکھیے۔ جی تو چاہتا تھا کہ کچھ عرصے کے لئے آپ کو اپنے پاس بلا لیتا مگر ابھی وسائل نہیں ہیں۔ ابھی تک انجمن سے میرے پاس اردو گھر کے افتتاح کی کوئی اطلاع نہیں آئی۔ آخر اکتوبر سے دہلی میں ایک اقبال سیمنار بھی ہے اس میں شرکت کا ارادہ ہے اگر شریک ہوا تو پھر اردو گھر کے افتتاح میں بھی شرکت کا امکان ہے۔ اپنی خیریت اور کوائف سے ضرور باخبر رکھیے۔ میں آپ کی صلاحیت اور خلوص دونوں کی بڑی قدر کرتا ہوں۔ امید ہے بخیریت ہوں گے۔

مخلص

آل احمد سرور

سری نگر

۱۸ر جولائی ۱۹۸۶ء

جاتسی صاحب

کل آپ کا خط ملا۔ ''ہماری موجودہ تعلیمی صورت حال'' آپ شوق سے تہذیب الاخلاق میں قسط وار چھاپ دیں، مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ اچھا ہے ایک وسیع حلقے میں یہ پہنچ سکے گا۔

تہذیب الاخلاق کا پہلا شمارہ نئے دور کا دیکھا۔ ابھی تو کچھ زیادہ فرق نہیں معلوم ہوتا۔ میرے نزدیک حسب ذیل عنوانات پر ہر شمارے میں مضمون ہونا چاہیے۔

۱۔ سرسید کا کوئی مضمون کسی اہم مسئلے پر
۲۔ تعلیم خصوصاً یونیورسٹی کی سطح پر تعلیم سے متعلق
۳۔ نئی تعلیمی پالیسی کے کسی پہلو پر
۴۔ سائنس پر کسی اہم دریافت کے سلسلے میں
۵۔ مسلمانوں کی خدمات سائنس میں
۶۔ تہذیبی صورت حال
۷۔ ادبی صورت حال
۸۔ اصلاح رسوم
۹۔ کسی تعلیمی یا سائنسی یا تہذیبی یا مذہبی موضوع پر اہم کتاب پر سیر حاصل تبصرہ
۱۰۔ یونیورسٹی کے کسی شعبے کا اہم کام
۱۱۔ علمی کوائف

شاعری، ناول، افسانے وغیرہ کی بالکل ضرورت نہیں ہے۔ یہ تہذیب الاخلاق کے دائرے سے خارج ہیں۔

آپ کے کام کے سلسلے میں عابد کو پھر بھیجا ہے۔ اگر کام نہ ہوا تو خود بات کروں گا۔ شاید اگست میں علی گڑھ کا پھیرا ہو۔

تہذیب الاخلاق میں کسی اہم لکچر کا خلاصہ بھی دیا جا سکتا ہے جو یونیورسٹی میں کسی مقامی یا بیرونی عالم نے دیا ہو۔ آپ ان تجاویز پر غور کیجیے۔

مخلص

آل احمد سرور

www.taemeernews.com

استاذ مکرم السلام علیکم

ضیاے حیات پر آپ نے جو تبصرہ تحریر فرمایا ہے اس کو پڑھ کر کم از کم مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ آپ کی ایک وقتی رائے تھی جو امین زبیری کی بطل پرستی کا رد عمل تھی۔ یہ بات صرف اس لیے لکھ رہا ہوں کہ اگر مجھے علی یاور جنگ کی لائف پر تبصرہ لکھنا ہو تو میں وہی سب کچھ، اُسی انداز و نقطۂ نظر سے لکھوں گا جو آپ نے ضیاے حیات کے تبصرہ میں اختیار فرمایا ہے۔

سال سوا سال پہلے رشید صاحب نے ضیاء الدین مرحوم پر ایک مقالہ سپرد قلم فرمایا تھا جس کو پڑھ کر مجھے بڑی مسرت ہوئی اور میں نے اس مقالے سے یہ سبق سیکھا کہ جب ان اشخاص پر قلم اٹھانا ہو جن سے شخصی یا نظریاتی اختلاف ہو تو کس طرح قلم اٹھانا چاہیے (سرور صاحب نے قلم اٹھانا ہو سے لے کر جملے کے آخری لفظ تک کے نیچے خط کھینچ کر تحریر فرمایا "رشید صاحب کو ضیاء الدین صاحب سے اختلاف نہیں تھا۔ صرف ایک زمانے میں کچھ ناچاقی رہی") رشید صاحب کا مذکورہ مقالہ ان کے "مرشد" (جو ضیاء الدین مرحوم کے سب سے بڑے حریف مانے جاتے تھے) کے انتقال کے بعد لکھا گیا ہے اس لیے اس میں وہ بڑی حد تک لاتعلق ہو کر اپنے خیالات پیش کر سکے ہیں ....

کبیر احمد جائسی

۱۶-۳-۷۳

آپ کے اکتوبر کے پرچے کے لیے سر سید پر مضمون لکھنے کے متعلق غور کروں گا۔ ادھر مصروفیت کچھ زیادہ ہی ہے۔[1]

۱۔ ضیاے حیات پر تبصرہ میں میں نے جو کچھ لکھا تھا وہ آج بھی میرے نزدیک صحیح ہے۔ یہ میری وقتی نہیں سوچی سمجھی رائے ہے، جو برسوں کے مطالعے اور تجربے کا نتیجہ ہے۔ آج لکھتا تو شاید کچھ الفاظ میں تبدیلی ہوتی مگر بات وہی ہوتی۔

۲۔ رشید صاحب کے اُس مقالے سے جو سال سوا سال پہلے فکر و نظر میں شائع ہوا، میں متفق نہیں ہوں۔ رشید صاحب ذاکر صاحب کے دوست ضرور ہیں مگر ذاکر صاحب کے افکار و نظریات سے قطعی متاثر نہیں۔ یہ ملحوظ رکھنا چاہیے کہ رشید صاحب بہت عرصے تک ڈاکٹر ضیاء الدین سے قریب رہے، اُس زمانے میں اُن کی ذاکر صاحب سے دوستی بھی رہی مگر یہ ایک ذاتی بات تھی۔

آپ چاہیں تو کسی وقت اس سلسلے میں بات کر سکتے ہیں۔

آل احمد سرور

۱۶-۳-۷۳

سری نگر

۳۰/اکتوبر ۱۹۸۶

جائسی صاحب تسلیم

آپ کے دو خطوں کا جواب نہ دے سکا۔ معذرت خواہ ہوں۔ ادھر تہذیب الاخلاق کا تازہ شمارہ ملا۔ آپ نے خدا جانے کہاں سے میرا مضمون

---

[1] سرور صاحب نے یہ نوٹ میرے مندرجہ بالا خط کے حاشیہ پر تحریر کر کے مجھ کو واپس بھجوایا تھا۔

www.taemeernews.com

مرتب کرلیا۔ اچھا انتخاب رہا۔ پرچہ مجموعی طور پر بہتر نظر آیا۔ مطبوعات آپ کو ملی ہوں گی۔ میں نے دفتر میں تاکید کردی تھی۔ ادھر ایک دن کے لیے علی گڑھ گیا تھا۔ CASR کی ایک میٹنگ میں، عظیم صاحب کے اصرار پر۔ افسوس ہے کہ آپ سے نہ مل سکا۔ رات کو نو بجے فراغت ہوئی اور صبح ہی واپس ہو گیا۔ خیر اب تو میں شروع دسمبر میں آ ہی رہا ہوں۔ یہاں اب سردی شروع ہوگئی ہے۔ رات کو 3 ڈگری ٹمپریچر ہوتا ہے۔ اب انسٹی ٹیوٹ نسیم باغ جانے والا ہے وہاں سات کمرے مل گئے ہیں۔ گھر سے ذرا دور تو ہوگا مگر کشادگی زیادہ ہوگی۔

بیگم آپ کو اور بچوں کو دعا کہتی ہیں اپنی خیریت سے باخبر رکھیے۔ میری کوتاہ قلمی پر آزردہ نہ ہوجیے۔ شکر ہے کہ اب علی گڑھ میں حالات ٹھیک معلوم ہوتے ہیں۔

مخلص

آل احمد سرور

☆☆☆

www.taemeernews.com

امیر زہرا حسین*

سرور صاحب یاد آتے ہیں

یہ ۱۹۷۰ء کے اوائل کا زمانہ تھا۔ سرور صاحب کے مشورے سے میں نے اردو میں ایم۔ اے کے لیے داخلہ لیا۔ کلاس زیادہ بڑی نہ تھی۔ بارہ یا تیرہ طالب علم رہے ہوں گے۔ لڑکیاں زیادہ تھیں۔ ہم آرام سے ان چھوٹے چھوٹے کمروں میں بیٹھ جاتے جہاں استادوں کے نام کی تختیاں لگیں تھیں۔ جذبی صاحب کلاسیکی شاعری، خلیل الرحمن اعظمی جدید ادب، قاضی عبدالستار صاحب افسانہ اور مسعود حسین خاں صاحب لسانیات پڑھاتے تھے۔ اسی زمانے میں شکاگو سے سرور صاحب نے پروفیسر نعیم کو بھی اپنے شعبے میں بلا لیا تھا۔ تنقید خود سرور صاحب پڑھاتے۔ ان کا کمرہ سب سے مختلف تھا یوں بھی وہ صدر شعبہ کا کمرہ تھا۔ سرور صاحب اس وقت صدر شعبہ تھے۔ کلاس شروع ہونے سے پہلے کوئی نہ کوئی ان کے پاس ہوتا۔ کوئی شاعر، کوئی ادیب، کوئی مہمان یا پھر انتظامیہ سے متعلق کوئی فرد۔ گھنٹی بجتے ہی سب اٹھ جاتے۔ سرور صاحب اپنے لکچر کے لیے پورے تیار نظر آتے، سوائے چند سیکنڈ کے جس میں وہ اپنا خوبصورت پان چھالیہ کا بٹوہ نکالتے۔ تھوڑا سا منہ میں ڈالتے اور پھر سلیقے سے بند کر کے واپس رکھ دیتے۔ گویا اب ان کا تخیل ادب کے میدان کا ایسا شہسوار ہے جسے وہ جہاں چاہتے موڑ دیتے۔ تسلسل میں یا موضوع کی دلچسپی میں کہیں کمی نہ آتی۔ بالکل خاموشی اور سناٹا۔ کہاں گھنٹہ گذر گیا پتہ ہی نہیں لگتا۔ اب سوچتی ہوں کہ ہم اتنے خاموش کیسے بیٹھے رہتے نہ کوئی سوال اور نہ کوئی وسوسہ۔ کہیں تبادلۂ خیالات (interaction) نہ ہوتا۔ دراصل یہ ان کی شخصیت کا جادو تھا جو سب کو مسحور رکھتا۔ ان کے ذہن کے ساتھ ساتھ سفر کرنے لگتا۔ وہ کسی بھی ازم یا نظریے کے نہ تھے۔ ادب کی روایت کے پاس دار اور امکانات کو پہچانتے۔ اقبال کو برابر حوالے میں پیش کرتے۔ مثلاً

ہے رنگ لالہ و گل نسرین جدا جدا
ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیے

جہاں جہاں حسن، انسانیت، رواداری، اعتدال پسندی اور روشن خیالی ملی وہ مزاج کا حصہ

83,Rushgroue Ave London NW9 6RG, London, U.K*

www.taemeernews.com

بن گئی۔ خود لکھتے ہیں:

> ''خواجہ منظورؔ صاحب کے فیض سے ادب میں قدروں کا احساس ہوا۔ رشید صاحب سے ہمدردی اور ادبی بصیرت ملی، اور ذاکر صاحب سے زندگی کو بامعنی اور روشن خیالی کو عام کرنے کا جذبہ ملا۔ ذاکر صاحب سے مل کر مجھے زندگی، تعلیم، تہذیب، مشرق، مغرب، علم و ادب کے اسرار و رموز کا علم ہوا''۔

سرورؔ صاحب کی ادبی بصیرت خالص مشرقی ہے وہ آلڈس ہکسلے، سمرسٹ مام، آرنلڈ، ایلیٹ کو اپنے لکچروں میں برابر پیش کرتے۔ یوں بھی ان کا مغربی ادب بلکہ عالمی ادب کا مطالعہ بڑا وسیع تھا۔ مگر پس منظر اپنی سرزمین ہوتی وہ اپنی اردو شاعری میں غالبؔ اور انیسؔ کو عالمی شاعری کی صف میں کھڑا کرتے ہوئے مولانا ابوالکلام آزاد کے ہم نوا نظر آتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

> '' ہمارا ادبی سرمایہ ہمالیہ کے ہندوستان کی طرح ہے جس میں غالبؔ ایورسٹ کی چوٹی کی طرح ہیں مگر جس میں کنچن چنگا، کے ٹو، ننگا پربت، نندا دیوی، ترشول کی جگہ، انیسؔ، میرؔ، سوداؔ، نظیرؔ، اقبالؔ اس کے مینار ہیں۔ سرسبز وادیاں ہیں۔ تند دریا ہیں۔ برف پوش پہاڑوں کے دامن میں نیلا آنچل پھیلائے جھیلیں ہیں۔ ہنستے، کھلکھلاتے تختے ہیں۔ کالی بھیانک مگر پُرکشش جلال رکھنے والی چٹانیں ہیں، غرض ہزار شیوۂ حسن اور ہزار داستانِ عشق''۔

سرورؔ صاحب کا جمالیاتی ذوق جب تنقید پر قلم اٹھاتا ہے تمام علوم سے فیض اٹھا کر پھر اپنی قدروں کی طرف واپس لوٹ آتا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

> ''ہماری تنقید نے بلاشبہ اس بیس سال میں خاصا قدم آگے بڑھایا لیکن اسے ابھی ایسا جمالیاتی نظریہ مرتب کرنا ہے جس میں ایک طرف روایت کا احساس ہو، دوسری طرف حسن کاری کے نئے آداب کے سمجھنے کی گنجائش۔ جس میں نثر اور نظم کے بنیادی فرق کو ملحوظ رکھا جائے اور دونوں کے حسن کے ساتھ انصاف ہو سکے اور جس میں شاعری کے نئے احساس کی ترجمانی اور نثر کے نئے شعور کی عکاسی کے لیے اصول موجود ہوں۔ اس جمالیاتی نظریے کے لیے ادب کو محض فنِ لطیف سمجھنا کافی نہ ہوگا۔ یہ نظریہ انتخابی ہوگا، اس کی ہندوستانیت مشرقی مزاج کا سہارا لے کر علیحدگی پسندی کی طرف نہ لے جائے گی اور اسے انسان دوستی کی قدریں دے گی۔ یہ ادب کی خاطر تعلیم، تہذیب، سماجیات، نفسیات سب کی وادیوں سے گذرے گی مگر ان میں بھٹکتے رہنے کے بجائے اپنے مرکز کی طرف واپس آئے اور بقول

www.taemeernews.com

ایلیٹ فن اور فن پاروں کی توضیح کے
ذریعے سے ذوق سلیم کی اشاعت کر کے
صنعتی دور میں انسانیت کی قدروں کا علم
بلند رکھے گی۔''

آج جب سارے نظریے اور حوالے بکھر چکے ہیں اور آپس میں مل کر گڈمڈ ہو گئے ہیں۔ کہاں مادیت پرستی اور کہاں مارکسیت۔ جمال پرست حسن اور آرٹ نے نئے زاویے تلاش کر لیے ہیں۔ فرینکفرٹ اسکول (Frankfurt School) کے ماننے والوں کی طرح جن کی زندگی پر آسائشوں کا بوجھ ہے اس کی یکسانیت اور بے رنگی سے گھبرا کر آرٹ کے نئے تجربوں میں پناہ لیتے ہیں۔ ان کا تجربہ کتنا بھی اہم اور منفرد کیوں نہ ہو وہ جزوی ہے، آفاقی نہیں بن سکتا۔

سرور صاحب کی تنقید اور ان کی شخصیت کے شش جہت کینوس پر تو شمس الرحمٰن فاروقی صاحب لکھیں گے، شہریار صاحب لکھیں گے، اور ابوالکلام قاسمی لکھیں گے۔ میں نے تو ان کی شخصیت کی ایک کرن کو پکڑنے کی کوشش کی ہے۔ جس میں ایک والہانہ پن ہے۔ فطرت سے عشق ہے انسان اور انسان دوستی کی ایک لگن ہے۔ اپنے دوست خوشونت سنگھ کا ذکر کرتے ہوئے سرور صاحب نے لکھا ہے:

''خوشونت سنگھ نے لکھا کہ تم زندگی
کو ذرا زیادہ سنجیدگی سے لیتے ہو۔ میں تو
پھولوں سے، اچھی صورتوں سے اور
اچھی شراب سے دل بہلاتا ہوں۔ ذاکر
صاحب نے کہا تھا کہ ناسازگار حالات
کے تین مجرب نسخے ہیں۔ ایک تصوف،
دوسرا شراب، تیسرا کام۔'' میں نے تیسرا
نسخہ آزمایا ہے۔ مزاجی اعتبار سے لبرل
مگر اس سوشلزم کا قائل ہوں جو انسانی
چہرہ رکھتا ہے۔ مجھے انتہا پسندی کے دور
میں لبرل ازم کی میانہ روی کہہ کر مطعون
کیا جاتا ہے سماجی انصاف کی ضرورت کو
محسوس کرنے کے باوجود میں کیونزم کو
اس کی تاریخی مادیت کے فلسفے کی وجہ سے
قبول نہ کر سکا۔ مگر میں کیونسٹ مخالف بھی
نہیں رہا۔''

ایجاب وقبول کی ایک کیفیت میں مجھے سرور صاحب کی شخصیت کا وہ درویشانہ پہلو زیادہ متاثر کرتا ہے جو باہر کا نظارہ کرتا ہے، جس سے کبھی خوش ہوتا ہے کبھی اس میں کھو جاتا ہے اور کبھی اداس ہو جاتا ہے۔ لکھتے ہیں:

''پہاڑوں سے مجھے شروع سے
عشق رہا۔ میرے لیے پہاڑوں میں
زیادہ کشش ہے۔ مجھے ان کی آغوش
میں سکون ملتا ہے۔ برف پوش چوٹیوں
کا نظارہ روح کو پرواز پر مائل کر
دیتا ہے۔ چٹانوں میں سے ہو کر تیز
اور پر شور موجوں کا سکڑنا، سمٹنا،
پھیلنا اور آگے بڑھنا وجد میں لاتا ہے۔
اگر ندی پر شور نہیں بلکہ ایک شیریں نغمے
کے ساتھ ساتھ ترل ترل بہہ رہی ہو تو
ورڈز ورتھ کا یہ مصرع یاد آتا ہے:

www.taemeernews.com

"Beauty born of murmuring sound" دیودار کے جھنڈ کہہ رہے ہیں کہ ہماری طرح تم بھی آسمان سے باتیں کرو، دریا کے کنارے دور تک خودرو پھول رنگ اور خوشبو پھیلاتے ہیں یہ نظارے دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ جسم اور روح دونوں نے غسل کیا ہے، ذہن سے سارا رنگ دور ہوجاتا ہے۔ پہلگاؤں، چندن واڑی، شیش ناگ، گلمرگ، کھلن مرگ، سونا مرگ میری روح میں آج بھی بسے ہیں۔''

اگر یہاں پر ایلیٹ کی ڈائری سے ایک اقتباس پیش کروں تو ایسا بے محل نہ ہوگا۔ رچمنڈ ہل اور رچمنڈ پارک کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

''روشن دن ہے، ابھی خزاں ہی ہے، جاڑا شروع نہیں ہوا، ابھی ہم پارک میں چہل قدمی کرکے لوٹے ہیں درختوں اور ان کے پتوں نے رنگ بکھیر دیئے ہیں، اوک کے درخت زرد رنگ کی پتیوں سے ڈھکے ہوئے ہیں جس نے سونا بکھیر دیا ہے، رچمنڈ ہل نے سب کو ڈھانک لیا ہے۔ جیسے سارے منظر پر زرد رنگ کی نقاب پڑی ہوئی ہے۔ چلتے چلتے جب پارک کے آخری کونے پر پہنچے تو دور سے اوک کے درختوں کے پیچھے سے ڈوبتے سورج نے منظر کو لال بنا دیا ہے۔ خزاں کی عجب کیفیت ہے۔ ہری گھاس کے اوپر سوکھی جھڑی ہوئی لال پتیاں مجھے بہت عزیز ہیں۔''

سرور صاحب نے اپنے نام و نسب کے حوالے سے لکھا ہے:

''ذکر اللہ صاحب سید آل احمد مارہروی کے خلیفہ تھے۔ انہوں نے میرے پردادا احسان اللہ شاہ کو خلافت عطا کی۔ میرا نام آل احمد انہیں بزرگ کے نام پر رکھا گیا۔''

کون جانے اس نام کے پیچھے ایک صوفی چھپا ہو جس کا اوڑھنا بچھونا ادب ہو۔ پان، اچھی چائے اور ٹھنڈا پانی ان کا عیش ہو۔ برسات میں شام کی شفق نظر میں رنگ بھر دے۔ اچھا فقرہ، اچھا شعر وجد کی کیفیت پیدا کردے۔ پہاڑ، برف پوش وادیاں، چمکتا سورج، جھرنے اور آبشار روح کو جلا بخشتے ہیں۔ لندن میں بلومسبری سکوائر (Bloomsbury Sqr) سے گزرتے ہوئے ہیمپڈ میں کیٹس کی رہائش گاہ پر جاتے ہوئے کینووڈ (Kenwood) پارک میں بیلوں اور پھولوں سے ڈھکی ڈاکٹر جانسن کے نام کی خالی بینچ کو دیکھ کر سرور صاحب بہت یاد آتے ہیں اور خیال آتا ہے کہ کوئی گوشہ، کوئی کرسی اور کوئی بینچ سرور صاحب کے نام پر بھی ہو۔

☆☆☆

www.taemeernews.com

سید احتشام احمد ندوی*

مجلس نور و سرور

پروفیسر آل احمد سرور کی ایک مجلس کا ذکر جس میں کئی علمی مسائل زیر بحث آئے۔ اس دن سرور صاحب بہت خوش تھے اور محفل بڑی پرنور تھی جس کا اندازہ اس روداد سے ہوگا جس کو راقم الحروف نے بعد میں قلم بند کر لیا تھا۔

۹ ستمبر ۱۹۹۲ء، آج میں پروفیسر آل احمد سرور کی خدمت میں حاضر ہوا۔ دروازہ گھر کا کھلا تھا۔ بیگم سرور صاحبہ نے اشارہ سے اندر بلا لیا۔ دیکھا تو پروفیسر سرور صاحب اور پروفیسر گیان چند جین تشریف فرما ہیں۔ آج سرور صاحب نہایت مسرور اور دلشاد تھے۔ بڑے عمدہ انداز سے فرمایا کہ آپ کو میں نے پہچانا نہیں۔ میں نے عرض کیا احتشام ندوی، فرمایا کہ داڑھی کب رکھ لی۔ پھر میرے پاس آکر بیٹھ گئے۔ فرمایا کہ برا نہ مانیے گا رنگین کا ایک شعر ہے۔ اشارہ آپ کی داڑھی کی طرف نہیں ہے بلکہ سخن گسترانہ بات ہے۔ رنگین ریختی لکھتا ہے۔ وہ عورتوں کی زبان میں لکھتا ہے مگر اس کی زبان فن کارانہ اور تعبیر پر قدرت کی ترجمان ہوتی ہے۔ پھر رنگین کا یہ شعر پڑھا جو صحیح یاد نہ رہ گیا پر اس کا دوسرا مصرعہ ہے:

منڈا داڑھی۔ میں باز آئی خدا کے نور سے

سرور صاحب نے فرمایا کہ دس برس میں کشمیر میں رہا۔ میں نے عرض کیا کہ کشمیری زبان پر کیا فارسی کے اثرات پڑے ہیں؟ اور اردو سے اس کا تعلق کتنا ہے؟ فرمایا کہ کشمیری تو ہندو مسلم سب کی زبان ہے۔ وادی میں صرف پانچ فیصدی ہندو تھے (اصل دو فیصدی تھے اور اب وہ بھی وادی چھوڑ چکے ہیں) فرمایا کہ کشمیری زبان شاردا خط میں لکھی جاتی تھی جس پر سنسکرت کے اثرات تھے۔ اس صوبہ پر شیوا نظریہ کے اثرات تھے۔ کشمیری پنڈت اب بھی شاردا رسم الخط میں کشمیری لکھتے ہیں۔ جب مسلمان آئے تو انہوں نے فارسی رسم الخط اختیار کیا۔ انہوں نے زبان پر اثرات ڈالے۔ کشمیری داردک کی شاخ ہے۔ مگر ڈوگری زبان پنجابی کی شاخ ہے۔ وہ جموں میں رائج ہے۔ جموں میں ایک چھوٹا سا علاقہ ایسا ہے جہاں وادی کے لوگ آکر بس گئے ہیں۔ وہاں کشمیری

* پروفیسر و سابق صدر شعبۂ عربی، کالی کٹ یونیورسٹی، نیو سرسید نگر، علی گڑھ۔

www.taemeernews.com

بولی جاتی ہے۔ فرمایا! کشمیر کے لوگ عبداللہ کا تلفظ اپنے انداز سے کرتے ہیں جو ہمارے تلفظ سے مختلف ہوتا ہے۔

فرمایا کہ اردو کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ کھڑی بولی سے نکلی اور وہ نواحِ دہلی کی زبان ہے۔ یہ گیان چند صاحب موجود ہیں بتا سکتے ہیں مگر میرا خیال ہے کہ اردو روہیل کھنڈ سے نکلی۔ ہنس کر فرمایا میں بھی روہیل کھنڈ (بدایوں) کا رہنے والا ہوں اور گیان چند صاحب بجنور (قصبہ سیوہارہ) کے باشندے ہیں۔

فرمایا کہ مجھ کو پروفیسر احتشام حسین میموریل لکچر دینے کے لیے بلایا گیا۔ الہ آباد یونیورسٹی میں میں نے اکبر الہ آبادی پر تین لکچر دیے۔ میں نے یہ ثابت کیا کہ اکبر نے ہماری زبان کو وسعت دی ہے اور اس کو انگریزی الفاظ سے بھر دیا ہے۔ پھر اکبر کے چند اشعار پڑھ کر سنائے۔ فرمایا کہ ان تینوں لکچروں کے عنوانات مختلف ہیں۔ ان میں ہماری تہذیب کا سرمایہ ہے۔ زبان کی وسعت ہے اور شاعری کی عظمت پوشیدہ ہے۔ خود اقبال نے اکبر سے کسب فیض کیا ہے۔ اکبر ۱۸۴۵ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۲۰ء میں انتقال کیا (کتابوں میں ۱۸۴۶ء اور ۱۹۲۱ء درج ہے)۔ فرمایا کہ اقبال کو جو کچھ بلندی اور عظمت حاصل ہوئی وہ مغربی مصنفین کے مطالعہ سے حاصل ہوئی۔ انہوں نے مغرب سے بہت کچھ سیکھا۔ اقبال کی عظمت ان کے خیالات اور مربوط فلسفیانہ تصورات سے مستعار ہے جو انہوں نے اپنی نظموں میں پیش کیے ہیں۔ غالب کے یہاں بھی فلسفہ ہے مگر مربوط نہیں ہے۔ غالب فلسفیانہ خیالات اشعار میں منفرد انداز سے پیش کرتے ہیں۔ مگر اقبال کا فلسفہ منظم و مرتب ہے۔ اقبال کی عظمت مسلّم ہے مگر یہ عظمت ان کے پیام اسلام یا ان کے قرآن کی ترجمانی کے باعث نہیں۔ قرآن بے شک ان کے فلسفہ کا محور ہے مگر ان کی عظمت اس فنی بلندی کے باعث ہے جو وہ پیش کرتے ہیں۔ ان کے یہاں فن اعلیٰ مرتبہ اختیار کر لیتا ہے۔ موضوع جو بھی اختیار کریں مگر فن و تخیل اعلیٰ مرتبہ کو پہنچ جاتا ہے۔ فرمایا کہ اقبال کی سب سے عمدہ نظم 'ساقی نامہ' ہے۔ پھر اس کے تین اشعار پڑھ کر سنائے۔ فرمایا کہ 'ساقی نامہ' میں انہوں نے بعض ترکیبیں اکبر سے لی ہیں۔ 'ساقی نامہ' کی شان اس کی روانی ہے۔ یہ کیفیت 'مسجد قرطبہ' میں بھی نہیں۔ بے شک 'مسجد قرطبہ' ایک اعلیٰ درجہ کی نظم ہے مگر 'ساقی نامہ' کی سرشاری اس میں موجود نہیں۔ اس تبصرہ کو سن کر پروفیسر گیان چند نے فرمایا کہ میں اس رائے سے متفق نہیں، 'ساقی نامہ' سے بہتر نظم 'مسجد قرطبہ' ہے۔ سرور صاحب نے فرمایا کہ 'مسجد قرطبہ' کی عظمت تسلیم مگر 'ساقی نامہ' کا مزاج کچھ اور ہے۔

فرمایا کہ اردو مرثیہ صحیح معنی میں مرثیہ نہیں ہے۔ اس کا انداز 'رزم نامہ' کا ہے۔ مولانا شبلی نے 'موازنہ انیس و دبیر' میں انیس کی عظمت ظاہر کی مگر آج کل کسی شاعر کا دوسرے شعراء سے مقابلہ کا رجحان پیدا ہو گیا ہے۔ کوئی انیس کو شیکسپیر قرار دیتا ہے اور کوئی کچھ اور مگر اصلاً ان کا اپنا رنگ ہے۔

سرور صاحب نے کہا کہ لکھنؤ یونیورسٹی میں فارسی اور اردو کے دونوں شعبہ ایک میں تھے۔ پروفیسر مسعود حسن صاحب رضوی صدر شعبہ تھے مگر اردو کا سارا کام میرے ذمہ تھا۔ ایک سال کوئی

www.taemeernews.com

طالب علم نہ آیا تو وائس چانسلر کو بڑی فکر ہوئی۔ آزادی سے قبل ایک چوتھائی طلبہ اردو میں غیر مسلم ہوا کرتے تھے۔ اتفاق سے ایک مسلم لڑکی نے اپلائی کیا کسی دوسرے سبجیکٹ میں، مگر وائس چانسلر نے اس سے کہا کہ تم اردو لے لو اور جاکر سرور صاحب سے ملو۔ اس لڑکی کا معاملہ یہ تھا کہ لیٹ آئی تھی اور قانون کے لحاظ سے وائس چانسلر اپنے خصوصی اختیار سے داخلہ دے سکتے تھے۔ وائس چانسلر نے یہ شرط رکھی کہ اگر تم اردو میں داخلہ لو تو میں تم کو داخلہ دے دوں گا۔ وہ لڑکی میرے پاس آئی اور بولی کہ اگر آپ فرسٹ کلاس دینے کا وعدہ کریں تو میں داخلہ لے لوں گی۔ میں نے کہا کہ ہرگز نہیں میں یہ سودے بازی نہیں کر سکتا خواہ شعبہ بند ہو جائے۔ میں نے اس معاملہ میں سختی برتی اور وہ لڑکی چلی گئی۔

سرور صاحب نے فرمایا کہ میں بہار کی ایک یونی ورسٹی میں اکسپرٹ بن کر گیا۔ سامنے بیٹھے ہوئے دو آفیسر صاحبان سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ آپ حضرات کا تعلق بہار سے تو نہیں، دونوں نے نفی میں جواب دیا۔ پھر فرمایا کہ بہار میں اکسپرٹ کو رشوت دی جاتی ہے۔ اب سے کافی دنوں قبل پروفیسر شپ کی رشوت ۲۰ ہزار تھی۔ چنانچہ پروفیسر خلیق الرحمٰن جو بہار کے گورنر تھے اور یہاں مسلم یونیورسٹی میں میرے ساتھی رہ چکے تھے میں ان سے ملا تو مذاق میں بولے کہ ۲۰ ہزار تو آپ کو پیش کیے گئے ہوں گے۔ سرور صاحب بولے مجھے تو کچھ بھی پیش نہیں کیا گیا۔

سرور صاحب نے فرمایا کہ مسلم یونیورسٹی میں پروفیسر کی ایک جگہ تھی، اس کے لیے دو امیدوار منتخب ہوئے۔ ایک صاحب نمبر اول تھے اور دوسرے کو نمبر دو پر رکھا گیا۔ نمبر اول کے بارے میں ۷۔۸ خط آ گئے کہ وہ شخص قابل اطمینان نہیں سیرت کے لحاظ سے۔ سرور صاحب نے کرنل زیدی وائس چانسلر صاحب سے جاکر کہا کہ جس کالج میں وہ حضرت کام کرتے ہیں اس کے پرنسپل کو لکھ کر اس شخص کے بارے میں معلومات حاصل کر لی جائیں۔ پرنسپل کا خط آیا کہ اس شخص کے اوپر کرپشن کے کئی مقدمے چل رہے ہیں۔ اب مشکل یہ آن پڑی کہ سلکشن کمیٹی کی سفارش کو مجلس منتظمہ (.E.C) بدل نہیں سکتی۔ لہٰذا اس سفارش پر مجلس منتظمہ نے اپنے ریمارک کے ساتھ وزیٹر کو بھیج دیا جو صدر جمہوریہ ہوتا ہے۔ اس نے ریمارک کو منظور کر لیا۔

اب سرور صاحب پھر کشمیر کی طرف لوٹے۔ فرمایا کہ قالین بنانا کشمیریوں نے ایران سے سیکھا ہے، یہ ان کو وراثت میں ملا ہے۔ انھوں نے قالین بافی کے فن کو آزادی کے بعد زیادہ توجہ سے ترقی دی ہے مگر اس کا اثر کشمیر کے مسلمانوں پر برا پڑتا ہے۔ اس لیے کہ وہاں طلبا پرائمری اسکول سے تعلیم چھوڑ کر قالین بننے لگتے ہیں اور کارخانوں میں نوکری کر لیتے ہیں۔ فرمایا کہ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ قالین بننے کے لیے انگلیاں نرم اور چھوٹی ہونی چاہییں اور کمسن لڑکوں کی انگلیاں اس کام کے لیے موزوں ہوتی ہیں۔ لہٰذا والدین ان کو اس کام پر لگا دیتے ہیں اور وہ پیسے کمانے لگتے ہیں مگر تعلیم کی قیمت پر۔ سرور صاحب نے فرمایا کہ پرائمری اور سکنڈری تعلیم تو ہر شخص پر لازم کر دینی چاہیے۔ مگر اعلیٰ تعلیم کی طرف

www.taemeernews.com

صاحب صلاحیت طلبہ کو جانا چاہیئے۔ اس لیے کہ بغیر پرائمری اور ثانوی تعلیم کے انسان جاہل رہ جاتا ہے۔ فرمایا کہ میں نے شیخ محمد عبداللہ صاحب سے شکایت کی تو انہوں نے کہا کہ دیکھیے اس پیشے سے مسلمانوں کے پاس پیسہ تو آرہا ہے۔ سرور صاحب نے فرمایا کہ مگر اس وادیٔ کشمیر میں پنڈت اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلاتا ہے اور ان کے بچوں میں درمیان میں تعلیم منقطع کرنے کی نسبت (drop out) صفر ہے۔ سب اپنے بچوں کو تعلیم دلاتے ہیں مگر مسلمانوں کی اکثریت اپنے بچوں کو اسکول سے چھڑا لیتی ہے۔

سرور صاحب نے فرمایا کہ ایک فٹ قالین میں ایک ہزار گرہیں لگتی ہیں۔

اب موضوع بدلا۔ فرمایا کہ میں شکاگو یونیورسٹی میں چھ ماہ وزٹنگ پروفیسر رہا۔ پھر ان کے یہاں کے طرز تعلیم پر روشنی ڈالی اور فرمایا کہ میں نے لسانیات کی بعض کلاسز میں تجربے کے لیے شرکت کی۔ خود سرور صاحب نے اردو ادب پر لکچر زدیے۔ اس طرح یہ محفل نور و سرور اختتام کو پہونچی۔

www.taemeernews.com

محمد ضیاء الدین انصاری*

آثارِ آل احمد سرور

عظیم دانشور، مفکر، عالم، نقاد اور اردو کے صاحب طرز ادیب پروفیسر آل احمد سرور ۹ر فروری ۲۰۰۲ء کو ہمیشہ کے لیے ہم سے جدا ہو گئے۔ وہ موجودہ عہد کے اردو نقادوں اور ادیبوں کے سلسلہ کی سب سے مضبوط اور آخری کڑی تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کے اُٹھ جانے سے اردو ادب کو نا قابل تلافی نقصان پہنچا ہے۔ ان کا حلقۂ احباب بہت وسیع تھا۔ وہ بڑے وسیع القلب، کشادہ ذہن اور مرنجان مرنج انسان تھے۔ ان کے معتقدوں اور دوستوں، جن میں ہر مسلک اور ہر قوم و مذہب کے لوگ شامل تھے، کے لیے ان کی باغ و بہار شخصیت ایک آفتاب تازہ کے مانند تھی۔ اور بقول خود۔

ستارے کتنے یہاں ڈوبتے ابھرتے ہیں
کبھی کبھی ہی نکلتا ہے آفتاب کوئی

واقعی وہ ایسا ہی آفتاب تھے، جو صدیوں میں طلوع ہوتا ہے۔ میر تقی میر کے الفاظ میں ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ۔

مت سہل ہمیں جانو، پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

سرور صاحب نے علم و ادب کی خدمت کو اپنا فرض اولین قرار دیا، اور آخر وقت تک اسی مشن کی تکمیل میں مصروف رہے۔ ابتدا میں انہوں نے شاعری کی طرف زیادہ توجہ کی۔ ۱۹۳۵ء میں ان کا پہلا مجموعۂ کلام 'سلسبیل' شائع ہوا۔ اس پر سہ ماہی 'اردو' اورنگ آباد میں تبصرہ شائع ہوا جس کا لہجہ کافی سخت تھا۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ تبصرہ مولوی عبدالحق کا تحریر کردہ تھا۔ مگر بعد میں معلوم ہوا کہ اصلاً اسے اختر حسین رائے پوری نے لکھا تھا اور مولوی صاحب نے تبصرہ نگار کا نام ظاہر کیے بغیر اسے شائع کر دیا تھا۔ یہ بات راقم کو خود سرور صاحب نے بتائی تھی۔ لیکن سرور صاحب کا اصل میدان شاعری نہیں، تنقید تھا۔ اسی لیے تنقید کی جانب انہوں نے زیادہ توجہ کی اور اپنی بہترین صلاحیتوں کو صرف کیا اور اگرچہ شاعری کی طرف بھی ان کا میلان جاری رہا اور بعد میں دو مزید مجموعۂ کلام 'ذوقِ جنوں' (۱۹۵۵ء)

* ڈائرکٹر، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ۔

www.taemeernews.com

اور 'خواب اور خلش' (۱۹۹۱ء) میں شائع بھی ہوئے، لیکن وہ شاعر کی حیثیت سے کبھی پہچانے نہیں گئے؛ بلکہ ایک بلند پایہ ناقد اور ایک صاحب اسلوب ادیب کی حیثیت سے مشہور ہوئے۔

سرور صاحب صف اول کے نقادوں میں تھے۔ یوں تو انہوں نے کوئی مستقل تصنیف اس فن میں بطور یادگار نہیں چھوڑی جس سے ان کے نظریات کا اندازہ کیا جا سکتا اور تنقیدی دبستان کا تعین کیا جا سکتا تاہم ان کی قدر و قیمت متعین کرنے کے لیے ان کے تنقیدی مضامین ہی کافی ہیں جن کی تعداد سیکڑوں تک پہنچتی ہے۔ ان میں مختلف اصناف اور ان سے متعلق شخصیات بھی شامل ہیں، مختلف ادبی تحریکات اور مشرق و مغرب کے ادبی اور عصری رجحانات بھی شامل ہیں۔ اگر ہم ان تمام مضامین کا زمانی ترتیب سے مطالعہ کریں تو ہمیں اس کثرت میں وحدت نظر آئے گی، ایک مربوط اور منظم تنقیدی شعور دکھائی دے گا اور ان کے تنقیدی نظریات اور افکار کا تدریجی ارتقا بھی نظر آئے گا۔ انہوں نے اپنا منفرد اور جداگانہ نظام انتقاد قایم کیا جس کا سلسلہ بڑی حد تک مولوی عبدالحق کے وسیلہ سے مولانا حالی تک پہنچتا ہے۔ وہ 'مقدمہ شعر و شاعری' سے بہت زیادہ متاثر تھے۔ لیکن اس کے باوجود انہوں نے 'مقدمہ' کو حرف آخر نہیں سمجھا بلکہ دیگر مکاتب فکر سے بھی حسب ضرورت استفادہ کیا، اور نظری تنقید کے ساتھ علمی تنقید کی بھی بہترین مثالیں پیش کیں۔ ان کی فکر میں ایک نظم، ربط اور سلیقہ ہے۔ اسی لیے ان کی بعض تنقیدی تحریریں سائنٹفک تنقید کے زمرے میں بھی آجاتی ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ بنیادی طور پر وہ سائنس کے طالب علم تھے۔ انہوں نے سینٹ جانس کالج آگرہ سے بی۔ ایس۔ سی کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا تھا۔ اس کے بعد وہ ادب کی طرف مائل ہوئے اور پہلے انگریزی میں (۱۹۳۴ء) اور پھر اردو ادبیات میں ایم۔ اے کیا (۱۹۳۶ء) اور دونوں امتحانوں میں امتیاز حاصل کیا۔ اس طرح ان کا ذہن سائنس اور ادب دونوں کا حسین امتزاج بن گیا تھا۔ ان کا طرز استدلال بڑا سائنٹفک ہے انگریزی ادب کے وسیلہ سے انہیں مغربی ادبیات، عصری رجحانات اور جدید ترین تنقیدی میلانات سے واقفیت ہوئی جس سے اپنی تحریروں میں انہوں نے بھرپور فائدہ اٹھایا۔

سرور صاحب ابتدا ہی سے اردو تحریک سے وابستہ رہے۔ اسی لیے قاضی عبدالغفار کے انتقال کے بعد ۱۹۵۶ء میں مولانا ابوالکلام آزاد کے ایما پر انہیں انجمن ترقی اردو (ہند) کا جنرل سکریٹری مقرر کیا گیا۔ اسی حیثیت سے وہ انجمن کے ترجمان ہفت روزہ ہماری زبان کے ایڈیٹر بھی بنائے گئے۔ اور مارچ ۱۹۷۴ء تک اس حیثیت سے کام کرتے رہے۔ اس اٹھارہ سال کے عرصہ میں انہوں نے ہماری زبان کے ذریعہ اردو تحریک کو بہت آگے بڑھایا، اسے ملک کے طول و عرض میں پھیلایا اور صحافت کا اعلیٰ معیار قایم کیا۔ اس زمانے کے حالات اور ادبی تحریکات سے متعلق ان کے اداریے بڑے پُرمغز اور جاندار ہوتے تھے۔ ان کے علاوہ عصری مسائل سے متعلق بھی سرور صاحب کی تحریریں ان کی

www.taemeernews.com

دانشوری اور بصیرت کا بہترین نمونہ پیش کرتی ہیں۔

سرور صاحب ۱۹۵۰ء میں انجمن ترقی اردو کے سہ ماہی رسالہ 'اردو ادب' کے بھی ایڈیٹر مقرر ہوئے اور ۱۹۷۴ء تک یہ اہم فریضہ انجام دیتے رہے۔ در اصل ۱۹۷۴ء میں سرور صاحب کی سکریٹری شپ کی میعاد ختم ہوگئی۔ اس کے ساتھ ان کی 'ہماری زبان' اور 'اردو ادب' کی ایڈیٹر شپ بھی ختم ہوئی۔ سرور صاحب نے 'اردو ادب' کو معیار کی جس بلندی پر پہنچایا اس کی نظیر معاصر رسالوں میں نہیں ملتی۔ آپ نے اس کے کئی خصوصی شمارے بھی شائع کیے ان میں مولانا آزاد نمبر، نہرو نمبر، غالب نمبر، ڈاکٹر تارا چند نمبر، مہاتما گاندھی نمبر اور سید ین نمبر خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ ان میں سے ہر ایک شمارہ انتہائی اہم اور اپنی نظیر آپ ہے۔

سرور صاحب نے بہت سی کتابوں پر تبصرے بھی کیے۔ لیکن ان کا اندازہ یہاں بھی منفرد اور جداگانہ تھا۔ وہ سرسری اور روایتی قسم کے تبصرے کرنے کے روادار نہیں تھے۔ ان کے بیشتر تبصرے انتہائی جامع اور مبسوط ہوتے تھے۔ ان کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے زیر تبصرہ ہر کتاب اور ہر رسالہ کو بالاستیعاب پڑھا ہے اور اس کے ایک ایک لفظ پر غور کیا ہے۔ وہ تبصرہ میں کتاب کے ہر پہلو پر اظہار خیال کرتے ہیں اور غیر جانبدارانہ اور معروضی انداز میں اس کے محاسن اور معایب دونوں کو واضح کر دیتے ہیں۔ ان میں بصیرت بھی ہوتی ہے اور آگہی بھی۔ انہوں نے فن تبصرہ نگاری کو ایک واضح شکل عطا کی۔ یہ ان کا قابل قدر کارنامہ ہے۔

سرور صاحب اب اس دنیا سے رخصت ہو گئے اور کبھی واپس نہیں آئیں گے لیکن ان کی یاد ہمارے دلوں میں ہمیشہ رہے گی۔ قدم قدم پر ان کی کمی محسوس ہوگی۔ ایسے میں ان کے خیالات ہماری رہنمائی کریں گے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم ان کی تحریروں کا عمیق مطالعہ کریں۔ لیکن اس میں دِقت یہ ہے کہ ان کی تحریریں یک جا نہیں ہیں۔ مختلف کتابوں، رسالوں، اخباروں وغیرہ میں منتشر ہیں۔ انہیں ایک سلسلہ میں پرونا ہوگا۔ اس کے لیے سب سے پہلی ضرورت ہے کہ ان تمام تحریروں کی ایک تفصیلی فہرست تیار کی جائے اور اس میں اس بات کی نشان دہی بھی کر دی جائے کہ کون سی تحریر کہاں کہاں دستیاب ہے، اور کس کس کتاب، رسالہ یا اخبار میں شائع ہوئی ہے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ سرور صاحب کی شخصیت اور فن سے متعلق اب تک جو کچھ لکھا گیا ہے، اس کی بھی نشان دہی کر دی جائے۔ اس سے مطالعات سرور کے مزید امکانات روشن ہوں گے۔ اسی خیال کے پیش نظر یہ کتابیات ترتیب دی گئی ہے۔ لیکن یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ یہ کتابیات ہر لحاظ سے مکمل اور کافی و شافی ہے۔ اس نوعیت کے کام مکمل ہو بھی نہیں سکتے۔ اصلاً یہ ریزہ چینی کا کام ہے جس میں ژرف نگاہی، دقت نظر اور باریک بینی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس میں کام کرنے والے کے صبر کا امتحان بھی ہوتا ہے جس میں شاید ہی کوئی پورا اترتا ہو۔ موجودہ زمانہ میں برصغیر کے باہر یورپ، امریکہ اور مسلم ممالک میں اردو جاننے والوں کی بہت بڑی

www.taemeernews.com

تعداد موجود ہے۔اس میں سرور صاحب کے احباب، تلامذہ اور معتقدین بھی شامل ہیں ۔ ان حضرات نے سرور صاحب کی وفات کا ماتم کس انداز سے کیا، ان پر کیا لکھا اور اسے کہاں شائع کرایا، اس کا علم ہمیں بہت کم ہے۔ان سب کے بارے میں معلومات حاصل کرنا، جوئے شیر لانے سے کم نہیں ۔ لہٰذا ان کے سلسلہ میں ہمیں جو مواد دستیاب ہو سکا، اس پر ہم نے اکتفا کیا اور اسے اس کتابیات کی زینت بنایا۔ اس طرح گویا ایک بنیاد فراہم کردی جس پر دیگر حضرات اپنے اپنے وسائل کے مطابق عمارتیں کھڑی کر سکتے ہیں۔

اس کتابیات کی ترتیب میں مجھے خدا بخش لائبریری کے کارکنوں کا تعاون حاصل رہا۔اس کے لئے میں ان کا شکر گزار ہوں ۔ میں خصوصی طور پر ممنون ہوں ڈاکٹر محمد ذاکر حسین صاحب، لائبریری اسسٹنٹ کا، جنھوں نے مواد کی فراہمی میں میری بہت مدد کی ۔سید انور علی صاحب نے بڑی محنت سے مسودے کو کمپیوٹر پر کئی بار کمپوز کیا، ان کا شکریہ ادا کرنا بھی میرے اخلاقی فرائض میں شامل ہے۔

میں انتہائی ممنون و متشکر ہوں پروفیسر آزرمیدخت صفوی صاحبہ، صدر شعبۂ فارسی اور مدیر اعزازی سہ ماہی 'فکر و نظر' علی گڑھ کا جنھوں نے میری اس حقیر سی کاوش کو ادارۂ 'فکر و نظر' سے شائع ہونے والے سرور نمبر میں شامل کیا۔

ا۔ اداریے

(i)۔ **اداریے** [اداریوں کا مجموعہ]

ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۹۹ء، ۲۵۶ص

انجمن ترقی اردو (ہند) کے ترجمان 'ہماری زبان' کے اردو تحریک سے متعلق سرور صاحب کے اداریوں کا انتخاب جن کی مجموعی تعداد ۷۶ ہے۔

مندرجات:

۱۔ اردو تحریک ایک ذاتی جائزہ
۲۔ ادیب اور آزادی
۳۔ ادبی مسائل۔ قومی وحدت
۴۔ زبان کے معاملے میں ہوش مندی کی ضرورت
۵۔ سہ لسانی فارمولا اور اردو
۶۔ مرکزی زبان کے سلسلہ میں کشمکش
۷۔ علاقائی زبان میں اعلیٰ تعلیم اور اردو
۸۔ بھارتی بھاشا سمیتی اور دوسرا جلسہ
۹۔ اردو دوستوں سے خطاب
۱۰۔ بنیادی مسائل پر پہلے توجہ کیجیے
۱۱۔ کیا اردو کا مسئلہ محض سیاسی ہے؟
۱۲۔ اتر پردیش میں اردو کے لیے کیا ہو؟
۱۳۔ اتر پردیش میں اردو
۱۴۔ اتر پردیش کے اردو دوستوں سے
۱۵۔ اردو خط و کتابت کورس
۱۶۔ ہندی دوستوں سے ایک سوال
۱۷۔ سرکاری زبان بل پر یہ ہنگامے کیوں؟
۱۸۔ ایک تلخ حقیقت

www.taemeernews.com

۱۹۔ خطاطی کی ترتیب
۲۰۔ شری جے پرکاش نرائن اور اردو
۲۱۔ کیا ہم اپنا رسم خط بدل دیں؟
۲۲۔ سرکاری زبان کا مطالبہ کیوں ہو رہا ہے؟
۲۳۔ اردو میں ابتدائی اور ثانوی تعلیم کے مسائل
۲۴۔ رہرو تشنہ لب نہ گھبرانا
۲۵۔ اردو کالجوں کا قیام
۲۶۔ سرکاری زبان یا علاقائی زبان
۲۷۔ اردو میں ابتدائی تعلیم اور ثانوی تعلیم پر توجہ سب سے ضروری ہے
۲۸۔ ہندوستانی زبانوں میں اعلیٰ تعلیم
۲۹۔ جن سنگھ اور اردو
۳۰۔ کیا اتر پردیش میں اردو کو واقعی سہولتیں ملتی ہیں؟
۳۱۔ بے محنت پیہم کوئی جوہر نہیں کھلتا
۳۲۔ تخلیق، تنقید، تعبیر
۳۳۔ تخلیق، تحقیق، تنقید
۳۴۔ نثر اور نظم کی زبان
۳۵۔ ترجمے کا فن
۳۶۔ کتابیں جو زندہ ہیں
۳۷۔ سماج اور زبان
۳۸۔ تہذیب، تفریح اور تلقین
۳۹۔ اردو شاعری اور وطنیت
۴۰۔ کیا اردو مشکل ہوتی جا رہی ہے
۴۱۔ کچھ بنیادی باتیں
۴۲۔ ترقی اردو بورڈ
۴۳۔ رسم خط میں تبدیلی کا سوال کیوں؟
۴۴۔ یونیورسٹی کے معیار کے مطابق اردو میں علمی کتابوں کی تیاری کا مسئلہ
۴۵۔ اردو اور مسلمان
۴۶۔ ونوبا بھاوے اور اردو رسم خط
۴۷۔ ہندوستان کے اردو شاعروں سے
۴۸۔ اردو کی بقاء اور ترقی کے لئے ضروری کام
۴۹۔ اتر پردیش میں اردو کے ذریعہ ثانوی تعلیم
۵۰۔ انگریزی اور ہندوستانی زبانیں
۵۱۔ کچھ اردو رسم خط کے بارے میں
۵۲۔ مشاعرے اور فلم
۵۳۔ انگریزی، ہندی، اردو
۵۴۔ علاقائی زبانوں سے رشتہ مضبوط کیجیے
۵۵۔ نیپال اور اردو
۵۶۔ ایسی بلندی — ایسی پستی
۵۷۔ سائنسی انقلاب کا ادب پر اثر
۵۸۔ ہمارے اخبار اور رسالے
۵۹۔ اردو اور مسلمان
۶۰۔ ہمارے مشاعرے
۶۱۔ رسم خط کا مسئلہ
۶۲۔ کیا ہندوستانی زبانوں کے لیے رسم خط ضروری ہے
۶۳۔ قومی وحدت اور اردو
۶۴۔ سمپورنا نند جی اور اردو
۶۵۔ اردو کا علاقہ کہاں ہے؟
۶۶۔ شری لیش پال اور اردو
۶۷۔ ہندوستان میں اردو کا مستقبل
۶۸۔ نئی زندگی اور پرانی شاعری
۶۹۔ اردو میں انگریزی الفاظ
۷۰۔ عام فہم زبان لکھیے

www.taemeernews.com

۷۱۔ کیا ہم اپنا رسم خط بدل دیں
۷۲۔ ہماری شاعری
۷۳۔ اردو ایک مستقل زبان ہے
۷۴۔ اردو کے شاعروں اور ادیبوں سے
۷۵۔ ہمارے مشاعرے
۷۶۔ اردو دوستوں کے تین بنیادی کام

(ii) افکار کے دیے

ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ ۲۰۰۰ء، ۲۱۵ ص
(ہماری زبان کے اداریوں اور چند دیگر مضامین کا انتخاب)

مندرجات:

پیش لفظ
افکار کے دیے جلاتے رہو
ہم کدھر جا رہے ہیں؟
ہمارا ادب کدھر جا رہا ہے؟
قومی وحدت کا مسئلہ
قومی ضرورت کیا ہے؟
ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیے
جذباتی آہنگی کیسے ہو؟
ذہن کا دریچہ کھلا رہے
چوٹی کی بات
لال قلعہ میں
صحت مند نظریہ کیا ہے؟
ہمیں ہر چیز سے مطلب ہے
عروج آدم خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
ساہتیہ اکاڈمی کا سمینار
ہر چیز کی قیمت ادا کیجیے
جنگ آزادی یا غدر
تقریروں کا مرض
کچھ اپنے متعلق
ہندوستان میں رائے عامہ
اٹھے کبھی گھبرا کے تو میخانے کو ہو آئے
نقصاں نہیں جنوں سے جو سودا کرے کوئی
جوہر طبیعتوں کے دکھانے کا وقت ہے
سادگی سے کیوں چڑتے ہو
عقیدہ اور عمل
عصری میلانات اور وقتی کارنامے
فوری حل اور دور رس پروگرام
دونوں پر نظر ضروری ہے
کچھ بنیادی حقائق
تعمیری نقطۂ نظر اور احتجاجی نقطۂ نظر
یہ کیسی جمہوریت ہے
یوم جمہوریت
الکشن اور اردو
دل پھر طواف کوئے ملامت کو جائے ہے
اپنے کو دوسروں کی مدد سے بچاؤ
ٹیگور کی یاد میں
پیر مغاں کی یاد میں
اقبال کی یاد میں
گورکی کی یاد میں
پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا (سرسید کی یاد میں)
میر ولایت حسین کی آپ بیتی
اقبال اور ہم

www.taemeernews.com

غالب، اردو اور ہندوستان
ڈاکٹر ذاکر حسین کی ادبی خدمات
اردو کے صاحب طرز نثر نگار
(رشید احمد صدیقی)
ابھی اس راہ سے کوئی گیا

امریکہ۔ چند تاثرات
میں نے امریکہ کو کیسا پایا
امریکہ کا نظام
امریکہ میں اردو
شکاگو یونی ورسٹی

۲۔ اقبالیات

(i) 'اقبال اور اردو نظم'۔ اقبال انسٹی ٹیوٹ، کشمیر یونیورسٹی، سری نگر، ۱۹۸۶ء، ۱۲۰ص
اقبال انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام 'اقبال اور اردو نظم' کے موضوع پر اپریل ۱۹۸۴ء میں منعقد سمینار میں پیش کیے گئے مقالات کا مجموعہ:

مندرجات:

۱۔ پیش لفظ	آل احمد سرور

(ii) اقبال اور تصوف۔ اقبال انسٹی ٹیوٹ، کشمیر یونیورسٹی، سری نگر، ۱۹۸۰ء، ۲۵۵ص
اقبال انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام 'اقبال اور تصوف' کے موضوع پر اکتوبر ۱۹۷۷ء میں منعقد سمینار میں پیش کیے گئے مقالات کا مجموعہ:

مندرجات:

۱۔ پیش لفظ	آل احمد سرور
۲۔ اردو شاعری میں تصوف کی روایت	آل احمد سرور

(iii) اقبال اور مغرب۔ اقبال انسٹی ٹیوٹ، کشمیر یونیورسٹی، سری نگر، ۱۹۸۱ء، ۲۱۲ص

مندرجات:

۱۔ پیش لفظ	آل احمد سرور
۲۔ اقبال اور نئی مشرقیت	آل احمد سرور

(iv) تشخص کی تلاش کا مسئلہ اور اقبال
اقبال انسٹی ٹیوٹ، کشمیر یونیورسٹی، سری نگر، ۱۹۸۴ء ۱۶۴ص

مندرجات:

۱۔ پیش لفظ	آل احمد سرور
۲۔ تشخص کا مسئلہ۔ اقبال اور مولانا آزاد کی نظر میں	آل احمد سرور

(v) جدیدیت اور اقبال۔ اقبال انسٹی ٹیوٹ، کشمیر یونیورسٹی، سری نگر، ۱۹۸۰ء، ۲۵۵ص
اقبال انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام 'اقبال اور جدیدیت کے موضوع پر منعقدہ سمینار میں پیش کیے گئے مقالات کا مجموعہ۔

مندرجات:

۱۔ پیش لفظ	آل احمد سرور
۲۔ جدیدیت کیا ہے؟	آل احمد سرور

www.taemeernews.com

(vi) دانشورِ اقبال۔ ایجوکیشنل بک ہاؤس،
علی گڑھ، ۱۹۹۴ء، ۲۸۵ص

مندرجات:

۱۔ ابتدائیہ — آل احمد سرور
۲۔ دانشورِ اقبال — ،،
۳۔ عصرِ حاضر میں قدروں کا بحران اور اقبال — ،،
۴۔ اقبال اور نئی مشرقیت — ،،
۵۔ تشخص کا مسئلہ: اقبال اور مولانا آزاد کی نظر میں — ،،
۶۔ جدید اور مشرقی اقبال — ،،
۷۔ اقبال اور تصوف — ،،
۸۔ اقبال اور جمہوریت — ،،
۹۔ اقبال کی سیاسی فکر — ،،
۱۰۔ اقبال اور ابلیس — ،،
۱۱۔ اقبال کی معنویت — ،،
۱۲۔ خطابت، شاعری اور اقبال — ،،
۱۳۔ کلیدی خطبہ: انٹرنیشنل اقبال سیمینار علی گڑھ — ،،
۱۴۔ اقبال اور فانی — ،،
۱۵۔ اقبال، فیض اور ہم — ،،
۱۶۔ اقبال کا کارنامہ اردو نظم میں — ،،
۱۷۔ غزل کی زبان اور اقبال کی غزل کی زبان — ،،
۱۸۔ خضرِ راہ — ،،
۱۹۔ اقبال: ہالہ سے شعاعِ امید تک — ،،
۲۰۔ اقبال کا فن۔ ایک عمومی جائزہ — ،،
۲۱۔ صرف ایک کتاب — ،،

(vii) عرفانِ اقبال۔ مرتبہ زہرہ معین۔
تخلیق کار، لاہور، ۱۹۷۷ء، ۲۴۰ص

طبع دوم۔ اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، ۱۹۸۳ء، ۲۷۲ص
علامہ اقبال سے متعلق پروفیسر آل احمد سرور کے مضامین کا مجموعہ۔

مندرجات:

۱۔ جبریلِ مشرق — آل احمد سرور
۲۔ اقبال اور ابلیس — ،،
۳۔ اقبال اور اس کے نکتہ چیں — ،،
۴۔ اقبال اور ان کا فلسفہ — ،،
۵۔ روحِ اقبال — ،،
۶۔ خطوط میں اقبال کی شخصیت — ،،
۷۔ اقبال کے خط — ،،
۸۔ اقبال کی عظمت — ،،
۹۔ اردو غزل۔ میر سے اقبال تک — ،،
۱۰۔ اقبال اور مغرب — ،،
۱۱۔ اقبال کے استعارے — ،،
۱۲۔ اقبال اور جمہوریت — ،،
۱۳۔ اقبالیات پر [سرور صاحب] کے تنقیدی اشارے؛ مرتبہ زہرا معین (سرور صاحب کی مختلف تحریروں سے اقتباسات)
۱۴۔ آل احمد سرور کے نام اقبال کا ایک یادگار خط
۱۵۔ بیادِ اقبال: آل احمد سرور کا منظوم خراجِ عقیدت

(viii) مقالاتِ یومِ اقبال: مرتبہ آل احمد سرور
رضا انٹر کالج، رامپور، ۱۹۴۵ء

www.taemeernews.com

۳۔ تنقید

(i) ادب اور نظریہ

ادارۂ فروغ اردو، لکھنؤ، ۱۹۵۴ء، ۲۹۶ص

مندرجات:

۱۔ اردو غزل میر سے اقبال تک
۲۔ تہذیب اور ادب میں سرسید کا کارنامہ
۳۔ نظیر اور عوام
۴۔ اختر شیرانی
۵۔ غالب کا ذہنی ارتقاء
۶۔ اقبال کی عظمت
۷۔ رشید احمد صدیقی
۸۔ مولانا سہیل کی شاعری
۹۔ جوش کا سرود و خروش
۱۰۔ ضیاے حیات۔ایک تبصرہ
۱۱۔ روایت اور تجربے۔اردو شاعری میں
۱۲۔ نئے ہندوستان کی تعمیر میں اردو کا حصہ
۱۳۔ ادب اور نظریہ

(ii) پہچان اور پرکھ

مکتبہ جامعہ، نئی دہلی، ۱۹۹۰ء، ۱۹۲ص

مندرجات:

۱۔ کچھ اس کتاب کے بارے میں
۲۔ ادب میں قدروں کا مسئلہ
۳۔ شاعری اور نثر کا فرق
۴۔ تنقید میں انتخابی نظریے کی ضرورت
۵۔ غزل کا فن
۶۔ ہماری مشترک تہذیب اور اردو غزل
۷۔ اردو شاعری میں انسان کا تصور
۸۔ میر میری نظر میں
۹۔ غالب کا نظریۂ شاعری
۱۰۔ غالب کی شاعری کی خصوصیات
۱۱۔ انیس کی شاعرانہ عظمت
۱۲۔ حسرت کی عشقیہ شاعری۔میری نظر میں
۱۳۔ فانی کی شخصیت اور شاعری
۱۴۔ جوش کی شخصیت اور شاعری
۱۵۔ کچھ فراق کے بارے میں

(iii) تنقید کیا ہے؟ اور دوسرے مضامین

کتابی دنیا، دہلی، ۱۹۴۷ء، ۱۹۷ص
طبع دوم۔مکتبہ جامعہ، نئی دہلی، ۱۹۵۲ء، ۲۱۴ص
طبع سوم، مکتبہ جامعہ، نئی دہلی، ۱۹۵۵ء، ۲۱۴ص
طبع چہارم، مکتبہ جامعہ، ۱۹۵۹ء، نئی دہلی، ۲۱۵ص

مندرجات:

۱۔ یادگار حالی
۲۔ اکبر کی ظرافت اور اس کی اہمیت
۳۔ شبلی میری نظر میں
۴۔ اقبال کے خطوط
۵۔ موجودہ ادبی مسائل
۶۔ ولیم سمرسٹ مائم
۷۔ ترقی پسند تحریک پر ایک نظر
۸۔ تنقید کیا ہے؟

www.taemeernews.com

(iv) تنقید کے بنیادی مسائل

شعبہ اردو، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ۱۹۶۷ء، ۲۷۰ص

۸۔۹ رفروری ۱۹۶۴ء کو شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی کے زیر اہتمام تنقید کے موضوع پر منعقدہ سیمینار میں پیش کیے گئے مقالات کا مجموعہ۔

مندرجات:

۱۔ پیش لفظ — آل احمد سرور

۲۔ اردو تنقید کے بنیادی افکار، — ''

(v) تنقیدی اشارے

(ریڈیو پر چند ادبی تقریریں) مسلم ایجوکیشنل پریس، علی گڑھ، ۱۹۴۲ء، ۱۶۸ص

دوسرا ایڈیشن۔ نگار بک ایجنسی، لکھنؤ ۱۹۴۹ء ۲۴۶ص

چوتھا ایڈیشن۔ ادارہ فروغ اردو، لکھنؤ ۱۹۶۴ء ۲۶۴ص

مندرجات: (پہلا ایڈیشن)

۱۔ کچھ اس کتاب کے متعلق

۲۔ اردو ناول کا ارتقاء

۳۔ اردو نثر میں مزاحیہ نگاری

۴۔ اردو میں افسانہ نگاری

۵۔ اردو شاعری میں خمریات

۶۔ ناولسٹ اور جرم

۷۔ انگریزی شاعری

۸۔ ہندوستانی ادب میں حالی کا درجہ

۹۔ اکبر: شخصیت اور آرٹ

۱۰۔ چکبست لکھنوی

۱۱۔ اقبال اور ان کا فلسفہ

۱۲۔ شوکت علی خاں فانی بدایونی

۱۳۔ رتن ناتھ سرشار

۱۴۔ ہندوستانی ادب میں آغا حشر کا درجہ

۱۵۔ سمندر پار سے سرسید کے خطوط

۱۶۔ مکاتیب مہدی

۱۷۔ خنداں (یعنی رشید احمد صدیقی کی کتاب خنداں پر تبصرہ)

بعد کی اشاعتوں میں حسب ذیل مضامین کا اضافہ ہوا:

۱۔ خطوط میں شخصیت

۲۔ جدید اردو تنقید

۳۔ حیات شبلی۔ ایک تبصرہ

۴۔ مجھے کون کونسی کہانیاں پسند ہیں

۵۔ کچھ زہر عشق کے بارے میں

۶۔ مجھے کون کونسی کہانیاں پسند ہیں

(vi) فکر روشن

ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۹۵ء، ۲۴۰ص

مندرجات:

۱۔ جستجو کل کی لیے پھرتی ہے اجزا میں مجھے

۲۔ اردو میں دانشوری کی روایت

۳۔ جدید دنیا میں اسلام۔ مسائل اور امکانات

۴۔ سرسید کے اسلام کے تصور کی اہمیت

۵۔ سرسید کا تہذیبی تصور اور موجودہ دور میں اس کی معنویت

۶۔ علی گڑھ کی معنویت آج کیا ہے؟

۷۔ حالی کے مقدمۂ شعر و شاعری کی اہمیت

۸۔ ہندوستانی قومیت اور مسلمان

۹۔ اسلامی تشخص اور قومی تشخص مولانا آزاد کی نظر میں

۱۰۔ مولانا آزاد کا ایک قابل قدر مطالعہ

www.taemeernews.com

۱۱۔ مولانا آزاد کا اسلوب نثر
۱۲۔ ذاکر صاحب کی دانشوری
۱۳۔ ذاکر صاحب کی ادبی خدمات
۱۴۔ مجیب صاحب۔ شخصیت اور اسلوب
۱۵۔ مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن
۱۶۔ پریم چند اور ہم
۱۷۔ بیدی کی افسانہ نگاری
۱۸۔ رشید صاحب۔ایک ذاتی تاثر
۱۹۔ رشید صاحب۔ فن اور شخصیت
۲۰۔ آشفتہ بیانی میری
۲۱۔ آب گم۔ایک تاثر

(vii) کچھ خطبے کچھ مقالے

ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ ۱۹۹۶ء، ۲۶۹ص

مندرجات:

خطبے

۱۔ اردو تنقید۔ایک جائزہ
۲۔ جدیدیت کیا ہے؟
۳۔ نظیر اکبرآبادی
۴۔ اکبر الہ آبادی کی معنویت
۵۔ اردو رسم خط

مقالے

۶۔ قدیم اور جدید اردو ادب کی مشترک قدریں
۷۔ ہندوستان کی جنگ آزادی میں اردو کا حصہ
۸۔ اردو ادب ۱۸۵۷ء سے ۱۹۱۴ء تک
۹۔ ہندوستانی نشاۃ الثانیہ اور غالب
۱۰۔ حالی اور نقد غالب
۱۱۔ غالب کی اردو شاعری کے انگریزی تراجم
۱۲۔ اردوئے معلی
۱۳۔ فانی کی معنویت
۱۴۔ مولانا آزاد کی چھٹی برسی پر کچھ خیالات
۱۵۔ شخصیات اور واقعات جنھوں نے مجھے متاثر کیا؟
۱۶۔ کچھ آتش کے بارے میں

(viii) مجموعۂ تنقیدات:

مرتبہ عاصمہ وقار۔ الوقار پبلی کیشنز ۱۹۹۶ء، لاہور، ۱۰۱۶ص

سرور صاحب کے ساتھ تنقیدی مضامین کا انتخاب۔ ان مضامین کو بنیادی طور پر دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصے میں شعری موضوعات سے متعلق مضامین کو شامل کیا گیا ہے اور دوسرے حصے میں نثر سے متعلق۔ ابتدا میں 'حرفے چند' کے عنوان سے سید معین الرحمٰن کی تحریر ہے جس میں کتاب کا تعارف کرایا گیا ہے۔ اس کے بعد ان مضامین سے متعلق سرور صاحب کا ایک طویل مضمون (ص ۱۱ تا ۲۰) بعنوان ''یہ مضامین اور میرا ادبی نقطۂ نظر'' ہے۔

یہ مضامین سرور صاحب کے مختلف مجموعہ ہائے مضامین سے اخذ کیے گئے ہیں۔

مندرجات:

۱۔ یہ مضامین اور میرا نقطۂ نظر — آل احمد سرور
۲۔ نظم کی زبان
۳۔ غزل کا فن
۴۔ ہماری مشترک تہذیب اور غزل
۵۔ اردو شاعری میں انسان کا تصور
۶۔ شاعری میں شخصیت

www.taemeernews.com

۷۔ میرؔ، میری نظر میں
۸۔ میر کے مطالعے کی اہمیت
۹۔ لکھنؤ اور اردو ادب
۱۰۔ آتشؔ
۱۱۔ انیس کی شاعرانہ عظمت
۱۲۔ غالب کا نظریۂ شاعری
۱۳۔ غالب کی شاعری کی خصوصیات
۱۴۔ غالب اور جدید ذہن
۱۵۔ غالب کی شاعری کی معنویت
۱۶۔ غالب کی عظمت
۱۷۔ پورے غالب
۱۸۔ اقبال اور مغرب
۱۹۔ اقبال اور نئی مشرقیت
۲۰۔ اقبال کی معنویت
۲۱۔ اقبال، فیض اور ہم
۲۲۔ فیض: صاحب طرز شاعر
۲۳۔ فانی کی شخصیت اور شاعری
۲۴۔ حسرت: شخصیت اور شاعری
۲۵۔ حسرت کی عشقیہ شاعری
۲۶۔ حسرت کی عظمت
۲۷۔ جگر مرادآبادی
۲۸۔ جوش کی شخصیت اور شاعری
۲۹۔ کچھ فراق کے بارے میں
۳۰۔ مجاز: رومانیت کا شہید
۳۱۔ نئی اردو شاعری
۳۲۔ شاعری اور نثر کا فرق
۳۳۔ نثر کا اسٹائل
۳۴۔ فکشن کیا؟ کیوں اور کیسے؟
۳۵۔ پریم چند اور ہم
۳۶۔ بیدی کی افسانہ نگاری
۳۷۔ برنارڈ شا
۳۸۔ گورکی کا اثر اردو ادب پر
۳۹۔ لینن کا اثر اردو ادب پر
۴۰۔ حالی کے مقدمۂ شعر و شاعری کی اہمیت
۴۱۔ اردو میں ادبی تنقید کی صورت حال
۴۲۔ تنقید کے مسائل
۴۳۔ تنقید میں انتخابی نظریے کی ضرورت
۴۴۔ ادب میں قدروں کا مسئلہ
۴۵۔ ادب میں اظہار و ابلاغ کا مسئلہ
۴۶۔ تراجم اور اصطلاح سازی کے مسائل
۴۷۔ جدت پرستی اور جدیدیت کے مضمرات
۴۸۔ ادب میں جدیدیت کا مفہوم
۴۹۔ مولانا آزاد کا ایک قابل قدر مطالعہ
۵۰۔ مولانا آزاد کا اسلوب نثر
۵۱۔ رشید صاحب۔ ایک ذاتی تاثر
۵۲۔ رشید صاحب۔ فن اور شخصیت
۵۳۔ ''آشفتہ بیانی......''
۵۴۔ ذاکر صاحب کی ادبی خدمات
۵۵۔ مجیب صاحب: شخصیت اور اسلوب
۵۶۔ ''آب گم''۔ ایک تاثر
۵۷۔ سرسید کے تصور اسلام کی اہمیت
۵۸۔ عہد حاضر میں سرسید کے تہذیبی تصور کی معنویت
۵۹۔ آج علی گڑھ تحریک کی معنویت؟
۶۰۔ اردو اور ہندوستانی تہذیب

www.taemeernews.com

۶۱۔ پاکستانی دانشوروں سے مکالمہ

(ix) مسرت سے بصیرت تک

مکتبہ جامعہ، نئی دہلی، ۱۹۷۴ء، ۲۹۵ص

مندرجات:

۱۔ پیش لفظ
۲۔ میر کے مطالعہ کی اہمیت
۳۔ لکھنؤ اور اردو ادب
۴۔ آتش
۵۔ غالب اور جدید ذہن
۶۔ غالب کی شاعری کی معنویت
۷۔ غالب کی عظمت
۸۔ پورے غالب
۹۔ حسرت کی عظمت
۱۰۔ اقبال اور مغرب
۱۱۔ جگر مرادآبادی
۱۲۔ مجاز۔ رومانیت کا شہید
۱۳۔ فیض
۱۴۔ نئی اردو شاعری

(x) نظر اور نظریے

مکتبہ جامعہ، نئی دہلی، ۱۹۷۲ء، ۲۷۱ص

مندرجات:

۱۔ پیش لفظ
۲۔ شاعری میں شخصیت
۳۔ نظم کی زبان
۴۔ نثر کا اسٹائل
۵۔ فکشن کیا ہے؟ کیوں؟ اور کیسے؟
۶۔ ادب میں اظہار وابلاغ کا مسئلہ
۷۔ اردو ادب میں تنقید کی صورت حال
۸۔ تنقید کے مسائل
۹۔ جدّت پرستی اور جدیدیت کے مضمرات
۱۰۔ ادب میں جدیدیت کا مفہوم
۱۱۔ برنارڈ شا
۱۲۔ گورکی کا اثر اردو ادب پر
۱۳۔ لینن کا اثر اردو ادب پر
۱۴۔ تراجم اور اصطلاح سازی کے مسائل

(xi) نئے اور پرانے چراغ

ادارۂ فروغ اردو، لکھنؤ، ۱۹۴۶ء

تیسرا ایڈیشن (مع اضافہ جدیدہ) ادارۂ فروغ اردو، لکھنؤ، ۱۹۵۵ء، ۴۰۸ص

مندرجات:

۱۔ دیباچہ
۲۔ نئے اور پرانے چراغ
۳۔ اقبال اور ابلیس
۴۔ اقبال اور اس کے نکتہ چیں
۵۔ سرسید کے ایک مخالف (علی بخش خاں شرر بدایونی)
۶۔ سجاد انصاری
۷۔ غالب
۸۔ جدید غزل گو شعراء
۹۔ اکبر اور سرسید
۱۰۔ روح اقبال
۱۱۔ اردو شاعری میں فانی کی قدر و قیمت

www.taemeernews.com

۱۲۔ ریاض اور ہم
۱۳۔ فروزاں (مجموعۂ کلام معین احسن جذبی)
۱۴۔ جنگ عظیم کے بعد اردو شاعری
۱۵۔ عظمت اللہ خاں اور سریلے بول
۱۶۔ نیا ادبی شعور
۱۷۔ رشید احمد صدیقی کی شخصیت

۴۔ خطبات

(i) اردو میں دانشوری کی روایت
عابد حسین میموریل لکچر ۱۹۸۱ء

(ii) اردو اور ہندوستانی تہذیب
فخرالدین علی احمد میموریل لکچر ۱۹۸۶ء

(iii) اقبال، فیض اور ہم۔
اردو مرکز لندن، فیض میموریل لکچر ۱۹۸۸ء

(iv) اقبال کا نظریۂ شعری
شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی، ۱۹۹۹ء، ۸۰ص
نظام اردو خطبات۔ دہلی یونیورسٹی، ۷۸۔۱۹۷۷ء
مندرجات:
۱۔ اعتراف آل احمد سرور
۲۔ اقبال کا نظریۂ شعر ''
۳۔ اقبال کی شاعری ''

(v) اقبال کے مطالعے کے تناظرات
کشمیر یونیورسٹی، سری نگر، ۱۹۷۸ء، ۳۲ص
یونیورسٹی میں اقبال چیئر کے افتتاح کے موقع پر
۲۵ رجولائی ۱۹۷۷ء کو دیا گیا افتتاحی خطبہ:

۱۔ فانی۔ شخصیت اور شاعری
توسیعی لکچر جامعہ ملیہ۔ نئی دہلی ۱۹۸۱ء
۲۔ ہماری تعلیمی صورت حال
شیخ محمد عبداللہ میموریل لکچر ۱۹۸۴ء
۳۔ ہندوستان کدھر
خواجہ غلام السیدین یادگار خطبہ۔ ۱۹۸۰ء
کے۔جی۔سیدین میموریل ٹرسٹ، نئی دہلی ۱۹۸۳ء

(vi) ہندوستانی مسلمان اور مجیب صاحب ایک تنقیدی جائزہ
مکتبہ جامعہ، نئی دہلی، ۱۹۸۹ء،
پروفیسر محمد مجیب میموریل لکچر۔ ۱۹۸۹ء

۵۔ خود نوشت

(i) خواب باقی ہیں
ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۹۱ء، ۳۶۳ص
''ہزاروں خواب ہیں پامال لیکن خواب باقی ہیں''

(ii) حرف سرور۔ مرتبہ زہرہ معین۔
مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۸۰ء
سرور صاحب کی تحریروں سے ماخوذ حالات زندگی۔

www.taemeernews.com

۶۔ خطوط

(i) رشید احمد صدیقی کے خطوط

ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ ۱۹۹۶ء، ۳۳۳ص

سرور صاحب کے نام رشید احمد صدیقی کے خطوط مع ضمیمہ و حواشی:

- خط بنام خلیل الرحمن اعظمی
- خط بنام شکیب ایاز
- خط بنام ممتاز شیریں
- خط بنام نادم سیتا پوری

۷۔ شاعری

(i) خواب اور خلش

مکتبہ جامعہ، نئی دہلی، ۱۹۹۱ء، ص ۱۶۸

(ii) ذوق جنوں

ادارۂ فروغ اردو، لکھنؤ، ۱۹۵۵ء، ۲۵۰ص

(iii) سلسبیل (مجموعہ کلام)

انجمن اردوئے معلی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ،

۱۹۳۵ء، ۱۱۲ص

(مع تعارف حضرت رشید احمد صدیقی)

۸۔ غالبیات

(i) عرفان غالب

شعبۂ اردو، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ۱۹۷۳ء، ۲۹۹ص

غالب صدی تقریبات کے سلسلے میں مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے زیر اہتمام مارچ ۱۹۶۹ء میں منعقدہ سمینار میں پیش کیے گئے مقالوں کا مجموعہ۔

مندرجات:

۱۔ تعارف — آل احمد سرور

۲۔ پورے غالب (The Whole of Ghalib) — آل احمد سرور

۹۔ مرتبات

(i) اردو شعریات

اقبال انسٹی ٹیوٹ، کشمیر یونیورسٹی، سری نگر، ۱۹۸۷ء، ۲۸۰ص

اقبال انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام ''اردو شعریات'' کے موضوع پر ستمبر ۱۹۸۴ء میں منعقدہ سمینار میں پیش کیے گئے مقالات کا مجموعہ۔

www.taemeernews.com

مندرجات:

۱۔ پیش لفظ — آل احمد سرور

(ii) اردو فکشن

شعبۂ اردو، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ،
۱۹۷۳ء، ۲۷۳ص

شعبۂ اردو، مسلم یونیورسٹی کے زیر اہتمام ۲۷/اگست ۱۹۷۱ء کو اردو فکشن (ناول اور افسانہ) کے موضوع پر منعقدہ سہ روزہ سیمینار میں پیش کیے گئے مقالات کا مجموعہ۔

مندرجات:

۱۔ تعارف — آل احمد سرور
۲۔ فکشن، کیا، کیوں اور کیسے؟ — ,,

(iii) انتخاب مضامین سرسید

ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ ۱۹۹۰ء، ۱۲۸ص

مندرجات:

۱۔ تعارف — آل احمد سرور
۲۔ سمجھ — ,,

(iv) جدید دنیا میں اسلام: مسائل اور امکانات

اقبال انسٹی ٹیوٹ، کشمیر یونیورسٹی، سری نگر،
۱۹۸۳ء، ۳۲۸ص

اقبال انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام ۲/تا ۸/اکتوبر ۱۹۸۱ء کو 'جدید دور میں اسلام۔ مسائل اور امکانات' کے موضوع پر منعقدہ سیمینار میں پیش کیے گئے مقالات کا مجموعہ۔

مندرجات:

۱۔ پیش لفظ — آل احمد سرور
۲۔ جدید دنیا میں اسلام: مسائل اور امکانات — آل احمد سرور

(v) جدیدیت اور ادب

شعبۂ اردو، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ،
۱۹۶۹ء، ۲۸۸ص

۳۱/مارچ تا ۱/اپریل ۱۹۶۷ء کو 'جدیدیت اور ادب' کے موضوع پر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں منعقدہ سیمینار میں پیش کیے گئے مقالات کا مجموعہ۔

مندرجات:

۱۔ ابتدائیہ — آل احمد سرور
۲۔ ادب میں جدیدیت کا مفہوم — ,,

(vi) شعرائے عصر کا انتخاب جدید

(۱۹۲۴ء تا ۱۹۴۲ء) مرتبہ عزیز احمد و آل احمد سرور، انجمن ترقی اردو (ہند)، دہلی، ۱۹۴۲ء، ۲۷۳ص

(vii) ہندوستان میں تصوف

اقبال انسٹی ٹیوٹ، کشمیر یونیورسٹی، سری نگر،
۱۹۸۷ء، ۱۰۱ص

مئی ۱۹۸۳ء میں تصوف کے موضوع پر اقبال انسٹی ٹیوٹ میں منعقدہ سیمینار میں پیش کیے گئے مقالات کا مجموعہ۔

مندرجات:

۱۔ پیش لفظ — آل احمد سرور
۲۔ اقبال اور تصوف — ,,

www.taemeernews.com

مضامین

(رسائل میں)

الف۔ آج کل۔ نئی دہلی

۱۔میر، میری نظر میں — میر نمبر — ۱۹۴۸ء

۲۔میر، میری نظر میں — جون ۱۹۸۸ء

ب۔ آواز۔ دہلی

۱۔اردو میں دیباچہ نگاری کی روایت — ۱۶/جون ۱۹۷۷ء

۲۔اقبال کے استعارے — ۱۶/دسمبر ۱۹۷۷ء

۳۔تاریخ ادب میں ادوار کا تعین — ۱۶/دسمبر ۱۹۷۶ء

۴۔ڈاکٹر مختار احمد انصاری — ۱۰/فروری ۱۹۸۱ء

۵۔رشید احمد صدیقی کی مکتوب نگاری — ۱۶/جنوری ۱۹۷۳ء

۶۔ غالب کی ایک غزل — ۱۶/دسمبر ۱۹۸۲ء

۷۔گفتگو کے آداب — ۱۶/جنوری ۱۹۷۸ء

ج۔ ادب۔ علی گڑھ

تفہیم شعر — جنوری ۱۹۸۲ء

د۔ ادبِ لطیف۔ لاہور

غالب اپنی شخصیت کے آئینے میں — جولائی ۱۹۵۵ء

ہ۔ ادیب۔ علی گڑھ

۱۔خطوطِ غالب — اپریل ۱۹۸۱ء

۲۔غالب کی ایک غزل کا تجزیہ — جنوری ۱۹۸۳ء

و۔ اردو ادب۔ علی گڑھ

۱۔اردوئے معلیٰ — اکتوبر ۱۹۵۱ء

۲۔جدید اور قدیم اردو ادب کی مشترک قدریں — ۱۹۵۴ء

۳۔روایت و تجربے اردو شاعری میں — جنوری ۱۹۵۳ء

۴۔زیرِ لب — جولائی ۱۹۵۴ء

۵۔تنہائے گفتنی — اکتوبر ۱۹۵۱ء

۶۔شذرات — شمارہ نمبر ۱، ۱۹۶۱ء

۷۔ضیائے حیات — جولائی ۱۹۵۳ء

۸۔غالب کا ذہنی ارتقا — جولائی ۱۹۵۲ء

۹۔مولانا آزاد_ ایک تاثر — ۱۹۵۹ء

۱۰۔میر تقی میر_ حیات اور شاعری (تبصرہ) — جولائی ۱۹۵۴ء

۱۱۔نگہ بلند سخن دلنواز جاں پرسوز — نہرو نمبر — ۱۹۶۴ء

ز۔ اردو۔ دہلی

اقبال اور اس کے نکتہ چیں — اکتوبر ۱۹۳۸ء

ح۔ اردو دنیا۔ نئی دہلی

اردو دوستوں سے اپیل — مارچ ۲۰۰۲ء

ط۔ اقبالیات۔ سری نگر

اقبال انسٹی ٹیوٹ، سرینگر کے زیر اہتمام منعقدہ

www.taemeernews.com

سمیناروں کے مقالوں کے مجموعوں میں سرور صاحب کے مقالات)

۱۔اقبال اور فانی شمارہ ۲، ۱۹۸۲ء
۲۔اقبال کا فن۔ایک عمومی جائزہ اپریل ۱۹۸۶ء
۳۔اقبال کی بہترین اردو نظم اپریل ۱۹۸۸ء
۴۔اقبال کی سیاسی فکر اپریل ۱۹۸۹ء
۵۔اقبال کی معنویت شمارہ۔۲، ۱۹۸۲ء
۶۔جبریل اور ابلیس ستمبر ۱۹۸۱ء
۷۔جوش کی شخصیت اور شاعری اپریل ۱۹۸۹ء
۸۔حسرت۔شخصیت اور شاعری شمارہ ۲، ۱۹۸۲ء
۹۔دو دنیاؤں کا فرق۔اقبال اور فانی شمارہ ۲، ۱۹۸۲ء
۱۰۔ضرب کلیم کا اسلوب ستمبر ۱۹۸۱ء
۱۱۔غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی (شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ کی وفات پر اداریہ) شمارہ ۲، ۱۹۸۲ء

ی۔ الفاظ [دوماہی] علی گڑھ

بیدی کے افسانے۔ایک تاثر نومبر۔دسمبر ۱۹۸۰ء

ک۔ امکان۔بمبئی

پریم چند کی اہمیت ۱۹۸۱ء

ل۔ بازیافت۔کشمیر یونیورسٹی، سری نگر

اردو میں قدروں کا مسئلہ ۱۹۸۱ء

م۔ تحریر۔ دہلی

رشید احمد صدیقی اکتوبر ۱۹۷۵ء

ن۔ تہذیب الاخلاق۔ علی گڑھ

۱۔ایسی چنگاری بھی یارب اپنے خاکستر میں تھی (مشہور ماہر امراض چشم ڈاکٹر حمیدہ سعید الظفر کی رحلت پر تعزیتی مضمون) جولائی ۱۹۸۸ء
۲۔تہذیب الاخلاق کا رول کیا ہونا چاہیے جنوری ۱۹۸۷ء
۳۔رشید احمد صدیقی اگست ۱۹۸۷ء
۴۔رشید احمد صدیقی۔شخصیت اور فن جنوری ۱۹۹۰ء
۵۔سرسید اور ہم اکتوبر ۱۹۸۷ء
۶۔ " اکتوبر ۱۹۸۸ء
۷۔کیا علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی میں اردو بھی ذریعہ تعلیم ہو اکتوبر ۱۹۸۹ء
۸۔میر ولایت حسین کا ایک اہم مضمون ستمبر ۱۹۸۸ء

س۔ جامعہ۔نئی دہلی

۱۔اردو شاعری میں انسان کا تصور مارچ ۱۹۷۵ء
۲۔اردو گھر فتنہ ستمبر ۱۹۶۸ء
۳۔اردو نثر میں مولانا آزاد کا اجتہاد اپریل ۱۹۶۸ء
۴۔ترجمہ اور اصلاح سازی کے مسائل ستمبر ۱۹۷۱ء
۵۔سرسید کا تہذیبی تصور اور موجودہ دور میں اس کی معنویت مئی ۱۹۷۲ء
۶۔سرسید کے اسلام کی اہمیت آج کیا ہے مئی ۱۹۶۹ء
۷۔مولانا آزاد کی چھٹی برسی پر کچھ خیالات مارچ ۱۹۶۴ء

ع۔ خوشبو کا سفر [ماہنامہ] حیدرآباد

اقبال اور فیض جون ۲۰۰۲ء

www.taemeernews.com

ف۔ ساقی۔ دہلی

روح صہبائی (اثر صہبائی کے مجموعہ کلام
روح صہبائی پر تبصرہ) اپریل ۱۹۴۷ء

ص۔ سرسید ہال ریویو۔ اے۔ ایم۔ یو۔ علی گڑھ

کچھ سہانی یادیں، کچھ پرانی
باتیں اولڈ بوائز نمبر ۱۹۷۵ء

ق۔ سوغات۔ بنگلور

جدت پرستی اور جدیدیت کے مضمرات ستمبر ۱۹۷۱ء

ر۔ سہیل۔ علی گڑھ

جبریل مشرق ستمبر ۱۹۸۱ء

ش۔ شاعر۔ بمبئی

ایک روشن چراغ تھا نہ رہا نومبر ۱۹۶۸ء

ت۔ شاہراہ۔ دہلی

۱۔ سرمایہ داری اور کلچر اپریل۔ مئی ۱۹۵۱ء
۲۔ یادیار مہرباں آید همی شیر کشمیر نمبر ۱۹۸۳ء

ث۔ شب خون

۱۔ ادب میں جدیدیت کا مفہوم جون ۱۹۶۸ء
۲۔ اردو میں تراجم کے مسائل مارچ ۱۹۶۸ء
۳۔ کچھ دن پاکستان میں جنوری ۱۹۷۹ء
۴۔ نئی اردو شاعری نومبر ۱۹۶۹ء

خ۔ صبا۔ حیدرآباد

مجنوں جو مر گیا تو جنگل اداس ہے
(پنڈت جواہر لال نہرو) جولائی ۱۹۶۴ء

ذ۔ صبح نو۔ پٹنہ

ایک آفاقی شاعر۔ اقبال مئی ۱۹۶۹ء

ض۔ علی گڑھ میگزین۔ علی گڑھ

۱۔ اردو شاعری میں پرانا اور نیا انداز مارچ ۱۹۴۱ء
۲۔ اقبال کا ذہنی ارتقاء ۱۹۶۱ء
۳۔ سر آرنلڈ راس ۱۹۳۲ء
۴۔ سرسید اور مغرب کے تہذیبی و ادبی
اثرات علی گڑھ تحریک نمبر ۵۸۔۱۹۵۵ء
۵۔ شاعری میں شخصیت ۱۹۵۹ء
۶۔ غالب اور جدید ذہن غالب نمبر ۵۱۔۱۹۴۹ء
۷۔ غالب کی عظمت غالب نمبر ۵۱۔۱۹۴۹ء
۸۔ مجھ کو کون سی کہانیاں پسند ہیں مارچ ۱۹۴۲ء
۹۔ مشرقی اور مغربی تنقید کے معمار ۷۶۔۱۹۷۵ء
۱۰۔ ہندوستانی ادب میں حالی کا درجہ دسمبر ۱۹۳۹ء

ظ۔ فروغ اردو۔ لکھنؤ

۱۔ اقبال کا پیغام اپریل ۱۹۶۶ء
۲۔ دبی چنگاریاں مئی ۱۹۶۶ء
۳۔ میر اور سودا جنوری۔ فروری ۱۹۵۶ء
۴۔ نئے ادب کے محرکات ستمبر ۱۹۶۴ء

غ۔ فکر و نظر

۱۔ اردو ادب میں ادبی تنقید کی صورت حال اکتوبر ۱۹۹۶ء
۲۔ پورے غالب (غالب نمبر) ۱۹۶۹ء
۳۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کی ادبی خدمات
(ذاکر نمبر) ۱۹۶۹ء

www.taemeernews.com

۴۔ شبلی کی اردو شاعری (شبلی نمبر) ۱۹۹۶ء
۵۔ شیخ محمد عبداللہ جنوری، جولائی ۸۸۔۱۹۸۷ء
۶۔ علی گڑھ اور عصر حاضر جنوری ۱۹۸۵ء
۷۔ عیار غالب ۸؍جون ۱۹۷۰ء
۸۔ مولانا آزاد ایک قابل قدر مطالعہ
(ڈکسن کے قلم سے مولانا کی ذہنی اور
مذہبی سوانح عمری) ابوالکلام نمبر ۱۹۸۹ء
۹۔ نسخہ حمیدیہ کا انتخاب غالب نمبر ۱۹۶۹ء

الف۔ ماہ نو۔ کراچی

اقبال کا ایک غیر مطبوعہ خط اقبال نمبر، ۱۹۷۷ء

ب۔ نقد ونظر [ششماہی] علی گڑھ

خضر طریقت (خواجہ منظور حسین)
خواجہ منظور حسین نمبر ۱۹۸۵ء

ج۔ نقوش۔ لاہور

۱۔ اختر شیرانی ادب العالیہ نمبر اپریل ۱۹۶۰ء
۲۔ برنارڈ شا شمارہ ۱۹۔۲۰
۳۔ جگر مراد آبادی اگست، ستمبر ۱۹۵۳ء
۴۔ رشید احمد صدیقی شخصیت نمبر۲، اکتوبر ۱۹۵۶ء

د۔ نگار۔ لکھنؤ

۱۔ لکھنؤ اور اردو ادب نومبر ۱۹۴۸ء
۲۔ نثر کا اسٹائل کیا ہے؟ نومبر ۱۹۴۸ء
۳۔ نئے اور پرانے چراغ (یعنی نئی اور
پرانی شاعری کا ایک تجزیہ) مارچ ۱۹۴۴ء

۵۔ نیا سفر (ششماہی)۔ الہ آباد

فکشن، کیا، کیوں، کیسے؟ جنوری، جون ۲۰۰۲ء

و۔ ہماری زبان [ہفت روزہ] علی گڑھ

۱۔ آدت ناتھ جھا یکم فروری ۱۹۷۳ء
۲۔ آزادی کے بائیس سال ۱۵؍اگست ۱۹۶۹ء
۳۔ آشفتہ بیانی میری ۸؍جون ۱۹۵۸ء
۴۔ این سکلیر یکم دسمبر؍۱۹۶۵ء
۵۔ اپنے کو دوسرے کی مدد
سے بچاؤ ۱۵؍مارچ ۱۹۶۲ء
۶۔ اٹھے کبھی گھبرا کے تو میخانے
کو ہو آئے ۸؍مئی ۱۹۷۰ء
۷۔ آثر صاحب کی یاد میں ۱۵؍مارچ ۱۹۶۷ء
۸۔ اردو تحریک یکم فروری ۱۹۶۱ء
۹۔ اردو تحریک — ایک ذاتی جائزہ یکم مئی ۱۹۷۱ء
۱۰۔ اردو تحریک — ایک ذاتی جائزہ ۸؍مئی ۱۹۷۱ء
۱۱۔ اردو دنیا۔ جدت پرستی
اور جدیدیت یکم اگست ۱۹۷۱ء
۱۲۔ اردو کو بعض ریاستوں میں سرکاری درجہ
دینا کیوں ضروری ہے ۱۵؍ستمبر ۱۹۷۳ء
۱۳۔ اسٹائن بک ۸؍جنوری ۱۹۶۹ء
۱۴۔ افکار کے دیئے جلاتے رہو ۸؍نومبر ۱۹۵۸ء
۱۵۔ افکار کے دیئے جلاتے رہو ۱۵؍نومبر ۱۹۵۸ء
۱۶۔ افکار کے دیئے جلاتے رہو ۲۲؍نومبر ۱۹۵۸ء
۱۷۔ افکار کے دیئے جلاتے رہو یکم دسمبر ۱۹۵۸ء
۱۸۔ افکار کے دیئے جلاتے رہو ۸؍دسمبر ۱۹۵۸ء
۱۹۔ اقبال اور ہندوستان ۲۲؍اپریل ۱۹۷۲ء

www.taemeernews.com

۲۰۔ امریکہ میں اردو	۱۵/مئی ۱۹۷۰ء
۲۱۔ انجمن ترقی اردو (ہند) ایک تعارف	۸/اپریل ۱۹۶۸ء
۲۲۔ برق کی یاد میں	جولائی ۱۹۶۵ء
۲۳۔ برنارڈ شا	جنوری ۱۹۵۱ء
۲۴۔ بنے بھائی	یکم جنوری ۱۹۷۳ء
۲۵۔ پاکستان میری نظر میں	۸/جنوری ۱۹۷۲ء
۲۶۔ پروفیسر عبدالقادر سروری	۲۲/مارچ ۱۹۷۱ء
۲۷۔ ترقی اردو بورڈ	۱۵/ستمبر ۱۹۷۱ء
۲۸۔ تسکین قریشی	۸/جولائی ۱۹۷۱ء
۲۹۔ تقریروں کا مرض	۲۲/مئی ۱۹۵۷ء
۳۰۔ جذباتی ہم آہنگی کیسے ہو	۸/جنوری ۱۹۶۲ء
۳۱۔ جنگ آزادی یا غدر	۸/مئی ۱۹۵۷ء
۳۲۔ چوٹی کی بات	۸/اگست ۱۹۶۳ء
۳۳۔ چھوٹی بساط بڑی کائنات	۲۲/دسمبر ۱۹۷۲ء
۳۴۔ چھوٹی بساط بڑی کائنات	یکم جنوری ۱۹۷۳ء
۳۵۔ چھوٹی بساط بڑی کائنات	۸/فروری ۱۹۷۳ء
۳۶۔ چھوٹی بساط بڑی کائنات	۱۵/فروری ۱۹۷۳ء
۳۷۔ حبیب صاحب	یکم جولائی ۱۹۷۱ء
۳۸۔ حرف آخر	یکم اپریل ۱۹۵۱ء
۳۹۔ حسرت کی عظمت	یکم اکتوبر ۱۹۵۱ء
۴۰۔ خطبۂ صدارت رسم خط سمینار	۸/فروری ۱۹۷۱ء
۴۱۔ " "	۱۵/فروری ۱۹۷۱ء
۴۲۔ دو قابل قدر شخصیتیں شادانی اور ہمایوں کبیر	۲۲/اگست ۱۹۶۹ء
۴۳۔ دہلی میں غالب صدی تقریبات	۲۲/فروری ۱۹۶۹ء
۴۴۔ " "	۸/مارچ ۱۹۶۹ء
۴۵۔ دہلی میں غالب صدی تقریبات	۱۵/مارچ ۱۹۶۹ء
۴۶۔ ڈاکٹر اشرف کی یاد میں	۱۵/جون ۱۹۶۲ء
۴۷۔ ڈاکٹر تارا چند	۲۲/اکتوبر ۱۹۷۳ء
۴۸۔ ڈبلو۔ ایچ۔ آڈن	۱۵/اکتوبر ۱۹۶۹ء
۴۹۔ ذاکر صاحب کی یاد میں	۸/مئی ۱۹۶۹ء
۵۰۔ " " "	۱۵/مئی ۱۹۶۹ء
۵۱۔ " " "	۲۲/مئی ۱۹۶۹ء
۵۲۔ " " "	یکم جون ۱۹۶۹ء
۵۳۔ ذہن کا دریچہ کھلا رکھیے	۸/فروری ۱۹۶۳ء
۵۴۔ رومانیہ کے تاثرات	۲۲/نومبر ۱۹۷۲ء
۵۵۔ زہے روانی عمرے کہ در سفر گذرد	۸/نومبر ۱۹۷۲ء
۵۶۔ سادگی سے کیوں چڑتے ہو؟	۱۵/ستمبر ۱۹۶۲ء
۵۷۔ ساہتیہ اکیڈمی سمینار: ان زبانوں کے مسائل جو کسی ریاست کی سرکاری زبان نہیں	۸/اگست ۱۹۶۹ء
۵۸۔ سلام کی یاد میں	۲/نومبر ۱۹۷۳ء
۵۹۔ سمپورنانند_ایک تاثر	یکم فروری ۱۹۶۹ء
۶۰۔ سید عبداللطیف	۸/نومبر ۱۹۷۱ء
۶۱۔ سیکولر ڈیماکرسی کا اردو ایڈیشن	یکم دسمبر ۱۹۷۱ء
۶۲۔ شریمتی اندرا گاندھی اور اردو	۲۲/مارچ ۱۹۷۴ء
۶۳۔ شکاگو یونیورسٹی	۲۲/مئی ۱۹۷۰ء
۶۴۔ شکاگو یونیورسٹی	یکم جون ۱۹۷۰ء
۶۵۔ شیخ محمد اکرام	۲۲/مارچ ۱۹۷۳ء
۶۶۔ صادق صاحب	۱۵/دسمبر ۱۹۷۱ء
۶۷۔ صحتمند نظریہ کیا ہے؟	یکم مارچ ۱۹۶۶ء
۶۸۔ عالم کی موت کیا ہے، عالم کی موت ہے	۸ دسمبر ۱۹۷۲ء
۶۹۔ عصری میلانات اور وقتی تقاضے	۲۲/جون ۱۹۶۰ء

www.taemeernews.com

۷۰۔ عقیدہ اور عمل	۱۵؍نومبر ۱۹۶۲ء
۷۱۔ غالب کے تیس بہترین اشعار	۱۵ فروری ۱۹۶۹ء
۷۲۔ قومی ضرورت کیا ہے؟	۱۵؍جولائی ۱۹۵۸ء
۷۳۔ قومی وحدت کا مسئلہ	۲۲؍اپریل ۱۹۵۸ء
۷۴۔ کچھ اپنے متعلق	۲۲؍ستمبر ۱۹۶۹ء
۷۵۔ لال قلعہ میں	۱۰؍نومبر ۱۹۶۳ء
۷۶۔ لاہور کا جو ذکر کیا	یکم نومبر ۱۹۷۰ء
۷۷۔ مخدوم محی الدین	یکم ستمبر ۱۹۶۹ء
۷۸۔ مرحوم کی یاد میں	۱۵؍ستمبر ۱۹۵۸ء
۷۹۔ مولانا حفظ الرحمٰن_ایک تاثر	۲۲؍اگست ۱۹۶۲ء
۸۰۔ ” ”	یکم ستمبر ۱۹۶۲ء
۸۱۔ مولانا ضیاء الدین بدایونی	۲۲ جنوری ۱۹۷۳ء
۸۲۔ میرا صفحہ	۱۵؍ستمبر ۱۹۶۷ء
۸۳۔ ”	یکم جنوری ۱۹۶۸ء
۸۴۔ ”	یکم فروری ۱۹۶۸ء
۸۵۔ ”	۸؍مارچ ۱۹۶۸ء
۸۶۔ ”	۸؍اپریل ۱۹۶۸ء
۸۷۔ ”	۸؍مئی ۱۹۶۸ء
۸۸۔ ”	۲۴؍مئی ۱۹۶۸ء
۸۹۔ ”	۸؍جون ۱۹۶۸ء
۹۰۔ ”	۲۲؍جون ۱۹۶۸ء
۹۱۔ ”	۸؍جولائی ۱۹۶۸ء
۹۲۔ ”	۲۲؍جولائی ۱۹۶۸ء
۹۳۔ ”	۸؍ستمبر ۱۹۶۸ء
۹۴۔ ”	۸؍نومبر ۱۹۶۸ء
۹۵۔ ”	یکم ستمبر ۱۹۷۰ء
۹۶۔ ”	۱۵؍اکتوبر ۱۹۷۰ء
۹۷۔ میرا صفحہ	۲۲؍دسمبر ۱۹۷۰ء
۹۸۔ ”	۲۲؍فروری ۱۹۷۱ء
۹۹۔ ”	۱۵؍اپریل ۱۹۷۱ء
۱۰۰۔ ”	۲۲؍فروری ۱۹۷۲ء
۱۰۱۔ ”	۸؍جون ۱۹۷۲ء
۱۰۲۔ میر عثمان علی خاں	۱۵؍مارچ ۱۹۶۷ء
۱۰۳۔ میں نے امریکہ کو کیسا پایا	۸؍جون ۱۹۷۰ء
۱۰۴۔ ” ”	۱۵؍جون ۱۹۷۰ء
۱۰۵۔ ” ”	۲۲؍جون ۱۹۷۰ء
۱۰۶۔ ” ”	یکم جولائی ۱۹۷۰ء
۱۰۷۔ ” ”	۸؍جولائی ۱۹۷۰ء
۱۰۸۔ ” ”	۱۵؍جولائی ۱۹۷۰ء
۱۰۹۔ ” ”	۲۲؍جولائی ۱۹۷۰ء
۱۱۰۔ ” ”	یکم؍اگست ۱۹۷۰ء
۱۱۱۔ ” ”	۱۵؍اگست ۱۹۷۰ء
۱۱۲۔ ” ”	یکم ستمبر ۱۹۷۰ء
۱۱۳۔ ” ”	۱۵؍ستمبر ۱۹۷۰ء
۱۱۴۔ ” ”	۲۲؍ستمبر ۱۹۷۰ء
۱۱۵۔ ” ”	یکم اکتوبر ۱۹۷۰ء
۱۱۶۔ ” ”	۸؍اکتوبر ۱۹۷۰ء
۱۱۷۔ ” ”	۱۵؍اکتوبر ۱۹۷۰ء
۱۱۸۔ ” ”	۲۴؍اکتوبر ۱۹۷۰ء
۱۱۹۔ نریش کمار شاد	۱۵؍جون ۱۹۶۹ء
۱۲۰۔ نظم کی زبان	۱۵؍جون ۱۹۶۶ء
۱۲۱۔ ” ”	۲۲؍جون ۱۹۶۶ء
۱۲۲۔ نقصاں نہیں جنوں سے جو سودا کرے کوئی	۸؍جنوری ۱۹۶۲ء
۱۲۳۔ وزیر اعظم سے انجمن کے وفد کی ملاقات	یکم فروری ۱۹۶۷ء

www.taemeernews.com

۱۲۴۔ ہر چیز کی قیمت ادا کیجئے ۱۵ر ستمبر ۱۹۶۹ء
۱۲۵۔ ہر رنگ میں بہار کا
اثبات چاہئے یکم ستمبر ۱۹۵۸ء
۱۲۶۔ ہمارا ادب کدھر جا رہا ہے ۲۲ر ستمبر ۱۹۵۷ء
۱۲۷۔ " " (قسط ۲) یکم اکتوبر ۱۹۵۷ء
۱۲۸۔ ہمیں ہر چیز سے مطلب ہے ۱۵ر اپریل ۱۹۶۶ء

۱۳۰۔ ہندوستانی یونیورسٹی کے لئے
۱۲۹۔ ہندوستان میں رائے عامہ ۸ر جون ۱۹۵۸ء
۱۳۰۔ معیاری نصاب ۸را کتوبر ۱۹۶۶ء
۱۳۱۔ یوم ظفر کا مشاعرہ ۲۲ر نومبر ۱۹۶۳ء

ز۔ ہندوستانی۔ الٰہ آباد

اقبال اور ابلیس جولائی ۱۹۳۸ء

تبصرے

(رسائل میں)

آتش خاموش۔ (ناول از صالحہ عابد حسین)
اردو ادب (سہ ماہی) علی گڑھ دسمبر ۱۹۵۲ء
آہنگ۔ (مجموعۂ کلام اسرار الحق مجاز لکھنوی)
اردو ادب، علی گڑھ جون ۱۹۵۲ء
ادبی اور قومی تذکرے۔ (از کشن پرشاد کول)
اردو ادب، علی گڑھ جنوری ۱۹۵۲ء
ببلیو گرافی آف اقبال۔ (مرتبہ عبدالغنی و خواجہ نور الٰہی)
اردو ادب، علی گڑھ مارچ ۱۹۵۵ء
جلوۂ صد رنگ۔ (مجموعۂ کلام حبیب احمد صدیقی)
اردو ادب، علی گڑھ اکتوبر ۱۹۵۰ء
چاند نگر۔ (از ابن انشاء)
اردو ادب، علی گڑھ جون ۱۹۵۵ء
تمنا۔ (مجموعہ کلام میکش اکبر آبادی)
اردو ادب، علی گڑھ جون ۱۹۵۵ء
حیات اجمل۔ (مؤلفہ قاضی عبدالغفار)
اردو ادب، علی گڑھ جون ۱۹۵۲ء

حیات اکبر۔ (مرتبہ عشرت حسین)
اردو ادب، علی گڑھ مارچ ۱۹۵۲ء
حیات سرسید۔ (مؤلفہ نور الرحمٰن)
اردو ادب، علی گڑھ ستمبر ۱۹۵۱ء
حیات شبلی۔ (مؤلفہ سید سلیمان ندوی)
تنقیدی اشارے، مسلم ایجوکیشنل پریس، علی گڑھ ۱۹۴۲ء
حیدر آباد کے ادیب۔ (مرتبہ زینت ساجدہ)
ہماری زبان (ہفت روزہ) علی گڑھ ۱۵۔فروری ۱۹۵۹ء
حیدر آباد کے شاعر۔ (مرتبہ خواجہ حمید الدین شاہد)
ہماری زبان، علی گڑھ ۱۵۔فروری ۱۹۵۹ء
خنداں۔ (مجموعۂ مضامین رشید احمد صدیقی)
تنقیدی اشارے، ادارۂ فروغ اردو ۱۹۶۴ء
خون کی لکیر۔ (مجموعۂ کلام علی سردار جعفری)
اردو ادب، علی گڑھ ستمبر ۱۹۵۰ء
دستِ صبا۔ (مجموعہ کلام فیض احمد فیض)
اردو ادب، علی گڑھ دسمبر ۱۹۵۲ء

www.taemeernews.com

دیوان غالب۔ (مع شرح از عرش ملسیانی)
اردو ادب، علی گڑھ ستمبر ۱۹۵۰ء
دیوانجی۔ (کلیات ظریف لکھنوی)
اردو ادب، علی گڑھ ستمبر ۱۹۵۰ء
ڈال ڈال، پات پات۔ (از برہم ناتھ دت)
ہماری زبان، علی گڑھ دسمبر ۱۹۶۱ء
روح اقبال۔ (مؤلفہ یوسف حسین خاں)
نئے اور پرانے چراغ، ادارۂ فروغ اردو لکھنؤ ۱۹۵۵ء
روح صہبائی۔ (مجموعۂ کلام اثر صہبائی)
ساقی (ماہنامہ) دہلی اپریل ۱۹۴۷ء
روزگار فقیر۔ (مؤلفہ فقیر سید وحید الدین)
اردو ادب شمارہ ۳، علی گڑھ ۱۹۵۰ء
زیر لب۔ (خطوط صفیہ اختر بنام جان نثار اختر)
اردو ادب، علی گڑھ ستمبر ۱۹۵۴ء
ساز لرزاں۔ (مجموعہ کلام غلام ربانی تاباں)
اردو ادب، علی گڑھ اپریل ۱۹۵۱ء
ستاروں سے ذروں تک۔ (مجموعۂ کلام جگن ناتھ آزاد)
اردو ادب، علی گڑھ اپریل ۱۹۵۱ء
سرود و خروش۔ (مجموعۂ کلام جوش ملیح آبادی)
اردو ادب، علی گڑھ دسمبر ۱۹۵۲ء
شاعر۔ (مشاعرہ نمبر۔ مرتبہ اعجاز صدیقی)
اردو ادب، علی گڑھ دسمبر ۱۹۵۰ء
ضیاے حیات۔ (مؤلفہ محمد امین زبیری)
ادب اور نظریہ، ادارۂ فروغ اردو، لکھنؤ ۱۹۵۴ء
علی گڑھ میگزین۔ (اکبر نمبر، مرتبہ شبیہ الحسن نونہروی)
اردو ادب، علی گڑھ دسمبر ۱۹۵۱ء
علی گڑھ میگزین۔ (علی گڑھ نمبر۔ مرتبہ نبی قریشی)
اردو ادب، علی گڑھ جون ۱۹۵۵ء
علی گڑھ میگزین۔ (غالب نمبر، مرتبہ مختار الدین احمد)
اردو ادب، علی گڑھ ستمبر ۱۹۵۰ء
عہد حاضر اور اردو غزل گوئی (مؤلفہ عندلیب شادانی)
اردو ادب، علی گڑھ جون ۱۹۵۲ء
فروزاں (مجموعۂ کلام معین احسن جذبی)
اردو ادب، علی گڑھ جون ۱۹۵۲ء
نئے اور پرانے چراغ، ادارۂ فروغ اردو لکھنؤ، ۱۹۵۵ء
کارواں (خاص نمبر۔ ۱۹۵۱ء)
اردو ادب، علی گڑھ اپریل ۱۹۵۱ء
مثنویات میر بخط میر (مرتبہ رام بابو سکسینہ)
اردو ادب، علی گڑھ مارچ ۱۹۵۷ء
محمد علی: ذاتی ڈائری کے چند اوراق
(مرتبہ عبد الماجد دریابادی)
اردو ادب، علی گڑھ مارچ ۱۹۵۵ء
مراثی شاد۔ جلد اول (مرتبہ حمید عظیم آبادی)
اردو ادب، علی گڑھ مارچ ۱۹۵۲ء
مرزا شوق لکھنوی۔ (مؤلفہ خواجہ احمد فاروقی)
اردو ادب، علی گڑھ دسمبر ۱۹۵۰ء
مرقع شعراء۔ (مرتبہ رام بابو سکسینہ)
اردو ادب، علی گڑھ مارچ ۱۹۵۷ء
مسدس بے نظیر۔ (از میر یار علی جان صاحب)
اردو ادب، علی گڑھ اپریل ۱۹۵۱ء
مشترکہ زبان۔ (مرتبہ انجمن ترقی اردو، ہند)
اردو ادب، علی گڑھ ستمبر ۱۹۵۱ء
مکاتیب اقبال۔ (بنام محمد نیاز الدین)
اردو ادب، علی گڑھ مارچ ۱۹۵۵ء

www.taemeernews.com

مکتوبات عبدالحق ۔ (مرتبہ جلیل قدوائی)
اردو ادب، علی گڑھ شمارہ ۔۲ ۱۹۶۳ء
میر تقی میر ۔ حیات اور شاعری (مؤلفہ خواجہ احمد فاروقی)
اردو ادب، علی گڑھ ستمبر ۱۹۵۴ء
نادراتِ غالب ۔ (مرتبہ آفاق حسین آفاق)
اردو ادب، علی گڑھ ستمبر ۱۹۵۰ء
نشاط رفتہ ۔ (مجموعۂ کلام عندلیب شادانی)
اردو ادب، علی گڑھ مارچ ۱۹۵۲ء
نقدِ حیات ۔ (از ممتاز حسین)
اردو ادب، علی گڑھ دسمبر ۱۹۵۰ء
نقدِ رواں ۔ (مثنوی از جگت موہن لال رواں)
اردو ادب، علی گڑھ جون ۱۹۵۲ء
نقشِ جمیل ۔ (مجموعۂ کلام علامہ جمیل مظہری)
اردو ادب، علی گڑھ مارچ ۱۹۵۵ء
نقوش: شخصیات ۔ (مرتبہ محمد طفیل)
نقوش یا اردو ادب، علی گڑھ مارچ ۱۹۵۵ء
نقوش و افکار ۔ تنقیدی مضامین از مجنوں گورکھپوری
اردو ادب، علی گڑھ جون ۱۹۵۶ء
نوائے ادب ۔ (انجمن اسلام بمبئی کا سہ ماہی ترجمان)
اردو ادب، علی گڑھ دسمبر ۱۹۵۰ء
نیا ادب ۔ (مؤلفہ کشن پرشاد کول)
اردو ادب، علی گڑھ دسمبر ۱۹۵۰ء
ہفت رنگ ۔ (مجموعۂ کلام عرش ملسیانی)
اردو ادب، علی گڑھ جون ۱۹۵۱ء
ہمایوں ۔ لاہور (سالگرہ نمبر)
اردو ادب، علی گڑھ اپریل ۱۹۵۱ء
یادگار حالی ۔ (مؤلفہ صالحہ عابد حسین)
اردو ادب، علی گڑھ دسمبر ۱۹۵۰ء
یادگار فرحت ۔ (مرتبہ غلام یزدانی)
اردو ادب، علی گڑھ اپریل ۱۹۵۱ء

مطالعہ سرور

(پروفیسر آل احمد سرور کی شخصیت اور فن پر کتابوں اور رسالوں کی فہرست)

کتابیں

۱۔ آل احمد سرور شخصیت اور فن ۔ مرتب امتیاز احمد
ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۹۷ء ۲۲۳ص
مندرجات:

	مرتب
۱۔ پیش لفظ	
۲۔ آل احمد سرور سے انٹرویو	خلیل الرحمٰن اعظمی
۳۔ سرور صاحب	شمیم حنفی
۴۔ روشنی کا سفر	نور الحسن
۵۔ سرور صاحب	کبیر احمد جائسی
۶۔ سرور صاحب	منظر سلیم
۷۔ تو یہ ہیں سرور صاحب	قیصر قلندر
۸۔ آل احمد سرور بحیثیت شاعر	احتشام حسین
۹۔ آل احمد سرور کا نا آشنا	محمد نور الاسلام نشتر
۱۰۔ آل احمد سرور کا احساس جمال	اخلاق احمد
۱۱۔ آل احمد سرور کی تنقید نگاری۔ ایک بازیافت	کلیم الدین احمد

www.taemeernews.com

١٢۔ مرا فقتہ النور فی ذکر السرور — شمس الرحمٰن فاروقی

١٣۔ آل احمد سرور کی دو کتابیں (نظر اور نظریے و مسرت سے بصیرت تک) — وارث علوی

١٤۔ آل احمد سرور کی تنقید نگاری — عبدالمغنی

١٥۔ آل احمد سرور کی تنقید نگاری — سید جعفر

١٦۔ احتشام و سرور — احتشام احمد ندوی

١٧۔ سرور۔ ایک نقاد — خان رشید

١٨۔ آل احمد سرور کی تنقید نگاری — محمد عظیم

١٩۔ تنقیدی اشارے — عبدالحق

٢٠۔ نئے اور پرانے چراغ — ہری چند اختر

٢١۔ آل احمد سرور کی خدمت میں (محبت اور معذرت کے ساتھ (نظم) — معین احسن جذبی

٢٢۔ بہ لطف نگاہ سرور — تنویر احمد

٢۔ ارمغان سرور مرتب۔ اصغر عباس
انجمن ترقی اردو، نئی دہلی، ٢٠٠١ء ٢٦١ ص
(آل احمد سرور دو روزہ قومی سمینار
منعقدہ ٢٤/٢٥ فروری ٢٠٠١ء کے مقالات)

مندرجات:

١۔ حرف آغاز — خلیق انجم

٢۔ شروع کی بات — اصغر عباس

٣۔ خطبہ استقبالیہ — اصغر عباس

٤۔ خطبۂ صدارت — سید حامد

٥۔ کلیدی خطبہ — شمس الرحمٰن فاروقی

٦۔ توقیت سرور — سلطان احمد

٧۔ آل احمد سرور: نظریے سے نظر تک — شارب ردولوی

٨۔ سرور صاحب کی تنقید (معاصر تنقیدی فکر کی روشنی میں) — خورشید احمد

٩۔ جناب آل احمد سرور کا تنقیدی کارنامہ — عبدالمغنی

١٠۔ شاعر، نقاد آل احمد سرور کی فکری سرزمین کے وسیع کینوس — پروفیسر اے۔ سنگھ
مترجمہ: سیما صغیر

١١۔ پروفیسر آل احمد سرور کی میر شناسی — نثار احمد فاروقی

١٢۔ آل احمد سرور اور اقبال تنقید — ظہیر احمد صدیقی

١٣۔ کچھ سرور صاحب کی نثر کے بارے میں — عبداللہ ولی بخش قادری

١٤۔ آل احمد سرور کی نظم نگاری۔ ایک جائزہ — سلطان احمد

١٥۔ سرور صاحب کے تاثرات امریکہ — سعید الظفر چغتائی

١٦۔ پروفیسر آل احمد سرور کی شاعری — انجمن آرا انجم

١٧۔ سرور صاحب اپنے اداریوں کی روشنی میں — نور الحسن نقوی

١٨۔ سرور صاحب کی انجمن — خلیق انجم

١٩۔ آل احمد سرور اور انجمن ترقی اردو — شہاب الدین ثاقب

٢٠۔ پروفیسر آل احمد سرور کی دانشوری — ریاض الرحمٰن شیروانی

٢١۔ سرور صاحب۔ ایک دانشور — صدیق الرحمٰن قدوائی

www.taemeernews.com

۲۲۔آل احمد سرور کا سفر۔ نقد ونظر سے دانشوری تک — عبدالباری
۲۳۔ہمارے سرور صاحب — سلمیٰ صدیقی
۲۴۔آل احمد سرور اور لکھنؤ — سید محمود الحسن
۲۵ سرور صاحب۔ چند تاثرات — امیر عارفی
۲۶۔سرور صاحب کی سرگرمیاں — شہناز ہاشمی
۲۷۔سرور صاحب۔ایک ذاتی تاثر — زاہدہ زیدی
۲۸۔سرور صاحب کی نذر (نظم) — محمد عرفان

۳۔ آل احمد سرور (دانشور، نقاد اور شاعر)

مرتب۔شاہد ماہلی غالب انسٹی ٹیوٹ، ۱۹۹۷ء ۹۶ص

مندرجات:

ابتدا میں پروفیسر شہریار کا قصیدہ در مدح پروفیسر آل احمد سرور (ص۴) ہے۔ اس کے بعد پروفیسر نذیر احمد کا سپاسنامہ بخدمت جناب پروفیسر آل احمد سرور (ص۵۔۷)۔ بعد ازاں پروفیسر مختار الدین احمد، پروفیسر اسلوب احمد انصاری، شمس الرحمٰن فاروقی، جگن ناتھ آزاد، سید حامد، کمال احمد صدیقی، گوپی چند نارنگ، خلیق انجم، شہاب الدین دسنوی، ظہیر احمد صدیقی، حامدی کاشمیری، عبدالمغنی، محمد انصار اللہ، اصغر عباس، کبیر احمد جائسی، ابوالکلام قاسمی، ایم حبیب خاں اور جناب مظہر امام کے مختصر، لیکن جامع اور معلومات افزا تاثراتی مضامین شامل ہیں۔(ص۸۔۹۳)۔

آخر میں ''سرور صاحب۔ماہ وسال کے آئینے میں'' کے عنوان سے سرور صاحب کا سوانحی خاکہ درج کیا گیا ہے۔(ص۹۴-۹۶)۔

۴۔آل احمد سرور: حیات اور ادبی خدمات

عابد النساء۔ادارۂ شعر وحکمت، حیدرآباد ۱۹۸۰ء

۵۔تحفۃ السرور۔مرتب شمس الرحمٰن فاروقی

مکتبۂ جامعہ، نئی دہلی، ۲۵۲ص ۱۹۸۵ء

(پروفیسر آل احمد سرور کے اعزاز میں مضامین)

اس میں مع عرض مرتب کل ۱۴ مضامین ہیں۔جن میں صرف تین مضامین سرور صاحب سے متعلق ہیں۔ان کی صراحت ذیل میں کی جاتی ہے:

۱۔ عرض مرتب
۲۔ آئینہ بہ انداز گل آغوش کشا ہے — اصغر عباس
۳۔ سرور صاحب میری نظر میں — گیان چند

خصوصی شمارے

۱۔ پروفیسر آل احمد سرور (شخصیت اور ادبی خدمات)
(ماہنامہ 'کتاب نما'۔نئی دہلی (جلد ۳۲، شمارہ ۵)
دسمبر ۱۹۹۲ء ص۸۸

مندرجات:

۱۔اداریہ — خلیق انجم
۲۔سرور صاحب کی خودنوشت (خواب باقی ہیں) — گیان چند
۳۔خواب باقی ہیں — شافع قدوائی
۴۔خواب باقی ہیں — خلیق انجم
۵۔آل احمد سرور۔ایک ناقد کامل — عبدالمغنی

www.taemeernews.com

۶۔روشنی کا سفر — نورالحسن نقوی

۷۔ایک دن سرور صاحب کے ساتھ — عتیق احمد صدیقی

۸۔پروفیسر آل احمد سرور اور ان کا اسلوب نگارش — رفیعہ سلطانہ

۹۔آل احمد سرور۔ایک تاثر — کمال احمد صدیقی

۱۰۔پروفیسر آل احمد سرور۔چند یادیں — ایم حبیب خاں

۱۱۔آل احمد سرور کی ادبی شخصیت اور میرے رشتے — ذکاء الدین شایاں

۱۲۔پوچھتے ہیں وہ کہ — اطہر پرویز

۱۳۔غالب اور آل احمد سرور — نائلہ انجم

۱۴۔پروفیسر آل احمد سرور مشاہیر کی نظر میں — شمیم جہاں

سید حامد، جگن ناتھ آزاد، شمس الرحمٰن فاروقی، ظہیر احمد صدیقی، اور ابوالفیض سحر کے تاثرات

۱۵۔سوانحی خاکہ پروفیسر آل احمد سرور — خلیق انجم

۲۔ہماری زبان۔(ہفت روزہ) نئی دہلی۔
(آل احمد سرور نمبر)
یکم تا ۸؍اپریل ۲۰۰۲ء، ۴۰ص

مندرجات:

۱۔سرور صاحب۔ایک یادداشت — صدیق الرحمٰن قدوائی

۲۔اردو کے دانشور نقاد۔پروفیسر آل احمد سرور — نثار احمد فاروقی

۳۔سرور صاحب بھی ہم سے جدا ہو گئے — خلیق انجم

۴۔پروفیسر آل احمد سرور کی وفات پر بیگم سرور کے نام تعزیتی خط — جگن ناتھ آزاد

۵۔آل احمد سرور۔زہے ذوق جنون ہوشمندی — اسلم پرویز

۶۔اردو تنقید کا معتبر نام۔آل احمد سرور — شریف الحسن نقوی

۷۔آل احمد سرور کی تنقید نگاری — اکبر رحمانی

۸۔پروفیسر آل احمد سرور۔ان سے مجھے بھی کچھ تعلق تھا — عبدالغفار شکیل

۹۔عصر حاضر کا دانشمند ناقد ادب — شمس بدایونی

۱۰۔پروفیسر آل احمد سرور اور اردو تحریک — ابوالفیض سحر

۱۱۔پروفیسر آل احمد سرور — شاہد ماہلی

۱۲۔آل احمد سرور کا تنقیدی تناظر — تابش انصاری

۱۳۔افزائش علم و آگہی کی علامت۔آل احمد سرور — شمیم طارق

۱۴۔آل احمد سرور کی ادبی اور فنکارانہ شخصیت — ذکاء الدین شایاں

۱۵۔آل احمد سرور کی دانشوری (ہماری زبان کے اداریوں کی روشنی میں) — آفتاب احمد آفاق

۱۷۔غم رحلت سرور (قطعہ) — منشاء الرحمٰن منشاء

۱۸۔معاون قوم پروفیسر آل احمد سرور (قطعۂ تاریخ) — عبدالہادی کاوش

۱۹۔قطعہ تاریخ بر وفات آل احمد سرور مرحوم — وقار مانوی

۲۰۔قطعات تاریخ بر وفات آل احمد سرور — نگار اناوی

www.taemeernews.com

۲۱۔آل احمد سرور کی رحلت (قطعات تاریخ) قمر سنبھلی
۲۲۔تعزیت نامہ۔آل احمد سرور کے انتقال پر ملال پر (نظم) مظفر صدیقی
۲۳۔اے سرور ادب الوداع (نظم) شاہین اجمیری
۲۴۔پروفیسر آل احمد سرور کی یاد میں ویریندر پرساد سکسینہ
۲۵۔پروفیسر آل احمد سرور کے پسندیدہ شعرائے کرام سید امتیاز الدین
۲۶۔آل احمد سرور۔ایک زندہ اور مثالی شخصیت محمد ایوب واقف
۲۷۔پروفیسر آل احمد سرور۔کثیر الجہات شخصیت انوار الحسن وسطوی
۲۸۔پروفیسر سرور اور بدایوں تسنیم غوری بدایونی
۲۹۔آل احمد سرور کا اسلوب نثر ممتاز احمد خاں
۳۰۔پروفیسر آل احمد سرور کی یاد میں تسکینہ فاضل
۳۱۔آل احمد سرور کلیم الدین کی نظر میں جاوید دربھنگوی
۳۲۔پروفیسر آل احمد سرور معاصرین کی نظر میں: پروفیسر عبدالمغنی، پروفیسر نثار احمد فاروقی، پروفیسر شمیم جیراجپوری، ڈاکٹر رضیہ حامد، عبدالغفار شکیل، ڈاکٹر طیب انصاری، چودھری شرف الدین، احمد مکرم، او۔ پی۔ آزاد بہاولپوری اور ڈاکٹر ارمان بلاری کے تاثرات
۳۳۔کچھ یادیں، کچھ باتیں سرور صاحب کی باقر مہدی

مضامین

(کتابوں میں)

الف۔ آل احمد سرور۔شخصیت اور فن

مرتبہ امتیاز احمد ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۹۷

مندرجات:

۱۔احتشام و سرور۔ایک تقابلی مطالعہ۔ احتشام احمد ندوی
۲۔آل احمد سرور (بحیثیت نقاد)۔ احتشام حسین
۳۔نئے اور پرانے چراغ۔ ہری چند اختر
۴۔آل احمد سرور کا احساس جمال۔ اخلاق اثر
۵۔آل احمد سرور سے انٹرویو۔ خلیل الرحمن اعظمی
۶۔سرور صاحب۔ کبیر احمد جائسی
۷۔سرور۔ایک نقاد۔ خان رشید
۸۔آل احمد سرور کی تنقید نگاری۔ سیدہ جعفر
۹۔سرور صاحب۔ شمیم حنفی
۱۰۔تنقیدی اشارے۔ عبدالحق
۱۱۔آل احمد سرور کی تنقید نگاری۔ عبدالمغنی
۱۲۔مرافقۃ النورفی ذکر السرور۔ شمس الرحمن فاروقی
۱۳تو یہ ہیں سرور صاحب! قیصر قلندر
۱۴۔ آل احمد سرور کی تنقید نگاری۔ ایک جائزہ کلیم الدین احمد

www.taemeernews.com

۱۵۔آل احمد سرور کی تنقید نگاری۔ محمد عظیم
۱۶۔سرور صاحب۔ منظر سلیم
۱۷۔ آل احمد سرور کا نا آشنا۔ محمد نور اسلام نشتر
۱۸۔روشنی کا سفر۔ نور الحسن نقوی
۱۹۔آل احمد سرور کی دو کتابیں۔(نظر اور نظریے اور مسرت سے بصیرت کا تنقیدی جائزہ) وارث علوی

ب۔اردو ادب کی تاریخ

فرینڈس بک ہاؤس، علی گڑھ ۱۹۸۷ء

۱۔آل احمد سرور۔ (بحیثیت نقاد)۔ نسیم قریشی

ج۔اردو ادب کی تنقیدی تاریخ

ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، ۱۹۸۳ء

۱۔آل احمد سرور (بحیثیت نقاد) احتشام حسین

د۔ اردو تنقید پر ایک نظر

ادارۂ فروغ اردو، لکھنؤ ۱۹۶۹ء

۱۔ آل احمد سرور۔بحیثیت نقاد کلیم الدین احمد

ہ۔ اردو تنقید کا ارتقا

انجمن ترقی اردو، کراچی (پاکستان) ۱۹۵۱ء

۱۔آل احمد سرور۔(بحیثیت نقاد) عبادت بریلوی

و۔ اردو تنقید کے معمار

مرتبہ ایم۔حبیب خاں انڈین بک ڈپو، علی گڑھ ۱۹۶۵ء

۱۔آل احمد سرور (بحیثیت نقاد) خان رشید

ز۔ اردو تنقید کے نئے دبستانی ابعاد

کلکتہ۔ ۱۹۹۵ء

۱۔آل احمد سرور۔بحیثیت نقاد نیلوفر مرتضیٰ

ح۔ اردو تنقید میں نفسیاتی عناصر

ادارۂ فروغ اردو، لکھنؤ ۱۹۶۸ء

۱۔پروفیسر آل احمد سرور۔بحیثیت نقاد محمود الحسن رضوی

ط۔ اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک

ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ

۱۔آل احمد سرور۔بحیثیت نقاد خلیل الرحمٰن اعظمی

ی۔ تحفۃ السرور

مرتبہ شمس الرحمٰن فاروقی۔مکتبہ جامعہ، نئی دہلی، ۱۹۸۵ء

۱۔آئینہ بہ انداز گل آغوش کشا ہے۔ اصغر عباس
۲۔ عرض مرتب۔(سرور صاحب کے فن سے تفصیلی بحث) شمس الرحمٰن فاروقی
۳۔سرور صاحب میری نظر میں۔ گیان چند

ک۔ تصویریں اجالوں کی

ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ ۱۹۹۹ء

۱۔آل احمد سرور ۔قلمی خاکہ نور الحسن نقوی

ل۔ تفہیم ادب

ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ ۲۰۰۲ء

۱۔آل احمد سرور۔بحیثیت نقاد شائستہ نوشین

www.taemeernews.com

م۔ تنقیدی افکار
نیشنل بک ڈپو، حیدرآباد ۱۹۷۷ء

ا۔اردو تنقید اور آل احمد سرور۔ سلیمان اطہر جاوید

ن۔ تنقیدی سرمایہ اردو میں
کتاب محل، الہ آباد ۱۹۴۶ء

ا۔آل احمد سرور۔بحیثیت نقاد عبدالشکور

س۔ جدید اردو تنقید۔اصول ونظریہ
کتاب پبلشرز، لکھنؤ ۱۹۶۸ء

ا۔تاریخی، مارکسی اور سائنٹفک تنقید۔ شارب ردولوی
اس باب میں مارکسی تنقید کے ضمن میں سرور صاحب کی تنقید نگاری کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔

ع۔جدید اردو تنقید کے معمار
رائل بک کمپنی، کراچی ۱۹۹۷ء

ا۔ آل احمد سرور۔مشرق اور مغرب کا امتزاج عبدالسلام

ف۔شعر، غیر شعر اور نثر
شب خون کتاب گھر، الہ آباد ۱۹۷۳ء

ا۔آل احمد سرور۔ شمس الرحمن فاروقی
اس کتاب میں مختلف مباحث کے ضمن میں صفحہ، ۱۳، ۱۹، ۵۰، ۵۱، ۲۲۱اور ۲۹۵ پر سرور صاحب کا تذکرہ ملتا ہے۔

ص۔متن وتنقید
علی گڑھ ۲۰۰۱ء

ا۔سرور صاحب کی تنقید۔ خورشید احمد

مضامین

(رسالوں/اخباروں میں)

(الف)

(i) آج کل (ماہنامہ) نئی دہلی
جنوری ۱۹۵۱ء

ا۔ تبصرہ:اردو ادب۔حسرت نمبر، مرتبہ آل احمد سرور عرش ملسیانی

(ii) آج کل (ماہنامہ) نئی دہلی
۱۹۵۵ء

ا۔تبصرہ: نئے اور پرانے چراغ عرش ملسیانی

(iii) آج کل (ماہنامہ) نئی دہلی
فروری ۱۹۶۱ء

ا۔ تبصرہ:اردو ادب آزاد نمبر، مرتبہ آل احمد سرور شہباز حسین

(iv) آج کل (ماہنامہ) نئی دہلی
جنوری ۱۹۶۶ء

ا۔تبصرہ:اردو ادب۔نہرو نمبر، مرتبہ آل احمد سرور عرش ملسیانی

www.taemeernews.com

(v) آج کل (ماہنامہ) نئی دہلی

۱۹۷۶ء

۱۔تبصرہ: نظر اور نظریے — ادارہ (آج کل)

(vi) آج کل (ماہنامہ) نئی دہلی

جون ۲۰۰۲ء

۱۔آل احمد سرور کے اداریے — ابرار رحمانی

۲۔معاصر تنقید اور آل احمد سرور — انور پاشا

۳۔آگے، آگے، پیچھے۔ کہانی: آل احمد سرور کے نام — جوگندر پال

۴۔سرور کی تنقیدی بصیرت — راشد انور

۵۔سرور اور تنقید غالب — سرور الہدیٰ

۶۔سرور کی تنقید اور نثری زبان — ذکاء الدین شایاں

۷۔مرافقۃ النور فی ذکر السرور — شمس الرحمن فاروقی

۸۔اداریہ۔ بروفات آل احمد سرور — محبوب الرحمن فاروقی

۹۔سرور صاحب کا طرز نقد — صدیق الرحمن قدوائی

۱۰۔سرور اور تنقید اقبال — منور حسن کمال

۱۱۔آل احمد سرور کی وراثت — محمد حسن

۱۲۔سرور صاحب۔ ایک طویل مضمون سے اقتباس — نورالحسن نقوی

(ب) آہنگ (ماہنامہ)

نومبر، ۱۹۸۴ء

۱۔ آل احمد سرور (یادوں کے چند سائے) — محمد غنی

(ج) اخبار اردو (ماہنامہ) اسلام آباد

مارچ ۲۰۰۲ء

۱۔ بیسویں صدی کا آخری نقاد۔آل احمد سرور — ناہید کشور

(د) اخبار مشرق (روزنامہ) کلکتہ

۲۸ر اپریل ۲۰۰۲

۱۔آل احمد سرور۔ایک عہد ساز شخصیت — محمد زاہد

(ہ) اردو ادب (سہ ماہی) علی گڑھ

سیّدین نمبر، ۱۹۷۲ء

۱۔خطوط بنام آل احمد سرور۔ گیارہ خط — غلام السیدین

(و) اردو ادب (سہ ماہی) نئی دہلی

مارچ ۲۰۰۲ء

۱۔کچھ یادیں، کچھ باتیں سرور صاحب کی — باقر مہدی

(ز)

(i) اردو (سہ ماہی) اورنگ آباد

اکتوبر ۱۹۳۷ء

۱۔ تبصرہ: سلسبیل (مجموعہ کلام) — حمید الحق

(ii) اردو (سہ ماہی) اورنگ آباد

اکتوبر ۱۹۴۲ء

۱۔ تبصرہ: تنقیدی اشارے — حمید الحق

www.taemeernews.com

(ح) اظہار (پہلی کتاب) بمبئی

۱۹۷۵ء

۱۔آل احمد سرور کی تنقیدیں — وارث علوی

(ط)

(i) انقلاب (روزنامہ) بمبئی

۱۴ر فروری ۲۰۰۲ء

۱۔ آل احمد سرور — نورالحسن نقوی

(ii) انقلاب (روزنامہ) بمبئی

۲۱ر فروری ۲۰۰۲

۱۔آل احمد سرور۔اردو ادب کی متوازن شخصیت — ابرار رحمانی

(ی) الفاظ (دوماہی) علی گڑھ

مارچ۔جون ۱۹۸۰ء

۱۔پوچھتے ہیں وہ کہ...... — اطہر پرویز

۲۔آل احمد سرور کے تنقیدی مضامین کا اشاریہ — محمد ضیاءالدین انصاری

۳۔آل احمد سرور۔تنقید نگار — نورالحسن نقوی

(ک)

(i) ایوان اردو (ماہنامہ) دہلی

مارچ ۲۰۰۲ء

۱۔پروفیسر آل احمد سرور کی وفات پر دانشوروں کے تاثرات — ادارہ (ایوان اردو)

۲۔آل احمد سرور۔ایک جامع تنقیدی نظام کا علمبردار — انور پاشا

۳۔شاعری اور دانشوری کا خوبصورت امتزاج — رفعت سروش

۴۔آل احمد سرور اور تہذیب تنقید — سرورالہدیٰ

۵۔پروفیسر آل احمد سرور — تنویر احمد علوی

۶۔آل احمد سرور کو آخری سلام — محمد حسن

(ii) ایوان اردو (ماہنامہ) دہلی

اپریل ۲۰۰۲ء

۱۔تخلیقی تنقید کا معمار آل احمد سرور — حسن مثنیٰ

۲۔پروفیسر آل احمد سرور اور دانشوری کی روایت — ابوالفیض سحر

۳۔اردو کے دانشور نقاد۔پروفیسر آل احمد سرور — نثار احمد فاروقی

(ل) تہذیب الاخلاق (ماہنامہ) علی گڑھ

اپریل ۲۰۰۲ء

۱۔پروفیسر آل احمد سرور شخصیت اور کردار — ریاض الرحمٰن شروانی

۲۔استاد محترم۔آل احمد سرور — منظر عباس نقوی

(م) جنگ (روزنامہ) کراچی

۱۰ر فروری ۲۰۰۲ء

۲۔بیسویں صدی کا آخری نقاد۔آل احمد سرور — ناہید کشور

(ن) جہان اردو (روزنامہ) دربھنگہ

۱۔اردو ادب کا سنجیدہ نقاد — مشتاق احمد

www.taemeernews.com

(س) خبرنامہ لکھنؤ

جون ۱۹۸۲ء

۱۔آل احمد کی تنقید نگاری — شکیل احمد

(ع) راشٹریہ سہارا (روزنامہ) نئی دہلی

۱۷رفروری ۲۰۰۲ء (ضمیمہ)

۱۔اردو ادب کی ایک متوازن شخصیت — رفعت سروش

(ف) ساقی (ماہنامہ) دہلی

فروری ۱۹۴۷ء

۱۔آل احمد سرور کی تنقید نگاری — محمد احسن فاروقی

(ص) سب رس (ماہنامہ) حیدر آباد

مارچ ۱۹۷۸ء

۱۔آل احمد سرور بحیثیت نقاد — عابد النساء

(ق) سوغات (میسور)

۱۹۵۵ء

۱۔تبصرہ: نئے اور پرانے چراغ — عزیز احمد

(ر)

(i) شب خون (ماہنامہ) الہ آباد

۱۔آل احمد سرور کی تنقید نگاری — عبد المغنی

(ii) شب خون (ماہنامہ) الہ آباد

مئی ۱۹۷۳ء

۱۔تبصرہ: نظر اور نظریے — شمس الرحمن فاروقی

(iii) شب خون (ماہنامہ) الہ آباد

مئی ۲۰۰۲ء

۱۔آل احمد سرور کی یاد میں — شمس الرحمن فاروقی

(ش) شیرازہ (سہ ماہی) سری نگر

جون ۱۹۸۴ء

۱۔آل احمد سرور کا نا آشنا — نور اسلام نشتر

(ت) ضیاء وجیہ (ماہنامہ) رام پور

فروری ۲۰۰۲ء

۱۔پروفیسر آل احمد سرور — عبد الہادی خاں کاوش

(ث) طلوع فکر (ماہنامہ) کراچی

فروری ۲۰۰۲ء

۱۔آہ آل احمد سرور — شکیل نوازش رضا

(خ) فکر و نظر (سہ ماہی) علی گڑھ

مارچ ۲۰۰۲ء

۱۔سرور صاحب — قاضی افضال حسین

(ذ) قومی آواز (روزنامہ) نئی دہلی

۲۷ فروری ۲۰۰۲

۱۔آل احمد سرور۔اردو ادب کی متوازن شخصیت — ابرار رحمانی

(ض)

(i) کتاب نما (ماہنامہ) نئی دہلی

جون ۱۹۸۳ء

۱۔سرور صاحب — شمیم حنفی

www.taemeernews.com

(ii) کتاب نما (ماہنامہ) نئی دہلی

دسمبر ۱۹۹۲ء

۱۔ پروفیسر آل احمد سرور۔ چند یادیں — ایم حبیب خاں
۲۔ خواب باقی ہیں (تنقیدی مطالعہ) — خلیق انجم
۳۔ سوانحی خاکہ پروفیسر آل احمد سرور — خلیق انجم
۴۔ آل احمد سرور کا اسلوب نگارش — رفعت سلطانہ
۵۔ خواب باقی ہیں (تنقیدی مطالعہ) — شافع قدوائی
۶۔ آل احمد سرور کی شخصیت اور میرے رشتے — ذکاء الدین شایاں
۷۔ پروفیسر آل احمد سرور مشاہیر کی نظر میں — شمیم جہاں
(سید حامد، جگن ناتھ آزاد، شمس الرحمن فاروقی، ظہیر احمد صدیقی اور ابوالفیض سحر، کے تاثرات)
۸۔ ایک دن۔ سرور صاحب کے ساتھ — عتیق احمد صدیقی
۹۔ آل احمد سرور ایک تاثر — کمال احمد صدیقی
۱۰۔ آل احمد سرور ناقد کامل — عبدالمغنی
۱۱۔ سرور صاحب کی خود نوشت (خواب باقی ہیں) — گیان چند
۱۲۔ غالب اور آل احمد سرور — نائلہ انجم
۱۳۔ خوشبو کا سفر — نورالحسن نقوی

(ظ) مریخ (ماہنامہ) پٹنہ

اکتوبر ۲۰۰۲ء

۱۔ آل احمد سرور کا تنقیدی کارنامہ — عبدالمغنی

(غ) معارف (ماہنامہ) اعظم گڑھ

مارچ ۲۰۰۲ء

۱۔ پروفیسر آل احمد سرور (وفیات) — ضیاء الدین اصلاحی

(الف) نقد و نظر (ششماہی) علی گڑھ

جنوری ۱۹۶۰ء

۱۔ تبصرہ بر رشید احمد صدیقی کے خطوط مرتبہ آل احمد سرور — اسلوب احمد انصاری

(ب) نقد و نظر (ششماہی) علی گڑھ

جولائی ۱۹۶۰ء

۱۔ تبصرہ بر دانشور اقبال از آل احمد سرور — اسلوب احمد

(ج) نقوش (شخصیات نمبر حصہ ۲) لاہور

اکتوبر ۱۹۵۶ء

۱۔ آل احمد سرور — خلیل الرحمن اعظمی
۲۔ سرور صاحب — وقار عظیم

(د)

(i) ہماری زبان (ہفت روزہ) نئی دہلی

آل احمد سرور نمبر، یکم۔ ۸ اپریل ۲۰۰۲

۱۔ پروفیسر آل احمد سرور کی وفات پر بیگم سرور کے نام تعزیتی خط۔ — جگن ناتھ آزاد
۲۔ آل احمد سرور کی دانشوری 'ہماری زبان' کے اداریوں کی روشنی میں۔ — آفتاب احمد آفاق

۳۔ پروفیسر آل احمد سرور معاصرین کی نظر میں: ادارہ 'ہماری زبان'
پروفیسر عبدالمغنی، پروفیسر نثار احمد فاروقی، پروفیسر شمیم جے راجپوری۔ ڈاکٹر رضیہ حامد، عبدالغفار شکیل، ڈاکٹر طیب انصاری، چودھری شرف الدین، احمد مکرم، او۔ پی۔ آزاد بھاولپوری اور ڈاکٹر ارمان بلاری کے تاثرات۔

۴۔ آل احمد سرور۔ زہے ذوق جنون ہوشمندی — اسلم پرویز

۵۔ پروفیسر آل احمد سرور اپنے کارناموں کے آئینے میں — اشفاق احمد اعظمی

۶۔ آل احمد سرور کی تنقید نگاری۔ — اکبر رحمانی

۷۔ پروفیسر آل احمد سرور کے پسندیدہ شعرائے کرام — سید امتیاز الدین

۸۔ پروفیسر آل احمد سرور کثیر الجہات شخصیت — انوار الحسن وسطی

۹۔ آل احمد سرور۔ ایک زندہ اور مثالی شخصیت — محمد ایوب واقف

۱۰۔ پروفیسر آل احمد سرور کی یاد میں — تسکین فاضل

۱۱۔ پروفیسر سرور اور بدایوں — تسنیم غوری بدایونی

۱۲۔ آل احمد سرور کلیم الدین کی نظر میں — جاوید دربھنگوی

۱۳۔ سرور صاحب بھی ہم سے جدا ہوگئے — خلیق انجم

۱۴۔ پروفیسر آل احمد سرور اور اردو تحریک — ابوالفیض سحر

۱۵۔ پروفیسر آل احمد سرور کی یاد میں — ویریندر پرساد سکسینہ

۱۶۔ پروفیسر آل احمد سرور — شاہد ماہلی

۱۷۔ آل احمد سرور کی ادبی اور فنکارانہ شخصیت — ذکاء الدین شایاں

۱۸۔ پروفیسر آل احمد سرور ان سے مجھ کو بھی تعلق تھا۔ — عبدالغفار شکیل

۱۹۔ عصر حاضر کا دانشمند ناقد ادب — شمس بدایونی

۲۰۔ افزائش علم و فضل کی علامت آل احمد سرور — شمیم طارق

۲۱۔ اردو کے دانشور نقاد۔ پروفیسر آل احمد سرور — نثار احمد فاروقی

۲۲۔ سرور صاحب۔ ایک یادداشت — صدیق الرحمٰن قدوائی

۲۳۔ آل احمد سرور کا تنقیدی نظریہ — نامی انصاری

۲۴۔ اردو تنقید کا معتبر نام آل احمد سرور — شریف الحسن نقوی

(ii) ہماری زبان (ہفت روزہ) نئی دہلی

یکم مارچ ۲۰۰۲ء

(قسط۲) ۸ مارچ ۲۰۰۲ء

۱۔ سرور صاحب رُلا گئے سب کو — خلیق انجم

www.taemeernews.com

منظوم خراج عقیدت

الف۔ آج کل (ماہنامہ) نئی دہلی

جون ۲۰۰۲ء

۱۔آج گئے آل احمد سرور (قطعہ تاریخ) اشراق حمزہ پوری

۲۔ نظم — اظہار عنایتی

۳۔ نظم (ماہنامہ مادۂ تاریخ وفات) — انور شمیم انور

۴۔ نظم (مع مادۂ تاریخ وفات) — انیس امام

۵۔ قطعۂ تاریخ وفات — رزاق افسر

۶۔ نظم (بروفات آل احمد سرور) — شفق اطہری

۷۔ نظم — مہدی پرتاپ گڑھی

ب۔ ایوان اردو (ماہنامہ) دہلی

مارچ ۲۰۰۲ء

۱۔تحقیق وتنقید کے فانوس (قطعات تاریخ) — ظفر مرادآبادی

۲۔آل احمد سرور کی رحلت — قمر سنبھلی

۳۔آل احمد سرور بھی نہ رہا (نظم) — کفیل آزر

۴۔چل بسا حیف منارۂ نور — منشاء الرحمٰن منشاء

۵۔آل احمد سرور زندہ ہے — منور امروہوی

۶۔قطعۂ تاریخ بروفات آل احمد سرور — وقار مانوی

(ج) ہماری زبان (ہفت روزہ) نئی دہلی

آل احمد سرور نمبر یکم-۸/ اپریل ۲۰۰۲ء

۱۔اے سروراد ب الوداع — معین الدین شاہین اجمیری

۲۔قطعۂ تاریخ وفات امام الناقدین حضرت آل احمد سرور — نگار اناوی

۳۔آل احمد سرور کی رحلت — قمر سنبھلی

۴۔معاون قوم پروفیسر آل احمد سرور (قطعۂ تاریخ) — عبدالہادی خاں کاوش

۵۔قطعات تاریخ بروفات آل احمد سرور — کوثر امروہوی

۶۔تعزیت نامہ آل احمد سرور کے انتقال پر ملال پر (نظم) — مظفر صدیقی

۷۔غم رحلت سرور — منشاء الرحمٰن منشاء

۸۔قطعۂ تاریخ بروفات آل احمد سرور — وقار مانوی

ENGLISH

1. ISLAM IN THE MODERN WORLD: Problems and Prospects Ed. by Aley Ahmad Suroor, , Iqbal Institute, University of Kashmir,Srinagar[n.d.] v.231 p

Papers presented in six day seminar (Oct. 3 to 8, 1981) on Islam in the modern World organised by Iqbal Institute, Srinagar

CONTENTS :

FOREWORD by Prof. Aley Ahmad Suroor I-V

www.taemeernews.com

2. THE ISLAMIC RESURGENCE:
Ed. by Aley Ahmad Suroor, , Iqbal Institute, University of Kashmir,Srinagar,1982, xii , 118p
Papers presented in a Seminar on Islamic Resurgence organised by the Iqbal Institute in July 1979.
CONTENTS:
FOREWORD by Prof. A.A. Suroor Vii-Xii

3. MODERNITY AND IQBAL:
Ed. BY Aley Ahmad Suroor, Iqbal Institute, University of Kashmir,Srinagar 1985. 88p.
Papers presented in a seminar on IQBAL AND MODERNITY organised by the Iqbal Institute in 1981.
CONTENTS:
FOREWORD by Aley Ahmad Suroor i-ii

4. LITERATURE :THE QUESTION& THE ANSWER.
Aley Ahmad. Suroor
New Delhi, Sahitya Akademy, 1992. 43 p.
(Sahitya Akademi Samvatsar Lecture:7)
Vol. 5. no.1. 1962 P.99 - 102

ARTICLES (IN JOURNALS)

1. Urdu: A wind of Change.
Aley Ahmad. Suroor
Indian Literature.(bi-monthly,N.Delhi)
Vol.10 no. 4 1967 P.90 - 105

2. The Writer's role in National Integration
Aley Ahmad. Suroor
Indian Literature.(bi-monthly,N.Delhi)

3. Nazar aur Nazariye
(Review) P. 523 - 24
Saraswati Saran Kaif
(Sahitya Akademi Awards : Books and Writers - (1955 - 1978)
Sahitya Akademy,
New Delhi,1990.

☆☆☆

www.taemeernews.com

باقیات

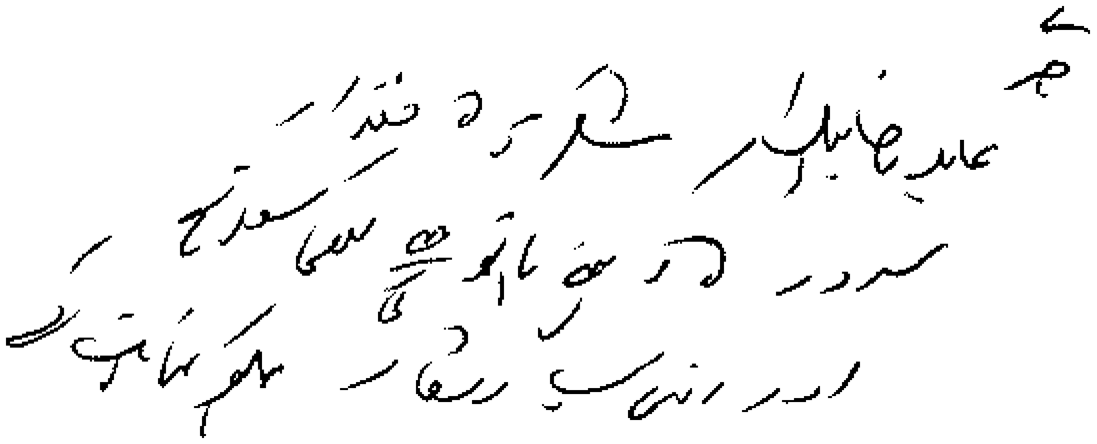

www.taemeernews.com

سوانح

یوں تو اس شمارہ میں سرور صاحب کی زندگی سے متعلق مفصل اطلاعات موجود ہیں لیکن زیرِ نظر صفحات اس لیے اہم ہیں کہ یہ مختصر خاکہ خود ان کا لکھا ہوا ہے اور ان کو پڑھ کر اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان کی اپنی نظر میں ان کی زندگی کے نقطہ ہای مرکزی کیا رہے۔ بقول غالب یہ گویا وہ 'بیرنگ' ہے جس کی تزئین و تشریح بعد میں 'خواب باقی ہیں' کی شکل میں رونما ہوئی۔ ہینڈ رائٹنگ خود سرور صاحب کی ہے۔

مدیر

www.taemeernews.com

مختصر حالاتِ زندگی

پیدائش بدایوں۔ یوپی۔ ہائی اسکول کے امتحان میں تاریخ پیدائش ۹ ستمبر 1912ء
ہمارا خاندان صدیقی فرشوری ہے۔ روایت ہے کہ خواجہ شمس الدین معز ہی کوئی بزرگ تھا
جو ایک عالم اور شاعر ہندوستان آئے۔ سلسلۂ نسب حضرت عبدالرحمٰن بن ابوبکر سے
مل جاتا ہے۔ مکتب کی تعلیم، قرآن شریف اور فارسی کے بعد گورنمنٹ ہائی اسکول بدایوں میں تیسرے
درجے میں نام لکھایا گیا۔ میرے والد اس زمانے میں یہاں پوسٹ ماسٹر تھے۔ پھر ہم لوگ بجنور، سیتاپور،
گونڈہ اور بعض دوسرے شہروں میں رہے۔ ہائی اسکول گونڈہ ہائی اسکول سے کیا۔ اس کے بعد
سینٹ جانس کالج آگرہ سے بی ایس سی کیا۔ ایم اے انگریزی میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے پاس کیا
علی گڑھ آ گیا۔ مطالعہ اور شاعری کا شوق شروع سے تھا۔ ۱۹۳۴ میں سینٹ جانس کالج آگرہ میں انگریزی میں لیکچرر
مقرر ہوا۔ ۱۹۳۶ میں اردو میں ایم اے کیا جس کے بعد میری خدمات مستقل طور پر اردو کو منتقل کر دی گئیں
خواجہ منظور حسین، ڈاکٹر یوسف حسین، رشید احمد صدیقی اردو شعبے کے ساتھ رہے۔
۱۹۳۴ میں مسلم یونیورسٹی کا لیکچرر، ۱۹۳۳ میں پہلا مضمون شائع ہوا۔
۱۹۳۵ میں پہلا مجموعہ کلام سلسبیل شائع ہوا۔ ۱۹۳۶ میں رشید احمد صدیقی کے ساتھ رسالہ سہیل
کا ایڈیٹر مقرر ہوا۔ ۱۹۴۱ میں تنقیدی مضامین کا پہلا مجموعہ تنقیدی اشارے شائع ہوا
۱۹۴۴ میں انتخاب، ۱۹۴۵ میں ... اردو شاعری کا انتخاب شائع ہوا۔
میں لکھنؤ یونیورسٹی میں ریڈر کی حیثیت سے تقرر ہوا۔ ۱۹۴۶ میں تنقیدی مضامین کا دوسرا
مجموعہ نئے اور پرانے چراغ شائع ہوا۔ اسی سال مولوی عبدالحق کی تحریک پر لکھنؤ یونیورسٹی میں
اردو کا صدر مقرر ہوا۔ ۱۹۴۷ میں تنقید کیا ہے شائع ہوا۔ تیسرا تنقیدی مضامین کا مجموعہ
... ۱۹۵۰ میں ادب اور نظریہ ...
آیا۔ ۱۹۵۴ میں چوتھا مضامین کا مجموعہ ادب اور نظریہ شائع ہوا۔ ۱۹۵۵ میں شاعری کا
دوسرا مجموعہ ذوقِ جنوں شائع ہوا۔ ۱۹۵۵ میں ...
... استعفیٰ دے دیا۔ ...
استعفیٰ واپس لے لیا۔ ۱۹۵۵ میں ذاکر حسین صاحب کی دعوت پر ...
آنے کی دعوت دی۔ اردو میں علی گڑھ واپس آیا۔ ...
ترجمہ کیا اور ...
منتخب ہوا۔ ۱۹۵۸ میں رشید احمد صدیقی کے سبکدوش ہونے پر پروفیسر اور صدر شعبۂ اردو
مقرر ہوا۔ ۱۹۵۶ سے انجمن ترقی اردو ہند
کا جنرل سکریٹری ... ۱۹۷۴ کے مارچ تک ... رہا۔ ۱۹۶۰ میں
... ۱۹۶۶ میں ...
... ۱۹۶۹ میں ...
(یو۔ ایس۔ اے) میں ... ۱۹۷۴ میں

www.taemeernews.com

[illegible] کے تحت روما، ہنگری اور سوویت یونین کی سیر کی اور رسالے [illegible] کی ادارت کی۔ ۱۹۷۳ء میں [illegible] مضامین کا ایک اردو مجموعہ [illegible] اور [illegible] میں مرتب کر کے [illegible] شائع کیا۔ [illegible] ۱۹۷۴ء میں [illegible] کی اور [illegible] اکتوبر ۱۹۷۳ء میں علی گڑھ کی ملازمت سے سبکدوش ہوا اور اپریل ۱۹۷۴ء کے [illegible] کی [illegible] وغیرہ [illegible] مقرر ہوا۔ [illegible] ۱۹۷۷ء میں شیخ محمد عبداللہ کی دعوت پر کشمیر یونیورسٹی میں اقبال چیئر پر مقرر ہوا۔ ۱۹۷۹ء میں اقبال انسٹی ٹیوٹ وجود میں آیا اور میں اس کا ڈائرکٹر مقرر ہوا۔ [illegible] کئی علمی سیمیناروں کے مقالوں کی رپورٹ شائع کیں۔ اقبال انسٹی ٹیوٹ کے سیمیناروں کے [illegible] مقالات کے کئی مجموعے شائع کئے ہیں۔ ۱۹۷۷ء میں [illegible] اقبال [illegible] ۱۹۸۳ء [illegible] کے [illegible] تمام [illegible] شائع کئے گئے۔ ۱۹۸۲ء میں [illegible] کے [illegible] شائع ہو گئے۔ [illegible] اور [illegible] کی [illegible] مجموعے [illegible] مضامین کے دو مجموعے اشاعت کے لیے تیار ہیں۔

[illegible] اور [illegible] سے [illegible] اور [illegible] کے شاعر [illegible]

اقبال کے [illegible] کی عظمت کو مانتا ہوں۔ [illegible] اور [illegible] کو اہمیت دیتا ہوں۔ [illegible] کی شاعری کو زیادہ [illegible] سے [illegible] رہا۔

شاید ۱۹۳۶ء میں [illegible] اور [illegible]

میری ایک نظم کا آخری شعر حسب حال ہے

بہت سنبھالا، بہت [illegible]، بہت ہی [illegible]
بہت [illegible]، بہت [illegible]، سب [illegible]، بہت [illegible]
[illegible] کی [illegible] کا بھی [illegible]

آل احمد سرور

آل احمد

www.taemeernews.com

کلام سرور بہ خط سرور

شعروں کے انتخاب کا معاملہ بڑا ہی نازک اور بہت ہی دشوار ہوتا ہے۔خوش قسمتی سے ہماری یہ مشکل خود سرور صاحب نے آسان کر دی۔ملاحظہ فرمایئے انتخاب اشعار سرور بہ خط سرور۔

مدیر

انتخاب کلام آل احمد سرور

انتخاب غزلیات

(۱) جینا کا تھا مجھکو سبق، یہ دن بہار رہیں تو بس
سر عشق یکوں ہی الگ اور لبوتا ہی ہے

(۲) ~~ساحل کے حلقوں کے اثر سے مکین~~
طوفاں خون سے گزرے ہیں مزا اور ہی کچھ

(۳) حیات تازہ کے فروغ کے دل دو ٹکتا تھا
ہوا چلی تو کلی بھر بھی مسکرا ہی گئی

(۴) ہر ذکر کا سوز جذبے غم دنیا کے ہوش گئے
اپنے بھی دل تیرے تصور نے مٹائے

(۵) دشت میں پھول کھلائے تھے بہت اہل وفا
دلبر خوباں میں اگر ناز نہ رنگ بار ہے

(۶) ہر لے بہار لالہ و گل سے ہزار رنگ
یک حال دوست کا عالم نے بہکی

(۷) آئینہ سے ہوتی ہے تو صبح کا روبار عشق
سودائے دشت سے الفت زیادہ رکھتے ہیں

(۸) ہر گلستہ دل کے علاوہ بھی کو کیا معلوم
محاسبے ہو رہے آنا کے در پیاں ٹھہرے

(۹) ~~دشت و دمن میں پھول کھلائے تو بات ہے~~
یہ کیا بنا ہے جو مستقیم حسن ہو ہے

(۱۰) سرد آہ و نئی صبح کو نکالے ہے نگاہ
اگر چہ ہے نئی شکست زندگی ہے

(۱۱) اپنے شمار زمانے میں پیدا کیا گیا
غم دل کے ساتھ عاشق ہیں اگر کا بات ہے

(۱۲) ~~نگاہیں منتظر تھیں شب گزرنی ہو چکے~~ رکھ ملائے
ہم سے جو دور تو کچھ اور کا ہی ہوتی جاتی ہے

(۱۳) وہ کشمکش میں میرے دل آج بھی کھلتا ہی
دن بیسیم ہوتے جاتے ہیں یہ حال ہو تی جاتی ہے
اکتا گیا ہے موت سے ہر شخص کا اک تن تنہا ترک کو
مرد آشتی ہی ہو رہے ہو کے حال ہوتی جاتی ہے

(۱۴) تم سے ہو نازنیں تقاضے کی آرزو تو ہے
میرے دل اور اپنے حال کبھی ایک آرزو تھی

(١٥) زلفِ ہستی کو سنوارا ترے گیسو کی طرح
یاں تک کہ یہ بہت سخت ، اُلجھ کے رہ گیا

(١٦) رہِ حیات پہ ہے پیچ و خم سے گزر رہے
کسی طرف کوئی سیدھا سا راستہ نہ گیا

(١٧) یہ مسرت سے ہے نہ غم سے ہے
زندگی کشمکش کے دم سے ہے

(١٨) دل کی اک چھوٹی سی بستی اور یہ غم کون و مکاں
اُن کی برکت سے سمجھ آتا ہے ، آسان ہو گئے

(١٩) شوق تھا کہ ہاتھ بیاباں جانے کو کیوں سچے ہیں
چاندنی دل میں رہے ، یہ بھی گزرتے جانا ہے

(٢٠) کیا ہو رہے تو آیا ہے بہاروں کا سفر
طرف خوابوں کے مطابق تو سنوارا گیا

(٢١) دو ہی وحشت آیا ہے ساقی کی سی حال جاتے ہیں
محفل سے ہر طلبی مستوں کا رخ گزر گیا

(٢٢) ہے حال پر سوچ کے اللہ رے اپنا حوصلہ
ان کا سراغ پا کو ڈھونڈنا سمجھتے ہی ہے

(٢٣) ہیں معاملے حضوب و جذب و گداز
وہ نوائے دل و ادائے گریز

(٢٤) آرزو کا ہر دور سلسلہ تھا
دلبری کا غرور ، غم آمیز

(٢٥) تیرا روپ کا سراپا بیاں پھر تو لے رہے ہو کیا
فضا میں ہو اڑتے بال و پر سکوں ہو گئے

(٢٦) اگر یہ النشور ہی پیدا دیکھا ہوا تھا
گر عشق ہی میں جنوں پر یہ کہ سلسلہ تمام کیا

(٢٧) ہر اک منزل کے رستے ہو کے دوزخ سے نکلے ہیں
آشنا کا حق ہے پھولوں پر جو اشکوں سے چلتے ہیں

(٢٨) نوکِ سرِ خار کو سب خونِ جگر دے ڈالا
یہ وہ ہے تو گلستاں سینچ چلے

(٢٩) اپنی آنکھوں میں بھی اک شورِ جنوں تھا
تجھ کو ایسے میں بیاباں کی ہوا یاد آئی

(۳۰) کمالی کو بس دو توہی منتشر کر سکے
جہاں کوئی چراغ ہے وہ اپنا ہی چراغ ہے

(۳۱) سو دردِ رہین کا ذکر کیا اب یہ جذب کا کاروبار
آج ہیں سب کو ڈھونس میرا حساب صاف ہے

(۳۲) بیہوشی سے درد کے باب سے، جذب و جنوں کے دور تک
میلانِ ملک رہو، وضع میں انقلاب ہے

(۳۳) علم و حکمت کے شہر میں تھے
اپنے اپنے لئے کتابت لائی

(۳۴) حیات کا درد بھی کی تھی نے زندہ بادوں کی دلداری
ذکی وادی میں کھلتے ہیں گلاب خستہ و خستہ

(۳۵) ہر لمحوں ہوئے بیٹھ کر لمبے رکھے گئے شوق
دل منتظر بیتی جنوں کے جو ہر نہ ہو سکا

(۳۶) حسن و فا کے کس کی ہمدرد کی سمال ہے آج
اپنے ہی شیخ کو بچالے یہ ہر کمال ہے آج

(۳۷) سے دو اور اوراق فکر سے کے بیتا میں دل
بے صنم خانہ افکار کھلا ہے

(۳۸) ہزار پتھر ادیے خود ہوئے نازک آبگینے پر
ہزاروں قطروں کی آگ مرنا لئی نازشیں ہے

(۳۹) کچھ تو کیے ہیں رنگیں سب رفتار کی بات
خود کچھ خون جگر ہی ملا دیتے ہیں

(۴۰) اب عالم ہے یوں تو لطف محبت کی بات
دل نے جو کچھ کیا وحشت میں رہ
تمام ہی ارمان ہو تو ہر شب میں رہے
سو اپنے ہی فرغ کا سلاست میں رہ

(انتخاب از فرد یا جنون)

(۴۱) چاند ماند کیا ہے اُٹھو اور چلے ہی آئے
ایک شام کا دروازہ نئی منزل لائے

(۴۲) ہم کو خود سے اور حقیقت سے دیکھ کر
زہر ہے کون سا آتی ہے جو راس آئے گا

(۴۳) ایک عالم ہے کب تو سودہ سواہ سال
وہ تو دشت ہی ہے بھی دوزخ کی کمی پاشہ تھا

(۴۴) سنبل عالم میں چراغاں کے لیے اللہ رے
اپنی مینائے دل کی پیروی میں ہم [illegible]

(۴۵) نہیں بیٹھیں تو دل دنیا کی خاطر مت جائے
یہ کیسی تو نے تھی جو ہم کے حوصلہ عجب ہے

(۴۶) اپنی شمع سے یاد وطن زخم کھلا ہے
ہم سے کی محبت کو کھلے بنا تے ہیں

(۴۷) [illegible]
یاد جاناں کی جب یادوں [illegible] باقی ہے

(۴۸) یہ انجم و مہر و خورشید بن نکلے ہیں
[illegible] سینے سے جو [illegible] جہاں نکلے

(۴۹) فضا موسم کو [illegible] یہ بے گھر تے ہو
ان کی تلوار سے ہی زخم کوئی کھا دیکھا

(۵۰) حسن کو دیدۂ دل نذر کیے دو بیا
حسن و ادا کے سے راز [illegible] بار کبھی

(۵۱) اٹھی شمع کاروان ما ہے یہ ڈھونڈو اب ساحل
لو دے شمع کاروان ما ہے کو شعلہ او دیکھو

(۵۲) تمہارے نزدیک دل کے لیے ایا یا یا
سنت کدے سے ہی کو کا شمع فروزاں دیکھی

(۵۳) حسن کے شہر کی یا صنم کے جادو کی وجہ بات
کوئی کھولے سے ہی لیتا منزل رب پیار کا ہے

(۵۴) ستے ہیں اس شہر کو بھی اعتبار تھا
کچھ دیو، کوئی فنا یہ رہے ہی لوگ

(۵۵) سیرے لیے دشت کو گلزار کر دیا
[illegible] جیسا ہی رہے ہی لوگ

(۵۶) بے جا نہ تھی شہروں کی تنہائی کا یہ غم بھی
پھر تنہائیوں کو اب تو [illegible] ہے ہی لوگ

(۵۷) جھکو آزادی رنگ کے دکھوے تھے جیت
پاؤں ہی زنداں کی زنجیر پڑی ہے اے دوست

(۵۸) یہ سیاہی کی سفیدی کی لکیریں کیسی
زندگی تیری لکیروں کے بڑی ہے اے دوست

(۵۹) ڈالی نے جو اپنے ذہن میں پیدا

زندگی تازہ مضمون ڈھونڈھ رہی ہے اے دوست

(۶۰) میری غزل کی تعبیر ہو رہی جاتی ہے

مگر ہم نے کوچے میں تنہا رہے

(۶۱) دل میں طوفان نہ ہو کوئی تو شہرت ہی

چاہے کی سیاہی میں طوفان اٹھاتے رہیے

(۶۲) ہر وہ پہچلتے ہیں دل میں ترستے

کوئی ستارہ ہے الفت سیاہ سا

(۶۳) گزرے ہیں اندھیرے کا ہی ہاتھ کرتے

اپنے شیشے کو کچھ نام سایہ تم نے

(۶۴) ہمدرد و سب ہستی کا تماشا بن کے گیا ہے

کہ وہ نہ رہا کو الٹی زرد بہ محفل تک نہیں رہتے

(۶۵) ہم یہ ہاتھی حباب آنکھ اور دم ہاتھی تماں اٹھے

صبح کی آنچ جو اپنے تو دیوانے میں جل اٹھے

(۶۶) لہو کی سیند ہوتی ہیں ہونے کھوٹی ہیں رہ سوں ہی

جو جانے بس سے شگونے کو بہاروں کا سلسلہ اٹھے

(۶۷) نسیم جھونکے کس سے کچھ نظر بھی تو ہو

چراغ لالہ دل کے لیے لہو بھی تو ہو

(۶۸) چاندنی چہرے کا نقشہ بھول جانے کی بات

پھر کہانی ادھر راستے دیوانے کی بات

(۶۹) شمع کے جلوے پہ ہستی کی جان جاتی ہے پروانہ

کون سمجھے ایک پروانے کے جل جانے کی بات

(۷۰) حقائق کے پرستاروں نے خوابوں کو کچل ڈالا

مگر کچلے ہوئے خوابوں کی تعبیر نہیں جاتی

(۷۱) تشنہ سا سفر دریں ہو تشنہ کوئی نہیں ملتا

پھر محفل میں سیر دل کی ویرانی نہیں جاتی

(۷۲) فلک کی گردشیں دل کی ریت اڑا کر

سنتے ہیں مرے تجھے ہونٹوں کے آنسو بہائے ہوئے

(۷۳) ہر قدم پر خود ہی دیکھ بڑھا دامن دوست

عاشقی کا مارا کب تنہا آ کے جاتا ہے

www.taemeernews.com

(۷۴) یاد آتا ہے تجھے حسن میں یا کوئے دوست
دیر تک کس کے خیالات میں [illegible] جاتا ہے

(۷۵) دل وہ ساغر کہ محبت میں [illegible] جائے
ہر زمانے میں گرہ اور زمانہ لگے

(۷۶) دل بیمار کسی راہ دو دست [illegible] ہے
[illegible] میں [illegible]

(۷۷) دل وہ معصوم کہ ہر بات کو [illegible] مانگے
قتل پر صبح [illegible] میں سمائی مانگے

(۷۸) دل یہی پہلے ہی سمجھے تم سے [illegible] ہوگا
پھر نیا درد ، الگ اپنی [illegible] مانگے

(۷۹) دیکھو مجھے پہلے وہ زخموں کا [illegible]
پھر ایک لیے زخم یہ [illegible] دنیا کو

(۸۰) ہاں ہاں [illegible] امید کا مرہم رکھیے تو
اب اور یاس [illegible] تماشا دیا کریں

(۸۱) [illegible] بار بار روئے دکھ دیا [illegible]
[illegible] بار روئی [illegible] گئی ہے

(۸۲) رنگ سنیئے [illegible] کی جستجو ہی نہیں
ستم یہ ہے کسی [illegible] استفسار بھی ہے

(۸۳) [illegible] ، [illegible] ، [illegible]
[illegible] ہے

(۸۴) [illegible] تنہائی [illegible] ملا کرتے ہیں
وہ [illegible] تو تنہا ہی رہا کرتے ہیں

(۸۵) ساتھ دنیا [illegible] کا بھی پیار [illegible] ہو گیا
[illegible] - آج ہی [illegible]

(۸۶) [illegible] راستے ہی [illegible] ہو
[illegible] ہی [illegible] چند [illegible] ہے

(۸۷) [illegible] توڑ [illegible] ہو
چند [illegible] ہے ، [illegible]

(۸۸) [illegible] ہی [illegible] گھر کا [illegible]
میرا [illegible] سایہ دار [illegible] ہے

(۸۹) دیر و حرم رشک کا کوئی گزر ہو دوارا نہ ہوا
جب تو ہوئے یکجا تیری بزم میں کیا کیا نہ ہوا

(۹۰) شہ جاے حسن رخ ہوتی ہے گلشن نہ کھو دی ہے
نگاہ شوق تک سیر جو بات کی طرح میں

(۹۱) سر اٹھیتا نہ کرنا کے پیچھے کچھ میں گواڈ
اگرچہ لکھی گئی ہے کو کا کی طرح میں

(۹۲) رنگ خوشبو میں کی جا دو کیا بائے اڑے
رنگ ادا میں ان گنت پہلو کیا بائے اڑے

(۹۳) ہم تو بیٹھے تھے کہ دار و رسن کی جا جا میں
پیش روائی کو قدر گیسو کیا بائے اڑے

(۹۴) ہم زلف پیر دیکھے تھے جلوہ جانے خوب ہو
اس کی چوڑے میں غم اور کیا بائے اڑے

(۹۵) چشم ساقی کا میرا نام ہے لطف ساقی ہے کراں
پھر سے سیرت زندگی میں زلف کیا بائے اڑے

(۹۶) غم دوران غم امتداد کے لیے جو تھے
یہ بھی اپنی ہی تماشوں کے کیا بائے رکھے

(۹۷) صبح اگر آئی ہے پھر بزم میں بھی محشر کی خبری
یہ جا رہے نگاہ میں باتوں کا تل نہ میں لکھے

(۹۸) جب یہ سوچیا خالی تھی یہ رہگزر ملی
ملی ہے رہگزر مجھے ادا رہگزر کو میں

(۹۹) دنیا بڑی ہے اور اطلس میں بکھرے پڑے
اس کھیسے میں بھول گیا ہے گھر کو میں

(۱۰۰) شفق زمانے کو خوب آئی ہے
میں اک دیر تک تھا سو مستبر کیا تھا

(۱۰۱) مشترکہ دھوپ تو گیا سو کوئی اب یہ بھی نہیں
اپنا اپنا ہے رنگ، سایۂ دیوار بھی اب

(۱۰۲) مراد ہے گر اس کا گیا علاج کریں
سر کو دل تو بیٹے کچھ بدل گیا ہے میاں

(۱۰۳) وحشت کا مشن نکلنے والے کو سمجھاتے رہتے ہیں
وہ بھی تو گھر جانا ہو گا جس نے گھر کا ساتھ دیا

(۱۰۴) دشت کا زندگی کیا بات یاں نظر آتا نہیں
چلتی رہتی ہے مگر بگولا اڑتا رہتا ہے

www.taemeernews.com

(۱۰۵) [illegible]
تا عمر ہی دھوپ میں جو شجر دیکھتے رہیں

(۱۰۶) اب خدا کی بندگی کا حق ادا ہو کس طرح
پتھر کے تراشے بتوں کی بندگی کیسے کریں

(۱۰۷) آج کل کیا کیا گرجتے اور برستے ساتھ ہیں
دل لگی کے ساتھ، تلواریں کسی کے ساتھ ہیں

(۱۰۸) بھیڑ کوئی ہو، تماشا کوئی ہو، بیٹھا ہے کوئی
خواہشوں کے بارے جو ہیں وہ کسی کے ساتھ ہیں

(۱۰۹) وہ شناسا درد کتنی بار ذہن پر آئی
سننے والوں میں توجہ کی کمی پائی گئی

(۱۱۰) وہ گلی راستے کی ہو، پھر کتاب حرف آشنا
ان آوازوں کلیوں کا موسم ہے ابھی کے

(۱۱۱) رنگ بکھرے ہیں زمانے کی تمنا کرتی ہے
رنگ بکھرے ہیں مہکنے کی روشنی باقی ہے مشکل سے

(۱۱۲) چلو ہم اپنی خطا دیکھا اعتراف کر لیں
پھر اس کے بعد سبھی کی خطا معاف کریں

(۱۱۳) کبھی کبھی تو نئے زخم کا مزا چکھیں
کبھی کبھی تو روایت سے انحراف کریں

(۱۱۴) سو آن کے در پہ جبینیں جھکانے آئے ہیں
وہ پہلے اپنی جبینوں کو گرد صاف کریں

(۱۱۵) دشت میں کل کوئی وحشی بے صدا رہتا تھا
منتظر داروں کی یہ تہذیب تو بیچارگی ہے

(۱۱۶) عزل یہ وقت کی ہے اور کمانیاں تو ہے
ہماری بات بھی ہے اور تمہاری بات بھی ہے

(۱۱۷) وقت کا گزرے دھندلا دے کتنے منظر
ہاں مگر تیرا بھی تیری بھی آج تک ہے

(۱۱۸) بہاروں کی تمنا میں ہمیں رہنا ہو دیکھنا ہے
چمن سے کیسے مانگیں اور خوشی اپنی جدا مانگیں

(۱۱۹) کون لیے ہستی ترشے، کون یہ زحمت کرے
ذرا دیکھیں ہم کو ان سے بہت جو اٹھاتے ہیں لوگ

(۱۲۰) ہم نہ اس کوچے میں تھے یاروں نہ اس کوچے میں تھے
(انتخاب از [illegible]) نہ کسی کی جیب میں تھے نہ کسی کے دل میں تھے

www.taemeernews.com

سراج اجملی*

قطعۂ تاریخ وفات پروفیسر آل احمد سرور

بتاؤ علم کی پیاس اب بھلا کہاں سے بجھے
وہ چشمہ خشک ہوا جس پہ جا کے پیتے تھے
یہ حال جا کے وہاں اس جہاں میں کون کہے
نہ قاصدے نہ صبائے نہ مرغِ نامہ برے
جدھر نگاہ اٹھاؤ سکوتِ خاموشی
کہاں سے اب وہ انا البحر کی صدا آئے
وہ آل احمد خوش خو سرورِ دانشور
سوئے جنابِ خدا جب مراجعت کر گئے
ملا ہے مصرعِ تاریخ اسمِ ذات کے ساتھ
سرورِ علم سے سرشار آلِ احمد تھے

1936 + 66 = 2002

* لکچرر شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

November 2003

FIKR-O-NAZAR

SUROOR NUMBER

Aligarh Muslim University